قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت

جلد اول

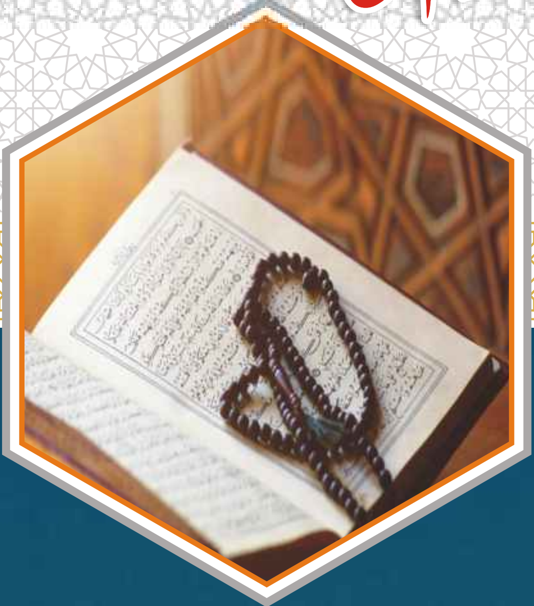

سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں موجود فصاحت و بلاغت اور
اعجاز قرآنی کے نکات، فوائد اور لطائف پر مشتمل ایک علمی کاوش

تالیف

مولانا محمد نعمان صاحب

استاذِ حدیث جامعہ انوار العلوم مہران ٹاؤن کورنگی کراچی

مکتبۃ المتین

عرضِ مؤلف

قرآن کریم اللہ رب العزت کی بے مثال، لاریب اور لاجواب کتاب ہے، قرآن کریم میں فصاحت وبلاغت کے دریا موج زن ہیں، ایک ایک آیت میں معانی، بیان اور بدیع کے عمدہ فوائد ونکات یکجا ہیں۔ مشرکین مکہ اور ہر دور کے کفار جو قرآن کا مثل نہ لاسکے تو اس کی بنیادی وجہ قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت ہے۔ اگرچہ یہ لوگ فی البدیہہ شاعر تھے، انہیں سینکڑوں اشعار حفظ تھے، اپنے آباء واجداد کے مفاخر وکارناموں پر طویل قصیدے پڑھتے تھے، لیکن قرآن کریم کے چیلنج کا جواب نہ دے سکے، اس کی بنیادی وجہ قرآن کریم کی حیرت انگیز اور محیر العقول فصاحت وبلاغت ہے۔

قرآن کریم کی بلاغت کو سمجھنے کے لیے اہلِ علم حضرات نے علم معانی، علم بیان اور علم بدیع پر متعدد کتابیں لکھیں، تاکہ ان کی روشنی میں قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کو سمجھا جاسکے، بعض علمائے کرام نے صرف علم معانی پر، بعض نے صرف علم بیان پر اور بعض نے علم بدیع پر لاجواب کتابیں لکھیں، اور بعض اہلِ علم نے تینوں فنون کو یکجا کر کے تعریفات، اَمثلہ اور تطبیق سب کو یکجا کیا، بعض نے قرآن کریم کے اعجاز کو واضح کیا، اس سلسلے کی معروف کتب درج ذیل ہیں:

۱......مجاز القرآن: امام ابوعبیدہ معمر بن مثنی رحمہ اللہ (متوفی ۲۱۰ھ)

۲......البیان و التبیین: امام جاحظ رحمہ اللہ (متوفی ۲۵۵ھ)

۳......النکت في إعجاز القرآن: امام ابوالحسن علی بن عیسی رمانی رحمہ اللہ (متوفی ۳۸۴ھ)

۴......بیان إعجاز القرآن: امام ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی رحمہ اللہ (متوفی ۳۸۸ھ)

۵......کتاب إعجاز القرآن: امام ابوبکر باقلانی رحمہ اللہ (متوفی ۴۰۳ھ)

۶......تلخیص البیان عن مجازات القرآن: شیخ شریف رضی (متوفی ۴۰۶ھ)

۷......کتاب إعجاز القرآن: قاضی عبدالجبار معتزلی (متوفی ۴۱۵ھ)

۸......سحر البلاغة وسر البراعة: امام ابومنصور ثعالبی رحمہ اللہ (متوفی ۴۲۹ھ)

۹......دلائل الإعجاز: علامہ عبدالقاہر جرجانی رحمہ اللہ (متوفی ۴۷۱ھ)

۱۰......أسرار البلاغة: علامہ عبدالقاہر جرجانی رحمہ اللہ (متوفی ۴۷۱ھ)

۱۱......أساس البلاغة: علامہ جاراللہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ)

۱۲......مفتاح العلوم: علامہ سکاکی رحمہ اللہ (متوفی ۶۲۶ھ)

۱۳......تلخيص المفتاح: علامہ قزوینی رحمہ اللہ (متوفی ۷۳۹ھ)

۱۴......مختصر المعانی: علامہ تفتازانی رحمہ اللہ (متوفی ۷۹۳ھ)

۱۵......عقود الجمان فی المعانی والبیان: علامہ سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ)

۱۶......معترک الأقران فی إعجاز القرآن: علامہ سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ)

۱۷......زهر الربيع فی المعانی والبيان والبديع: شیخ احمد بن محمد محلاوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۵۱ھ)

۱۸......جواهر البلاغة فی المعانی والبيان والبديع: استاذ احمد بن ابراہیم بن مصطفیٰ ہاشمی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۶۲ھ)

۱۹......علوم البلاغة "البيان، المعانی، البديع": احمد بن مصطفیٰ المراغی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۷۱ھ)

۲۰......البلاغة الواضحة: علی حازم، مصطفیٰ امین۔

بعض مفسرین کرام تفسیر کے دوران قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کے فوائد ونکات، اعجازِ قرآن، اصطلاحات، رموز وتشبیہات جابجا نقل کرتے ہیں، جیسے:

۱......الهداية إلى بلوغ النهاية: امام ابو محمد مکی بن ابی طالب قیروانی رحمہ اللہ (متوفی ۴۳۷ھ)

۲......الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل: علامہ جاراللہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ)

۳......أنوار التنزيل وأسرار التأويل: قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ)

۴......فتوح الغيب فی الكشف عن قناع الريب: علامہ طیبی رحمہ اللہ (متوفی ۷۴۳ھ)

۵......إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم: امام ابو السعود محمد بن محمد رحمہ اللہ (متوفی ۹۸۲ھ)

۶......روح المعانی: علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰ھ)

۷......التحرير والتنوير: علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ)

۸......التفسير المنير: دکتور وهبة الزحيلي

۹......حدائق الروح والريحان: علامہ محمد امین بن عبداللہ ہرری۔

۱۰......صفوة التفاسير: علامہ محمد علی صابونی۔

۱۱......بیان القرآن: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۶۲ھ)

ہمارے ہاں اردو تفاسیر میں عموماً شانِ نزول، تفسیر، لغوی، نحوی، فقہی، کلامی مسائل ومباحث تو ذکر کی جاتی ہیں، لیکن آیات میں موجود بلاغت کے رموز ونکات نقل نہیں کیے جاتے، حالاں کہ فہم قرآن میں یہ سب سے اہم باب ہے جسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، تدریس میں بھی اور تحریر میں بھی۔ درس نظامی میں بھی بلاغت کی صرف دو ہی کتابیں نصاب میں شامل ہیں، (۱) دروس البلاغۃ (۲) مختصر المعانی۔ ایک عموماً سال کے آخر میں تیزی سے گزر جاتی ہے، جب کہ دوسری کتاب میں قیل وقال، اشکال وجواب، لطائف ونکات اور ادنیٰ مناسبت سے منطقی وکلامی رموز نقل کیے جاتے ہیں، اس بات میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ اس کے پڑھنے سے استعداد میں خوب اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس سے فن سمجھ کر کتاب اللہ کی بلاغت سمجھ میں آجائے تو ایسا بہت کم ہوتا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عام فہم انداز میں قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت ذکر کی جائے، تاکہ طلباء کرام بآسانی اسے سمجھ سکیں۔ اصطلاحات، تطبیق، تشریح اور تعبیرات نہایت عام فہم اور سلیس استعمال کی ہیں تاکہ استفادہ آسان ہو۔ جو اصطلاح استعمال ہوئی حاشیہ میں اس کی تعریف بھی ذکر کر دی تاکہ اصطلاح اور تطبیق کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ تعریفات حاشیہ میں اس لیے ذکر کیں کہ اصطلاح کا سمجھنا اس پر موقوف ہوتا ہے، اور حاشیے میں باریک فونٹ پر رکھا تاکہ کتاب کی ضخامت بھی کم رہے، اور اصل کتاب پڑھنے والے پر تعریفات کے پڑھنے کا بوجھ نہ آئے اور تسلسل میں انقطاع نہ ہو۔ تعریف، تطبیق اور وضاحت عام فہم رکھی گئی تاکہ کمزور طلباء بھی قرآنی بلاغت بآسانی سمجھ سکیں۔ چونکہ اردو زبان میں مکمل قرآن کریم کی بلاغت پر شاید کوئی کتاب موجود نہیں ہے، اس لیے امید ہے کہ شائقین تفسیر کے لیے فہم بلاغت میں یہ کتاب مُمِدّ ومعاون ہوگی۔ یہ پہلی جلد ہے جو تین سورتوں (سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران) پر مشتمل ہے۔

قرآنی آیات کے ساتھ ترجمہ حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کے ”آسان ترجمہ“ سے نقل کیا ہے۔اگراللہ رب العزت کی مدد ونصرت اور فضلِ الٰہی شاملِ حال رہاتوان شاءاللہ یہ کام چار جلدوں میں مکمل ہوگا۔

راقم نے علم معانی،علم بیان اورعلم بدیع کی تمام اصطلاحات،اَمثلہ اور تطبیق پر اردو زبان میں کام شروع کیا ہے،تاکہ اس سے یہ فن بآسانی سمجھ آسکے،اس میں جابجا قرآنی آیات،احادیث، اشعار اور محاورات سے مثالیں دی ہیں۔ان شاءاللہ امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد تینوں فنون کی جملہ اصطلاحات،تشریح وتوضیح کا سمجھنا آسان ہوگا۔قارئین کرام سے دعاؤں کی درخواست ہے کہ رب العالمین محض اپنے فضل وکرم سے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

اس کام میں میرے ساتھ شاگرد رشید مولانا محمد داؤد انور صاحب حفظہ اللہ (فاضل جامعہ علوم اسلامیہ) نے نہایت تعاون کیا ہے،اللہ رب العزت ان کی جان ومال اورعلم وعمل میں برکتیں نصیب فرمائے۔آمین

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ رب العالمین اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے،اورقارئین کرام کے لیے نافع اور راقم کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔آمین

محمد نعمان

استاذ الحدیث جامعہ انوارالعلوم مہران ٹاؤن کورنگی کراچی

٢٥ جمادی الثانی ١٤٤٣ھ/ 30 جنوری 2022ء

0332-2557675

أَعُوذُ بِٱللَّهِ مِنَ ٱلشَّيۡطَٰنِ ٱلرَّجِيمِ

میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود کے شر سے۔

تعوذ کے الفاظ

علامہ قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کے ہاں تعوذ میں "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ" پڑھنا اولیٰ ہے اس لئے کہ یہ کتاب اللہ کے الفاظ ہیں:

أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم. وهذا اللفظ هو الذی عليه الجمهور من العلماء فی التعوذ لأنه لفظ كتاب اللّٰه تعالى. ❶

تعوذ کا معنی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) تعوذ کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعوذ کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کے ذریعے پناہ لیتا ہوں کہ شیطان رجیم مجھے دین ودنیا میں کوئی ضرر نہ پہنچا سکے، جن احکام کی بجا آوری کا مجھے حکم کیا گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ مجھ سے وہ بدافعال سرزد ہو جائیں جن سے مجھے روکا گیا ہے:

ومعنى أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم، أی: أستجير بجناب اللّٰه من الشيطان الرجيم أن يضرنی فی دينی أو دنياى، أو يصدنی عن فعل ما أمرت به، أو يحثنی على فعل ما نهيت عنه. ❷

تعوذ دعا کے معنی میں ہے

علامہ ابوالحسن ماوردی رحمہ اللہ (متوفی ۴۵۰ھ) فرماتے ہیں تعوذ دعا کے معنی میں

❶ تفسير القرطبی: القول فی الاستعاذة، ج۱ ص۸۶

❷ تفسير ابن كثير: الكلام على تفسير الاستعاذة، ج۱ ص۲۹

ہے اگرچہ یہ خبر کے لفظ کے ساتھ ہے:

أنها فی معنى الدعاء، وإن كانت بلفظ الخبر. ❶

”أَعُوْذُ“ فعل مضارع کا حال کے معنی میں استعمال ہونا حقیقت ہے

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں کہ ”أَعُـوْذُ“ فعلِ مضارع ہے، یہ حال اور استقبال دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے، کیا اس کا استعمال دونوں میں حقیقت ہے؟ حق بات یہ ہے کہ فعل مضارع کا حال کے معنی میں استعمال ہونا حقیقت ہے جب کہ مستقبل کے معنی میں استعمال ہونا مجاز ہے:

أعوذ فعل مضارع، وهو يصلح للحال والاستقبال، فهل هو حقيقة فيهما؟ والحق أنه حقيقة فی الحال مجاز فی الاستقبال. ❷

تعوذ کا وقت

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ جمہور امت کے نزدیک سلفاً وخلفاً، سنت اور اور آثارِ صحابہ سے یہ بات ثابت ہے کہ تعوذ قراءت سے پہلے پڑھا جائے گا:

إن السنة وآثار الصحابة إنما جاء ت بالاستعاذة قبل الشروع فی القراء ة وهو قول جمهور الأمة من السلف والخلف. ❸

لفظِ شیطان کی لغوی تحقیق

”**شطن يشطن شيطانا**“ میں لفظِ نون اصل کلمے میں سے ہوگا یا زائد ہوگا، اگر اصل ہو تو اس صورت میں شطن بمعنی **بعد** کے ہوگا، **لأن الشيطن بعيد من الملاء**

❶ النكت والعيون: مقدمة، ج۱ ص۴۳

❷ التفسير الكبير: الباب السابع، ج۱ ص۹۵

❸ إغاثة اللهفان من مصائد الشيطان: الباب الثانی عشر، ص۹۲

الأعلى، بعيد من رحمة الله، بعيد من محبة الإنسان.

لفظ ’’شیطان‘‘ کے مادے کے بارے میں دوقول ہیں:

ایک یہ لفظ ’’شیطان‘‘ ،شطن سے مشتق ہےاور دوسرا یہ ’’شاط‘‘ سے مشتق ہے۔دونوں قول درج ذیل ہیں:

۱.....امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ (متوفی ۵۰۲ھ) فرماتے ہیں:

الشيطان النون فيه أصلية وهو من شطن: أي تباعد. ❶

ترجمہ: لفظ شیطان میں نون اصلیہ ہے اور وہ ’’شطن‘‘ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں وہ دور ہوا۔

لغت عرب میں کہا جاتا ہے ’’غُرْبَةٌ شَطُونٌ‘‘ (دور کی مسافری) امیہ بن ابی صلت، نابغہ ذبیانی اور سیبویہ نے یہ مادہ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔اہلِ عرب کہتے ہیں ’’تَشَطَّنَ فُلَانٌ‘‘ (کہ فلان نے شیطانی فعل کیا) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحیح یہی ہے کہ شیطان ’’بعد‘‘ کا معنی رکھتا ہے اور اسی پر کلام عرب کی بھی دلالت ہے۔

۲.....امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے دوسرا قول بھی بیان کیا ہے:

قيل: بل النون فيه زائدة من شاط يشيط: احترق غضبا، فالشيطان مخلوق من النار كما دل عليه قوله تعالى: وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ. ❷

ترجمہ: یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ شیطان میں نون زائدہ ہے اور یہ شاط یشیط سے مشتق ہے۔جس کا معنی ہے ’’غصے میں جلنا‘‘ ہے، کیونکہ شیطان آگ کی مخلوق ہے۔جیسا کہ اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے (اور جنات کو پیدا فرمایا آگ کے شعلے سے۔)

اس معنی کے لحاظ سے شیطان حسد، بغض اور عناد سے عبارت ہے۔خلاصہ کلام یہ ہوا

---

❶ المفردات في غريب القرآن: كتاب الشين، شطن، ص ٤٥٤

❷ المفردات في غريب القرآن: كتاب الشين، شطن، ص ٤٥٤

کہ پہلے مادۂ اشتقاق کی بناء پر شیطان رحمتِ حق اور نیکی سے دوری پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے مادۂ اشتقاق کی بناء پر شیطان غصہ وحسد، بغض وعناد اور تکبر ونخوت کی آگ پر دلالت کرتا ہے۔

اگر لفظِ نون زائد ہو تو اس کی اصل ''شاط'' ہوگی اس صورت میں بمعنیٰ ''احترق'' یعنی جلنا، لأن الشیطن یحترق من الإنسان حسدا.

شیطان بنوآدم کو بہکانے کی کتنی کوشش کرتا ہے

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ شیطان نے حضرت آدم وحواء علیہما السلام کو بہکانے کے لئے ایک جملے میں چھ (٦) تاکیدات استعمال کیں:

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّيْ لَكُمَا مِنَ النَّاصِحِيْنَ. (الأعراف: ۲۱)

۱..... پہلی تاکید یہ ہے کہ قسم کھا کر کہنے لگا میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ ۲..... ''إِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل لایا۔ ۳..... ''لَكُمَا'' میں معمول کو عامل پر مقدم کیا اختصاص کے لئے۔ یعنی میری نصیحت تم دونوں کے ساتھ خاص ہے اور تمہارا اس میں فائدہ ہے میرا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ۴..... ''اَلنَّاصِحِيْنَ'' صیغہ اسمِ فاعل کے ذریعے ثبوت اور دوام کی طرف اشارہ کیا، فعل ذکر نہیں کیا اس لئے کہ وہ تجدد پر دلالت کرتا ہے، اس میں استمرار اور دوام کا معنیٰ نہیں ہوتا۔ ۵..... ''لَكُمَا'' جو جوابِ قسم ہے اس پر لام تاکید داخل کیا۔ ٦..... ''اَلنَّاصِحِيْنَ'' لاکر اپنے آپ کو ناصح شمار کرتے ہوئے کہا کہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ یعنی تمہارے بہت سے خیرخواہ ہیں اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں:

فتضمن هذا الخبر أنواعا من التأكيد: أحدها: تأكيده بالقسم. الثاني: تأكيده بإن. الثالث: تقديم المعمول على العامل إيذانا بالاختصاص أى نصيحتى مختصة بكما وفائدتها إليكما لا إلى. الرابع:

إتيانـه بـاسـم الفاعل على الثبوت واللزوم دون الفعل الدال على التجدد. الـخـامـس: إتيانه بلام التأكيد في جواب القسم. السادس: أنه صور نفسه لهـمـا نـاصـحـا مـن جملة الناصحين فكأنه قال لهما: الناصحون لكما في ذلك كثير وأنا واحد منهم. ❶

لفظِ رجیم کی لغوی تحقیق

لفظ''رجیم'' رجام سے مشتق ہے، رجیم بروزن فعیل بمعنی مفعول کے ہے وہ جس کو پتھروں سے مارا جائے، یہ اظہارِ نفرت کے لئے ہوتا ہے اس لئے اس کا ترجمہ''مردود'' سے کرتے ہیں۔

لفظ''**الرجيم**''جس کا مادہ رجم ہے،الرجام پتھر کو کہا جاتا ہے۔بناء بریں''**الرمي بـالرجام**''(پتھروں سے مارنا) کے معنی میں مستعمل ہے۔جس پر پتھراؤ کیا گیا ہوا سے ''**مرجوم**'' کہتے ہیں۔قرآن میں مذکور ہے کہ قومِ نوح نے تبلیغِ حق کا انکار کرتے ہوئے کہا:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ. (الشعراء: ١١٦)

ترجمہ: وہ بولے اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو ضرور سنگسار کئے جاؤ گے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ. (الملک:۵)

ترجمہ: اور بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

''**الرجيم**'' دراصل فعیل کے وزن پر اسم مفعول ہے جو''**مرجوم**''یعنی''**مطرود عـن الخير**''(خیراور نیکی سے بھگایا ہوا، یا محروم کیا ہوا) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

---

❶ إغاثة اللهفان من مصائد الشيطان: الباب الثالث عشر، ص ١١٤

''الــرجیم'' کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اسمِ فاعل کے طور پر راجم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

لأنه يرجم الناس بالوساوس.

کیونکہ یہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے:

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ. (الناس:۵،۶)

ترجمہ: جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خواہ وہ (وسوسہ انداز شیطان) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

لہذا ''الــرجیــم'' کے دونوں معنی ''خیر اور نیکی سے دور بھگایا ہوا'' اور ''وسوسہ اندازی کرنے والا'' قرآن ہی سے ماخوذ ہیں۔

لفظِ رجیم دو معنوں میں مستعمل ہے

امام قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

''رجیم'' سے مراد وہ شخص ہے جسے ذلیل کر کے بھلائی سے دور ہٹا دیا جائے۔ ''رجیم'' کا اصل معنی پتھر مارنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''رَجَمْتُهُ أَرْجُمُهُ'' میں نے اسے پتھر مارا، اور میں اسے پتھر مارتا ہوں ''فَهُوَ رَجِيْمٌ مَرْجُوْمٌ''

الرجيم أى المبعد من الخير المهان. وأصل الرجم الرمى بالحجارة، وقد رجمته أرجمه، فهو رجيم ومرجوم. (1)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) نے دو قول نقل کئے ہیں پہلا قول یہ ہے کہ رجیم بروزن فعیل بمعنی مفعول کے ہے، دوسرا قول رجیم بمعنی راجم کے ہے، لیکن حافظ ابن کثیر

(1) تفسير القرطبی: القول فی الاستعاذة، ج ۱ ص ۹۰

رحمہ اللہ نے پہلے قول کوراجح قرار دیا ہے۔آپ نے فرمایا کہ ''رجیم ''فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول کے ہے،یعنی وہ جس کو پتھروں سے مارا جائے اور جو تمام خیر کے کاموں سے دھتکارا ہوا ہے،جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے زینت دی اور ہر سرکش شیطان سے بچاؤ بنایا۔اس آیت میں ''رجیم ''مفعول کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ''رجیم '' بمعنی ''راجم '' کے ہے اس لئے کہ شیطان لوگوں کو وسوسوں اور گمراہیوں سے رجم کرتا ہے۔ پہلا قول زیادہ مشہور اور اصح ہے:

الرّجيم: فعيل بمعنى مفعول، أى: إنه مرجوم مطرود عن الخير كله، كما قال تعالى: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ ...... وقيل: رجيم بمعنى راجم لأنه يرجم الناس بالوساوس والربائث، والأول أشهر واصح. ❶

تعوذ پڑھنے کی حکمت

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ھ) فرماتے ہیں کہ بے شک بندے کی زبان جھوٹ،غیبت،چغل خوری کی وجہ سے نجس ہو جاتی ہے،تو اللہ تعالیٰ نے تعوذ کا حکم دیا تا کہ بندے کی زبان پاک ہو جائے،تا کہ وہ لسانِ طاہر کے ذریعے اس کلام باری تعالی کو پڑھے جو پاکیزہ ذات نے اتارا ہے:

الحكمة فيه أن العبد قد ينجس لسانه بالكذب والغيبة والنميمة فأمر الله تعالى العبد بالتعوذ ليصير لسانه طاهرا فيقرأ بلسان طاهر كلاما أنزل من رب طيب طاهر. ❷

❶تفسیرابن کثیر: الكلام على تفسير الاستعاذة، ج١ ص٣١

❷التفسير الكبير: الباب السابع، ج١ ص٩٥

”أعوذ“ میں صیغہ واحد متکلم استعمال کرنے کی حکمت

سوال: ”أَعُوْذُ“ میں صیغہ واحد متکلم کیوں استعمال کیا جبکہ عموماً دعا کے موقع پر جمع کے صیغے استعمال ہوتے ہیں؟

جواب: شیطان کے مقابلے میں جماعت فرد کی طرح ہے، کیونکہ شیطان غیر مرئی ہے اس کے مقابلے میں جماعت فرد کی حیثیت رکھتی ہے، شیطان کے مقابلے میں ہر فرد کو اپنے اپنے بچاؤ کا حکم دیا گیا ہے، جب شیطان دکھائی نہیں دیتا ہے تو اس کے ساتھ مقابلہ جماعت کی صورت میں کیا جائے:

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ. (الأعراف:۲۷)

لہٰذا ہر شخص کو شیطان سے بچاؤ کے لئے انفرادی طور پر تعوذ کا حکم دیا گیا اور اس میں کوئی مستثنیٰ نہیں، چاہے انبیاء ہوں یا اولیاء یا صالحین، سب اس میں شامل ہیں کہ شیطان سے اپنا بچاؤ کریں۔

کیا شیطان کے شر سے بچنے کے لیے صرف تعوذ کافی ہے؟

سوال: جب شیطان عدو مبین ہے تو دفاعی تدبیر کے لئے کیا صرف تعوذ کافی ہے؟

جواب: تعوذ شیطانی اضرار سے بچاؤ کے لئے مؤثر بالخاصہ ہے۔ اس جملے میں اللہ رب العزت نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ شیطانی حملوں سے نجات مل جاتی ہے، اس کی معقول توجیہ یہ ہے کہ مستعیذ بندہ ہے، مستعاذ بہ اللہ ہے، مستعاذ منہ شیطان ہے، شیطان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قوی ہے، وہ عالم الغیب ہے، وہ علیم ہے، شیطان کے تمام مکر وفریب کو جانتا ہے، وہ بصیر ہے بندہ کی حالت سے واقف ہے، وہ سمیع ہے بندہ کی پکار بھی اس نے سن لی، اور وہ قادر مطلق ہے بندہ کی مدد کرنے پر قادر ہے، اور خود ذات باری تعالیٰ نے تعوذ پڑھنے کی تدبیر بھی سکھلائی ہے، لہٰذا وہ اپنے بندے کی مدد بھی کرے گا۔

مثال: جیسے ایک آٹھ سالہ بچہ چار سالہ بچے کو مارتا ہے تو چار سالہ بچہ جب اپنے والدین کو پکارتا ہے تو وہ مارنے والا بھاگ جاتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے میں اگرچہ چار سالہ بچے سے قوی تھا، لیکن اس کے والدین مجھ سے کہیں زیادہ مجھ پر قوی ہیں، اور وہ اپنے بچے کی مدد بھی کریں گے اور ان کے دل میں اپنے بچے کی محبت بھی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز سے زیادہ قوی ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ والدین سے کہیں زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرنے والے ہیں۔

شیطان اور دیگر اعداء میں فرق

سوال: شیطان اور دیگر اعداء میں کیا فرق ہے؟

جواب: شیطان ایسا دشمن ہے جو رشوت کو قبول نہیں کرتا اور اس سے بچاؤ کے لئے صرف انسانی مدد کافی نہیں۔ شیطان غیر مرئی دشمن ہے جس سے مقابلہ کرنا مشکل ہے، نہ وہ چاپلوسی کو قبول کرتا ہے، اور نہ اس کی مدح کرنا اس کی ایذاء رسانی سے بچا سکتی ہے، نہ خوش خلقی کو وہ قبول کرتا ہے، نہ بداخلاقی اس پر اثر انداز ہوتی ہے، اور شیطان انسان کی سب سے قیمتی متاع ایمان کا دشمن ہے جس کا فائدہ اخروی اور دائمی ہے، جبکہ دیگر اعداء صرف مال ومتاع کے دشمن ہیں جن کا نقصان صرف دنیا تک محدود ہے، بقیہ اعداء سے بچاؤ کے لئے عقلی تدابیر کافی ہیں، جبکہ شیطان سے بچاؤ کے لئے وحی الٰہی اور علومِ نبوت کی روشنی ضروری ہے۔

تعوذ میں بلاغت کے نکات

علامہ محمد امین بن عبداللہ ہرری نے بلاغت کے تین عمدہ نکات نقل کئے ہیں:

''اعوذ باللّٰہ'' میں صیغہ انشاء یعنی امر کے صیغے سے فعل مضارع کی طرف عدول کیا ہے۔ اصل عبارت یہ تھی ''اعذني یا رب'' اے اللہ! میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔

صیغہ انشاء یعنی امر ونہی میں استقبال کا مفہوم ہوتا ہے جب کہ یہاں مقصود حال کا مفہوم ہے، اور فعل مضارع معنی حال میں حقیقت ہوتا ہے اور استقبال میں مجاز۔

٢..... یہاں متکلم سے غائب کی طرف التفات ہے''اعوذ'' واحد متکلم ہے اور لفظ اللہ اسم ظاہر ہے جو غائب کے حکم میں ہوتا ہے، نیز لفظ اللہ کا ذکر برکت اور تلذذ کی غرض سے ہے۔

٣..... ''**الشیطن**'' موصوف کے لئے ''**الرجیم**'' صفتِ کاشفہ لائی موصوف کو مؤکد کرنے کے لئے، اور مخاطبین کو اس سے نفرت دلانے کے لئے کہ شیطان تو پتھروں سے سنگسار کے قابل ہے، نہ کہ محبت کا۔❶

❶حدائق الروح والريحان: فصل في مباحث الاستعاذة، ج١ ص١٨

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جوسب پر مہربان ہے اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

تسمیہ کے ذریعے جملہ امور کے افتتاح کی حکمت

١......علامہ جاراللہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

لأنهم كانوا يبدء ون بأسماء آلهتهم فيقولون باسم اللات باسم العزى فوجب أن يقصد الموحد معنى اختصاص اسم اللّٰه عز وجل بالابتداء وذلك بتقديمه وتأخير الفعل كما في قوله: إياك نعبد حيث صرح بتقديم الإسم إرادة للاختصاص. ❶

ترجمہ: مشرکین عرب اپنے کاموں کی ابتداء اپنے معبودوں کے نام سے کرتے تھے، پس وہ کہتے: لات کے نام سے، عزیٰ کے نام سے اس کام کو شروع کرتا ہوں۔ لہذا موحدین پر واجب ہے جب وہ اپنے کسی کام کا قصد کریں تو اللہ رب العزت کے نام سے شروع کریں، اور یہ حاصل ہوگا لفظ اللہ کو مقدم کرنے اور فعل کو مؤخر کرنے سے، پس اس صورت میں تخصیص کا معنی حاصل ہوگا، جیسے "**إياك نعبد**" میں عامل کو مؤخر کرنے اور معمول کو مقدم کرنے سے حصر کا معنی پیدا ہوتا ہے۔

بسم اللہ لکھنے کا طریقہ

بسم اللہ کو بغیر الف کے لکھا جاتا ہے کیوں کہ بولتے اور لکھتے وقت باءِ الصاق اس کی جگہ کافی ہوجاتا ہے، اور کثرتِ استعمال کی وجہ سے الف کو حذف کردیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ارشاد باری تعالیٰ: **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِى خَلَقَ.** میں قلتِ استعمال کی وجہ سے لکھنے میں الف حذف نہیں کیا جاتا۔

---

❶ حدائق الروح والريحان: مباحث البسملة، ج١ ص٢٢

تسمیہ میں لفظِ باء سے اُس کا کون سا معنی مراد ہے؟

علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

فالباء إما للاستعانة أو المصاحبة أو الإلصاق أو الاستعلاء أو زائدة أو قسمية والأربعة الأخيرة ليست بشيء و اختلف في الأرجح من الأولين فالذي يشعر به كلام البيضاوى أرجحية الأول... ما يدل عليه كلام الزمخشرى أرجحية الثاني... وعندى: أن الاستعانة أولى بل يكاد أن تكون متعينة إذ فيها من الأدب والاستكانة وإظهار العبودية ما ليس في دعوى المصاحبة. ❶

ترجمہ: لفظ باء استعانت کے لئے ہے یا مصاحبت یا الصاق یا استعلاء یا زائدہ یا قسم کے لئے ہے، آخری چار معانی مراد لینا یہاں درست نہیں ہے، اب اختلاف اس میں کہ راجح معنی کون سا ہے؟ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے والے یعنی استعانت کے معنی کو ترجیح دی ہے، جب کہ امام زمخشری رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا معنی یعنی مصاحبت والے کو ترجیح دی ہے، جب کہ میرے نزدیک راجح استعانت والا معنی ہے، بلکہ قریب ہے کہ یہی معنی متعین ہو، اس لئے کہ اس میں ادب، عاجزی اور عبودیت کا اظہار زیادہ ہے، جو مصاحبت والا معنی مراد لینے کی صورت میں نہیں ہے۔

حرف باء کے ذریعے قرآنِ کریم شروع کرنے کی حکمت

علامہ محمد امین بن عبداللہ ہرری نے اس کی متعدد حکمتیں نقل کی ہیں:

أحدها: أن فى الألف ترفعا وتكبرا وفي الباء انكسارا وتواضعا. ثانيها: أن الباء مكسورة أبدا وانكسار في الصورة. ثالثها: أنه لما عرضت

❶ روح المعانى فى تفسير القرآن العظيم: سورة الفاتحة، البحث الثالث فى معناها، ج ۱ ص ۶۴،۶۵

علیھا النقط ما قبلت إلا واحدة لیکون حالھا کحال محب لا یقبل إلا محبوبا واحدا. رابعھا: أن الألف حرف علة بخلاف الباء. خامسھا: أن الباء حرف شفوي ولذلک کان أول انفتاح نسم الذرة الإنسانیة فی عھد اللّٰہ بربکم بالباء في جواب بلی فلما کان الباء أول حرف نطق بہ الانسان. ❶

۱...... الف میں ترفع اور تکبر ہے جبکہ لفظ باء میں عاجزی اور تواضع ہے۔

۲......حرف باء ہمیشہ مکسور ہوتا ہے اس میں صورتاً انکساری کا معنی ہے۔

۳......حرف باء صرف ایک نقطے کو قبول کرتا ہے جیسے محبّ ایک محبوب کو قبول کرتا ہے۔

۴......الف حرف علت ہے بخلاف باء کے۔

۵...... باء حرف شفوی میں سے ہے، سب سے پہلا لفظ جو انسانی زبان سے جاری ہوا وہ باء ہے کیونکہ ''عَھْدِ أَلَسْتُ'' کے جواب میں لفظ ''بَلٰی'' کہا، تو اس میں سب سے پہلا حرف باء ہے۔

بسم اللہ کے باء کو طویل کر کے لکھنے کی وجہ

سوال: رسم الخط کا قاعدہ یہ ہے کہ جس اسم کے شروع میں ہمزہ وصل ہو تو وہ اسم درمیان کلام میں ہوگا یا اول کلام میں، اگر اول کلام میں ہو تو ہمزہ وصل کتابت اور تلفظ دونوں میں باقی رہے گا، اور اگر درمیان میں ہو تو ہمزہ وصل کتابت میں باقی رہتا ہے لیکن تلفظ میں گر جاتا ہے۔ جیسے ''اقرأ باسم ربک'' میں، لہٰذا ''بسم اللّٰہ'' میں درمیان کلام میں ہونے کی وجہ سے گر جاتا، البتہ کتابت میں باقی رہتا، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تلفظ اور کتابت دونوں میں گرا ہوا ہے؟

۱......جواب: ''بسم اللّٰہ'' کثرتِ استعمال کی وجہ سے خفت کا تقاضا کرتا ہے اور

❶ حدائق الروح والریحان: سورة الفاتحة، البحث الخامس، ج ۱ ص ۳۱، ۳۲

کبھی خفت حاصل ہوتی ہے حذف کرنے سے، لہٰذا یہاں بھی ہمزہ کو کتابت میں حذف کر دیا تا کہ آسانی ہو، اور بالکل نسیاً منسیا نہیں کیا بلکہ حذف پر قرینہ موجود ہے۔ یعنی حرف باء کو ذرا طویل کر کے لکھا تا کہ حذفِ ہمزہ پر دلالت کرے۔

۲...... جواب: علامہ قتیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حرف باء کو طویل کر کے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا آغاز ایک طویل وعریض لفظ سے ہو، اسی وجہ سے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے کاتبوں کو حکم دیا کہ حرف باء کو طویل کر کے لکھو اور سین کے دندانے خوب ظاہر کرو اور میم کو گولائی میں لکھو، کتاب اللہ کی تعظیم کی وجہ سے:

طولوا الباء من بسم اللّٰہ وما طولوها في سائر المواضع، وذكروا في الفرق وجهين: الأول: أنه لما حذفت ألف الوصل بعد الباء طولوا هذه الباء ليدل طولها على الألف المحذوفة التي بعدها، قال القتيبي، إنما طولوا الباء لأنهم أرادوا أن لا يستفتحوا كتاب اللّٰہ إلا بحرف معظم، وكان عمر بن عبد العزيز يقول لكتابه طولوا الباء، وأظهروا السين. ودوروا الميم تعظيما لكتاب اللّٰہ. ❶

بسم اللہ کے حرف باء میں تمام مضامین کا خلاصہ ہے

علامہ علی بن احمد العزیزی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۷۰ھ) فرماتے ہیں:

ومعاني كل الكتب مجموعة في القرآن ومعاني القرآن مجموعة في الفاتحة ومعاني الفاتحة مجموعة في البسملة ومعاني البسملة مجموعة في بائها. ❷

❶ التفسير الكبير: الكتاب الثانی، الباب الثانی، ج۱ ص۱۰۳

❷ السراج المنير شرح الجامع الصغير في أحاديث البشير النذير: ج۱ ص۳

تسمیہ میں عامل کے حذف کرنے کی وجہ

شریعت نے تمام جائز کاموں میں بسم اللہ پڑھنے کی ترغیب دی ہے، اب انسانی افعال غیر محصور ہیں، اگر ہر ہر فعل کو ذکر کیا جاتا تو کلام میں بہت طوالت آجاتی، اس لئے قرینہ کے مطابق اس کا عامل محذوف نکالا جائے گا، مثلاً بوقتِ تلاوت "اقــــرأ" پانی پیتے وقت "اشرب" کھانا کھاتے وقت "أكل" وغیرہ۔ تو حذفِ عامل کی وجہ کلام کو طوالت سے بچانا ہے، ورنہ بسم اللہ اتنا طویل ہوجاتا کہ اس کا پڑھنا ہی دشوار ہوجاتا اس لئے عامل کو حذف کیا گیا ہے۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) نے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ ہر کام کرنے والے شخص کو چاہئے کہ جس کام کو تسمیہ سے شروع کرے اسی کام پر دلالت کرنے والے لفظ سے ایک فعل مشتق مان کر تسمیہ کو اس کے متعلق کر دے:

كذلک يضمر كل فاعل ما يجعل التسمية مبدأ له. ❶

تسمیہ میں لفظ اللہ کو پہلے اور رحمٰن ورحیم کو بعد میں ذکر کرنے کی کیا حکمت ہے

علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں:

لأن من شأن العرب إذا أرادوا الخبر عن مُخبَر عنه، أن يقدّموا اسمه، ثم يتبعوه صفاته ونعوته. ❷

ترجمہ: عرب کے ہاں اس بات کا رواج ہے کہ جب وہ کسی بات کی خبر دیتے ہیں تو اسم کو پہلے ذکر کرتے ہیں، پھر اس کے بعد صفات کو ذکر کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی پہلے

❶ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج١ ص٢٤

❷ جامع البيان في تأويل آي القرآن: سورة الفاتحة، ج١ ص١٣٢

اپنے نام کو ذکر فرمایا پھر اپنی صفات کو ذکر فرمایا۔

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

اللّٰه إشارة إلى القهر والقدرة والعلو، ثم ذكر عقيبه الرحمن الرحيم، وذلك يدل على أن رحمته أكثر وأكمل من قهره. ❶

ترجمہ: لفظ ''اللہ'' میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت، علوّ شان اور قہر وغضب کی طرف، پھر لفظ ''الرحمن الرحيم'' کو اس کے بعد لایا تاکہ یہ دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے قہر وغضب سے زیادہ اور کامل ہے۔

جمہور اہلِ علم کے ہاں لفظ اللہ عَلَم ہے

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

المختار عندنا أن هذا اللفظ اسم علم للّٰه تعالى، وأنه ليس بمشتق ألبتة، وهو قول الخليل وسيبويه، وقول أكثر الأصوليين والفقهاء. ❷

ترجمہ: ہمارے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' ذات باری تعالیٰ کا عَلَم ہے، اور یقیناً یہ مشتق نہیں ہے، اکثر اصولیین، فقہاء، امام خلیل، امام سیبویہ رحمہم اللہ کے نزدیک بھی راجح قول یہی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

ذهب إليه جماعة من العلماء أيضاً منهم الشافعي وأبو المعالي والخطابي والغزالي والمفضل وغيرهم، وروي عن الخليل وسيبويه: أن الألف واللام لازمة له لا يجوز حذفهما منه. قال الخطابي: والدليل على

---

❶ التفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب الحادى عشر، ج ۱ ص ۱۵۳

❷ التفسير الكبير: الكتاب الثانى، الباب التاسع، ج ۱ ص ۱۴۳

أن الألف واللام من بنية هذا الاسم، ولم يدخلا للتعريف: دخول حرف النداء عليه؛ كقولك: يا اللّٰه، وحروف النداء لا تجتمع مع الألف واللام للتعريف، ألا ترى أنك لا تقول: يا الرحمن ولا يا الرحيم، كما تقول: يا اللّٰه، فدل على أنهما من بنية الاسم. واللّٰه أعلم. ❶

ترجمہ: یہ بھی علماء کی ایک جماعت کا موقف ہے جن میں امام ابوالمعالی، امام خطابی، امام غزالی، امام شافعی رحمہم اللہ شامل ہیں، امام خلیل اور امام سیبویہ رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ لفظ ''اللہ'' کے شروع میں الف لام اسی کے ساتھ لازم ہے، اسے حذف کرنا جائز نہیں، امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات کی دلیل کہ الف اور لام لفظ ''اللہ'' کے اصلی حروف میں سے ہیں اور یہ معرفہ بنانے کے لئے نہیں لگائے گئے، اس پر حرفِ ندا کا داخل ہونا ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں ''یا اللہ'' حالانکہ حروف ندا الف لام کے ساتھ نہیں آسکتے۔ غور کیجئے ہم کبھی ''یا الرحمٰن، یا الرحیم'' نہیں کہتے، جیسے ''یا اللہ'' کہتے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ الف لام لفظ ''اللہ'' کے بنیادی حروف میں سے ہیں۔ واللہ اعلم

علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

والذي عليه أكابر المعتبرين كالشافعي ومحمد بن الحسن والأشعري وغالب أصحابه والخطابي وإمام الحرمين والغزالي والفخر الرازي وأكثر الأصوليين والفقهاء، ونقل عن اختيار الخليل وسيبويه والمازني وابن كيسان أنه عربي وعلم من أصله لذاته تعالى المخصوصة. ❷

ترجمہ: اکابر معتبر علماء جیسے امام شافعی، امام محمد، امام ابوالحسن اشعری اور ان کے اکثر متبعین، امام خطابی، امام الحرمین، امام غزالی، امام رازی اور اکثر اصولیین اور فقہاء، اور اسی

❶ التفسير القرطبي: البسملة، الحادية والعشرون، ج١ ص١٤٠

❷ روح المعاني: سورة الفاتحة، اشتقاق لفظ "اللّٰه"، ج١ ص٧٧

بات کو امام خلیل، امام سیبویہ، امام مازنی، امام ابن کیسان رحمہم اللہ نے پسند کیا ہے کہ لفظ اللہ عربی ہے اور اصل کے اعتبار سے ذات باری کا خاص نام ہے۔

لفظ اللہ کی دس خصوصیات

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ھ) نے فرمایا کہ لفظ ''اللہ'' میں دو ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی اور اسم میں نہیں ہیں:

اعلم أن هذا الاسم مختص بخواص لم توجد في سائر أسماء الله تعالى، ونحن نشير إليها: فالخاصة الأولى: أنک إذا حذفت الألف من قولک: ''اللّٰه'' بقي الباقي على صورة ''للّٰه''وهو مختص به سبحانه، كما في قوله: وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ، وإن حذفت عن هذه البقية اللام الأولى بقيت البقية على صورة ''لَهُ'' كما في قوله تعالى: لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ فإن حذفت اللام الباقية كانت البقية هي قولنا: ''هُوَ'' وهو أيضًا يدل عليه سبحانه كما في قوله: قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ. والواو زائدة بدليل سقوطها في التثنية والجمع فإنک تقول هما، هم فلا تبقى الواو فيهما، فهذه الخاصية موجودة في لفظ ''اللّٰه'' غير موجودة في سائر الأسماء. ❶

ترجمہ: لفظ اللہ سے آپ ایک ایک حرف کو حذف کرتے جائیں تو اس صورت میں بھی یہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوگا، اس کے معنی میں تبدیلی نہیں آئے گی مثلاً: ''اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ'' اب آپ پہلے حرف کو حذف کرو تو ''للّٰه'' باقی رہ جائے گا، یہ بھی قرآن کریم میں ذات باری تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے ''وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' اور اگر ایک لام کو حذف کرو تو ''لَهُ'' باقی رہ جائے گا، یہ بھی قرآن

❶ التفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب التاسع، ج١ ص١٤٩

میں اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے ”لَـهُ مَـقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“ اور اگر ایک لام کو حذف کرو تو ”هو“ رہ جائے گا، قرآن میں ”قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ“ باقی رہا لفظ واؤ تو وہ زائد ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ تثنیہ اور جمع کے صیغوں میں ساقط ہوجاتا ہے، اگر یہ زائد نہ ہوتا تو کبھی ساقط نہ ہوتا بلکہ باقی رہتا۔

إن كـلمة الشهادة وهي الكلمة التي بسببها ينتقل الكافر من الكفر إلـى الإسـلام لـم يحصل فيها إلا هذا الاسم فلو أن الكافر قال: أشهد أن لا إلـه إلا الرحمن أو إلا الرحيم، أو إلا الملک، أو إلا القدوس لم يخرج من الـكفر ولم يدخل في الإسلام، أما إذا قال أشهد أن لا إله إلا اللّٰه فإنه يخرج مـن الـكـفـر ويـدخل في الإسلام، وذلک يدل على اختصاص هذا الاسم بهذه الخاصية الشريفة. ❶

ترجمہ: کلمہ شہادت میں لفظ اللہ کا ذکر کرنا ضروری ہے، کلمہ شہادت وہ کلمہ ہے جس کے ذریعے انسان کفر کے اندھیروں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آتا ہے، اور کلمہ شہادت کا حصول ہوگا لفظ اللہ کے ساتھ، اگر کوئی ساری زندگی ”لا إلـه إلا الـرحمن“ یا ”إلا الـرحيم“ یا ”إلا الملک“ یا ”إلا القدوس“ کہے تو وہ کفر سے نہیں نکلے گا اور نہ ہی اسلام میں داخل ہوگا۔

علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب الفیر وزآبادی رحمہ اللہ (متوفی ۸۱۷ھ) نے لفظ ”اللہ“ کی دس (۱۰) خصوصیات نقل کی ہیں:

أَنَّـه يـقوم مقامَ جملةِ أَسماءِ الحقّ تعالى وصفاته. أَنَّ جملة الأَسماءِ فـي المعنى راجعة إِليه. الابتداء به في جميع الأُمور بمثل قولک: بسم اللّٰه، ختـم المناشير والتواقيع في قولک: حسبى اللّٰه، ختم الأُمور والأَحوال به وَآخِـرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رب العلمين، تعليق توحيد الحَقّ تعالى به في

---

❶ التفسير الكبير: الكتاب الثانى، الباب التاسع، ج١ ص١٤٩

قول لا إله إلا اللّٰه، تأكيد رسالة الرّسول به في قولك: محمّد رسول اللّٰه. تزيين حَجّ الحُجّاج به في قولهم: لبّيك اللّٰهم لبّيك، افتتاح الصّلاة واختتامها به في قولك: اللّٰه أكبر، وآخراً: ورحمة اللّٰه. به يُفتتح دعاء الدّاعين: اللّٰهم اغفر، اللّٰهمّ ارحم. لا ينتقِص معناه بنقص حروفه.❸

ا.....لفظ''اللہ'' تمام اسماء اور صفات کا قائم مقام ہوتا ہے۔٢.....تمام اسماء معانی میں اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔٣.....تمام امور میں اسی نام کے ساتھ ابتداء کا حکم ہے، جیسے آپ کا قول''**بسم اللّٰه**''۔٤.....تمام امور اور احوال کا اختتام اسی نام پر ہوتا ہے، جیسے ''**وآخر دعواهم أن الحمد للّٰه رب العلمين** ۔٥.....اللہ تبارک وتعالی نے اپنی توحید کو اسی نام کے ساتھ معلق کیا ہے''**لا إله إلا اللّٰه**''۔٦ .....نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو اسی نام کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے''**محمد رسول اللّٰه**''۔٧.....حُجّاجِ کرام کے حج کو تلبیہ میں اِن الفاظ کے ساتھ مزین کیا''**لبيك اللّٰهم لبيك**''(اس میں بھی لفظ''اللہ''موجود ہے)٨.....نماز کا آغاز اور اختتام لفظ''اللہ''پر ہوتا ہے، ابتداء''**اللّٰه أكبر**''سے اور اختتام''**السلام عليكم ورحمة اللّٰه**''سے۔٩.....دعا کرنے والے اپنی دعاؤں کا آغاز اسی نام کے ساتھ کرتے ہیں، جیسے''**اللّٰهم اغفر، اللّٰهم ارحم**''۔ ١٠.....لفظ''اللہ'' کے حروف کو حذف کرنے سے اس کے معانی میں کمی نہیں ہوتی، (حروف کے حذف کے باوجود اس کے مصداق میں فرق نہیں آتا جیسا کہ تفصیلاً ماقبل میں گزرا۔)

ذات باری تعالیٰ پر لفظ خدا کا اطلاق کرنا درست ہے

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقولهم بالفارسية خداي معناه أنه واجب الوجود لذاته لأن قولنا:

❸بصائر ذوي التمييز في لطائف الكتاب العزيز: الباب الثاني، بصيرة في لفظ "اللّٰه"، ج٢ ص ٢٠، ٢١

خداي كلمة مركبة من لفظتين في الفارسية: إحداهما: خود، ومعناه ذات الشيء ونفسه وحقيقته والثانية قولنا: آي ومعناه جاء، فقولنا: خداي معناه أنه بنفسه جاء، وهو إشارة إلى أنه بنفسه وذاته جاء إلى الوجود لا بغيره، وعلى هذا الوجه فيصير تفسير قولهم: خداي أنه لذاته كان موجوداً. ❶

ترجمہ: لفظِ ''خدا'' فارسی زبان کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے وہ ذات جس کا وجود واجب ہو، اس لئے کہ لفظ ''خدا'' مرکب ہے فارسی میں دولفظوں سے: ا.....خود، اس کا معنی ہے ذات، نفس اور حقیقت۔ ۲.....آی، اس کا معنی ہے (آیا) یعنی جس کا وجود بذات خود اور وہ اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہ ہو، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی کا وجود بذات خود ہے غیر کی وجہ سے نہیں ہے، پس اس وضاحت کے بعد ''خدا'' کا معنی ہے جس کا وجود بذات خود ہو اور وہ اپنے وجود میں کسی غیر کی طرف محتاج نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ''خدا'' واجب الوجود کا ترجمہ ہے۔

اکثر علماء کے ہاں لفظ ''اللہ'' اسم اعظم ہے

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

إن الاسم الأعظم هو قولنا: ''اللّٰه'' وهذا هو الأقرب عندي. ❷

ترجمہ: میرے نزدیک زیادہ درست بات یہ ہے کہ لفظ اللہ اسم اعظم ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

قوله: اللّٰه هذا الاسم أكبر أسمائه سبحانه حتى قال بعض العلماء: إنه اسم اللّٰه الأعظم. ❸

❶التفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب الرابع، ج١ ص١٢٢

❷تفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب الثالث، ج١ ص١١١

❸تفسير القرطبي: البسملة، عشرين، ج١ ص١٣٩

ترجمہ: لفظ اللہ تمام اسماء میں سب سے بڑھ کر ہے، یہاں تک کہ بعض علماء نے کہا کہ یہی اسمِ اعظم ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

ولذا قال الجمهور انه الاسم الأعظم قال القطب الرباني الشيخ عبد القادر الجيلاني: الاسم الأعظم هو الله لكن بشرط أن تقول الله وليس في قلبك سواه. ❶

ترجمہ: اسی وجہ سے جمہور علماء نے فرمایا کہ اسم اعظم (لفظ اللہ) ہے، شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسم اعظم لفظ "اللہ" ہی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب آپ "اللہ" کہو تو آپ کے دل میں اللہ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔

۸......علامہ علی بن احمد العزیزی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۷۰ھ) فرماتے ہیں:

وعند المحققين أنه الاسم الأعظم. ❷

ترجمہ: محققین علماء کے نزدیک لفظ "اللہ" اسم اعظم ہے۔

۹......علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۰۷ھ) فرماتے ہیں:

وعند المحققين انه الاسم الأعظم. ❸

ترجمہ: محققین علماء کے نزدیک لفظ "اللہ" اسم اعظم ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ) نے اس موضوع پر مستقل ایک رسالہ لکھا جس کا نام "**الدر المنظم في الاسم الأعظم**" ہے، اس میں انہوں نے اسم اعظم کی تعیین کے متعلق اہل علم کے بیس (۲۰) اقوال نقل کئے ہیں۔ یہ رسالہ "**الحاوی**

---

❶ مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: مقدمة المؤلف، ج١ ص٧٩

❷ السراج المنير شرح الجامع الصغير في أحاديث البشير والنذير: البسملة، ج١ ص٣

❸ فتح البيان فى مقاصد القرآن: سورة الفاتحة، ج١ ص٤١

للفتاوی“ میں موجود ہے، دیکھئے تفصیلاً: (1)

لفظ اللہ قرآن کریم میں کتنی بار آیا ہے؟

شیخ فواد احمد عبد الباقی فرماتے ہیں کہ لفظ اللہ قرآن کریم میں دو ہزار چھ سو ستانوے (۲۶۹۷) مرتبہ استعمال ہوا ہے، نو سو اسی (۹۸۰) مقامات پر حالت رفعی میں، اور پانچ سو بانوے (۵۹۲) مقامات پر حالت نصبی میں، اور گیارہ سو پچیس (۱۱۲۵) مقامات پر حالت جری میں استعمال ہوا ہے۔ حضرت نے قرآن کریم کی ان تمام آیات کو تفصیلاً ذکر کیا ہے، دیکھئے تفصیلاً: (2)

تسمیہ میں اللہ کے تین آسماء ذکر کرنے کی کیا حکمت ہے؟

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

الحکمة في ذکر هذه الأسماء الثلاثة أن المخاطبين في القرآن ثلاثة أصناف کما قال تعالی: فَمِنۡهُمۡ ظالم لِّنَفۡسِهِ وَمِنۡهُم مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌ بالخيرات فقال: أنا الله للسابقين، الرحمن للمقتصدين، الرحيم للظالمين. (3)

ترجمہ: قرآن کریم کے مخاطب تین قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں، دوسرے وہ جو میانہ روی کے ساتھ چلنے والے ہیں، تیسرے وہ ہیں جو نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنے والے ہیں، لفظ اللہ کا تعلق سابقین کے ساتھ اور رحمٰن کا تعلق مقتصدین کے ساتھ اور رحیم کا تعلق ظالمین کے ساتھ ہے۔

”الرحمن“ کے لغوی اور اصطلاحی معانی

رحمٰن: مادہ رح م سے ”فَعْلَان“ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، عربی قواعد کی رو سے

(1) الحاوی للفتاوی: الدر المنظم في الاسم الأعظم، ص ٤٠٥ تا ٤٠٩

(2) المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الکریم: ص ٤٠ تا ٧٥، سہیل اکیڈمی لاہور

(3) التفسیر الکبیر: الکتاب الثاني، الباب الحادي عشر، ج ١ ص ١٥٤

''فَعْلان''اور''فُعْلان''ایسے مصادر ہیں جن میں فعل کی انتہائی کثرت اور مبالغے کا معنی پایا جاتا ہے، جو اسماء اس وزن پر ہوں گے ان میں معنویت، انتہائی کثرت، فراوانی اور مبالغے کے ساتھ موجود ہوگی۔ یعنی ان کے مادوں کا مفہوم ان اسماء میں نہایت شدت اور زیادتی کے ساتھ پایا جائے گا، مثلاً''فُرْقَان''اس میں فرق وامتیاز پیدا کرنے کی صفت اپنے منتہائے کمال پر موجود ہے، یہ قرآن کا نام ہے اس لئے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کوئی کتاب حق وباطل میں واضح فرق پیدا نہیں کرسکتی۔''قُرْبَان''اس میں قرب کا معنی انتہائی افراط کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔''نُدْمَان''اس میں نادم اور شرمندہ ہونے کا معنی پایا جاتا ہے، لیکن اسم میں یہ صفت اس قدر شدت کے ساتھ موجود ہے کہ کوئی اور لفظ اس سے زیادہ معنی ندامت کا اظہار نہیں کرسکتا۔ اسی طرح''غَضْبَان''ہے اس میں بھی غیض وغضب کا معنی انتہائی شدت کے ساتھ موجود ہے، اس اسم سے بڑھ کر غضبناک ہونے کا مفہوم کوئی اور وزن ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ''الرحمن''بھی اسی وزن پر''رحم''سے ماخوذ ہے، جس کا معنی صاف طور پر یہ متعین ہوا کہ''انتہائی مہربانی کرنے والا''گویا لفظ''الرحمن''کا مفہوم یہ ہوا کہ رب العالمین وہ ہے جس کی ذات میں صفت رحمت کی اتنی کثرت، فراوانی اور غایت ونہایت ہے کہ کوئی اور ہستی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

''الرحیم''کے لغوی اور اصطلاحی معانی

''الرحمن''کے بعد دوسرا اسم صفت''الرحیم''ہے، اس کا معنی بھی''بہت رحم فرمانے والا''ہے، یہ''رحمت''سے''فَعِیْل''کے وزن پر اسم فاعل ہے، اور اس میں بھی معنوی مبالغے کی صفت پائی جاتی ہے۔ مستزاد یہ کہ''الرحیم''صفت مشبہ ہے، اس میں صفت رحم کے اعتبار سے ہمیشگی اور دوام واستمرار کی خوبی بھی پائی جاتی ہے،''الرحیم''اصطلاحی اعتبار سے''الرحمن''کے مقابلے میں عام ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے علاوہ کے لئے بھی

جائز ہے۔قرآن حکیم میں اس کے استعمال کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں:

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (البقرة:۵۴)

ترجمہ: یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (البقرة:۱۴۳)

ترجمہ: درحقیقت اللہ لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ. (البقرة:۲۱۸)

ترجمہ: یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

لفظ ''رحمٰن و رحیم'' یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں البتہ رحمٰن میں مبالغہ رحیم کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

۱......علامہ ابو القاسم محمود بن محمد الزمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

الرحمن فعلان من رحم كغضبان وسكران من غضب وسكر وكذلك الرحيم فعيل منه كمريض وسقيم من مرض وسقم وفي الرحمن من المبالغة ما ليس في الرحيم ولذلك قالوا رحمن الدنيا والآخرة ورحيم الدنيا. ❶

ترجمہ: ''الرحمن'' فعلان کے وزن پر ہے اور یہ ''رحم'' سے مشتق ہے، جیسے ''غضبان'' یہ مشتق ہے ''غضب'' سے اور ''سکران'' مشتق ہے ''سکر'' سے، اسی طرح ''الرحیم'' فعیل کے وزن پر ہے اور ''رحم'' سے مشتق ہے جیسے ''مریض'' یہ مشتق ہے ''مرض'' سے اور ''سقیم'' یہ مشتق ہے ''سقم'' سے۔ لفظ ''رحمن'' میں جو مبالغہ ہے وہ لفظ ''رحیم'' میں نہیں ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ''رحمن الدنیا

❶ الكشاف عن حقائق التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل: سورة الفاتحة، ج۱ ص۴۹

والآخرۃ'' کہ رحمٰن کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں کے ساتھ ہے، جبکہ ''رحیم في الدنیا'' میں رحیم کا تعلق صرف دنیا کے ساتھ ہے۔

لفظ رحمٰن ورحیم کے درمیان فرق

ا......قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

الرحمن أبلغ من الرحيم، لأن زيادة البناء تدل على زيادة المعنى كما في قَطَعَ وقَطَّعَ وكِبَار وكُبَّار، وذلک إنما يؤخذ تارة باعتبار الكمية، وأخرى باعتبار الكيفية، فعلى الأول قيل: يا رحمن الدنيا لأنه يعم المؤمن والكافر، ورحيم الآخرة لأنه يخص المؤمن، وعلى الثاني قيل: يا رحمن الدنيا والآخرة، ورحيم الدنيا، لأن النعم الأخروية كلها جسام، وأما النعم الدنيوية فجليلة وحقيرة. ❶

ترجمہ: ''رحمن'' میں بمقابلہ ''رحیم'' کے زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، جیسا کہ ''قَطَعَ'' (بمعنی کاٹنا) اور ''قَطَّعَ'' (بمعنی بار بار کاٹنا)، ''کِبَارٌ'' (بمعنی بڑا) اور ''کُبَّارٌ'' (بمعنی بہت بڑا) ان مثالوں سے واضح ہے۔ اور اس زیادتی کا کبھی کمیت (تعداد) کے اعتبار سے لحاظ کیا جاتا ہے اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے۔ تعداد کا اعتبار کرتے ہوئے کہا جاتا ہے ''یا رحمن الدنیا'' اس لئے کہ دنیا کی رحمت مؤمن وکافر دونوں کو عام ہے، اور ''رحیم الآخرۃ'' اس لئے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت صرف مؤمنین کے لئے ہوگی۔ کیفیت کا اعتبار کرتے ہوئے کہا جاتا ہے ''یا رحمن الدنیا والآخرۃ ورحیم الدنیا'' اس لئے کہ اُخروی نعمتیں سب کی سب بڑی ہیں اور دنیاوی نعمتیں سو وہ چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔

❶ التفسير البيضاوي: البسملة، ج ۱ ص ۲۹

لفظ رحمٰن کا اطلاق غیر اللہ پر جائز نہیں

۱......علامہ ابوبکر جصاص رحمہ اللہ (متوفی ۳۷۰ھ) فرماتے ہیں:

وفیہ اسمان من أسماء اللّٰہ تعالی المخصوصة بہ لا یسمی بھما غیرہ وھما اللّٰہ والرحمن. ❶

ترجمہ: تسمیہ میں اللہ تعالی کے دو نام ہیں جو ذات باری تعالی کے ساتھ ہیں، غیر اللہ کے لئے یہ دونوں نام رکھنا جائز نہیں ہے، ان میں ایک لفظ اللہ ہے دوسرا لفظ رحمٰن ہے۔

۲......امام قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

أکثر العلماء علی أن الرحمن مختص باللّٰہ عزوجل، لا یجوز أن یسمی بہ غیرہ، ألا تراہ قال: قل ادعوا اللّٰہ أو ادعوا الرحمن. ❷

ترجمہ: اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ صفت رحمٰن اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہے، ان کے علاوہ کسی کو رحمٰن کہنا جائز نہیں، غور کیجئے! اللہ تعالی نے خود ارشاد فرمایا کہ آپ کہئے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔

لفظ رحمٰن کو رحیم پر کیوں مقدم کیا؟

۱...... رحمٰن میں زیادتی بحسب الکمیت ہے، رحمٰن کے افراد زیادہ ہیں، کیونکہ دنیا میں یہ مؤمن کافر سب کو شامل ہے۔ اور رحمتِ دنیا وجود کے اعتبار سے مقدم ہے رحمتِ آخرت پر، نیز وہ بمنزلہ عَلَم کے ہے، اور چونکہ علم مقدم ہوتا ہے وصف پر اس لئے رحمٰن کو رحیم پر مقدم کیا۔

۲......رحمٰن کے اندر زیادتی بحسب الکیفیت کا لحاظ کیا تو لفظ رحمٰن بڑی بڑی نعمتوں

❶ أحکام القرآن للجصاص: البسملة، ج۱ ص۲٤

❷ تفسیر القرطبي: البسملة، الخامسة والعشرون، ج۱ ص۱٤۳

پر دلالت کرتا ہے، اور تسمیہ کے اندر اللہ کے اوصاف بیان کرنے کا موقع ہے، لہٰذا پہلے رحمٰن کا ذکر کیا تا کہ اللہ کے بڑے بڑے انعامات نمایاں ہوں، لیکن چھوٹی چھوٹی نعمتیں اس سے رہ گئیں، لہٰذا رحیم کو بطور تکملہ کے ذکر کیا، اس لئے اس کا ذکر بعد میں کیا۔

۳...... رحیم کو رؤس آیات کی محافظت کے لئے مؤخر کیا۔ رؤس آیت سے مراد آیت کے آخری حروف ہیں، آیات کے سجع کو برقرار رکھتے ہوئے رحیم کو مؤخر کیا، ان کا آخری حرف یائے ساکنہ کے بعد آ رہا ہے۔ جیسے: عالمین، دین، نستعین، وغیرہ۔

۴...... تسمیہ میں لفظ اللہ کا ذکر پہلے کیا، اس لئے کہ کوئی بھی شخص نہ مفرد کی صورت میں نہ مضاف کی صورت میں لفظ اللہ کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتا، اس لئے لفظ اللہ کو مقدم کیا۔ رحمٰن کا اطلاق مفرد کی صورت میں تو غیر اللہ پر جائز نہیں، البتہ مضاف کی صورت میں جائز ہے جیسے عبد الرحمٰن وغیرہ۔ رحیم کا اطلاق غیر اللہ پر مفرد اور مضاف دونوں صورتوں میں ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحیم کا اطلاق قرآن میں ہوا ہے۔

۵...... علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک رحیم کو مؤخر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رحیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے آپ مؤمنین پر بہت زیادہ مہربان اور نہایت رحیم ہیں (چونکہ رحمٰن اللہ کی صفت خاصہ ہے اس کو مقدم کیا اور رحیم عام ہے اس لئے اس کو مؤخر کیا):

وعندي من باب الإشارة أن تأخير الرحيم لأنه صفة محمد صلى الله عليه وسلم قال تعالىٰ: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. ❶

اسماءِ باری تعالیٰ میں اعتبار غایات کا ہوتا ہے نہ کہ مبادی کا

سوال: رحمت کا معنی رقتِ قلب اور غضب کا معنی "ثوران النفس" ہے اللہ تعالیٰ

❶ روح المعانی: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٨٦

تو جسم اور اس کے لوازمات سے پاک ہے۔ اب ان معانی کے نسبت اگر ذات باری تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے کیا مراد ہوگا؟

جواب: ذات باری تعالیٰ پر جن الفاظ کا اطلاق کرنا اگر ان کے حقیقی معنی کے اعتبار سے درست نہ ہو تو وہاں ان الفاظ کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر ان کی غایات اور آثار کے اعتبار سے ہوگا جو از قبیلِ تاثیر ہیں، ان اسباب و مبادی کے اعتبار سے نہیں جو از قبیلِ انفعال ہیں۔ مثلاً لفظِ رحمت اس کے معنی رقتِ قلب کے ہیں یہ مبدأ اور سبب ہے، مگر اس کا اثر انعام اور احسان ہے، مبدأ تو از قبیلِ انفعال ہے اور اثر از قبیلِ تاثیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کا معنی رقتِ قلب ہے جو مبدأ ہے یہ مراد نہیں بلکہ منتہی یعنی احسان کرنا مراد ہے، اسی طرح ثوران النفس مبدأ مراد نہیں بلکہ غایت یعنی انتقام لینا مراد ہے۔

۱......علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

فإذا سمعت الغضب في حق اللّٰه تعالى فاحمله على نهايات الأعراض لا على بدايات الأعراض. ❶

ترجمہ: جب آپ اللہ تعالیٰ کے متعلق لفظ غضب سنو تو اسے اعراض کی انتہاء (یعنی انتقام) پر محمول کرو نہ کہ اعراض کی ابتداء (یعنی نفس کا جوش مارنا)۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

أسماء اللّٰه تعالى إنما تؤخذ باعتبار الغايات التي هي أفعال دون المبادي التي تكون انفعالات. ❷

ترجمہ: اسمائے باری تعالیٰ کو غایات کے اعتبار سے لیا جائے گا جو افعال ہیں نہ کہ مبادی جو کہ انفعالات ہیں۔

❶التفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب الثامن، ج۱ ص۱۴۱

❷التفسير البيضاوي: البسملة، ج۱ ص۲۹

سورہ توبہ اور جانور کے ذبح کرتے وقت تسمیہ نہ پڑھنے کی حکمت

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ ھ) فرماتے ہیں کہ سورہ توبہ مشتمل ہے ان مضامین پر جن میں قتال کا حکم دیا گیا ہے اس لئے اس کے شروع میں تسمیہ نہیں لکھا گیا۔ نیز سنت یہ ہے کہ بوقتِ ذبح "بسم اللّٰہ اللّٰہ أکبر" کہا جائے، مکمل "بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم" نہ پڑھا جائے اس لئے کہ قتال اور جانور کے ذبح کرتے وقت "الرحمن الرحیم" نہ پڑھنا مناسب ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو فرض نمازوں میں تسمیہ کے سترہ (١٧) مرتبہ پڑھنے کی توفیق دی تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ نے ہم کو قتل اور عذاب کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے فضل واحسان کے لئے پیدا کیا ہے:

لما كانت سورة التوبة مشتملة على الأمر بالقتال لم يكتب في أولها بسم اللّٰه الرحمن الرحيم وأيضاً السنة أن يقال عند الذبح باسم اللّٰه واللّٰه أكبر ولا يقال: بسم اللّٰه الرحمن الرحيم لأن وقت القتال والقتل لا يليق به ذكر الرحمن الرحيم، فلما وفقك لذكر هذه الكلمة في كل يوم سبع عشرة مرة في الصلوات المفروضة دل ذلك على أنه ما خلقك للقتل والعذاب، وإنما خلقك للرحمة والفضل والإحسان. ❶

تسمیہ میں انیس (١٩) حروف ذکر کرنے کی دو حکمتیں

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ ھ) فرماتے ہیں:

قيل بسم اللّٰه الرحمن الرحيم تسعة عشر حرفًا، وفيه فائدتان: إحداهما: أن الزبانية تسعة عشر، فاللّٰه تعالى يدفع بأسهم بهذه الحروف التسعة عشر، الثانية: خلق اللّٰه تعالى الليل والنهار أربعة وعشرين ساعة،

❶ التفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب الحادي عشر، ج١ ص١٥٦

ثم فرض خمس صلوات في خمس ساعات فهذه الحروف التسعة عشر تقع كفارات للذنوب التي تقع في تلك الساعات التسعة عشر. ❶

ترجمہ: جہنم پر انیس (۱۹) فرشتے مقرر ہیں اور تسمیہ میں بھی انیس (۱۹) حروف ہیں، جو ان کے پڑھنے کا اہتمام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے فرشتوں سے محفوظ رکھے گا۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ دن اور رات میں کل چوبیس (۲۴) گھنٹے ہوتے ہیں، اور ان میں پانچ نمازیں فرض ہیں، اب باقی انیس (۱۹) گھنٹے رہ گئے، اب جو تسمیہ کے حروف پڑھنے کا اہتمام کرے گا تو یہ کفارہ ہو جائیں گے ان گناہوں کے جو انیس (۱۹) گھنٹوں میں صادر ہوئے ہیں۔

❶ التفسير الكبير: الكتاب الثاني، الباب الحادي عشر، ج ١ ص ١٥٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

سُوْرَةُ الْفَاتِحَة

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱)﴾

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

مذکورہ مقام میں حسن ابتداء اور براعتِ مطلع پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں دو قول (قول شافعی وقول حنفی) کے مطابق سورت کی ابتداء بہت ہی خوبصورت اور اچھے انداز سے ہوئی ہے۔ مذہب شافعی کے مطابق اگر "بِسْمِ اللّٰهِ" سورت کی پہلی آیت ہوتی تب بھی ابتداء اور افتتاح عمدہ اور خوبصورت طریقہ پر ہوتی ہے، کیونکہ "بِسْمِ اللّٰهِ" میں اللہ رب العزت کے اسم گرامی سے استعانت طلب کی جاتی ہے۔ اور اللہ سبحانہ کے نام کی استعانت سے کلام کی ابتداء حسنِ ابتداء کی اعلیٰ شاہکار ہے۔ اگر یہاں مذہب حنفی کے مطابق سورت کی پہلی آیت "بِسْمِ اللّٰهِ" نہ ہو بلکہ "اَلْحَمْدُ" ہو، تو یہ بھی حسنِ ابتداء وافتتاح کا سب سے بہترین اور عمدہ طریقہ ہے، کیونکہ اس میں اللہ سبحانہ کی حمد وثناء اور اوصاف عالیہ سے انکی تعریفیں کرنا پایا جاتا ہے۔ اور "اَلْحَمْدُ" نظم ونثر کی ابتداء اور آغاز میں بھی لایا جاتا ہے، اور اسی طرح قرآن کریم کی بعض کی سورتوں کی ابتداء بھی "اَلْحَمْدُ" سے کی گئی ہے، جو "اَلْحَمْدُ" سے کلام کی ابتداء کے حسن پر دلیل ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں "تلوین الخطاب" سے کام لیا گیا ہے۔ ❷ یہاں بھی کلام کو صیغۂ خبر سے بیان کیا گیا ہے، حالانکہ اس خبر سے لوگوں کو اللہ سبحانہ کے حمد ثناء کا خطاب یعنی

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو خوب صورت اور اچھے انداز سے شروع کیا جائے۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو ایک انداز سے دوسرے انداز کی طرف منتقل کر دیا جائے۔

حکم کرنا مقصود ہے۔ عربی میں حکم کے لئے فعل امر استعمال ہوتا ہے، مگر فعلِ امر کے لئے جو انداز اور صیغہ "اِحْمَدِ اللہ" ہونا چاہیے تھا آیت میں وہ انداز ترک کر دیا گیا، بلکہ اس انداز کے بجائے کلام کو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" بول کر جملہ خبریہ کی صورت میں خبر کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں " تلوین الخطاب" پایا جاتا ہے۔ " تلوین الخطاب" کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "لوگوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثناء کیا کرو"۔

سب سے پہلے اور آخر میں کہا جانے والا کلمہ

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ ھ) فرماتے ہیں:

أول كلمة ذكرها أبونا آدم هو قوله الحمد للّٰه، وآخر كلمة يذكرها أهل الجنة هو قولنا الحمد للّٰه، أما الأول: فلأنه لما بلغ الروح إلى سرته عطس فقال الحمد للّٰه رب العالمين، وأما الثاني: فهو قوله تعالى: وآخر دعواهم أن الحمد للّٰه رب العالمين ففاتحة العالم مبنية على الحمد وخاتمته مبنية على الحمد. ❶

ترجمہ: سب سے پہلا کلمہ جو ہمارے والد حضرت آدم علیہ السلام نے کہا وہ "**الحمد للّٰه**" ہے، اور سب سے آخری کلمہ جو اہل جنت، جنت میں کہیں گے وہ بھی "**الحمد للّٰه**" ہے، رہا پہلا کلمہ وہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس وقت کہا جب روح ان کی ناف تک پہنچی تو انہیں چھینک آئی، تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: "**الحمد للّٰه رب العالمين**" کہا، دوسرا کلمہ تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ جنتیوں کی آخری پکار بھی حمد ہوگی۔ پس عالم کی ابتداء اور انتہاء دونوں حمد پر مبنی ہیں۔

چار سورتوں کا افتتاح اللہ تعالیٰ نے الحمد للہ کے ساتھ کیا ہے

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ ھ) فرماتے ہیں:

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج۱ ص۱۹۵

ثم إنه تعالى افتتح سوراً أربعة بعد هذه السورة بقوله: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فأولها: سورة الأنعام وهو قوله: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الّذِی خَلَقَ السّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، وثانيها: سورة الكهف، وهو قوله: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی أَنْزَلَ على عَبْدِهِ الْكِتَابَ، وثالثها: سورة سبأ، وهو قوله: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی لَهُ مَا فِی السموات وَمَا فِی الأرض ورابعها: قوله: الحمد للّٰهِ فَاطِرِ السموات والأرض. ❶

ترجمہ: اللہ تعالی نے سورۂ فاتحہ کے بعد چار سورتوں کی ابتدا ''الحمد للّٰہ'' کے ساتھ کی ہے، ا.....سورۂ انعام کے شروع میں ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ'' ۲.....سورۂ کہف کے شروع میں ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ'' ۳.....سورۂ سبا کے شروع میں ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ'' ۴.....سورۂ فاطر کے شروع میں ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ''

الحمدللہ میں آٹھ حروف ہیں اور جنت کے دروازے بھی آٹھ ہیں

الحمدللہ میں آٹھ حروف ہیں اور جنت کے دروازے بھی آٹھ ہیں، پس جو شخص دل کی گہرائیوں کے ساتھ ان کلمات کو پڑھے تو وہ جنت کے آٹھوں دروازوں کا مستحق ہوگا:

الحمد لله ثمانية أحرف، وأبواب الجنة ثمانية، فمن قال هذه الثمانية عن صفاء قلبه استحق ثمانية أبواب الجنة. ❷

سورۂ فاتحہ اور صفاتِ باری تعالی

اگر سورۂ فاتحہ کے نفس مضمون پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں باری

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الثالث، ج١ ص١٦٢

❷ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج١ ص١٩٢

تعالی کی گیارہ صفات نمایاں طور پر بیان کی گئی ہیں، جن کا بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کا مضمون باری تعالی کی معرفتِ علمی کے حصول کے لئے مینارۂ نور کا درجہ رکھتا ہے، وہ صفات درج ذیل ہیں:

۱....محمود ۲.....اِلٰہ ۳.....رب ۴.....رحمٰن ۵.....رحیم ۶.....مالک ۷.....معبود ۸.....مستعان ۹.....ہادی ۱۰.....مُنعم ۱۱.....مُضِل

سورۂ فاتحہ اور صفاتِ عبدیت

جس طرح اس سورت میں ذاتِ باری تعالی کی گیارہ صفات مذکور ہیں، اسی طرح ہر ایک صفت الوہیت کے مقابلے میں ایک صفت عبدیت ہے، اس لحاظ سے مذکورہ صفات عبدیت بھی تعداد میں گیارہ ہی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱.....حامد ۲.....مخلوق ۳.....مربوب ۴.....محتاج فی الدنیا ۵.....محتاج فی الآخرۃ ۶.....مملوک ومحکوم ۷.....عابد ومطیع ۸..... مُستعین ومُستمد (مدد چاہنے والا) ۹..... طالبِ ہدایت یا ہدایت یافتہ ۱۰.....منعم علیہ یا انعام یافتہ ۱۱.....مستحقِ ضلالت یا گمراہ

الحمد میں الف لام کی تحقیق

۱......علامہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ) کی رائے یہ ہے کہ الف لام جنس کا ہے اور جن لوگوں نے الف لام کو استغراق کا مراد لیا ہے یہ ان حضرات کا وہم ہے:

و هو تعريف الجنس والاستغراق الذي يتوهمه كثير من الناس وهم منهم. ❶

علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

ولا يبعد أن يقال أن اختيار الزمخشري كون التعريف للجنس

❶ الكشاف: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۵۳

وكون القول بالاستغراق وهم لا يبعد أن يكون رعاية لنزعة اعتزالية. ❶

ترجمہ: علامہ زمخشری نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ الف لام جنس کا ہے، اور جن حضرات نے استغراق کا مراد لیا ہے یہ ان کا وہم ہے، لیکن یہ بات بعید نہیں ہے کہ انہوں نے یہ قول اعتزال کی رعایت رکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔

۲......علامہ قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں کہ الف لام استغراقِ جنس کے لئے ہے۔ ❷

حمد کی تعریف

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) حمد اور مدح کی تعریف فرماتے ہیں:

هو الثناء على الجميل الاختياري من نعمة أو غيرها.

ترجمہ: حمد افعالِ جمیلہ اختیاریہ پر زبان سے تعریف کرنا خواہ یہ تعریف نعمت کے مقابلے میں ہو یا نہ ہو۔

مدح کی تعریف

والمدح: هو الثناء على الجميل مطلقًا تقول حمدت زيدًا على علمه وكرمه، ولا تقول حمدته على حسنه، بل مدحته. ❸

ترجمہ: مدح مطلقاً افعال جمیلہ پر تعریف کرنا (خواہ اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ) آپ ''حمدت زيدا علي علمه وكرمه'' (میں نے زید کی تعریف کی اس کے علم اور سخاوت کی وجہ سے) تو کہہ سکتے ہیں مگر ''حمدت زيدا على حسنه'' (میں نے زید کی

❶ روح المعاني: سورة الفاتحة، ج١ ص٩٧

❷ تفسير القرطبي: سورة الفاتحة، الباب الرابع، ج١ ص١٧٧

❸ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج١ ص٣٠

تعریف کی اس کے حسن کی وجہ سے) نہیں کہہ سکتے بلکہ اس موقع پر ''مدحته'' کہیں گے۔

شکر کی تعریف

جميع ما أنعم اللّٰه به على عبده إلى ما خلق لأجله.

ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو ان مقاصد میں صرف کرنا جس کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔

حمد اور مدح کے درمیان فرق

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ھ) فرماتے ہیں کہ حمد اور مدح کے درمیان چند وجوہ سے فرق ہے: ا.....لفظ مدح عام ہے اس کے ذریعے سے تعریف جاندار اور بے جان دونوں کی جاتی ہے، جیسے آپ کسی خوبصورت موتی یا یاقوت کو دیکھ کر اس کی تعریف کرو، اب یہ مدح کہلائے گی لیکن اسے حمد نہیں کہا جائے گا۔ ۲.....مدح کبھی احسان سے پہلے بھی ہوتی ہے اور کبھی احسان کے بعد بھی، بخلاف حمد کے وہ احسان کے بعد ہوتی ہے۔ ۳.....لفظ مدح کا اطلاق منہی عنہ پر بھی ہوتا ہے (یعنی وہ کام جس سے شارع نے روکا ہوا) جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنْ نَحْثِيَ فِيْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ.

ترجمہ: ہم مدح کرنے والوں کے منہ کو مٹی سے بھر دیں۔

بخلاف حمد کے اس کا شریعت نے مطلقاً حکم دیا ہے، جیسا کہ روایت میں ہے:

مَنْ لَمْ يَحْمَدِ النَّاسَ لَمْ يَحْمَدِ اللّٰهَ. ❶

ترجمہ: جو لوگوں کی تعریف نہیں کرتے وہ اللہ تعالی کی بھی تعریف نہیں کرتے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ١٢٧٠ھ) نے حمد اور مدح کے درمیان چھ فرق ذکر کئے

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج١ ص

ہیں، اہلِ علم حضرات تفصیلاً دیکھیں: ❶

حمد اور شکر کے درمیان فرق

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حمد باعتبار مورد کے خاص ہے اور باعتبار متعلق کے عام ہے، جب کہ شکر باعتبار مورد کے عام اور باعتبار متعلق کے خاص ہے:

مورد الحمد في المشهور خاص ومتعلقه عام والشكر بالعكس موردا ومتعلقا. ❷

حمد ومدح اور شکر کے درمیان باعتبار استعمال کے یہ فرق ہے کہ حمد ومدح دونوں کے مقابلے میں ذم آتا ہے جبکہ شکر کے مقابلے میں کفر آتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ حمد ومدح کہتے ہیں ذکرِ محاسن کو، اور ذم کہتے ہیں ذکرِ قبائح کو اور ظاہر ہے کہ محاسن اور قبائح میں تقابل ہے، اور شکر کہتے ہیں اظہارِ نعمت "**بإتيان الفعل الذي ينبئ عن تعظيم المنعم**" اور کفر کہتے ہیں کتمانِ نعمت کو اور ظاہر ہے کہ اظہار وکتمان میں تقابل ہے۔

چنانچہ علامہ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والحمد نقيضه الذم والشكر نقيضه الكفران. ❸

ترجمہ: حمد کی نقیض ذم ہے اور شکر کی نقیض کفرانِ نعمت ہے۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

والذم نقيض الحمد و الكفران نقيض الشكر. ❹

❶روح المعاني: سورة الفاتحة، ج١ ص٩٤، ٩٥

❷روح المعاني: سورة الفاتحة، ج١ ص٩٦

❸الكشاف: سورة الفاتحة، ج١ ص٥٢

❹التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج١ ص٣١

”الحمد للّٰہ“ میں جملہ فعلیہ سے اسمیہ کی طرف عدول کیوں کیا؟

نحات نے قاعدہ بیان کیا ہے اگر مصدر کے بعد فعل کا فاعل یا مفعول بطورِ اضافت یا حرفِ جر کے ساتھ مذکور ہو اور وہ مفعولِ مطلق بیان نوع کے لئے نہ ہو تو ایسی صورت میں فعل کا حذف کرنا قیاساً واجب ہے۔ تو ”الحمد للّٰہ“ اصل میں ”نحمد اللّٰہ حمدا للّٰہ“ تھا ”حمدا“ مفعول مطلق ہے اور لفظ ”اللّٰہ“ مفعول ہے، اور وہ مصدر کے بعد ہے بطور حرفِ جر کے لہٰذا اس کے فعل ”نحمد“ کا حذف کرنا واجب ہے۔ نصب سے رفع کی طرف عدول کرنے کے دو فائدے ہیں۔ ثبوتِ حمد، عمومِ حمد، پس جملہ اسمیہ ثبوتِ حمد پر اسمیہ ہونے کی وجہ سے اور عمومِ حمد پر الف لام ہونے کی وجہ سے دلالت کرتا ہے۔ جملہ اسمیہ میں استمرار اور دوام کا معنی ہوتا ہے، بخلاف جملہ فعلیہ کے کہ اس میں تجدد اور حدوث کا معنی ہوتا ہے۔ فعل میں عموم اور ثبوت نہیں ہوتا، عموم تو اس لئے نہیں ہوتا کہ اس میں نسبت الی الفاعل ہوتی ہے جو متعین ہے اس لئے اس میں عموم نہیں ہوتا، فعل میں ثبوت اور دوام اس لئے نہیں ہوتا کیونکہ فعل زمانہ متعین کے ساتھ مقترن ہوتا ہے جبکہ جملہ اسمیہ زمانے سے خالی ہوتا ہے اسی وجہ سے ”الحمد للّٰہ“ میں جملہ فعلیہ سے اسمیہ کی طرف عدول کیا گیا ہے:

والعدل بها عن النصب إلى الرفع على الابتداء للدلالة على ثبات المعنى واستقراره. ❶

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

وأصله النصب وقد قرئ به وإنما عدل إلى الرفع ليدل على عموم الحمد وثباته له دون تجدده وحدوثه وهو من المصادر التي تنصب بأفعال مضمرة لا تكاد تستعمل معها. ❷

❶ الكشاف: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٥٢

❷ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٣١

ترجمہ:''الحمد'' کی اصل حالت نصب ہے چنانچہ ایک قراءت نصب کی بھی ہےاور نصب سے رفع کی طرف عدول اس لئے کیا گیا تا کہ جملہ عمومِ حمد اور ثباتِ حمد پر دلالت کرے، حدوث وتجدد پر دلالت نہ کرے،اور یہ''الحمد'' ایسے مصادر کے قبیل سے ہے جو افعالِ محذوفہ کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں،اور افعال کے ساتھ مذکور ہو کر مستعمل نہیں ہوتے۔

حمد کے ساتھ لفظ اللہ کے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

''الحمد للّٰه'' فرمایا حمد کے ساتھ دیگر صفات خالقیت ، رزاقیت کو ذکر نہیں کیا،اس کی حکمت یہ ہے کہ تا کہ اس وہم کو دور کیا جائے کہ حمد کسی خاص صفت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ حمد ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

خطیب شربینی رحمہ اللہ (متوفی ۹۷۷ھ) فرماتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ حمد کے ساتھ لفظ اللہ کو کیوں خاص کیا؟''الحمد للخالق'' یا دیگر صفات میں سے کوئی صفت حمد کے ساتھ کیوں ذکر نہیں کی؟

جواب یہ دیا گیا کہ تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ حمد کا اختصاص (اللہ تعالی کے لئے) کسی خاص وصف کے استحقاق کی وجہ سے ہے نہ کہ دیگر وصف کی وجہ سے۔یعنی اللہ تعالی کے ساتھ حمد کا اختصاص کسی خاص صفت مثلاً خالقیت ، رازقیت وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ تعالی کے لئے تعریف اس لئے خاص ہے کہ وہ خالق ہے یا رازق ہے،نہیں بلکہ حمد ذات باری تعالی کے ساتھ اس کی ذات کی وجہ سے خاص ہے،اس کے اوصاف کی وجہ سے نہیں ہے:

فإن قيل: لم خص الحمد بالله ولم يقل الحمد للخالق أو نحو من بقية الصفات؟ أجيب: بأن لا يتوهم اختصاص استحقاق الحمد بوصف دون وصف. ❶

❶السراج المنير: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٩

مذکورہ آیتِ کریمہ کے لفظِ ''اَلْحَمْدُ'' میں الف لام استغراق ہے۔ الف لام استغراق اس لئے استعمال ہوتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ لفظ کے تمام افراد کو شامل کر لیا جائے اور بات میں عموم پیدا ہو۔ اس آیت میں بھی الف لام استغراقی کے ذریعہ سے حمد وثناء کے تمام افراد وانواع کو عمومیت کے ساتھ اللہ سبحانہ کی ذاتِ عالی کے لئے ثابت کیا گیا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء میں مبالغہ وتاکید پیدا ہو۔

لفظ ''لِلّٰه'' میں لام اختصاص کے لیے ہے

مذکورہ آیت کے لفظِ ''لِلّٰه'' میں موجود لامِ جارہ ''اختصاص'' کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ❶ یہاں بھی چونکہ لامِ جارہ کے ذریعہ تمام محامد وتعریفات کو اللہ سبحانہ کی ذات کے ساتھ مختص کر دیا گیا ہے، اس لئے ''لِلّٰهِ'' کا لامِ جارہ اختصاص کے لئے ہوگا۔ اختصاص کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام محامد وتعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور وہی ان کا حقیقی حقدار ہے۔

''الحمد لله'' کے ساتھ ''رب العالمین'' کی صفت لانے میں کیا حکمت ہے؟

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ھ) فرماتے ہیں:

أنه تعالى لم يقل الحمد لله خالق العالمين، بل قال: الحمد لله رَبّ العالمين والسبب فيه أن الناس أطبقوا على أن الحوادث مفتقرة إلى الموجد والمحدث حال حدوثها، لكنهم اختلفوا في أنها حال بقائها هل تبقى محتاجة إلى المبقي أم لا؟ فخصه سبحانه بالذكر تنبيها على أن كل

❶ اختصاص کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی شئی کے ساتھ مختص کر دیا جائے۔

ما سوى اللّٰه فإنه لا يستغني عنه لا في حال حدوثه ولا في حال بقائه. ❶

ترجمہ: اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جتنے بھی حوادث وممکنات ہیں وہ اپنے وجود میں واجب الوجود کی طرف محتاج ہیں، اب اس میں اختلاف ہے کہ آیا اپنے باقی رہنے میں بھی غیر کی طرف محتاج ہیں یا نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے لفظ رب استعمال فرما کر اس بات کی تنبیہ کردی کہ حوادث جتنے بھی ہیں وہ اپنے وجود میں ذات باری تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی طرح باقی رہنے میں بھی محتاج ہیں۔

لفظ رب پر جب الف لام داخل ہوجائے تو یہ ذات باری کے ساتھ خاص ہوجاتا ہے

علامہ قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

متى أدخلت الألف واللام على رب اختص اللّٰه تعالى به، لأنها للعهد وإن حذفنا منه صار مشتركا بين اللّٰه وبين عباده. ❷

ترجمہ: لفظ ''رب'' پر جب الف لام داخل ہوجائے تو پھر یہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پھر اس کا اطلاق مخلوق پر کرنا جائز نہیں، اس صورت میں الف لام عہد خارجی کے لئے ہوگا، اور اگر الف لام کو حذف کردیا جائے تو اس صورت میں لفظ رب خالق اور مخلوق کے درمیان مشترک ہوجائے گا، البتہ جب مخلوق کے لئے استعمال ہو تو اضافت کے ساتھ ہوگا۔

لفظ رب کے متعلق ایک اہم نکتہ

علامہ محمد امین بن عبداللہ ہرری فرماتے ہیں:

---

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الثالث، ج١ ص١٦١، ١٦٢

❷ تفسير القرطبي: سورة الفاتحة، الباب الرابع، ج١ ص١٨٢

دقيقة في لفظ رب خصوصية لا توجد في غيره من أسمائه تعالى وهو أنک إذا قراء ته طردا كان من أسمائه تعالى وإن قلبته كان من أسمائه تعالى. ❶

ترجمہ: لفظ رب کے اندر ایسی خاصیت پائی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے دیگر اسماء میں نہیں پائی جاتی وہ یہ کہ اگر آپ لفظ رب کو پلٹ دیں تب بھی یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہوگا (یعنی بَرٌّ) جبکہ اگر دیگر اسمائے باری تعالیٰ کو پلٹ دیں تو پھر وہ اسمائے باری تعالیٰ میں سے نہیں رہتے۔

لفظِ عالمین کی تحقیق

یہ ''عَالَمُ''کی جمع ہے، عالم کا لغوی معنی ''**ما يعلم به الشیء**'' جیسے خاتم کا معنی ''**ما يختم به**'' عرف میں عالم کا معنی ''**مايعلم به الصانع**''عرفی معنی میں تخصیص ہے جیسا کہ لغوی معنی میں تعمیم ہے، تو عالم سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے وجود سے خالقِ کائنات کے وجود پر استدلال کیا جا سکے، خواہ وہ انسان ہوں یا دیگر حیوانات، نباتات ہوں یا جمادات ہوں:

و العالم اسم لما يعلم به كالخاتم. ❷

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رحمہ اللہ (متوفی ۷۱۰ھ) فرماتے ہیں:

والعالم هو ما علم به الخالق من الأجسام والجواهر والأعراض أو كل موجود سوى الله تعالى سمى به لأنه علم على وجوده. ❸

ترجمہ: اجسام، جواہر، اعراض اور ہر وہ موجود چیز جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہے وہ عالم ہے، عالَم کو عالم اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود پر علامت ہیں۔

❶ حدائق الروح والريحان: سورة الفاتحة، ج۱ ص۵٦

❷ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج۱ ص۳۲

❸ مدارك التنزيل: سورة الفاتحة، ج۱ ص۳۰

لفظ عالمین کو جمع کے صیغے کے ساتھ لانے میں کیا حکمت ہے؟

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

وإنما جمعه ليشمل ما تحته من الأجناس المختلفة، وغلب العقلاء منهم فجمعه بالياء والنون كسائر أوصافهم. ❶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے عالمین کو جمع کے صیغے کے ساتھ ذکر فرمایا تا کہ وہ اپنے ماتحت مختلف قسم کی اجناس کو شامل ہو، اوران اجناس مختلفہ میں عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے عالم کو یاءنون کے ساتھ جمع لائے جس طرح عقلاء کے دوسرے اوصاف کی یاءنون کے ساتھ جمع آتی ہے۔

لفظ عالمین کو جمع قلت کے صیغے کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا جبکہ مقام جمع کثرت کا تھا؟

عالمین کو جمع قلت کے ساتھ ذکر کیا حالانکہ مقام اس بات کا تقاضا کر رہا تھا کہ اس کو جمع کثرت کے صیغے کے ساتھ لاتے، تو جمع قلت کے صیغے کے ساتھ ذکر کرنا اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ عالم کتنے ہی کثیر کیوں نہ ہوں لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے سامنے یہ اقل القلیل ہے ان کی کوئی حیثیت نہیں:

فإن قيل: لم جمع جمع قلة مع أن المقام يستدعي الإتيان بجميع الكثرة، أجيب: بأن فيه تنبيهاً على أنهم وإن كثروا قليلون في جنب عظمته وكبريائه تعالى. ❷

وإنما كان الجمع الواو والنون مع أنه في المشهور جمع قلة والظاهر مستدع لجمع الكثرة تنبيها على أن العوالم وإن كثرت قليلة بل

❶ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج١ ص٣٢

❷ السراج المنير: سورة الفاتحة، ج١ ص٩

أقل من القليل في جنب عظمة الله تعالى وكبريائه. ❶

لفظ عالم ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کو شامل ہے پھر واو نون کے ساتھ اس کی جمع کیوں لائی گئی؟

جواب: یہاں جمع لانے میں عقلاء کو ان کی شرافت کی وجہ سے غلبہ دیا گیا ہے غیر عقلاء پر، لہٰذا جس طرح عقلاء کی دیگر صفات کی جمع واو نون کے ساتھ لائی جاتی ہے اسی طرح عالم کی جمع بھی واو نون کے ساتھ لائی گئی:

وغلب العقلاء منهم فجمعه بالياء والنون كسائر أوصافهم. ❷

لفظ عالمین میں الف لام کونسا ہے؟

علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ) فرماتے ہیں:

والتعريف فيه للاستغراق بقرينة المقام الخطابي فإنه إذا لم يكن عهد خارجي ولم يكن معنى للحمل على الحقيقة ولا على المعهود الذهني تمحض التعريف للاستغراق لجميع الأفراد. ❸

ترجمہ: ''**العالمین**'' میں الف لام استغراق کا ہے، اور قرینہ اس پر یہ مقام خطاب ہے کہ الف لام عہد خارجی کا نہیں ہے، اور نہ ہی یہ الف لام جنس پر محمول ہو سکتا ہے اور نہ عہد ذہنی پر، تو اب یہ متعین ہو گیا کہ یہ الف لام استغراق کا ہے مقصود اس سے تمام افراد کا احاطہ کرنا ہے۔

لفظ عالمین کو جمع کے صیغے کے ساتھ کیوں ذکر کیا؟

علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ عالم کو جمع کے صیغے کے

---

❶ روح المعاني: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱۰۸

❷ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج۱ ص۳۲

❸ التحرير والتنوير: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱٦۸

ساتھ لایا اس لئے کہ اگر اس کو مفرد کے صیغے کے ساتھ لاتے تو یہ وہم ہوتا ہے کہ الف لام عھد خارجی کے لئے یا جنس کے لئے ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ معھود جنسِ عالم یا مخصوص جنس کا رب ہے، تو جمع کے صیغے کے ساتھ لایا تا کہ تصریح ہو اس بات پر کہ یہ صیغہ جمع استغراق کے لئے ہے تا کہ تمام مخلوقات کو شامل ہو:

وإنما جمع العالم ولم يؤت به مفردا لأن الجمع قرينة على الاستغراق. ❶

”رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ“ اور ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ میں مناسبت

سورہ فاتحہ میں پہلے ”رَبِّ الْعٰلَمِیْن“ بول کر اللہ رب العزت کی صفتِ ربوبیت کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد ”الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے ذریعہ اللہ رب العزت کی صفتِ رحم کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مقام میں صفتِ ربوبیت کے بعد صفتِ رحم اس لئے بیان ہوئی تا کہ ”ترغیب بعد الترھیب“ کا فائدہ حاصل ہو۔ ❷ یہاں بھی پہلے صفتِ ربوبیت لائی گئی جس سے ترہیب کا مفہوم کشید ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت تمام عالمین کا رب ہے، اس لئے اس کی نافرمانی وسرکشی سے ڈرو ورنہ سخت سزا ملے گی۔ پھر اس کے بعد صفتِ رحم لائی گئی تا کہ ترغیب ہو، یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ترغیب دلائی جائے اور نافرمانی سے رکنے کی ترہیب دلائی جائے۔

مَالِک اور مَلِک میں فرق

مالک کہتے ہیں جو اعیان مملوکہ میں اپنی مرضی سے تصرف کرے اور یہ ماخوذ ہے مِلک بکسر المیم سے، اور ملک کہتے ہیں جو مامورین میں امر اور نہی کے ذریعے تصرف کرے اور یہ ماخوذ ہے مُلک بضم المیم سے:

❶ التحرير والتنوير: سورة الفاتحة، ج ١ ص ١٦٨

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگوں کو ڈرایا، دھمکایا جائے پھر اس کے بعد لوگوں کو ترغیب دی جائے۔

المالک: هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف يشاء من الملک.

والملک: هو المتصرف بالأمر والنهى فى المأمورين من الملک.❶

امام بغوی رحمہ اللہ (متوفی ۵۱٦ھ) فرماتے ہیں:

والملک هو القادر على اختراع الأعيان من العدم إلى الوجود ولا يقدر عليه أحد غير اللّٰه.❷

ترجمہ: ملک وہ قادر ذات ہے جو اعیان کو عدم سے وجود بخشے اور اس پر اللہ تعالی کے علاوہ کوئی قادر نہیں ہے۔

مَالِک اور مَلِک دونوں قراءتیں صحیح اور متواتر ہیں

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

قرأ بعض القراء: مَلِک يَوْمِ الدِّينِ وقرأ آخرون: مَالِکِ. وكلاهما صحيح متواتر فى السبع.❸

ترجمہ: بعض قراء ''مَلِکِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' پڑھتے ہیں اور بعض ''مَالِکِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' پڑھتے ہیں یہ دونوں قراءتیں صحیح ہیں اور قراءات سبع میں متواتر ہیں۔

والمتواتر منها قراءة مالک وملک.❹

روزِ جزاء کی ضرورت واہمیت

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦۰٦ھ) فرماتے ہیں:

❶التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج۱ ص۳۳

❷معالم التنزيل: سورة الفاتحة، ج۱ ص۷٤

❸تفسير ابن كثير: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱۲٥

❹روح المعاني: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱۱۲

واعلم أن من سلط الظالم على المظلوم ثم إنه لا ينتقم منه فذاک إما للعجز أو للجهل أو لكونه راضيا بذلک الظلم، وهذه الصفات الثلاث على اللّٰه تعالى محال، فوجب أن ينتقم للمظلومين من الظالمين، ولما لم يحصل هذا الانتقام في دار الدنيا وجب أن يحصل في دار الأخرى بعد دار الدنيا، وذلک هو المراد بقوله: مالک يَوم الدين. ❶

ترجمہ: جب کوئی ظالم ظلم کرتا ہے اور مظلوم اس سے انتقام نہیں لے سکتا، عجز کی وجہ سے یا ناواقف ہونے کی وجہ سے کہ مجھ پر ظلم کس نے کیا؟ یا مظلوم ظالم کے ظلم پر راضی ہے، ان تینوں باتوں کے ساتھ ذات باری تعالیٰ کا متصف ہونا محال ہے، پس ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم سے انتقام لے، جب دنیا میں ظالم کو اس کے ظلم کی سزا نہیں دی گئی تو ضروری ہے کہ ایک ایسا جہان ہو جہاں ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دی جائے، اور مظلوم کی مدد کی جائے پس اسی جہان کو روزِ جزاء کہتے ہیں۔

”مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ“ کی تفسیر قرآنِ کریم سے

”**إن القرآن يفسر بعضه بعضا**“ سورہ انفطار میں اللہ تعالیٰ نے ”مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ“ کی وضاحت فرمائی ہے:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ يَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ. (سورة الانفطار: ۱۷، ۱۸، ۱۹)

ترجمہ: اور تمہیں کیا پتہ کہ جزاوسزا کا دن کیا چیز ہے؟ ہاں تمہیں کیا پتہ کہ جزاوسزا کا دن کیا چیز ہے؟ یہ وہ دن ہوگا جس میں کسی دوسرے کے لئے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوگا، اور تمام تر حکم اُس دن اللہ ہی کا چلے گا۔

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحه، الفصل الرابع، ج۱ ص۲۰۴

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رحمہ اللہ (متوفی ۷۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ أي لا أمر إلا للّٰه تعالى وحده فهو القاضي فيه دون غيره. ❶

ترجمہ: اس دن بادشاہت صرف اللہ کی ہوگی، کسی کا کوئی حکم نہیں چلے گا، صرف اللہ کا حکم نافذ ہوگا، پس صرف اللہ ہی اس دن فیصلہ کرنے والا ہوگا کسی اور کے لئے کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

واللام للاختصاص أي الأمر له تعالى لا لغيره سبحانه لا شركة ولا استقلالًا أي أن التصرف جميعه في قبضة قدرته عز وجل لا غير. ❷

ترجمہ: لفظ ''لِلّٰه'' میں لام اختصاص کے لئے ہے، تمام اختیارات صرف اللہ کے ہوں گے کوئی بھی کسی بھی طرح سے اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہوگا، یعنی تمام امور میں ہر قسم کے تصرفات اس دن صرف اللہ کے لئے ہوں گے، نہ کہ کسی اور کے لئے۔

علامہ عبدالحق حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''نفس''، نکرہ، ''لنفس'' نکرہ، ''شيئا''، نکرہ تینوں نکروں کے عموم نے یہ بات بتادی کہ اس روز کسی کا بھی کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ

اس روز اللہ ہی کا اختیار ہوگا۔ ❸

اس آیت میں ''نفس'' نکرہ، ''لنفس'' نکرہ، ''شيئا'' نکرہ یہ تینوں الفاظ نکرہ پھر

❶ مدارك التنزيل: سورة الفاتحة، ج٣ ص٦١٢

❷ روح المعاني: سورة الانفطار، ج٣٠ ص٣٨٢

❸ تفسیر حقانی: سورہ انفطار، ج۵ ص۸۱

تحت النفی استعمال ہوا، اور اصول ہے کہ نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ نیز ''الأمـــر'' میں الف لام استغراق کے لئے ہے، اور لفظ ''لـلّٰــه'' میں لام اختصاص کے لئے ہے۔ اس قدر تاکیدات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس دن کوئی شخص بااختیار نہ کسی کو نفع پہنچا سکے گا نہ نقصان، اس دن بادشاہت صرف اور صرف اللہ رب العزت ہی کی ہوگی۔

''مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' میں اضافت تخصیص کے لیے ہے

مذکورہ آیت کریمہ میں لفظِ ''مَـالِکِ'' کی اضافت ''یَـوْمِ الـدِّیْنِ'' کی طرف کی گئی ہے۔ گذشتہ آیت کے لامِ جارہ کی طرح اس اضافت میں بھی اختصاص واقع ہوئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن تمام چیزوں کی ملکیت اور بادشاہت صرف اللہ سبحانہ کے ساتھ مختص ہوگی، وہ اکیلا بروز قیامت ملکیت اور بادشاہت سے متصف ہوگا، اُس دن اللہ کے سوا کسی چیز پر کسی کی ملکیت اور بادشاہت ہرگز جاری نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں قیامت کے دن اعمال کا بدلہ اللہ کے سوا کوئی نہ دیگا، اللہ تعالیٰ ہی تمام اعمال کا بدلہ دینگے۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے آیت میں ''مَالِک'' کی اضافت ''یَوْمِ الدِّیْن'' کی طرف کی گئی ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں لفظِ ''یَوْم'' کی اضافت ''الدِّیْن'' (جزاء) کی طرف کردی گئی ہے۔ جب دو چیزوں کے درمیان معمولی سی مناسبت، تعلق اور ملابست ہو تو ایک شے کی اضافت دوسرے کی طرف کردی جاتی ہے۔ چونکہ قیامت کے دن لوگوں کے اعمال حسنہ اور قبیحہ کا بدلہ دیا جائیگا، اس لحاظ سے قیامت اور جزاء کے درمیان ادنی سی ملابست پائی جاتی ہے۔ اس مناسبت وملابست کے پیش نظر آیت میں ''یـوم'' (روز) کی اضافت ''الـدِّیْـن'' (جزاء) کی طرف کردی گئی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ظروف زمان کی اضافت ان میں پیش آنے والے واقعات وحادثات کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے ''یــوم الأحـزاب''

میں یوم ظرف کی اضافت ’’واقعہ احزاب‘‘ کی طرف کردی گئی اور ’’یوم الفتح‘‘ میں ’’یوم‘‘ ظرف کی اضافت ’’فتح مکہ‘‘ کی طرف کردی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح آیت میں ’’یوم‘‘ کی اضافت اس میں دیئے جانے والے جزاء ’’الدِّین‘‘ کی طرف کردی گئی ہے۔

لفظ مالک کی جگہ قاضی اور حاکم کے نہ لانے میں کیا حکمت ہے؟

قاضی اور حاکم لفظِ مالک کا بدل نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ قاضی اور حاکم باوجود وسیع اختیار ہونے کے بھی وہ قانون کے پابند ہوتے ہیں، جوملکی، سیاسی قانون ہوں ان کے نفاذ کے پابند ہوتے ہیں، اس لئے وہ مطلق اختیار کے مالک نہیں ہوتے، جبکہ مالک کے اختیار مطلق ہوتے ہیں، وہ کسی قانون اور ضابطے کا پابند نہیں ہوتا۔ اس لئے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے مالک کا ترجمہ شہنشاہ کے ساتھ کیا۔ ❶

خالق اور مخلوق کی مدح میں بلیغ لفظ

امام ابوحاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر خالق کے حق میں استعمال کرنا مقصود ہوتو ’’مَــالِک‘‘ زیادہ بلیغ ہے، اور مخلوق کے حق میں استعمال کرنا ہوتو ’’مَـلِک‘‘ زیادہ بلیغ ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مخلوق میں سے جو مالک ہوگا ضروری نہیں کہ ’’مَلِک‘‘ (بادشاہ) بھی ہو مگر جب یہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوگا تو وہ مالک بھی ہے اور ’’مَلِک‘‘ بھی ہے:

وقال أبو حاتم: إن مالكا أبلغ في مدح الخالق من ملك، و ملك أبلغ في مدح المخلوقين من مالك، والفرق بينهما أن المالك من المخلوقين قد يكون غير ملك وإذا كان الله تعالى مالكا كان ملكا. ❷

❶ تفسير القرطبي: سورة الفاتحة، ج١ ص١٨٧

❷ تفسير القرطبي: سورة الفاتحة، الباب الرابع، ج١ ص١٨٥

''یوم الدین'' کی جگہ ''یوم القیامۃ'' کیوں نہیں فرمایا، اس میں کیا حکمت ہے؟

''یوم الدین'' اس لئے فرمایا اگر ''یوم القیامۃ'' فرماتے تو آیت کے درمیان سجع باقی نہ رہتا، آیات میں جو تسلسل ہے وہ ختم ہوجاتا۔ نیز لفظِ دین کے اندر عموم زیادہ ہے، یہ قیامت کے تمام احوال کو شروع سے لے کر آخر تک سب کو شامل ہے، جبکہ لفظ قیامت کے مفہوم میں اس قدر وسعت نہیں ہے:

وإنما قال مالک یوم الدین ولم یقل یوم القیامة مراعاة للفاصلة وترجیحا للعموم فإن الدین بمعنی الجزاء یشمل جمیع أحوال القیامة من إبتداء النشور إلی السرمد الدائم. ❶

''مَلِک'' اللہ کی صفت ذاتی ہے، جبکہ ''مَالِک'' اللہ کی صفت فعلی ہے

امام قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

إن وصف اللّٰہ سبحانه بأنه ملک کان ذلک من صفات ذاته، وإن وصف بأنه مالک کان ذلک من صفات فعله. ❷

ترجمہ: اگر ''مَــــلِک'' کہا جائے تو یہ اللہ رب العزت کی صفت ذاتی ہے اور اگر ''مَالِک'' کہا جائے تو یہ اللہ رب العزت کی صفت فعلی ہے۔

لفظ ''یوم'' کا استعمال

لفظ ''یوم'' تین طرح سے استعمال ہوتا ہے۔

❶روح المعاني: سورة الفاتحة، ج١ ص١١٥

❷تفسير القرطبي: سورة الفاتحة، الباب الرابع، ج١ ص١٨٨

۱......استعمال لغوی ۲......استعمال عرفی ۳......استعمال شرعی

لغت میں لفظ یوم مطلق وقت کے معنی استعمال ہوتا ہے، اورعرف میں طلوعِ شمس سے لے کر غروبِ شمس تک کے لئے، شرع کی اصطلاح میں طلوعِ فجر ثانی اور غروبِ شمس کے درمیان، لیکن یہاں مطلق وقت مراد ہے:

والیوم في العرف عبارة عما بين طلوع الشمس وغروبها من الزمان وفي الشرع عما بين طلوع الفجر الثاني وغروب الشمس والمراد ههنا مطلق الوقت. ❶

اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیت کو یومِ آخرت کے ساتھ کیوں مختص کیا؟

دنیا کے اندر اگرچہ حقیقتاً ملکیت اللہ رب العزت ہی کی ہے، مگر بظاہر انسان بھی مالک نظر آتا ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ انسان بھی ملکیت میں شریک ہے، اس کے برخلاف آخرت میں کہ وہاں تنہا اللہ رب العزت کا حکم نافذ ہوگا، حقیقت میں بھی اور ظاہر میں بھی، اسی تفرد کی بناء پر مالکیت کی نسبت خاص طور سے یوم آخرت کی طرف کی۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ (متوفی ۵۹۷ھ) فرماتے ہیں:

إنما خص يوم الدين لأنه ينفرد يومئذ بالحكم في خلقه. ❷

ترجمہ: ''یوم الدین '' کی تخصیص اس لئے کہ اس دن مخلوق کے بارے میں صرف اللہ تعالی کا فیصلہ نافذ ہوگا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

فيقال لم خصص يوم الدين وهو مالك يوم الدين وغيره؟ قيل له: لأن في الدنيا كانوا منازعين في الملك، مثل فرعون ونمرود وغيرهما،

---

❶ تفسير أبي السعود: سورة الفاتحة، ج۱ ص۲٤

❷ زاد المسير: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱۹

وفي ذلک اليوم لا ينازعه أحد في ملكه، وكلهم خضعوا له، كما قال تعالى: لمن الملک اليوم فأجاب جميع الخلق: للّٰه الواحد القهار فلذلک قال: مالک يوم الدين، أي في ذلک اليوم لا يكون مالک ولا قاض ولا مجاز غيره، سبحانه لا إله إلا هو. ❶

اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر روزِ جزاء کا ذکر کیوں فرمایا جبکہ وہ تو ہر چیز کا مالک ہے؟

دنیا میں تو فرعون نمرود وغیرہ اوران جیسے دوسرے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بادشاہت کا دعویٰ کرتے تھے مگر روز جزا کے دن اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بادشاہت کا دعویدار کوئی بھی نہیں ہوگا، ہرکوئی اس کے سامنے عاجز ہوگا، اس روز اللہ تعالیٰ پوچھیں گے ''لِمَنِ الْمُلْکُ الْيَوْمَ'' آج کے دن بادشاہت کس کی ہے؟ تو تمام مخلوق جواب دے گی ''لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ '' اس اللہ رب العزت کی ہے جو یکتا اور غالب ہے، اسی بناء پر ارشاد فرمایا ''مَالِکِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' اس دن اس کے بغیر نہ کوئی مالک ہوگا، نہ کوئی فیصلہ کرنے والا، اور نہ ہی کوئی بدلہ دینے والا ہوگا، اس کی ذات پاک ہے اوراس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

عبادت کو استعانت پر کیوں مقدم کیا؟

مذکورہ آیت کریمہ میں عبادت کو استعانت پر مقدم کیا گیا ہے، حالانکہ اس کے برعکس (استعانت کو مقدم اور عبادت کو مؤخر) بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہاں دو نکات کے حصول کیلئے عبادت کو استعانت پر مقدم کر دیا گیا ہے، وہ نکات یہ ہیں:

نمبر ا: یہاں عبادت کو استعانت پر اس لئے مقدم کیا گیا تا کہ آیتوں کے درمیان ''موافق الفواصل'' برقرار رہے۔ یعنی آیتوں کے آخری کلمہ کا اختتام ایک ہی حرف پر ہو۔ یہاں ''مَالِکِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' میں آخری حرف نون ہے۔ اگر متعلقہ آیت میں استعانت کو

❶ تفسير قرطبي: سورة الفاتحة، الباب الرابع، ج١ ص١٨٨

عبادت پر مقدم کرتے تو آیت ''اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ وَاِیَّاکَ نَعْبُدُ'' ہوتی جس سے آیت کا اختتام دال پر ہوتا اور اس آیت کا دوسری آیتوں کیساتھ کلمہِ فاصل (آخری کلمہ) سے موافقت نہ رہتی۔اس موافقت کو برقرار رکھنے کیلئے آیت میں عبادت کو استعانت پر مقدم کردیا گیا ہے۔

نمبر۲: مذکورہ آیت میں عبادت کو استعانت پر مقدم کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ حاجت اور ضرورت کو طلب کرنے سے پہلے کوئی وسیلہ اور ذریعہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ ضرورت اور حاجت کے طلب کی قبولیت کے لئے وسیلہ اور ذریعہ بہت مؤثر شئی ہے۔

عبادت کی لغوی تحقیق

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رحمہ اللہ (متوفی ۷۱۰ھ) فرماتے ہیں:

والعبادة أقصى غاية الخضوع والتذلل. ❶

ترجمہ: عبادت کہا جاتا ہے انتہائی درجے کے خضوع وخشوع کو۔

امام خازن رحمہ اللہ (متوفی ۷۴۱ھ) نے عبادت کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

العبادة غاية التذلل من العبد ونهاية التعظيم للرب. ❷

ترجمہ: بندے کی طرف سے انتہائی عاجزی اور رب کریم کے لئے انتہائی تعظیم کے اظہار کو عبادت کہتے ہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

والعبادة أعلى مراتب الخضوع ولا يجوز شرعا ولا عقلا فعلها إلا

❶مدارك التنزيل: سورة الفاتحة، ج١ ص٣١

❷تفسير الخازن: سورة الفاتحة، ج١ ص٢٠

للّٰہ تعالی لأنه المستحق لذلک لکونه مولیا لأعظم النعم من الحیاة والوجود وتوابعهما ولذلک یحرم السجود لغیره سبحانه لأن وضع أشرف الأعضاء علی أهون الأشیاء وهو التراب موطیء الأقدام والنعال غایة الخضوع. ❶

ترجمہ: عبادت خشوع وخضوع کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے، شرعاً اور عقلاً عبادت جائز نہیں ہے سوائے اللہ تعالی کے، اس لئے کہ وہی ذات عبادت کی مستحق ہے، کیونکہ اس نے تمام بڑی نعمتیں عطا کیں جن میں حیات، وجود اور ان کے مثل نعمتیں، اسی وجہ سے غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنا حرام ہے، اس وجہ سے کہ اس میں اشرف الاعضاء (پیشانی) کو اہون الاشیاء (مٹی) پر رکھنا ہے، اور اس مٹی کو قدموں اور جوتوں سے روندا جاتا ہے، (تو اس حقیر شی پر انسان اپنے جسم کے معزز عضو پیشانی کو رکھتا ہے تب جا کر عبادت ادا ہوتی ہے) اور یہ انتہائی خشوع وخضوع والی کیفیت ہے۔

عبادت کا اصطلاحی معنی

هو فعل اختیاري یکون النفس کارهة له لتحصیل مجرد رضاء الباري.

ترجمہ: یعنی عبادت وہ فعل اختیاری ہے جو خلاف نفس ہو محض ذات باری تعالیٰ کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہو۔

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

العبادة عبارة عن الفعل الذي یؤتی به لغرض تعظیم الغیر. ❷

ترجمہ: عبادت عبارت ہے اس فعل سے جس کو ادا کیا جائے غیر کی تعظیم کی وجہ سے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) عبادت کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

❶ روح المعاني: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱۱۶

❷ التفسیر الکبیر: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج۱ ص۲۰۸

وفي الشرع: عبارة عما يجمع كمال المحبة والخضوع والخوف. ❶

ترجمہ: عبادت کمالِ محبت، خوفِ خدا، خشوع اور خضوع کے مجموعے کا نام ہے۔

مفعول بہ کی تقدیم اور ''إیّاک'' کے تکرار کی وجہ

مذکورہ آیت میں ''اِیَّاکَ'' معمول اور ''نَعۡبُدُ، نَسۡتَعِیۡنُ'' عامل ہیں۔ اصول کے مطابق عامل مقدم اور معمول موخر ہوا کرتے ہیں، مگر جب کوئی خاص غرض مقصود ہو تو معمول کو عامل پر مقدم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی حصر واختصاص کی غرض سے معمول کو عامل پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ ❷ اس آیت میں بھی معمولات کو عاملوں پر مقدم کر کے عبادت اور استعانت (مدد طلب کرنے) کو اللہ کی ذات کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں ''اختصاص'' اور ''حصر'' پایا جاتا ہے۔ اختصاص اور حصر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اے اللہ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں کسی اور کی نہیں، اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں کسی اور سے نہیں''۔

اس آیت میں ''نَعۡبُد'' کیساتھ ''اِیَّاکَ'' ذکر کرنے کے بعد دوبارہ ''نَسۡتَعِیۡنُ'' فعل کیساتھ ''اِیَّاکَ'' کا اعادہ وتکرار ہوا ہے۔ یہاں دوسری مرتبہ ''اِیَّاکَ'' کا اعادہ وتکرار اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ عبادت اور استعانت دونوں علیحدہ علیحدہ ذاتی طور پر مقصودی شئی ہیں، ایسا نہیں کہ عبادت استعانت کو مستلزم ہو، یا استعانت عبادت کو مستلزم ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک ذاتی طور پر علیحدہ علیحدہ مقصود ہے۔

غائب سے خطاب کی طرف عدول کیوں کیا؟

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (١) اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (٤)﴾

❶ تفسير ابن كثير: سورة الفاتحة، ج١ ص١٢٨

❷ حصر واختصاص کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی شئی کیساتھ خاص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

یہاں دوسری آیت میں ''**التفات من الغيبة إلى الخطاب**'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں لفظِ ''لله'' اور لفظ ''رَبّ'' اللہ سبحانہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں، یہ دونوں اسم ظاہر ہیں، اور اسمِ ظاہر غائب کے درجے میں ہوتا ہے۔ ان دونوں غائب کے الفاظ کے لحاظ سے دوسری آیات میں ''اِیَّاکَ'' میں (کاف) خطاب کے بجائے ''اِیَّاہ'' بول کر غائب کی ضمیر لانا چاہیے تھی، تاکہ یہ آیت بھی پہلی آیت کے مطابق ہوجاتی، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ لائے گئے، اس سے واضح ہوا کہ اس دوسری آیت میں غائب سے خطاب کی طرف التفات ہوا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا کیونکہ یہ طریقہ نفوس اور قلوب پر زیادہ اثر کرتا ہے، اسی طرح عربوں کے اسلوب کے مطابق التفات زیادہ نشاط آور ہے۔ یہاں بھی لوگوں کو نشاط میں زیادتی دلانے کے لئے غائب سے خطاب کی طرف التفات ہوا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غائب سے خطاب کی طرف عدول اس لئے کیا کہ عرب والے عادتاً کلام میں تفنن کو پسند کرتے ہیں، یعنی مختلف اسالیبِ بیان سے کلام کو تعبیر کرنا اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہونا، اور اس انتقال کے دو فائدے ہیں:

۱......کلام میں جدت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ مقولہ ہے ''**كل جديد لذيذ**''

۲......سامع کو کلام سننے میں رغبت پیدا ہوتی ہے۔

علامہ جاراللہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

فإن قلت لم عدل عن لفظ الغيبة إلى لفظ الخطاب قلت هذا يسمى الالتفات في علم البيان قد يكون من الغيبة إلى الخطاب ومن الخطاب إلى

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو غائب کے الفاظ سے خطاب کے الفاظ کی طرف پھیر دیا جائے، یعنی کلام تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ ذکر کردیے جائیں۔

الغيبة ومن الغيبة إلى التكلم. ❶

ترجمہ: اگر یہ سوال کیا جائے کہ غائب سے خطاب کی طرف عدول کیوں کیا؟ میں کہتا ہوں اسے علم بیان کی اصطلاح میں ''التفات'' کہا جاتا ہے، اور یہ التفات کبھی غائب سے خطاب کی طرف، اور کبھی خطاب سے غائب کی طرف، اور غائب سے تکلم کی طرف ہوتا ہے۔

''إِيَّاكَ''، مفعول بہ کی تقدیم حصر اور اختصاص کے لئے ہے

نحوی قاعدے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ''إِيَّاكَ'' کو مؤخر ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ لفظ ''إِيَّاكَ'' ''نَعْبُدُ'' کا مفعول بہ ہے اور ظاہر ہے کہ معمول عامل سے مؤخر ہوتا ہے، لیکن یہاں ''إِيَّاكَ'' کو اس لئے مقدم کیا گیا تا کہ یہ حصر کے معنی پر دلالت کرے، کیونکہ قاعدہ ہے ''تقديم ما حقه التاخير يفيد الحصر والاختصاص'' نیز ''إِيَّاكَ'' سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں، لہٰذا تعظیم کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ باری تعالیٰ تمام کائنات کا مبداء ہے اور جب مبداء کائنات ہے تو وجود کے اعتبار سے مقدم ہوگا، لہٰذا ذکر میں بھی مقدم کردیا گیا تا کہ وجود ذکری وجود طبعی کے موافق ہوجائے، ''إِيَّاكَ'' کو مقدم کرکے عابد کو اس بات پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ اولاً اور بالذات نظر معبود پر ہونی چاہئے عبادت پر نہیں، ہاں معبود سے منتقل ہوکر عبادت کی طرف صرف اس حیثیت سے ہونی چاہئے کہ یہ ایک نسبت اور تعلق ہے جو ہمارے اور معبود کے درمیان ہے۔ اس تنبیہ کی وجہ یہ ہے کہ عارف کو درجہ وصول تک پہنچانا مقصود ہے اور وصول اس وقت متحقق ہوسکتا ہے جبکہ ذات باری تعالیٰ سے ملاحظہ میں بالکل استغراق ہوجائے اور اپنی اور دوسروں کی ذات واحوال سے بالکل بے خبر ہوجائے۔

علامہ جار اللہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

❶ الكشاف: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٥٦

تقديم المفعول لقصد الاختصاص. ❶

ترجمہ: مفعول کومقدم کرنا اختصاص اور حصر کی وجہ سے ہے۔

صیغہ ”نعبد“، جمع متکلم ذکر کرنے کی حکمت

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ھ) فرماتے ہیں:

لو قال إياک أعبد لكان ذلک تكبرًا ومعناه أني أنا العابد أما لما قال إياک نعبد كان معناه أني واحد من عبيدک، فالأول تكبر، والثاني تواضع، ومن تواضع لله رفعه الله. ❷

ترجمہ: اگر ”أَعْبُدُ“ فرماتے تو اس صورت میں معنی ہوتا: میں ہی اللہ رب العزت کی عبادت کرنے والا ہوں، تو اس میں تکبر کی آمیزش ہوتی، اس لئے ”نَعْبُدُ“ فرمایا کہ میں آپ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں اس میں تواضع ہے، اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقام عطا کرتے ہیں۔

”نَعْبُدُ“ جمع متکلم ذکر فرمایا اس کی حکمت یہ ہے کہ اپنی عبادت کو مؤحدین مؤمنین کی عبادت میں شامل کیا جائے۔ اپنی حاجت کو ان کی حاجت کے ساتھ ملایا جائے تاکہ ان کی عبادت وحاجت کی برکت سے ہماری بھی عبادت وحاجت قبول ہوجائے۔ وہ اس طور پر کہ جب تمام کی عبادتوں میں اپنی عبادت کو شامل کرکے دربارِ الٰہی میں پیش کرے گا یا تو اللہ تعالیٰ سب کو رد فرمائے گا یا سب کو قبول فرمائے گا اور یا بعض کو قبول فرمائے گا اور بعض کو رد کردے گا۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سب کو رد کردے، کیونکہ ان میں اللہ رب العزت کے ایسے برگزیدہ بندے بھی ہیں جن کی حاجات اور دعاؤں کو رد نہیں کیا جاسکتا، اور بعض کو رد فرمائیں

❶ الكشاف: سورة الفاتحة، ج١ ص٥٦

❷ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ص٢١٢

اور بعض کو قبول فرمائیں یہ بھی نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ یہ شان رحیمی وکریمی سے بعید ہے کہ اچھوں اور بروں میں امتیاز کر کے صرف نیکو کاروں کی عبادت کو قبول کیا جائے اور گناہ گاروں کی عبادت کو رد کیا جائے، اور یہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ بندے کو حکمِ شرعی ہے صَفقہ واحدہ کے تحت بائع نے دس کپڑوں کو فروخت کیا، اب ان میں سے بعض عیب دار نکلے تو اب مشتری کو یہ حق نہیں کہ عیب دار کو واپس کرے اور صحیح کو اپنے پاس رکھے، کیونکہ صفقہ واحدہ کے تحت بیع ہوئی ہے یا تو سب کو خریدے یا سب کو چھوڑ دے۔تو پھر ذات باری تعالیٰ جو کہ اکرم الاکرمین ہے، جود وسخا کا خزینہ ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اس طرح امتیاز کی نظر ڈال سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، اگر چہ وہ قادر اس پر بھی ہے، پس جب دونوں شقیں باطل ہوگئیں تو ساری دعاؤں کا قبول ہونا ثابت ہوگیا، پس جب بندہ ''إِيَّاكَ نَعْبُدُ و إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کہتا ہے کہ خدایا میری عبادت انتہائی ناقص ہے، جس طرح عبادت کا حق تھا اس طرح مجھ سے نہ ہوسکی، مگر میں نے اپنی عبادت کو تیرے پیارے بندوں کی عبادت میں شامل کردیا۔آپ کی شانِ رحیمی سے یہ بات بہت بعید ہے کہ تو ہماری عبادت کے نقص پر نظر ڈالے بلکہ تو ان اولیاء وصالحین کے طفیل ہماری عبادات کو بھی قبول فرما۔اسی نکتہ کی وجہ سے جماعت کے ساتھ نماز کو مشروع کیا گیا تا کہ بندے اکھٹے ہوکر عبادت ودُعا کریں اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ٦٨٥ھ) فرماتے ہیں:

أدرج عبادته في تضاعيف عباداتهم و خلط حاجته بحاجتهم لعلها تقبل ببركتها ويجاب إليها ولهذا شرعت الجماعة. (1)

ترجمہ: قاری (پڑھنے والے) نے اپنی عبادت کو دوسرے مؤمنین کی عبادتوں کے

(1) التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٣٦

ساتھ شامل کیا اور اپنی حاجت کو ان کی حاجت کے ساتھ ملا دیا شاید کہ اس کی عبادت ان کی عبادت کی برکت کی وجہ سے قبول ہو جائے اور ان کی حاجات کے ساتھ اس کی حاجت بھی پوری کر دی جائے، اور اسی حکمت کے پیش نظر نماز باجماعت مشروع ہوئی۔

حمد میں ''للّٰہ'' کی تاخیر اور ''إِیَّاکَ'' کی تقدیم میں کیا حکمت ہے؟

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ ھ) فرماتے ہیں:

والنكتة أن الحمد لما جاز لغير اللّٰه في ظاهر الأمر كما جاز للّٰه، لا جرم حسن تقدم الحمد أما ههنا فالعبادة لما لم تجز لغير اللّٰه لا جرم قدم قوله إياك على نعبد. ❶

ترجمہ: کسی شخص کی خوبیوں پر اس کی تعریف کرنا جائز ہے لیکن غیر اللہ کے لئے عبادت کرنا بالکل جائز نہیں ہے، تو ''إِیَّـاکَ'' کو مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ عبادت غیر اللہ کے لئے بالکل جائز نہیں، اسی وجہ سے معمول کو عامل پر مقدم کیا، جبکہ مدح دوسرے کے لئے جائز ہے اسی وجہ سے وہاں معمول کو مؤخر کیا۔

عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے کی دس اہم وجوہات

١......عبادت کو استعانت پر مقدم کر کے اس بات کو بتلانا ہے کہ سائل کو سوال کرنے سے پہلے مسؤول عنہ کے پاس کوئی وسیلہ یعنی ایسی چیز جس سے مسؤول عنہ خوش ہو، مثلاً ہدیہ، ثناء وغیرہ بھیجنا چاہئے کیونکہ تحفے کو پہلے بھیجنا اپنی مراد کی مقبولیت کے واسطے زیادہ داعی ہے، یہاں پر عبادت وسیلہ ہے اور استعانت سوال ہے اور وسیلہ کو سوال پر مقدم کیا جاتا ہے، لہٰذا اسی وجہ سے عبادت کو استعانت پر مقدم کیا گیا ہے۔

٢......عبادت اور استعانت سے نہ تو باری تعالیٰ کا معبود ہونا ظاہر کرنا ہے اور نہ

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج١ ص٢١٢

مستعان ہونا ظاہر کرنا ہے، بلکہ اپنی تذلل اور خاکساری کو ظاہر کرنا ہے اور صورت اس تذلل کی بندے نے یہ اختیار کی کہ عبادت کی نسبت اپنی طرف کر کے اپنے آپ کو عابد اور اللہ رب العزت کو معبود بنایا۔ اب اس سے بندے کے دل میں یہ وہم ہوسکتا تھا کہ میں نے عبادت جیسی بڑی چیز کو بارگاہ الٰہی میں پیش کیا اور اس کی وجہ سے میں بڑے انعام کا مستحق ہوگیا گویا اس قسم کا تکبر دل میں آسکتا تھا، تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے بعد میں فرمایا "إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" کہ عبادت بھی ہماری مدد سے ہے، یعنی عبادت بھی بغیر معونت باری تعالیٰ کے مکمل نہیں ہوسکتی، پس اسی نکتے کی وجہ سے عبادت کو استعانت پر مقدم کیا۔

۳...... عبادت امانت ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا. (الأحزاب: ۷۲)

ترجمہ: ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کا بوجھ اُٹھالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم، بڑا نادان ہے۔

تو اس مہتم بالشان عمل کی ادائیگی کے لئے اس کو مقدم کیا گیا۔

۴...... عبادت کے ذریعے جس قدر اللہ رب العزت کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور انسان اللہ رب العزت کے قریب ہوتا ہے استعانت میں اس طرح نہیں ہے۔

۵...... عبادت اللہ رب العزت کو مطلوب ہے جبکہ استعانت بندے کو مطلوب ہے، تو بندے کو چاہئے کہ اس چیز کو مقدم کرے جو ذاتِ باری تعالیٰ کو مطلوب ہو وہ عبادت ہے۔

۶..... عبادت انسان پر ہمیشہ لازم ہے کبھی اس سے سبکدوشی نہیں ہر حال میں اس کی ادائیگی ضروری ہے، جیسے نماز کہ کسی صورت میں اس کا چھوڑنا جائز نہیں، اگر کھڑے ہوکر نماز

پڑھنے پر قادر نہیں تو بیٹھ کر نماز پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی نماز ادا کرنے کی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھنے کا حکم ہے۔ لہٰذا عبادت کی ادائیگی ضروری ہے اور عبادت ہی کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کو پیدا کیا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاريات: ٥٦)

ترجمہ: اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

۷......عبادت کی یومِ جزاء کے ساتھ خصوصی مناسبت ہے، اسی وجہ سے اس کو یوم الجزاء کے فوراً بعد ذکر کیا، پہلے شرک وبدعت سے خلاصی کے لئے توحید اور عبادت ہے، پھر رسوخ کے لئے استعانت ہے۔

۸......سالکین کے مقام کی انتہا "إِيَّاكَ نَعْبُدُ" پر ہوتی ہے، اس کے بعد اس پر تمکین طلب کی جاتی ہے "إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" کے ذریعے۔

۹......اسلام نے ابتداء عبادت کا حکم دیا ہے استعانت کا حکم بعد الرسوخ ہے۔

۱۰......عبادت کو استعانت پر اس لئے مقدم کیا تاکہ رؤس آیات کی موافقت ہو جائے۔ رؤس آیات کہتے ہیں آیت کے ان آخری حروف کو جو ایک خاص کیفیت کے ساتھ متصف ہوں، اور یہاں خاص کیفیت آخری حرف سے پہلے "یاء" کا ساکن ہونا ہے، اگر عبادت کو مؤخر کرتے اور استعانت کو مقدم کرتے تو آیات کے درمیان جو تسلسل اور روانی ہے وہ باقی نہ رہتی، اسی وجہ سے عبادت کو استعانت پر مقدم کیا۔ [1]

لفظ "إِيَّاكَ" کو مکرر کیوں ذکر فرمایا؟

لفظ "إِيَّاكَ" کو مکرر اس لئے ذکر فرمایا تاکہ اس بات کی تصریح ہو جائے کہ جس طرح

[1] روح المعاني: سورة الفاتحة، ج٢ ص١١٩ / تفسير أبي السعود: سورة الفاتحة، ج١ ص٢٦ / التحرير والتنوير: سورة الفاتحة، ج١ ص١٨٦

ذاتِ باری تعالیٰ مستقلاً معبود ہے اسی طرح مستقلاً مستعان بھی ہے، کیونکہ اگر حرفِ واو کے ذریعے ذکر کرتے تو یہ وہم ہوسکتا تھا کہ معبود اور مستعان کا مجموعہ تو ذاتِ باری تعالیٰ پر منحصر ہے، لیکن ہر ایک تنہا تنہا ذاتِ باری تعالیٰ پر منحصر نہیں بلکہ غیر کے اندر بھی پایا جا سکتا ہے، تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے لفظ "إِيَّاكَ" کو مکرر ذکر فرمایا اور بتلا دیا کہ جس طرح مجموعہ ذات باری تعالیٰ پر منحصر ہے، اسی طرح تنہا تنہا عبادت اور استعانت بھی ذات باری تعالیٰ پر منحصر ہے، تو ضمیر کو مکرر لا کر اس بات کی وضاحت کردی کہ اللہ رب العزت ہی مستعان ہے:

وكرر الضمير للتنصيص على أنه المستعان به لا غير. ❶

وتكرير الضمير المنصوب للتنصيص على تخصيصه تعالى بكل واحدة من العبادة والإستعانة ولإبراز الاستلذاذ بالمناجاة والخطاب. ❷

"إِيَّاكَ نَعْبُدُ" میں حصر حقیقی ہے اور "إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" میں حصر ادعائی ہے

علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ "إِيَّاكَ نَعْبُدُ" میں حصر حقیقی ہے جبکہ "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" میں حصر ادعائی ہے:

فالحصر في إِيَّاكَ نَعْبُدُ حقيقي والقصر في إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ادعائي. ❸

"نَسْتَعِينُ" کی صرفی تحقیق

علامہ قرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

وأصل نستعين نستعون، قلبت حركة الواو إلى العين فصارت ياء،

❶التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج۱ ص۳۷

❷تفسير أبي السعود: سورة الفاتحة، ج۱ ص۲۶

❸التحرير والتنوير: سورة الفاتحة، ج۱ ص۱۸۶

والمصدر استعانة. ❶

"نَسْتَعِیْنُ" اصل میں "نَسْتَعْوِنُ" تھا واو کی حرکت عین کو منتقل کر دی گئی اور واو کو یاء سے بدل دیا، اس کا مصدر "استعانة" ہے۔

استعانت کا مفہوم

۱.....مافوق الاسباب ۲.....ماتحت الاسباب

۱......مافوق الاسباب کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ اسباب کی چیزوں سے قطع نظر کر کے اگر کسی کو نفع یا نقصان پہنچے تو وہ صرف اللہ رب العزت ہی کی طرف سے ہوگا، مثلاً: اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کو زہر دے کر مار دیا یا تلوار یا بندوق سے اسے قتل کر دیا یا دریا میں ڈبو دیا، یا آگ میں جھونک دیا اور وہ مر گیا تو یہ کہا جائے گا کہ یہ عالمِ اسباب کے ماتحت ہوا، اسی طرح بھوکے کو کھانا کھلانا یا پیاسے کو پانی دے دینا یا بیمار کو دوائی دے دینا اور اس کی بظاہر مایوس کن حالت سنور گئی تو یہی کہا جائے گا کہ سلسلہ اسباب ومسببات کے مطابق ہوا ہے، مگر ان تمام تر چیزوں کی عدم موجودگی میں جب کوئی بظاہر سبب نظر نہ آتا ہو اور ہم دیکھیں کہ کسی کو نفع یا نقصان ہو رہا ہے یا ہم اپنی تدبیر کے موافق منافع اور سود مند چیزیں ہی استعمال اور اختیار کرتے ہیں، لیکن وہ تمام ہمارے خلاف واقع ہو تو یہ کہا جائے گا کہ یہاں ایک ایسی زبردست قدرت کا ہاتھ ہے جس کے سامنے کسی کا بس وچارہ نہیں اور یہ معاملہ مافوق الاسباب ہوگا۔

۲......ماتحت الاسباب استعانت کا جواز شرعی نصوص سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی زندہ کے پاس موجود شخص سے ایسی چیز کی طلب کرے جو عادتاً اس کے بس اور اختیار میں ہو اس کو ماتحت الاسباب یا ظاہری استعانت کہا جاتا ہے، اور اس کے جواز

❶تفسير القرطبي: سورة الفاتحة، الباب الرابع، ج١ ص١٩١

میں کوئی کلام نہیں جیسے سورہ مائدہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدۃ: ۲)

ترجمہ: نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔

اللہ تعالیٰ نے لفظِ صراط کیوں فرمایا لفظ سبیل یا طریق کیوں نہیں فرمایا؟

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ ھ) فرماتے ہیں:

وإنما قال الصراط ولم يقل السبيل ولا الطريق وإن كان الكل واحدا ليكون لفظ الصراط مذكرا لصراط جهنم فيكون الإنسان على مزيد خوف وخشية. ❶

ترجمہ: لفظ صراط فرمایا ''سبیل'' یا ''طریق'' نہیں فرمایا اگرچہ سب کا معنی ایک ہے، (لیکن اس لفظ کے اختیار کرنے میں حکمت یہ ہے کہ) یہ پُلِ صراط کی یاد دہانی کرواتا ہے (کہ ہر انسان نے اس سے گزرنا ہے) تو اس سے مزید خوف اور ڈر پیدا ہوتا ہے۔

وللتذكير بذلك الصراط لم يقل السبيل ولا الطريق وإن كان الكل واحدا. ❷

ہدایت کا لغوی و اصطلاحی معنیٰ

علامہ ابن عطیہ اندلسی رحمہ اللہ (متوفی ۵۴۶ ھ) ہدایت کا لغوی معنیٰ بیان فرماتے ہیں:

والهداية في اللغة الإرشاد. ❸

ترجمہ: ہدایت لغت میں رہنمائی کرنے کو کہتے ہیں۔

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج١ ص٢١٩

❷ روح المعاني: سورة الفاتحة، ج١ ص١٢٥

❸ المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز: سورة الفاتحة، ج١ ص١٦

علامہ محمد طاہر ابن عاشور رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ) ہدایت کا اصطلاحی معنی بیان فرماتے ہیں:

والهداية في اصطلاح الشرع حين تسند إلى الله تعالى هي الدلالة على ما يرضي الله من فعل الخير ويقابلها الضلالة. ❶

ترجمہ: ہدایت شرع کی اصطلاح میں منسوب ہوتی ہے اللہ تعالی کی طرف، ہدایت کہتے ہیں کسی کی ایسے خیر کے کام کی طرف رہنمائی کرنا جو اللہ تعالی کو پسند ہو، اور اس ہدایت کا مقابل ضلالت (گمراہی) ہے۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

والهداية دلالة بلطف ولذلك تستعمل في الخير. ❷

ترجمہ: ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں اسی وجہ سے یہ لفظ خیر کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔

آیت میں استعارہ تصریحیہ اصلیہ پایا جاتا ہے

﴿اِهْدِ نَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵)﴾

ترجمہ: ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔

مذکورہ آیت میں "**استعارة تصريحية أصلية**" پایا جاتا ہے۔ ❸ یہاں دین اسلام کو حسی شعوری راستہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں دین اسلام "مشبہ" اور حسی راستہ "مشبہ بہ" ہے۔ ان دونوں میں وجہ شبہ وصول مقصود ہے، یعنی جس طرح راستہ پر چل کر

❶ التحرير والتنوير: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۱۸۸

❷ التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۳۸

❸ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

انسان منزل مقصود تک پہنچتا ہے، بالکل اسی طرح دین اسلام پر عمل پیرا ہو کر انسان کامیابی کے عروج پر چڑھ سکتا ہے۔اس میں چونکہ ''الصراط المستقيم'' بول کر صراحت کے ساتھ لفظوں میں ''مشبہ بہ'' کو ذکر کردیا گیا ہے۔اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔اسی طرح آیت میں ''استعارة أصلية'' بھی پایا جاتا ہے۔❶ یہاں چونکہ لفظ ''الصِّرَاطَ'' غیر مشتق ہے اوراس میں استعارہ واقع ہوا ہے۔اس لئے آیت میں ''استعارة أصلية'' پایا جاتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ''اِهْدِ'' فعلِ امر ہے۔فعل امر درحقیقت خود کو بڑا سمجھ کر کسی سے کسی کام کرنے کو طلب کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے،لیکن کبھی کبھی فعلِ امر اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے معانی کے لئے بھی فعلِ امر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی ''اِهْدِ''،فعل امر اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ اس سے صراطِ مستقیم پر دوام اور استمرار کی دعا کرنا مراد لیا گیا ہے۔آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ہمیں سیدھے راستہ پر ثابت قدمی اور استقامت نصیب فرمائے۔

صراط اس راستے کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں پائی جائیں

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں صراط اصل میں اس راستے کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں پائی جائیں۔

۱...مستقیم یعنی سیدھا ہو۔ ۲...موصل الی المقصود ہو یعنی مقصد تک پہنچانے والا ہو۔ ۳...سب سے زیادہ قریب اور نزدیک ہو۔۴...وسیع اور کشادہ ہو۔۵...اور مقصد تک پہنچنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔

جس راستے میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں اس کو صراط کہتے ہیں، جب تک یہ

❶ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جو غیر مشتقات میں واقع ہو۔

پانچ باتیں نہ پائی جائیں اس وقت تک اس پر صراط کا اطلاق نہیں ہوگا۔ ❶

صراط مستقیم کی دعا صرف اللہ تعالیٰ سے کیوں کی جاتی ہے؟

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كأن الإنسان يقول في الطريق: كثرة الأحباب يجرونني إلى طريق، والأعداء إلى طريق ثانٍ، والشيطان إلى طريق ثالث، وكذا القول في الشهوة والغضب والحسد، وكذا القول في التعطيل والتشبيه والجبر والقدر والإرجاء والوعيد والرفض والخروج، والعقل ضعيف، والعمر قصير، والصناعة طويلة، والتجربة خطرة، وقد تحيرت في الكل فاهدني إلى طريق أخرج منه إلى الجنة. ❷

ترجمہ: انسان کے سامنے مختلف راستے ہوتے ہیں، اب دوست واحباب ایک راستے کی طرف لے جاتے ہیں، اعداء دوسرے راستے کی طرف لے جاتے ہیں، شیطان تیسرے راستے کی طرف کھینچتا ہے، ایک طرف تمام باطل فرقے اپنی راہ پر لے جاتے ہیں، اب انسان متحیر وپریشان ہوجاتا ہے کہ کس راہ پر جائے، کونسا راستہ منزل مقصود تک پہنچانے والا ہے، ان راہوں میں کس راہ کا انتخاب کیا جائے؟ جب کہ عمر قلیل ہے، عقل کمزور ہے، تجربہ ناقص ہے، اب اسی پریشانی کے عالم میں انسان کہتا ہے اے میرے رب! تو ہی صراط مستقیم کی طرف میری رہنمائی فرما، اوراس راہ کی طرف جو مجھے جنت کی طرف لے جائے۔

اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کو دو صفات کے ساتھ متصف کیا ہے

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ ھ) فرماتے ہیں:

❶ معارف القرآن کاندھلوی: سورۂ فاتحہ، ج ا ص ۲۵

❷ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج ۱ ص ۲۱۸

أن ذلک الصراط المستقیم وصفه بصفتین أولاهما إیجابیة، والأخری سلبیة أما الإیجابیة فکون ذلک الصراط صراط الذین أنعمت اللّٰہ علیهم وأما السلبیة فهي أن تکون بخلاف صراط الذین فسدت قواهم العملیة بارتکاب الشهوات حتی استوجبوا غضب اللّٰه علیهم. ❶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کو دو وصفات کے ساتھ متصف فرمایا۔ ایک صفت ایجابی اور دوسری صفت سلبی ہے۔ ”صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ“ میں ایجابی صفت کا ذکر ہے، کہ اے اللہ ہمیں منعم علیہم کی راہ پر چلا ”غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ“ میں سلبی صفت کا ذکر کیا کہ مولائے کریم ہمیں ان کی راہ سے بچا جنہوں نے شہوات کا ارتکاب کر کے اپنی قوتِ عملی کو فاسد کر دیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو اپنے اوپر واجب کر دیا۔

آیتِ کریمہ سے شیخِ کامل کی اقتداء کا ثبوت

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

قال بعضهم: إنه لما قال: اهدنا الصراط المستقیم لم یقتصر علیه، بل قال: صِرَاطَ الَّذِیْنَ أَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ وهذا یدل علی أن المرید لا سبیل له إلی الوصول إلا إذا اقتدی بشیخ یهدیه إلی سواء السبیل. ❷

ترجمہ: بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ”اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ“ پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ آگے ”صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ“ کو بھی ذکر فرمایا۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی کہ کسی شیخ کامل کی اقتداء کی جائے جو اپنے مرید کی صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرے۔

❶ التفسیر الکبیر: سورة الفاتحة، الباب الثالث، ج١ ص١٦٤

❷ التفسیر الکبیر: سورة الفاتحة، الباب الثالث، ج١ ص١٦٤

انعام کو مطلق ذکر کیوں کیا؟

"أَنْعَمْتَ" میں انعام کو مطلق اس لئے ذکر کیا تا کہ یہ اپنے عموم پر باقی رہے اور اللہ تعالی کی تمام نعمتوں کو شامل ہو، اس لئے کہ اگر تخصیص کرتے تو نعمت ایک خاص فرد میں منحصر ہو جاتی، اسی وجہ سے اس کو مطلق ذکر کیا تا کہ یہ اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہو۔

علامہ جاراللہ زمخشری رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۸ھ) فرماتے ہیں:

وأطلق الإنعام ليشمل كل إنعام لأن من أنعم عليه بنعمة الاسلام لم تبق نعمة الا أصابته. ❶

ترجمہ: (اللہ تعالی نے "أَنْـعَـمْـتَ" میں) انعام کو مطلق ذکر کیا ہے تا کہ یہ تمام انعامات کو شامل ہو جائے، اس لئے کہ جس پر اللہ تعالی نے دین اسلام کی صورت میں انعام کیا تو اب کوئی نعمت باقی نہیں رہی مگر یہ کہ اس کو پہنچ گئی۔

آیت میں ایجاز بالحذف اور ایضاح بعد الابہام پایا جاتا ہے

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۵) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۶)﴾

ترجمہ: ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے، اور نہ ان کے راستے پر جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس سورت کی پہلی آیت میں "**ایجاز بالحذف**" پایا جاتا ہے۔ ❷ مذکورہ آیت میں حذف کہاں واقع ہوا ہے؟ اس بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض اہل علم فرماتے

❶ الكشاف: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۵۸

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام سے کوئی جملہ، کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے، جو کلام کے مفہوم و مراد کو سمجھنے میں مخل نہ ہو، اس کے ساتھ ساتھ کلام میں کوئی ایسا قرینہ بھی موجود ہو جو محذوف کو متعین کر دے۔

ہیں کہ یہاں ''اَلْحَمْدَ'' منصوب ہے، ان کے کہنے کے مطابق لفظِ ''اَلْحَمْدُ'' سے پہلے عامل کو حذف کر دیا گیا ہے، جو یا تو ''اُذْکُرُوا الْحَمْدَ'' ہے، یا ''اِقْرَوُا الْحَمْدَ'' ہے، گویا ''اَلْحَمْدَ'' کو منصوب فرض کرنے کی صورت میں ''اُذْکُرُوا'' یا ''اِقْرَوُا'' کا جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''ایجاز حذف'' واقع ہوا ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ ''اَلْحَمْدُ'' مرفوع مبتداء ہے۔ ان کے قول کے مطابق ''اَلْحَمْدُ'' مبتداء کے بعد خبر محذوف ہے، جو یا تو لفظِ ''کَائِنٌ'' ہے، یا لفظِ ''مُسْتَقِرٌّ'' واقع ہے۔ اصل عبارت ''اَلْحَمْدُ کَائِنٌ لِلّٰه'' یا ''اَلْحَمْدُ مُسْتَقِرٌّ لِلّٰه'' ہے، آیت سے ''کَائِن یا مُسْتَقِرٌّ'' حذف کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی واضح ہوا کہ آیت میں ''ایجاز بالحذف'' واقع ہوا ہے۔ آیت نمبر ۶ میں بھی ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔ یہ اصل میں ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِم...... صِرَاطَ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَصِرَاطَ الضَّآلِّیْن'' تھا۔ اس جملہ میں ''غَیْرِ الْمَغْضُوْب'' اور ''غَیْرِ الضَّآلِّیْن'' سے پہلے کلمہ ''صِرَاط'' مقدر نکالا گیا ہے جو آیت میں مذکور ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں ''ایجاز حذف'' واقع ہوا ہے۔ اور یہاں لفظِ ''صِرَاط'' کے محذوف ہونے پر قرینہ آیت کے شروع میں موجود لفظِ ''صِرَاط'' ہے، جو دوسرے کلمہ ''صِرَاط'' کے محذوف ہونے کی تعیین کرتا ہے۔

مذکورہ مقام میں ''الإیضاح بعد الابہام'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں آیت نمبر (۵) میں سیدھے راستہ پر ثابت قدمی کی دعا مانگی گئی ہے، مگر سیدھا راستہ کونسا ہے؟ اس بات کو مخفی اور مبہم رکھا گیا۔ اگلی آیت میں اس مبہم کی وضاحت ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِم'' سے کر دی گئی کہ سیدھے راستہ سے مراد ان نیک پارساں لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ سبحانہ

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کسی بات کو مبہم اور غیر واضح طور پر بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد مذکورہ ابہام کی وضاحت اور تفصیل بیان کر دی جائے، تا کہ کلام کا مفہوم قلب وجگر اور دل ودماغ میں اچھی طرح بیٹھ جائیے اور سامع پر کلام کا اثر تیزی سے ہو۔

کا خصوصی انعام اور فضل رہا۔ یہ انداز اس لئے اپنایا گیا تاکہ آیت کا مفہوم پختہ طور پر سامع کے دل و دماغ میں نقش ہو جائے۔ اس تقریر سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں ''الإیضاح بعد الابھام'' پایا جاتا ہے۔

مذکورہ آیت میں بہت اچھا انداز اور اسلوب اپنایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں ''اَنْعَمْتَ'' فعل کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف تو کر دی گئی ہے مگر ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ'' میں غضب کے فاعل کو مجہول چھوڑا گیا ''اَنْعَمْتَ'' کی طرح ''غَیْرَالَّذِیْنَ غَضِبْتَ عَلَیْهِمْ'' بول کر اللہ سبحانہ کی طرف غضب کی نسبت نہیں کی گئی، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس بات کی تعلیم دی جاسکے کہ لوگوں کو ہمیشہ اللہ سبحانہ کے بارے میں ادب کا پہلو اختیار کرنا چاہیے، یعنی جب کبھی خیر کا کام ہو تو اس کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف کر دی جائے اور جب شر کی بات آئے تو اسے اللہ سبحانہ کی طرف منسوب نہ کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر کیا ہے۔

انعام میں نسبت اللہ رب العزت کی طرف ہے جبکہ غضب اور ضلالت میں نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہیں کی گئی، اس میں کیا حکمت ہے؟

آداب میں سے ہے کہ خیر کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف کی جائے اور شر کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہ کی جائے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام خیر کے کاموں کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی، کہ میرا رب وہ جس نے مجھے پیدا کیا، اور راہ حق کی طرف میری رہنمائی کی، وہی مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے، لیکن آگے فرمایا: جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو میرا رب مجھے شفاء دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہیں کی، بلکہ اپنی طرف کی جبکہ شفاء کی نسبت اللہ عز وجل کی طرف کی۔ اسی طرح جنات نے جب قرآن سنا تو انہوں نے خیر کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی، لیکن شر کی نسبت اللہ سبحانہ

وتعالی کی طرف نہیں کی۔ تو اسی طرح اس آیت میں بھی ''أَنْـعَـمْـتَ''، میں خیر کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف کی گئی، جب کہ غضب اور ضلالت کی نسبت اللہ تعالی کی طرف نہیں کی گئی۔

علامہ صابونی نے اصول نقل کیا ہے کہ ''الخیر کله بیدیک و الشر لا ینسب إلیک'' خیر سب کی سب آپ کی طرف سے ہے، اور شر کی نسبت آپ کی طرف نہیں کی جائے گی۔

قرآنِ کریم کا یہ معلوم ومعروف اندازِ بیان ہے کہ خیر واحسان اور جود وکرم کے افعال کو صراحتاً براہ راست اللہ رب العزت کی طرف منسوب کرتا ہے اور جزا اور انتقام کے افعال کے لئے فاعل کو ذکر کئے بغیر صیغہ مجہول لاتا ہے، ادب واحترام کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہی اسلوب اس آیت میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ فعلِ انعام کی نسبت صراحتاً اللہ تعالی کی طرف کی گئی ہے اور غضب کے بیان میں فاعل کو ذکر نہیں کیا گیا۔ چند قرآنی شواہد ملاحظہ ہوں:

۱.....حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

الَّـذِی خَـلَقَنِی فَهُوَ یَهْدِینِ وَالَّذِی هُوَ یُطْعِمُنِی وَیَسْقِینِ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِینِ. (الشعراء:۷۸ تا ۸۰)

ترجمہ: وہ ذات جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو ہدایت دیتا ہے اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور سیراب کرتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے۔

ان آیات میں پیدا کرنے اور ہدایت دینے اور کھلانے پلانے کی نسبت حضرت خلیل علیہ السلام نے اللہ تعالی کی طرف کی ہے، اور بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا۔ ''مَرِضْتُ'' کہا ''اَمْرَضَنِی'' نہیں کہا یعنی وہ مجھ کو بیمار کرتا ہے۔

مؤمنین جنات کا قول قرآن نے یوں نقل کیا ہے:

وَاَنَّا لَا نَدْرِی اَشَرٌّ اُرِیدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا. (الجن:۱۰)

ترجمہ: اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ بھلائی چاہی ہے۔

یہاں ارادۂ رشد (بھلائی) کے فاعل کو صراحتاً بیان کیا گیا ہے، لیکن ارادہ شر کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہیں کی گئی۔

۳..... حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا. (الکهف: ۷۹)

ترجمہ: میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار بنادوں۔

یہاں کشتی کو عیب دار کرنے کی خواہش کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، لیکن آگے چل کر یتیم بچوں کے قصہ میں فعلِ خیر کے ارادہ کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف کی ہے:

فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنْ یَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَیَسْتَخْرِجَا کَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ. (الکهف: ۸۲)

ترجمہ: پھر تیرے رب نے چاہا کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، تیرے رب کی رحمت کی بنا پر ایسا ہوا۔

۴..... اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَائِکُمْ. (البقرة: ۱۸۷)

ترجمہ: تمہارے لئے حلال کردیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔

''اُحِلَّ'' بصیغہ مجہول اس لئے لایا گیا ہے کہ رفث (جماع) کے ساتھ فاعل کی تصریح مناسب نہ تھی، لیکن اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ. (البقرة: ۲۷۵) یہاں اس قسم کی قباحت نہ تھی۔ (۱)

علامہ قاضی ابوالسعود محمد بن محمد رحمہ اللہ (متوفی ۹۸۲ھ) فرماتے ہیں:

(۱) بدائع التفسیر: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۷۱

والعدول عن إسناد الغضب إليه تعالى كالإنعام جرى على منهاج الآداب التنزيلية في نسبة النعم والخيرات إليه عز وجل دون إضدادها كما في قوله تعالى الذي خلقني فهو يهدين والذي هو يطعمني ويسقين وإذا مرضت فهو يشفين وقوله تعالى وإنا لا ندري أشر أريد بمن في الأرض أم أراد بهم ربهم رشدا. ❶

ترجمہ: غضب کی نسبت اللہ تعالی کی طرف نہیں کی گئی جس طرح کہ انعام کی نسبت کی گئی ہے، یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالی نے جو آداب بیان کئے ہیں ان میں انعامات اور بھلائیوں کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف ہے، جبکہ ان کی اضداد کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: (میرا رب وہ ہے) جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے، اور جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالی کا فرمان ہے، (جب جنات نے کہا) ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا زمین والوں سے کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اُن کے پروردگار نے ان کو راہِ راست دکھانے کا ارادہ فرمایا ہے۔

علامہ محمد علی صابونی فرماتے ہیں:

نسب النعمة إلى اللّٰه عز وجل انعمت عليهم ولم ينسب إليه الإضلال والغضب فلم يقل غضبت عليهم أو الذين أضللتهم وذلك ليعلم العباد الأدب مع اللّٰه فالشر لا ينسب إلى اللّٰه تعالى وإن كان منه تقديرا الخير كله بيديك والشر لا ينسب إليك. ❷

ترجمہ: ''أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' میں نعمت کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی گئی ہے جب

❶ تفسير أبي السعود: سورة الفاتحة، ج١ ص٢٩

❷ صفوة التفاسير: سورة الفاتحة، ج١ ص٢١

کہ اضلال اور غضب کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف نہیں کی گئی، پس یہ نہیں کہا ''غَضَبْتَ عَلَيْهِمْ'' یا ''الَّذِيْنَ أَضْلَلْتَهُمْ ''جن پر آپ نے غضب کیا، یا وہ جن کو آپ نے گمراہ کیا، یہ اس وجہ سے تاکہ بندوں کو اللہ تعالی کے متعلق آداب سکھائے جائیں، پس شر کی نسبت اللہ تعالی کی طرف نہیں کی جائے گی اگر چہ شر اللہ رب العزت ہی کی جانب سے ہے، تمام خیر کے کاموں کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی جائے گی اور شر کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی جائے گی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا ثبوت

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ (متوفی ٦٠٦ھ) فرماتے ہیں:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ يدل على إمامة أبي بكر رضي الله عنه لأنا ذكرنا أن تقدير الآية: إهدنا صراط الذين أنعمت عليهم والله تعالى قد بين في آية أخرى أن الذين أنعم الله عليهم من هم فقال: فأولئك مع الذين أَنْعَمَ اللّه عَلَيْهِم من النبيين والصديقين الآية ولا شك أن رأس الصديقين ورئيسهم أبو بكر الصديق رضي الله عنه فكان معنى الآية أن الله أمرنا أن نطلب الهداية التي كان عليها أبو بكر الصديق وسائر الصديقين، ولو كان أبو بكر ظالماً لما جاز الاقتداء به، فثبت بما ذكرناه دلالة هذه الآية على إمامة أبي بكر رضي الله عنه. ❶

ترجمہ: یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہے، منعم علیہم سے مراد کون ہیں؟ تو قرآن کریم نے اس کی تعیین کردی کہ اس سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام

❶ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج١ ص ٢٢١

صدیقین کے سردار اور رئیس ہیں۔ پس آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اللہ سے وہ ہدایت طلب کریں جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صدیقین تھے۔ اگر حضرت ابوبکر صدیق ظالم ہوتے تو ان کی اقتداء جائز نہ ہوتی، پس اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت ہوئی۔

علامہ محمد امین بن محمد شنقیطی رحمۃ اللہ عنہ (متوفی ۱۳۹۳ھ) فرماتے ہیں:

يؤخذ من هذه الآية الكريمة صحة إمامة أبي بكر الصديق رضي الله عنه وقد بين الذين أنعم عليهم فعد منهم الصديقين. وقد بين صلى الله عليه وسلم أن أبا بكر رضي الله عنه من الصديقين، فاتضح أنه داخل في الذين أنعم الله عليهم، الذين أمرنا الله أن نسأله الهداية إلى صراطهم فلم يبق لبس في أن أبا بكر الصديق رضي الله عنه على الصراط المستقيم، وأن إمامته حق. ❶

ترجمہ: اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کو لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ جماعتوں کو بیان کیا، اور ان میں صدیقین کو بھی شمار کیا، تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیقین میں سے ہیں، پس اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ بھی انعام یافتہ جماعتوں میں شامل ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ان کے طریقے کے مطابق ہدایت کا سوال کریں، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کے صراطِ مستقیم پر ہونے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی امامت برحق ہے۔

غضب کی تعریف

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

❶ أضواء البيان في ايضاح القرآن بالقرآن: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٤٣

الغضب: تغير يحصل عند غليان دم القلب لشهوة الانتقام. ❷

ترجمہ: غضب اس تبدیلی کو کہتے ہیں جو بدن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انتقام کے ارادے سے دل کا خون جوش مارے۔

غضب کی نسبت جب اللہ رب العزت کی طرف ہوتو غایت وانتہاء مراد ہوتی ہے

لفظ غضب کا معنی حقیقی کا اعتبار کرتے ہوئے ذات باری تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کرنا درست نہیں، اس لئے کہ غضب معنی حقیقی کے اعتبار سے قلب اور دم کا تقاضہ کرتا ہے، اور ذات باری تعالیٰ ان سے منزہ ہے۔ اسی طرح غلیان جس کے معنی جوش مارنے کے ہیں یہ از قبیل انفعال کے ہے اور ذات باری تعالیٰ فاعل ہے منفعل نہیں۔ پس جب غضب کو ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو غضب سے مراد غایت اور منتہاء یعنی سزا اور عذاب ہوگا۔ سزا اور عذاب از قبیلِ افعال ہے انفعال نہیں۔ پس اس صورت میں ترجمہ ہوگا: وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اور اس کی سزا کے مستحق ہوئے، پس انفعال کا اشکال ختم ہوگیا۔ نیز قلب اور دم کا سوال بھی نہ رہا، اس لئے کہ سزا اور عذاب دینے کے مفہوم میں قلب اور دم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ (متوفی ۶۰۶ھ) نے ایک قاعدہ کلیہ نقل کیا ہے کہ جتنے بھی اعراضِ نفسانیہ ہیں مثلاً رحمت، خوشی، غضب، حیا، غیرت، مکر، تکبر، استہزاء وغیرہ۔ پس جب ان اعراض کی ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف نسبت ہوگی تو اس وقت غایت مراد ہوگی۔ مثلاً لفظِ غضب اس کا معنی خون کا جوش مارنا، اب یہ معنی مراد نہیں ہوگا، بلکہ اس کی غایت مغضوب علیہ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرنا مراد ہوگا۔ اسی طرح لفظِ حیاء کا اطلاق جب ذات باری تعالیٰ

❷ التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الفصل التاسع، ج۱ ص۲۲۳

پر ہوتو اس سے فعل کا ترک کرنا مراد ہوگا نہ کہ انکسار نفس:

واعلم أن هذا على الله تعالى محال، لكن ههنا قاعدة كلية، وهي أن جميع الأعراض النفسانية أعني الرحمة، والفرح، والسرور، والغضب، والحياء، والغيرة، والمكر والخداع، والتكبر، والاستهزاء لها أوائل، ولها غايات، ومثاله الغضب فإن أوله غليان دم القلب، وغايته إرادة إيصال الضرر إلى المغضوب عليه، فلفظ الغضب في حق الله تعالى لا يحمل على أوله الذي هو غليان دم القلب، بل على غايته الذي هو إرادة الأضرار، وأيضاً، الحياء له أول وهو انكسار يحصل في النفس، وله غرض وهو ترك الفعل، فلفظ الحياء في حق الله يحمل على ترك الفعل لا على انكسار النفس، وهذه قاعدة شريفة في هذا الباب. ❶

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۵ھ) فرماتے ہیں:

فإذا أسند إلى الله تعالى أريد به المنتهى والغاية. ❷

ترجمہ: جب اس (غضب) کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی جائے تو اس کا انجام کار یعنی انتقام لینا مراد ہوگا۔

لفظِ ’’لا‘‘ کے بجائے ’’غیر‘‘ کے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ اصل میں ’’لا‘‘ کا استعمال اثبات کے بعد ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے ’’**جاء نی العالم لا الجاهل**‘‘ میرے پاس عالم آیا جاہل نہیں آیا۔

❶التفسير الكبير: سورة الفاتحة، الباب الخامس، ج۱ ص۲۲۳

❷التفسير البيضاوي: سورة الفاتحة، ج۱ ص۴۱

یہ ''لا'' عطف کے لئے آتا ہے، لیکن غیر اپنے ماقبل کا تابع ہوتا ہے اس میں وصفی معنی پائے جاتے ہیں اور ''لا'' کے ہم معنی نہیں ہے۔ یہاں عطف کے بجائے صفت کے معنی زیادہ مناسب ہے۔ عطف اور وصف کے فرق کو سمجھ لینے سے اس آیت کی لطافت واضح ہوجائیگی ''**لا المغضوب علیھم**'' کے معنی اس سے زیادہ نہ ہوں گے کہ ''**مغضوب علیھم**'' سے ''صراط'' کی نسبت سلب کرلی جائے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''**جاء نی العالم لا الجاھل**'' اس کے معنی بس اتنے ہی ہیں کہ عالم کے لئے مجیئت (آنا) ثابت اور جاہل سے اس فعل کی نفی کردی جائے، مگر غیر اپنے سے پہلے کلمہ کی صفت ہوتا ہے اس طرز بیان سے دو وصف حاصل ہوئے۔

ایک وصف ثبوتی ''**منعم علیھم**'' دوسرا سلبی ''**غیر المغضوب علیھم**'' اس کے ذریعہ جو فائدہ حاصل ہوسکتا تھا وہ بھی حاصل ہوگیا، اور ساتھ ہی مزید حمد وثنا ثابت ہوگئی، اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ اہلِ ایمان غضب والوں سے قطعاً مختلف ہیں، وہ غضب کے مستحق نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ غیر یہاں بطور صفت کے لایا گیا ہے نہ کہ بصورتِ استثناء، دوسری حالت میں وصفی معنی فوت ہوجاتے جو کہ اصل مقصود ہیں۔

دوسرا فائدہ: اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم ہی انعام یافتہ ہیں، مسلمان نہیں۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ انعام یافتہ تم نہیں بلکہ تمہارے غیر ہیں، اور مسلمانوں سے خطاب ہے کہ نعمت والے تم ہو نہ تمہارے غیر۔ یہاں لفظ غیر پوری طرح مغایرت (اجنبیت) کو بتلا رہا ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں یہود ونصاریٰ کا صراحتاً نام نہیں لیا گیا ہے، ان کے وصف کو بیان کیا گیا ہے، اس سے ان کی صفات مغضوبیت وضلالت کو بے نقاب کرنا مقصود ہے، اور یہ کہ ان کی راہ، انعام یافتہ مؤمنین کی راہ سے بالکل الگ ہے، اس لئے کہ انعام کامل، غضب وضلال کے یکسر منافی ہے، یہ انعامِ کامل کسی مغضوب علیہ اور ضال کے لئے ثابت نہیں ہوسکتا۔ [1]

[1] بدائع الفوائد: سورة الفاتحة، ج ١ ص ٧٥

لفظ ''غَیرِ'' بیک وقت دو معنی کے لئے آتا ہے۔

ا......ایک تو نفی کے لئے ہے۔۲......مغایرت کے اثبات کے لئے، تو اب منعم علیہم اور مغضوب میں مغایرت کو بھی ثابت کرر ہا ہے اور ساتھ ساتھ مغضوب کی نفی بھی کرر ہا ہے، اب جب لفظِ غَیــرِ میں نفی کا معنی بھی ہے تو پھر لفظِ ''لَا'' کو تاکید کے طور پر آ گے ذکر کیا۔ لفظِ ''لَا'' میں صرف نفی کا معنی ہوتا ہے مغایرت کا نہیں ہوتا۔

''لَاالْـمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ'' نہیں فرمایا اس لئے کہ حرف ''لَا'' فقط ماقبل کی نفی کیلئے آتا ہے، اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوئے کہ اے اللہ ہم کو اہلِ انعام کا راستہ بتلا، نہ کہ اہل غضب کا، اور لفظِ غیر ماقبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے، فرق اتنا ہے کہ مغایرت پر صراحتاً اور نفی ماقبل پر ضمناً اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ! ہم کو اہلِ انعام کا راستہ بتلا، جن کا راستہ اہلِ غضب اور اہلِ ضلال کے راستے سے بالکل مغایر اور مباین ہو، خود اہلِ انعام اور ان کا راستہ غضب اور ضلال کے شائبے سے بالکلیہ پاک ہے۔ ❶

اہلِ غضب کے لئے اسم مفعول اور اصحاب ضلال کے لئے اسم فاعل کا صیغہ اختیار کرنے میں کیا حکمت ہے؟

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر بات ہے کہ اہل غضب وہ ہیں جن پر اللہ رب العزت کا غضب نازل ہوا۔ ان کو مغضوب کہنا ہی صحیح ہے باقی رہے اہل ضلال تو یہ خود گمراہ ہوئے اور گمراہی کو انہوں نے پسند کیا، یہاں ضال لانا مناسب تھا اور یہ وجہ بھی ہے کہ مضلین (گمراہ کئے گئے) کہنے کی صورت میں ان کے لئے ایک قسم کا عذر کا پہلو نکل آتا کہ خود گمراہ نہیں ہوئے بلکہ گمراہ کئے گئے ہیں۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اس توجیہ کی بنا پر منکرین تقدیر (قدریہ) کے لئے استدلال کی گنجائش نہیں ہے اس آیت کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے، لیکن اضلال کی اصل

❶ معارف القرآن کاندھلوی: سورہ فاتحہ، ج ا ص ۳۱، ۳۲

نسبت اللہ رب العزت کی طرف ہے۔(کیونکہ اسبابِ ضلال کا خالق وہی ہے)اس آیت میں فرقہ جبریہ کا بھی رد ہے۔جو بندے کی طرف کسی فعل کی نسبت کو حقیقتاً جائز قرار دیتے۔''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ '' سے قدریہ کی تردید ہوگئی۔ چنانچہ اس پوری آیت میں قدریہ اور جبریہ کے عقائد فاسدہ کا ابطال موجود ہے اور ساتھ ہی مذہب اہلِ حق اہل سنت کی تائید ونصرت کا بھی واضح بیان ہے۔اصل میں اہلِ حق ہی کا مسلک صحیح ہے جو کہ بلحاظِ توحید وخلق، تقدیر وقدرت کے قائل ہیں اور عمل وکسب کے اعتبار سے بندوں کے افعال کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں۔اس آیت سے تقدیر، شریعت، قیامت اور نبوت سب ثابت ہو گئے، نبوت کا ثبوت اس طرح ہوا کہ نعمت اور غضب عذاب وثواب کا دوسرا نام ہے اور نعمت والے انبیاء کرام اور ان کے پیروکار ہی ہیں۔متبعین کو جو کچھ بھی ہدایت ملی ہے وہ انبیاء کرام کے ذریعے ہی سے ملی ہے، کیوں کہ انسان کی نجات کے لئے اللہ عزوجل کی ہدایت ضروری ہے اور یہ ہدایت انبیاء کرام کی راہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، اس دلیل سے وضاحت واختصار کے ساتھ نبوت ثابت ہوگئی، یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اس کا پھل وہ کامل نعمت ہے جو دارالنعیم جنت میں حاصل ہوگی اور اس کی مخالفت کا بھی ایک ثمر ہے اور وہ دائمی بدبختی کی صورت میں غضب الٰہی کا نزول ہے۔غور کیجیے کہ یہ سورت باوجود اختصار کے، دین کے کتنے عظیم اور اہم مطالب پر مشتمل ہے۔ ❶

''مغضوب علیھم'' کو ''ضآلین'' پر کیوں مقدم کیا؟

یہ تقدیم چند وجوہ کی بنا پر ہے:

۱ ..... مغضوب علیھم (یہود) بلحاظ زمانہ مقدم ہیں۔

۲ ..... یہود مدینہ میں آپ کے پڑوس میں آباد تھے، نصاریٰ کی بستیاں دور تھیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن میں یہود سے زیادہ خطاب کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ، آل عمران، مائدہ ان

❶ بدائع الفوائد: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۸۳

سورتوں میں غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

۳.....یہود کا کفر بہ نسبت نصاریٰ کے زیادہ سخت ہے، اس لئے غضب، لعنت اور عقوبت خاص طور سے ان پر مسلط ہے۔ان کا کفر سرکشی اور بغاوت کی راہ سے آیا ہے، ان کی روش سے بچانے کے لئے لازمی تھا کہ ان کا ذکر پہلے کیا جاتا، اور یہ بات بھی اظہر ہے کہ ناواقف مجرم اور جان بوجھ کر سرکشی کرنے والے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔

۴.....اس سے پہلے **منعم علیهم** کا ذکر ہو چکا ہے۔غضب انعام کی ضد ہے، لہٰذا متصلاً ذکر، علم بلاغت کے لحاظ سے صفت، مقابلہ اور ازدواج کا حسن پیدا کر رہا ہے جو ضالین کے پہلے لانے سے حاصل نہ ہوگا۔ ❶

حرفِ واو کے ہوتے ہوئے پھر حرفِ ''لَا'' کا اضافہ کیوں کیا؟

''وَلَا الضَّالِّينَ'' میں حرفِ عطف یعنی حرفِ واو کے ہوتے ہوئے حرفِ ''لَا'' کا اس لئے اضافہ کیا کہ اہلِ انعام کے راستے کا اہلِ غضب اور اہلِ ضلال کے راستے سے فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم ہو جائے۔''وَلَا الضَّآلِّينَ '' سے اگر حرف ''لا'' کو حذف کر کے ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ وَالضَّالِّينَ'' کہا جائے تو مجموعہ فریقین کے راستے سے اہلِ انعام کے راستے کا مغایر ہونا مفہوم ہوگا، اہل انعام کے راستے کا ہر واحد سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ مجموع من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو مستلزم نہیں۔ ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموع من حیث المجموع کی مغایرت کو بالاولویت مستلزم ہے۔ ❷

لفظ ''لَا'' کو ذکر کرنے کے فوائد

لفظ واو مطلق جمع کے لئے آتا ہے خواہ وہ جمعیت علی سبیل الاقتران ہو یا علی سبیل

❶ بدائع الفوائد: سورة الفاتحة، ج ۱ ص ۸۲

❷ معارف القرآن کاندھلوی: سورہ فاتحہ، ج۱ص۳۲

التعاقب ہو یا علی سبیل التباعد ہو، اب جب ''جاء نی زید و عمرو'' کہا جائے تو اس میں تینوں احتمالات ہوں گے، اب اگر ''ماجاء نی زید و عمرو'' کہا جائے تو مقصود تینوں احتمالات کی نفی کرنا ہوگا، لیکن چونکہ واو مطلق جمعیت کے لئے آتا ہے اس پر یہ وہم ہوگا کہ اس میں جمعیت کاملہ کی نفی ہے علی سبیل التباعد والتعاقب کی نفی نہیں ہے، اس لئے اس وہم کو دور کرنے کے لئے لفظ ''لا'' لاکر اس نفی کی تاکید کردی، اب مطلب ہوگا ''ماجاء نی زید ولا عمرو'' زید وعمرو نہ تو ایک وقت میں آئے نہ علی سبیل التعاقب نہ علی سبیل التباعد آئے، تو لفظِ ''لَا'' کو نفی سابق کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

''لا'' کے لانے میں چار اہم فوائد ہیں:

۱.....اس کے ذریعے سے غیر میں جو نفی کے معنی پائے جاتے ہیں، اس کی تاکید ہو جاتی ہے۔ اگر غیر میں نفی کے معنی نہ ہوتے تو پھر ''لا'' کے ساتھ حرفِ عطف واو کا لانا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

۲.....''لا'' کے اضافہ سے یہ فائدہ ہوا کہ انعام یافتہ گروہ کی راہ، یہود ونصاریٰ دونوں میں سے ہر ایک کی راہ سے الگ ہے یہاں فرداً فرداً مغایرت ثابت ہوگئی۔ ''لا'' کے نہ لانے کی صورت میں یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ دونوں گروہوں سے مجموعی طور پر غیرت مقصود ہے نہ کہ ہر ایک سے علیحدہ۔

اس وہم کو دور کرنا مقصود ہے کہ ''ضالین ، مغضوب علیهم'' کی صفت ہے۔ ایسا ہوا کرتا ہے کہ ایک ذات کی چند صفتوں کے درمیان حرف عطف لے آیا کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہوں، سورۂ مؤمنون کی ابتدائی چند آیات)

جب ''لا'' یہاں داخل ہو گیا تو معنی یہ ہوئے کہ دونوں وصف دو گروہوں سے الگ الگ تعلق رکھتے ہیں اور دونوں مقصود بالذکر ہیں، اس مقام پر ''لا'' غیر پر چند وجوہ کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے:

۱.....حرف کم ہیں۔ ۲.....تکرار نہیں۔

۳.....''غیــر'' کے دو بار لانے سے زبان پر ثقل ہو جاتا، درمیان میں صرف ایک کلمہ مغضوب ہی کا فصل ہوتا۔ عبارت کے اس بھونڈے پن سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟

۴.....''لا'' کے ساتھ عطف کرنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ صراط مستقیم والوں سے غضب اسی طرح دور ہے جس طرح ان سے ضلال منتفی (دور) ہے، اگرچہ غیر نے اس نہی کو بتلایا ہے، مگر ''لا'' نہی کے معنی میں زیادہ زوردار ہے۔ ❶

❶ بدائع الفوائد: ج۱ ص۸٤

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

﴿الٓمّٓ (۱)﴾

اس سورت میں "حسن ابتداء و افتتاح" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ابتداء میں "الٓم" ایسا کلمہ لایا گیا جس کے معنی میں حد درجہ کی دقت، غموض اور پوشیدگی ہے۔ کلام کے شروع میں جب اس قسم کے کلمات لائے جاتے ہیں، تو اس سے سامع کو نظر و فکر اور تدبر کرنے پر تنبیہ ہوجاتی ہے اور سامع فوراً تحقیق و جستجو میں لگ جاتا ہے۔ مذکورہ آیت میں بھی چونکہ "الٓم" ایسا کلمہ لایا گیا ہے جس سے لوگ استنباط اور نظر و فکر میں پڑ جاتے ہیں، اسی لئے آیت میں "حسنِ ابتداء" پایا جاتا ہے۔

﴿ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ (۲)﴾

ترجمہ: یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں۔

مذکورہ آیتِ مبارکہ میں "ذٰلِكَ" اسم اشارہ استعمال ہوا ہے، اسماء اشارات میں سے "ذٰلِكَ" دور کی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن مذکورہ آیت کریمہ میں کتاب کے ازحد قریب ہونے کے باوجود "ذٰلِكَ" اسم اشارہ لایا گیا، جو "بُعد و دوری" پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں قرآن کے نہایت قریب ہونے کے باوجود اسم اشارہ بعید کا اس لئے لایا گیا تاکہ قرآن کے مقام و منزلت کی بلندی پر دلالت ہو، اور یہ بتایا جاسکے کہ قرآن کا مقام و مرتبہ لوگوں کے تصورات اور خیالات سے کافی بلند و بالاتر ہے۔

❶ اس کا مطلب یہ کہ کلام کو متکلم اچھے اور خوبصورت طریقہ سے شروع کرے۔

﴿لَا رَیْبَ فِیْهِ (۲)﴾

اس آیتِ کریمہ میں بھی سورہ فاتحہ کی آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی طرح "تلوین الخطاب" سے کام لیا گیا ہے۔ ❶ یہاں بھی "لَا رَیْبَ فِیْهِ" جملہ خبریہ ہے، مگر مراد اس سے قرآن میں شک نہ کرنے کا حکم دے کر لوگوں کو خطاب کرنا مقصود ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اے لوگوں قرآن کی حقانیت اور سچائی پر ہرگز شک نہ کرو، قرآن محل شک وشبہ نہیں"۔

مذکورہ آیت کریمہ میں لفظِ "رَیْبَ" کو جار مجرور یعنی "فِیْهِ" پر مقدم کیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا کیوں کہ اس مقام میں پہلے "رَیْب" ہی کا ذکر زیادہ موافق اور مناسب ہے، کیونکہ یہ مقام قرآن سے شک وتردد کی نفی کا مقام ہے۔ اگر یہاں "فِیْهِ" کو مقدم کرتے اور "رَیْبَ" کو مؤخر کرتے تو اول وہلہ میں سامع کے سامنے مقام کا مقصود اور غرض واضح نہ ہوتا، اسی لئے "رَیْبَ" کو جار مجرور پر مقدم کیا گیا ہے۔ جس سے مقام کی غرض اولِ وہلہ میں سامع کے سامنے گویا مجسم ہو کر آجاتی ہے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲)﴾

ترجمہ: یہ ہدایت ہے ان کے ڈر رکھنے والوں کے لئے۔

مذکوہ آیتِ کریمہ میں "مجاز عقلی" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "هُدًى" مصدر استعمال ہوا ہے، جو بمعنی اسمِ فاعل (ہادی) کے ہے۔ اس کا حقیقی فاعل اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے نہ کہ کتاب، کیونکہ ہدایت اللہ دیتا ہے قرآن نہیں، مگر چونکہ قرآن کی وجہ سے اللہ رب

---

❶ مطلب اس کا یہ ہے کہ کلام کو ایک انداز سے دوسرے انداز کی طرف منتقل کیا جائے، مثلاً کلام کو خبر کے صیغوں سے ذکر کیا جائے مگر مراد اس سے کسی فعل کے کرنے کا حکم ہو۔

❷ مجاز عقلی یہ ہے کہ کلام میں فعل یا معنی فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے کسی ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی جائے، یعنی نسبت ظاہر کے اعتبار سے ہو حقیقت کے اعتبار سے نہ ہو۔

العزت لوگوں کو ہدایت عطا فرماتے ہیں، اس لئے قرآن لوگوں کی ہدایت کا سبب اور ذریعہ ہے۔اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے آیت میں "ھُــدًی" معنیٰ فعل کی نسبت ظاہری طور پر فاعل حقیقی (اللہ سبحانہ) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی (اَلْـکِتَــاب) کی طرف کردی گئی ہے۔آیت میں چونکہ فاعل حقیقی کے بجائے فاعل غیر حقیقی کی طرف معنیٰ فعل کی نسبت کی گئی ہے، اس لئے اس میں "مجاز عقلی" پایا جاتا ہے۔

اس آیت میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "اَلْمُتَّقِیْن" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس کا حقیقی معنی ہے فی الحال پرہیز گار ہونا اور اس کا مجازی معنی ہے مستقبل میں پرہیز گار ہونا۔آیت میں "اَلْــمُتَّــقِیْــن" بول کر مستقبل میں پرہیز گار ہونا مراد لیا گیا ہے۔ان دونوں معنوں (حقیقی ومجازی) کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہیں بلکہ ما یکون و مایؤ ول کا علاقہ پایا جاتا ہے۔(جس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کا اطلاق اس کے محل پر مستقبل کے اعتبار سے ہو۔) دلیل اس کی یہ ہے کہ جب کتاب نازل ہوتی تھی، اس وقت فوری طور پر آدمی متقی نہیں ہوجاتا تھا بلکہ مستقبل میں قرآن کی وجہ سے آدمی تقوی دار بنتا ہے۔اسی لئے ان دونوں میں علاقہ ما یکون علیہ کا ہے، چونکہ آیت کے لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ "ما یکون علیہ" کا ہے اس لئے اس میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲)﴾

مذکورہ آیت میں "ایجاز" واقع ہوا ہے۔ ❷ اس آیت میں "مُتَّقِیْن" کا لفظ استعمال

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو، بلکہ سببیت، مسببیت، حالیت، محلیت، جزئیت، کلیت، ما کان علیہ یا ما یکون علیہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

❷ ایجاز کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے معانی اور اغراض کو مختصر الفاظ سے بیان کردیا جائے اور وہ الفاظ کلام کی غرض کی وضاحت کے لئے بھی کافی ہوں۔دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی معنی اور مقصد کو عادۃً استعمال ہونے والے الفاظ سے بھی کم الفاظ سے بیان کیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ غرض بھی پوری ہوجائے۔

ہوا ہے، جو اصل میں ”وِقَایة“ سے ماخوذ ہے۔اور ”وقایة“ ہر ایسے چیز کو جامع اور شامل ہے جن سے بچنا انسانوں پر لازم ہو۔ یہاں چونکہ بہت سی چیزوں سے بچنے کے معنی کو ”مُتَّـقِیْن“ کے مختصر سے لفظ سے بیان کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ”ایجاز“ پایا جاتا ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظ ”لِّـلْـمُتَّقِیْنَ“ میں موجود ”لام“ جارہ اختصاص اور حصر کے لئے ہے۔ ❶ یہاں بھی ”لام“ جارہ کے ذریعہ قرآن کی ہدایت اور رہنمائی کو تقوی داروں کیساتھ مختص کر دیا گیا ہے۔ اس میں قرآن کی ہدایت ورہنمائی کو تقوی داروں کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا کیونکہ عموماً قرآن سے زیادہ تر تقوی دار ہی منتفع ہوتے ہیں، اگرچہ قرآن تمام عالم انسانیت کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس اختصاص کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قرآن دوسرے لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ نہیں، بلکہ اس اختصاص کا مطلب یہ ہے کہ عموماً تقوی دار ہی قرآن سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اسی لئے ان کے ساتھ قرآن کی ہدایت کو مختص کر دیا گیا ہے۔

﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾

ترجمہ: جو بے دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ”إطلاق المصدر وإرادة اسم الفاعل“ پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ”الْـغَـیْـبِ“ مصدر کا لفظ استعمال ہوا ہے، مگر آیت میں یہ لفظ اپنے مصدری معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ مصدر ”الـغـائـب“ اسم فاعل کے معنی میں ہے، لیکن یہاں اسم فاعل کا معنی مراد لینے کے لئے مصدر کا اطلاق اس لئے ہوا تا کہ آیت میں مبالغہ پیدا ہو، آیت کا

❶ اختصاص کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئ کو کسی شئ کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں کوئی مصدر ذکر کیا جائے مگر کلام میں اس لفظ کا مصدری معنی مراد نہ ہو بلکہ اس مصدر سے اسم فاعل مراد لیا جائے۔

مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ تقوی دار لوگ سراپا مخفی اور پوشیدہ باتوں تک ایمان لانے میں کسر نہیں چھوڑتے ۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”إطلاق المصدر و إرادة الفاعل“ پایا جاتا ہے۔

﴿وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ (۳)﴾

ترجمہ: اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے (اللہ کی خوشنودی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ”مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ“ پورا جملہ جار مجرور مل کر ”يُنفِقُوْنَ“، فعل کا معمول ہے اور ”يُنفِقُوْنَ“ عامل ہے، اصول کے رو سے عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں، مگر جب کوئی نکتہ یا غرض مطلوب ہو تو معمول کو عامل پر مقدم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی دو نکات کے حصول کی غرض سے معمول کو عامل پر مقدم کر دیا گیا ہے۔

نمبر۱: اس مقام میں معمول کو عامل پر اس لئے مقدم کیا تا کہ منفق بہ (یعنی اللہ سبحانہ کی عطا کردہ نعمتوں) کی عظمت شان اور اہمیت کو واضح کیا جائے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ نے جو اشیاء تقوی داروں کو عطاء فرمائی ہیں، وہ بہت ہی عظیم الشان اور اہم ہیں۔

نمبر۲: اس آیت میں ”مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ“ معمول کو ”يُنفِقُوْنَ“ عامل پر اس لئے مقدم کر دیا تا کہ اس آیت اور گذشتہ آیت کے کلمہ فاصل میں موافقت رہے۔اس سے پہلی والی آیت کا کلمہِ فاصل ”لِلْمُتَّقِيْنَ“ ہے جو ”نون“ پر ختم ہوتا ہے۔اب اگر اس آیت میں معمول کو مؤخر اور عامل کو مقدم کر دیتے، تو اس آیت کا کلمہِ فاصل ”رَزَقْنٰهُمْ“ ہوتا، جس کی وجہ سے دونوں آیتوں کے درمیان کلمہ فاصل میں موافقت نہ رہتی۔آیت میں جب عامل پر معمول کو مقدم کر دیا تو اس سے موافقت کلمہِ فاصل حاصل ہوگئی۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ نے ”رَزَقْنٰهُمْ“ کی تعبیر فعل ماضی جمع متکلم سے کی ہے، حالانکہ اللہ سبحانہ کی ذاتِ عالی وحدہ لاشریک لہ ہے۔اس آیت میں اللہ سبحانہ نے واحد ہونے

کے باوجود اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا جو عظمتِ شان کے لیے ہے۔ یہ ضمیر جمع اللہ تعالی نے اس لئے استعمال کی تا کہ بادشاہوں کا اپنے بارے میں جمع کے صیغے استعمال کرنے کا جو طریقہ وعادت رائج ہے، اس پر عمل ہو جائے اور اس سے اللہ سبحانہ کی عظمت واضح ہو جائے۔

﴿الَّـذِيْـنَ يُـؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳)
وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)﴾

ترجمہ: جو بے دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے (اللہ کی خوشنودی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔ اور جو اس (وحی) پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ پر اتاری گئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی اور آخرت پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں۔

مذکورہ دونوں آیاتِ کریمہ میں اطناب کی ایک قسم " تکرار" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ایک مرتبہ آیت نمبر ۳ میں "الَّـذِيْـنَ يُـؤْمِـنُـوْن" کا ذکر ہوا ہے، پھر دوبارہ آیت نمبر ۴ میں "وَالَّـذِيْنَ يُؤْمِنُوْن " بول کر گذشتہ آیت نمبر ۳ کے اسی جملہ کو مکرر ذکر کر دیا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ البتہ اس میں مختصر سی تفصیل ہے کہ یہ کونسا تکرار ہے؟ تکرار لفظی ومعنوی دونوں ہیں، یا پھر ان دونوں میں سے کوئی ایک۔ جواب یہ ہے کہ اگر دونوں آیتوں کا مصداق موصوف ایک ہو تو یہ تکرار لفظی اور معنوی دونوں ہیں، اور اگر ان دونوں آیتوں کا مصداق جدا گانہ ہو تو یہ تکرار لفظی ہوگا معنوی نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)﴾

ترجمہ: یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی طرف سے صحیح راستے پر ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

❶ تکرار کا مطلب یہ ہے کہ کسی جملہ یا کلمہ کو مکرر ذکر کیا جائے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں بھی گذشتہ آیتوں کی طرح " تکرار " پایا جاتا ہے۔ (۱) یہاں ایک مرتبہ آیت کی ابتداء میں "اُولٰٓئِكَ" کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد دوبارہ "هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" سے پہلے "اُولٰٓئِكَ" بول کر اسی لفظ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت کریمہ میں "اُولٰٓئِكَ" کا تکرار اور اعادہ پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ اس تکرار کے ذریعہ اِس نکتہ پر دلالت ہو کہ ہدایت اور فلاح میں سے ہر ایک حکم مذکورہ بالا صفات عالیہ (تقویٰ، ایمان بالغیب، اقامت الصلوٰۃ) سے متصف اہل ایمان کو غیروں سے ممتاز کرنے میں مستقل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جب یہ دونوں حکم ایک ہی ساتھ کسی ایک میں پائے جائیں تو پھر اس کے کیا کہنے! نیز اس میں یہ بتلانا ہے کہ مذکورہ بالا صفات سے متصف حضرات کے لیے دو انعامات ہیں، (۱) دنیا میں رب العالمین کی طرف سے ہدایت۔ (۲) آخرت میں کامیابی۔ ہدایت اور فلاح میں سے ہر ایک کی اہمیت بتلانے کے لیے "اُولٰٓئِكَ" کو مکرر لایا۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں دو جملوں "اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ" اور وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" کے درمیان "واو" عاطفہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ عطف چونکہ دو چیزوں کے درمیان مغائرت اور جدائی پر دلالت کرتا ہے، اس لئے یہاں بھی عطف اس بات کی علامت ہوگی کہ اس مقام میں ہدایت اور فلاح کا مفہوم حقیقتاً ایک دوسرے کا مغائر ہے۔ ہدایت رُشد اپنانے اور نفسانی خواہشات کو ترک کرنے کا نام ہے اور فلاح کا مطلب دنیا میں کامیاب ہونا اور آخرت میں جنت کی صورت میں کامیابی سے ہمکنار ہونا۔ ان مفہومات کی مغائرت پر دلالت کرنے کے لئے ان کے درمیان حرفِ عطف کا استعمال ہوا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "اُولٰٓئِكَ" مبتداء اور "الْمُفْلِحُوْنَ" خبر ہے۔ ان دونوں کے

(۱) تکرار کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو مکرر ذکر کیا جائے۔

درمیان جو ضمیر آئی ہے، وہ ضمیرِ فصل ہے (ضمیرِ فصل کئی اغراض کے لئے استعمال ہوتی ہے، ان میں سے ایک غرض خبر اور صفت کے درمیان تمیز کرنا ہے، یعنی ضمیرِ فصل یہ بتاتی ہے کہ ضمیر کے مابعد والا ماقبل کے لئے خبر ہے صفت نہیں۔) اس آیت میں بھی مبتداء خبر کے درمیان ضمیرِ فصل اس لئے لائی گئی تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ یہاں "الْمُفْلِحُوْنَ" ترکیبی لحاظ سے "اُولٰٓئِكَ" کی خبر ہے صفت نہیں، اور یہ "اُولٰٓئِكَ" مسند، "الْمُفْلِحُوْنَ" مسندالیہ (اہل ایمان) کے لئے ہی ثابت ہے غیروں کے لئے نہیں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "هُمْ" ضمیرِ فصل کی وجہ سے "قصر الصفة على الموصوف" کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ❶ یہاں بھی چونکہ صفتِ فلاح کو اہل ایمان کیساتھ مختص اور منحصر کردیا گیا ہے۔ یہ صفت اہل ایمان سے جدا ہو کر یہود و نصاریٰ کی طرف متجاوز نہیں ہوگی، اس لئے آیت میں " قصر الصفة على الموصوف" پایا جاتا ہے۔ مذکورہ آیتِ کریمہ میں تاکید بھی پائی جاتی ہے۔ ❷ اس آیت میں چونکہ "هم" ضمیر سے "اُولٰٓئِكَ" اسم ظاہر کو مضبوط اور زوردار بنادیا گیا ہے، اس لئے اس میں "تاكيد المظهر بالمضمر" پائی جاتی ہے۔

﴿عَلٰی هُدًى﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں " استعارة تصريحية" اور " استعارة تبعية" پائے جاتے ہیں۔ ❸ یہاں "تقویٰ داروں کی حالت" کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو شخص

---

❶ قصر الصفة على الموصوف کا مطلب یہ ہے کہ صفت موصوف پر ہی منحصر ہو اور اس کے ساتھ مختص ہو۔ وہ صفت موصوف سے تجاوز کر کے دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔

❷ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات کو پرزور لہجہ میں زور دے کر بیان کیا جائے، نیز تاکید کی بھی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کے ذریعہ مضبوط کردیا جائے۔

❸ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ یعنی لفظ مستعار منہ کو لفظوں میں صراحت کے ساتھ ذکر کردیا جائے۔

کسی گھوڑے کے اوپر چڑھ کراس پر قابو پالے،اس میں اہل تقوی کی حالت " مشبہ" ہےاور موصوف شخص"مشبــہ بــہ " ہے۔تشبیہ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تقوی دار حضرات ہدایت پراس قدرقابواورتمکن پا چکے ہیں جیسے کوئی آدمی کسی سواری اورگھوڑے وغیرہ پر چڑھ کرقابو پالیتا ہے۔آیت میں چونکہ لفظِ "علیٰ" کواستعارۃً لیکرمشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے آیت میں "استعارۃ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔مذکورہ مقام میں استعارہ تصریحیہ کی وضاحت یوں بھی کی گئی ہے کہ اس میں ہدایت اور ہدایت یافتہ شخص کے درمیان جوارتباط اورتعلق پایا جاتا ہے،اس ارتباط کوایسے ارتباط سے تشبیہ دی گئی ہے جوارتباط کسی بلندی اوربلندی پر چڑھنے والے شخص کے درمیان ہو۔اس تشبیہ میں پہلا ارتباط "مشبـہ" اوردوسرا"مشبـہ بـہ " ہےاوران میں وجہ شبہ قدرت اورتمکن پانا ہے،مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی بلندی میں کوئی چڑھ کراس بلند مقام پرقدرت اورقابو پالیتا ہے، بالکل اسی طرح ہدایت پراہل تقوی نے قابواورتمکن پالیا۔یہ کلیات کی کلیات سے تشبیہ تھی۔اس میں مشبہ بہ اور مشبہ دونوں کلی تھے۔پھراس کے بعد کلیات کی یہ تشبیہ جزیات کی طرف منتقل ہوتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ "عـلیٰ" حرفِ جر مذکورہ مشبہ بہ کا ایک جزء ہے۔آیت میں اس جزءکواستعارتاً مشبہ بہ بنا کرلفظوں میں صراحت کےساتھ ذکرکردیا،اسی لئے اس میں "استعارۃ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔اس آیت میں "استـعارۃ تبعیۃ" بھی موجود ہے۔❶ یہاں "علیٰ" حرفِ جر ہے، چونکہ اس میں یہ استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں "استعارۃ تبعیۃ" بھی پایا جاتا ہے۔

﴿الٓـمّٓ(۱)ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ(۲)الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّارَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۳)وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآاُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (۴)﴾

❶ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جوحرف،فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

مذکورہ آیتوں کے مختلف مقامات میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں بالکل پہلی آیت میں بھی حذف ہوا ہے، لیکن یہ ان کے قول کے مطابق ہے جو حروف مقطعات کے ظنی مطالب بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں "هُدًى" سے پہلے "هو"، ضمیر بھی حذف کردی گئی ہے۔ یہ اصل میں "هُوَ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" تھا، اس میں "هو" ضمیر مبتداء ہے اور "هُـدًى" اس کی خبر ہے۔ آیت میں مبالغتاً "هـو" ضمیر حذف کردی گئی ہے، اسی طرح "مُنفِقُوْن" فعل کے بعد مفعول حذف کردیا گیا ہے۔ یہ اصل میں "يُنفِقُوْنَ المَالَ" تھا (جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل تقوی اللہ کے عطاء کردہ رزق میں سے مال خرچ کرتے ہیں۔) آیت سے یہ مفعول حذف کردیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد "بِمَا اُنزِلَ اِلَيْكَ" کے بعد بھی "ما" موصولہ کا بیان حذف کردیا گیا ہے۔ اصل میں یہ عبارت "بِمَااُنزِلَ اِلَيْكَ مِنَ الْقرآن" تھی۔ (جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل تقویٰ آپ پر اتاری جانے والی قرآن کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔) اس آیت سے بھی "من القرآن" کے الفاظ حذف کردئے گئے ہیں۔ اسی طرح "مِنْ قَبْلِكَ" میں لفظِ "قَبْل" کے بعد "اِرْسَالِكَ" یا "اِنْزَالِ اِلَيْكَ" حذف کردیا گیا ہے۔ گویا اصل عبارت "مِنْ قَبْلِ اِرْسَالِك" یا "مِنْ قَبْلِ اِنْزَالِ اِلَيْكَ" تھی، لیکن آیت میں سے یہ دونوں الفاظ حذف کردیئے گئے۔ بالکل اسی طرح "بالاخرة" میں "باء" جارہ کے بعد بھی "جزاء" کا لفظ حذف کردیا گیا ہے۔ یہ اصل میں "وَبِجَزَاءِ الْآخِرَةِ" تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ دار لوگ یوم آخرت کے جزاء پر ایمان رکھتے ہیں۔) اس میں "جَـزَاء" کا لفظ مقدر نکالا گیا ہے، جو آیت میں مذکور نہیں بلکہ حذف کردیا ہے۔ اس پوری تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں کے متعدد مقامات میں "ایجاز حذف" واقع ہوا ہے۔ ان جگہوں میں "ایجاز حذف" اس لئے واقع ہوا تا کہ ان آیتوں کے اغراض ومفاہیم میں تاکید ومبالغہ پیدا ہوجائے۔

---

❶ ایجاز حذف یہ ہے کہ کلام سے کوئی کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں ایسا قرینہ بھی موجود ہو جو محذوف کی تعیین کرے۔

﴿بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ﴾

جب یہ آیت آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تب بہت سی آیتیں قرآن کی نہیں اتری تھیں، بلکہ ان کا اترنا ابھی باقی تھا۔اس لحاظ سے آیت میں نزولِ آیت کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے مضارع کا صیغہ ہونا چاہئے تھا،لیکن اس میں مضارع کے بجائے"اُنۡزِلَ" فعل ماضی سے نزول آیات کی تعبیر بیان کی گئی ہے۔اس مقام میں فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی سے نزول آیات کی تعبیر مندرجہ ذیل نکتوں کی بنیاد پر ہوئی ہے۔

نمبرا: یہاں فعل ماضی سے تعبیر اس لئے بیان ہوئی تاکہ نازل شدہ آیات جو متحقق ہیں اِن کو اُن آیاتِ کریمہ پر غلبہ دیا جائے جن کا نازل ہونا متوقع ہے۔

نمبر۲: یہاں مضارع کی جگہ فعل ماضی سے اس لئے تعبیر بیان ہوئی تاکہ بعد میں اترنے والی آیتوں کو یقینی ہونے کی وجہ سے ان آیتوں کے بمنزلہ اتارا جائے جو اتر کر متحقق ہو چکی ہیں۔نیز چونکہ اُن کا نازل ہونا یقینی تھا اس لیے اُسے صیغہ ماضی سے تعبیر کیا۔

﴿عَلٰی ھُدًی﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں"ھُدًی"نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی کبھی شئی کی عظمت اور فخامت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔اس آیت میں بھی"ھُدًی"کو نکرہ لاکر اس ہدایت کی عظمت وفخامت بیان کی گئی ہے جس پر اہل تقویٰ قائم ہیں۔آیت کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ دار لوگ رب کی طرف سے ملنے والی ایسی عظیم الشان ہدایت پر فائز ہیں، جس کی کنہ اور حقیقت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

﴿اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دیگر اوصاف میں سے"رَّبِّہِمۡ" بول کر صرف صفت ربوبیت کے عنوان کو بیان کیا گیا ہے۔حالانکہ اللہ سبحانہ کے دیگر اوصاف کی طرح اس صفت کو چھوڑ کر بھی آیت کی مراد ظاہر کی جا سکتی تھی،لیکن یہاں دو خاص نکات کے

حصول کی غرض سے اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کے عنوان کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر۱: یہاں صفتِ ربوبیت کواس لئے بیان کیا تا کہ اس کے موصوف (یعنی ہدایت) کی فخامت اور عظمت واضح کی جائے کہ یہ ہدایت غیر معمولی ہدایت ہے، یہ اتنی عظیم الشان اور اہمیت والی ہدایت ہے جس کو رب نے عطاء کیا ہے۔

نمبر۲: یہاں صفت ربوبیت کا عنوان اس لئے لایا گیا تا کہ لفظ "رب" جن لوگوں کی طرف مضاف ہے ان کی عظمت اور شرافت بیان کی جائے، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رب کی ہدایت پر قائم ہیں وہ بہت عظیم اور معزز لوگ ہیں۔

مذکورہ پانچوں آیتوں میں "حسنُ التقسیم" پایا جاتا ہے۔ ❶ ان آیتوں میں درویش صفت پاکبازوں کے تمام اوصاف حمیدہ اور کمالات کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح عبادت کی دونوں قسمیں (عباداتِ مالیہ اور عبادتِ بدنیہ) کا استیعاب "یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ" سے آیت میں کر دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ آیات میں اقسام مسائل کا بھی استیعاب کیا گیا ہے۔ "الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" سے عقائد واصول کو بیان کیا، پھر "یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ...... إلی آخرہ" سے اعمال واوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ آیات میں چونکہ متقین کے یہ تمام اوصاف، عقائد، عبادات اور اعمال کے جملہ اقسام کا احاطہ کئے ہوئے، اس لئے ان آیتوں میں "حسنُ التقسیم" پایا جاتا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ(٦)﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے۔ ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں،

❶ حسن التقسیم فن بلاغت کا ایک اہم شاہکار ہے۔ اس کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں بیان کرنے والے شئ کے تمام اقسام وانواع کا استیعاب اس طرح کرے کہ کوئی شئ وقسم متکلم سے باقی نہ رہ جائے۔

چاہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ازلی کفار کے بارے میں خطاب کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کا ایمان نہ لانا اللہ تعالیٰ کے ہاں متعین ہو چکا ہے، وہ کسی حال میں ایمان لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے ایسے کفار کو ڈرانا اور نہ ڈرانا یکساں ہے۔اس آیت میں نکتہ بلاغت سمجھنے سے پہلے ایک تمہیدی بات ذہن نشین کرلی جائے، وہ یہ ہے کہ یہاں "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کا مصداق عام کفار بھی ہوسکتے اور مخصوص کفار بھی۔اب بلاغت کا نکتہ ملاحظہ ہو، اگر یہاں "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْ" کا مصداق عام کفار ہوں تو اس آیت میں موجود "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کے الفاظ بھی عام ہیں اور اس کا معنی بھی عام ہے۔گویا آیت میں عام بول کر عام معنی مراد لیا گیا ہے، اور اگر یہاں "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" سے عام کفار مراد نہ ہوں، بلکہ مخصوص کفار (ابوجہل، شیبہ بن ربیعہ، عقبہ بن ابی معیط، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ) ہوں تو اس آیت میں "إطلاق العام وإرادة الخاص" کا اصول پایا جائے گا۔ ❶ یہاں بھی گویا "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کے الفاظ عام ہیں، مگر اس کا مصداق مخصوص اشخاص ہونے کی وجہ سے معنی خاص ہے۔اسی لئے اس میں خطاب عام اور معنی خاص ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "ءَاَنْذَرْتَهُمْ" میں ہمزہ استفہامیہ استعمال ہوا ہے۔حروف استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حروفِ استفہام اس معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنی کے کئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔اس آیت میں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ یہ ہمزہ اثبات وتقریر کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ❷ یہاں ہمزہ کے ذریعہ آیت کے عنوان کو ثابت کیا گیا ہے، اس لئے یہ ہمزہ اثبات وتقریر کے لئے ہے۔اس صورت میں آیت کا مطلب

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں عام لفظ کا اطلاق کیا جائے مگر اُس لفظ سے خاص معنی مراد لیا جائے۔

❷ اثبات وتقریر کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کو کسی بات کے ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

یہ ہوگا کہ اے پیغمبر آپ کا ان کفار کو ڈرانا یا نہ ڈرانا ان کے نزدیک یکساں ہے، ان کو آپ کے ڈرانے نہ ڈرانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی لئے یہ بدبخت ایمان جیسی قیمتی نعمت سے محروم ہیں۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۷)﴾

ترجمہ: اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لئے زبردست عذاب ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ''استعارة تصريحية'' اور'' استعارة تبعية'' پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں کفار کے عدم قبول حق کو مہر لگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں کفار کا حق کو قبول نہ کرنا ''مشبه'' (مستعار) اور مہر لگنا ''مشبه به'' (مستعار منہ) ہے۔ ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح دستاویزات پر مہر لگنے سے باہر کی کوئی چیز اندر اور اندر کی کوئی چیز باہر نہیں آسکتی، بالکل اسی طرح کفار کے دل میں باوجود حق کے واضح ہونے کے حق داخل نہیں ہوسکتا اور کفر دلوں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس آیت میں چونکہ ''خَتَمَ'' بول کر مشبہ بہ (مہر لگنا) کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس میں ''استعارة تبعية'' بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں چونکہ ''خَتَمَ'' فعلِ مشتق ہے اور اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تبعية'' پایا جاتا ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ ''سَمْعِ'' واحد لیکن لفظ'' قُلُوْب ''اور'' اَبْصَار''، جمع لائے گئے ہیں۔ اس آیت میں سمع کو مفرد لانے اور دوسرے اعضاء کو جمع کی صورت میں ذکر کرنے میں ایک نکتہ کارفرماں ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ ''سَمْعِ'' کا تعلق صرف اور صرف ایک ہی شئی سے

❶ استعارہ تصریحیہ یہ ہے کہ لفظوں میں مشبہ بہ یعنی لفظ مستعار منہ کو صراحت کیساتھ ذکر کر دیا جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ اس استعارہ ہے جو فعل، حرف اور اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

ہے یعنی آواز سے، اسی لئے اس کو مفرد کی صورت میں بیان کیا گیا، باقی دل کا تعلق سینکڑوں محسوسات اور مدرِکات سے ہے، اسی طرح آنکھوں کا تعلق بھی ہزاروں کروڑوں مرئیات اور قابل دید اشیاء سے ہے، اس لئے ان دونوں کو جمع کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظ "غِشَـاوَۃٌ" نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کی فخامت اور عظمت کو بیان کیا جاتا ہے، یہاں بھی نکرہ لاکر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو پردہ کفار کی آنکھوں پر پڑا ہے، وہ اتنا بڑا، موٹا اور پھیلا ہوا ہے کہ اب انہیں ہدایت کا راستہ نظر نہیں آتا۔ یا یہ ایک خاص نوع کا پردہ ہے جس کی وجہ سے ان پر ہدایت کے راستے مسدود ہو گئے۔

﴿وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (٧)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ "عَـذَابٌ" نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کو مجہول اور مخفی رکھنا مقصود ہوتا ہے، یہاں بھی "عَـذَابٌ" کو نکرہ لاکر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفار کو ملنے والے عذاب کی نوع "مجهول الكم اور مجهول الكيف" ہوگی۔ (کم سے مراد مقدار کی تعیین، کیف سے مراد کیفیت کی تعیین ہے۔) یعنی اس کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ انسانوں کی ناقص عقلیں نہیں لگاسکتیں کہ کتنی مقدار میں اور کس حقیقت پر مشتمل عذاب ان کفار کو دیا جائے گا۔

﴿وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ "عَـــذَابٌ" کو نکرہ کی صورت میں بیان کرنے کے بعد "عَظِيْمٌ" سے اس کی صفت بھی لائی گئی ہے، جو ایک گُنا نکرہ میں تخصیص پیدا کرتی ہے۔ اس میں نکرہ کے بعد عظیم کی صفت اس لئے لائی گئی تاکہ اِن دو فوائد پر دلالت کی جائے۔

نمبر ا: "عَذَابٌ" کی صفت "عَظِيْمٌ" اس لئے لائی گئی تاکہ عذاب کو نکرہ لانے سے

عذاب کی جو جہالتِ کمیت اور کیفیت بیان ہوئی تھی اس سے عذاب کی قلت اور ندرت کا وہم پیدا نہ ہو۔

نمبر۲: "عَـذَابٌ" کی صفت "عَـظِـيْـمٌ" سے اس لئے لائی گئی تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کفار کو آلام وتکالیف کی ایک بھیانک اور عظیم نوع ملنے والی ہے، جس کی حقیقت اور کنہ اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ عذاب معمولی نہیں بلکہ نہایت ہی ہولناک ہوگا۔

﴿اِنَّ الَّـذِيْـنَ كَـفَـرُوْا سَـوَآءٌ عَـلَيْهِـمْ ءَ اَنْـذَرْتَهُـمْ اَمْ لَـمْ تُـنْـذِرْهُـمْ لَا يُـؤْمِـنُـوْنَ(٦) خَتَـمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (٧)﴾

ان دونوں آیاتِ کریمہ کے متعدد مقامات پر "ایجاز حذف" واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" اصل میں "اِنَّ الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وبِكَ، وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ" تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ بے شک ایسی قوم جو اللہ تعالیٰ کا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کا انکار کرے ان کو آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا کوئی فائدہ نہیں دیگا۔) اس تقدیری عبارت میں "اِنَّ" کے بعد "الْقَوْم" اور "كَفَرُوْا" کے بعد "بِاللّٰهِ وبِكَ وبِمَا جِئْتَ بِهٖ" نکالا گیا ہے، یہ چونکہ آیت سے حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے اس آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

اس فعل کے بعد بھی کچھ کلمات محذوف ہیں، یہ اصل میں "لَا يُـؤْمِـنُـوْنَ بِـاللّٰهِ وبِمَا أَخْبَـرْتَهُـمْ بِهٖ عَنِ اللّٰهِ" تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر مذکورہ کفار اللہ پر اور اللہ کی

---

❶ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں اس محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں کی خبریں انہیں دیتے ہیں ان پر ہرگز ایمان نہیں لائینگے۔) اس میں چونکہ "بِاللّٰہِ وبِمآأَخبرتَهُم بِهِ عَنِ اللّٰہِ" کے کلمات موجود ہیں، جو آیت سے حذف کردیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

گذشتہ جملوں کی طرح یہاں بھی "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِهِم" کے بعد "فَلَا تَعِیُ" اور "وَعَلٰی سَمعِهِم" کے بعد "فَلَا تَصْغٰی" کے جملے حذف کردیئے گئے ہیں۔ یہ اصل میں "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِهِم فَلَا تَعِیُ وَعَلٰی سَمعِهِم فَلَا تَصْغٰی" تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان کفار کے دلوں پر مہر لگادی ہے، پس ان کے دل حق کی بات کو محفوظ نہیں کرتے، اور ان کے کانوں پر بھی اللہ نے مہر لگادی ہے اس لئے انکے کان حق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔) اس جملہ سے چونکہ "فَلَا تَعِیُ" اور "فَلَا تَصْغٰی" کے جملے حذف کردیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَعَلٰٓی اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ﴾

اس جملہ سے بھی کچھ کلمات حذف کردیئے گئے ہیں۔ یہ اصل میں "وَجَعَلَ عَلٰی أَبصَارِهِم غِشَاوَةً فَلَا یُبصِرُونَ سَبِیلَ الهُدٰی" تھا۔ واضح رہے کہ یہاں "جَعَلَ" کو مقدر نکالنا ان قراء کے قول کے مطابق ہے جو "غِشَاوَةً" کو نصب دیتے ہیں۔ (اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے کفار کی نگاہوں پر پردہ ڈال دیا ہے، لہٰذا وہ ہدایت کا راستہ نہ دیکھتے ہیں اور نہ دیکھیں گے۔) اس جملہ سے چونکہ "جَعَلَ" اور "فَلَا یُبصِرُونَ سَبِیلَ الهُدٰی" کا جملہ حذف کردیا گیا ہے، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ﴾

مذکورہ جملہ سے بھی کئی کلمات حذف کردئے گئے ہیں، یہ اصل میں "لَهُم یَومَ القِیَامَةِ عَذَابٌ عَظِیمٌ دَائِمٌ" تھا۔ (مطلب اس کا یہ ہے کہ قیامت کے روز کفار کے لئے

بہت بڑا دائمی عذاب ہوگا۔) اسی طرح یہاں تقدیری عبارت یوں بھی ہوسکتی ہے ''وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فِي الدُّنيَا بِالقَتلِ وَالإِسرِ اَوْ بِالإِذْلَالِ وَوَضعِ الجِزيَّةِ وَفِي الآخِرَةِ بِالخُلُودِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ''۔ (مطلب اس کا یہ ہے کہ ان کفار کو دنیا میں قتل وقتال، غلامی، ذلت اور ٹیکس وجزئیہ مقرر کرکے اور آخرت میں دائمی جہنم کی آگ سے عذاب دیا جائے گا۔) مذکورہ جملہ سے چونکہ یہ سارے کلمات حذف کردیے گئے ہیں اس لئے اس میں ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (٨)﴾

ترجمہ: کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے منافقین کے قول کی حکایت ''مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الآخِرِ'' سے کی ہے، یہ جملہ فعلیہ ہے۔اس قول کی حکایت کے بعد اللہ سبحانہ نے ان پر رد کرنے کے لئے ''وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' کا جملہ ارشاد فرمایا، جو کہ جملہ اسمیہ ہے۔ منافقین کے قول کے مطابق اللہ سبحانہ کا یہ تردیدی جملہ بھی جملہ فعلیہ ہونا چاہئے تھا، تاکہ منافقین پر رد بھی انکے دعویٰ کے مطابق جملہ فعلیہ سے ہوجاتا، لیکن چونکہ جملہ فعلیہ دوام اور استمرار پر دلالت نہیں کرتا بلکہ وہ نفس حدوث فعل پر دلالت کرتا ہے اور اس کے برعکس جملہ اسمیہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، اسی دوام اور استمرار کے حصول کے لئے اللہ سبحانہ نے منافقین کے دعویٰ کے خلاف جملہ اسمیہ سے تردید کی تاکہ تمام زمانوں میں ان کے دعوائے ایمان کی نفی ہوسکے۔استمرار اور دوام کی صورت میں ''وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' کا مطلب یہ ہوگا کہ منافقین کسی حالت اور زمانہ میں ایمان کی دولت سے مالا مال نہیں ہوسکتے، یہ لوگ ماضی، حال اور مستقبل میں سے کسی بھی زمانہ میں ایمان نہیں لاسکتے۔اس مقام میں اگر ''وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' کی جگہ منافقین کے قول کے مطابق ''وَمَا اٰمَنُوْا'' بول کر جملہ فعلیہ لاتے تو

آیت میں منافقین کے دعوائے ایمان کی نفی محض ماضی کے اعتبار سے ہوتی، حال اور مستقبل کی نہیں، نیز جملہ اسمیہ کی طرح دوام واستمرار کا فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں چونکہ ایک مرتبہ "بـالـلّٰه" میں "باء" حرفِ جر کا ذکر ہو چکا، پھر اس کے بعد دوبارہ "بِـالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" میں "بـاء" حرفِ جر کا ذکر کیا گیا، اس لئے اس میں "بـاء" حرفِ جر کا تکرار پایا جا رہا ہے۔ اس میں "بـاء" کا اعادہ اور تکرار اس لئے ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ منافقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے سامنے ایمان کا دعویٰ تاکید اور زوردار انداز میں کرتے تھے۔ اس واسطے اللہ رب العزت نے ان منافقین کی تاکید سے بڑھ کر تاکیدات والے جملہ یعنی "وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ" سے تردید فرمائی۔ جس میں جملہ اسمیہ ہونے کی وجہ سے استمرار اور دوام سے تاکید آئی اور "ما" کی خبر میں "باء" حرفِ جارہ کا بھی اضافہ کیا گیا جس سے جملہ میں مزید تاکید حاصل ہوئی۔

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹)﴾

ترجمہ: وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں دھوکا دیتے ہیں اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) وہ اپنے سوا کسی اور کو دھوکا نہیں دے رہے لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مشارکة" پایا جا ہے۔ ❷ یہاں "يُخٰدِعُوْنَ" "مخادعه" مصدر سے فعل مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے، یہ بابِ مفاعلہ کے وزن پر ہے اور باب مفاعلہ کی ایک خاصیت "مشارکة" ہے، چونکہ آیت میں فعل بابِ مفاعلہ سے استعمال ہوا ہے، اس لئے اس فعل "خداع" (یعنی مکر وتدبیر) میں شرکت پائی جاتی ہے۔ یعنی منافقین

❶ تکرار اطناب کی ایک صورت ہے، اسکا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کلمہ یا جملہ مکرر اور بار بار ذکر کیا جائے۔

❷ مشارکہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی فعل اور ماخذ میں دو جانب سے شرکت ہو۔

اللہ اور مسلمانوں کے خلاف دھوکہ بازی اور مکر کرتے تھے اور اللہ بھی منافقین کے خلاف تدبیر کرتے ہیں، اس سے واضح ہوا کہ یہاں آیت میں "مشارکة" پایا جاتا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا خداع اور مکر حقیقی معنی پر محمول نہیں بلکہ منافقین کے اعمال وکردارِ بد کے مقابلہ میں بدلہ دینے کو صورتاً "خداع" کہا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں اللہ رب العزت اس سے پاک ہے، آیت میں اس لفظ کا استعمال یا مقابلۃً ہوا ہے، یا مزید سے استعمال کر کے کلام میں قوت لائی گئی ہے۔ کثرتِ الفاظ کثرتِ معانی پر دلالت کرتے ہیں، یعنی ان کا دھوکہ نہایت شدت کے ساتھ ہوتا تھا۔

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ کی طرف "خداع" کو منسوب کیا گیا ہے، اس میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے حضور منافقین کے ایمان عیاں کرنے اور کفر کو دلوں میں مخفی رکھنے کی حالت کو کسی ملک کی ایسی رعایا کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے ملک کے سلطان وقت کو دھوکہ اور چھمہ دے، یا یہ ہے کہ اس میں منافقین اللہ سبحانہ تعالیٰ کیساتھ جو معاملہ کرتے تھے اس معاملہ کی حالت کو ایسے شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو شخص نقصان کرنے کے لئے اپنے دوست کو دھوکہ دے۔ یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ اور مثال ہے، اس لئے اس میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں خداع کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف کرنے میں مجاز عقلی کا بھی احتمال ہے۔ ❷ اس آیت میں منافقین کے خداع کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف کی گئی ہے،

---

❶ استعارہ تمثیلیہ وہ استعارہ ہے جس میں ایک مرکب حالت کو دوسری مرکب حالت سے تشبیہ اور مثال دی جائے۔

❷ مجاز عقلی یہ ہے کہ کسی بھی فعل یا معنی فعل کی نسبت فاعل یا مفعول حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی یا مفعول غیر حقیقی کی طرف مناسبت کی وجہ سے کر دی جائے، یعنی کلام میں جو نسبت کسی کی طرف کی جا رہی ہو وہ نسبت ظاہراً ہو حقیقت میں نہ ہو۔

حالانکہ اللہ سبحانہ اس کا حقیقی مفعول نہیں کیونکہ منافقین اللہ تعالیٰ کو کبھی فریب نہیں دے سکتے۔ اس کے اصل مفعول تو ''رسول ومومنین'' ہیں۔جن کو کفار حقیقت میں دھوکہ دیتے تھے،لیکن چونکہ رسول ومؤمنین کو دھوکہ دینا درحقیقت اللہ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے،اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے آیت میں خداع کو اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔

مذکورہ آیت میں "ایجاز حذف" کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔ ❶ یہ آیت اصل میں ''یُخٰدِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ" تھا،اس میں سے چونکہ لفظ''رسول'' کو حذف کردیا گیا ہے،اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "توریة" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''یُخٰدِعُوْنَ" کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جو''مخادعة'' مصدر سے ماخوذ ہے،اس کے دو معنی ہیں،ایک معنی قریب ہے اور وہ معنی قریب ''دھوکہ دینے'' کے ہے، جو لفظ کے استعمال کیساتھ ہی ذہن میں آجاتا ہے، اور اس کا دوسرا معنی بعید ہے، وہ معنی بعید باطنی طور پر اللہ ورسول کی اطاعت سے روگردانی کرنے کے ہے، یہی معنی یہاں مراد لیا گیا ہے، جو فوری طور پر اخفاءِ قرینہ کی وجہ سے ذہن میں نہیں آتا،آیت میں چونکہ ایسا لفظ استعمال ہوا جس میں معنی قریب اور معنی بعید دونوں پائے جاتے ہیں،مگر مراد معنی بعید ہے،اس لئے اس میں "توریة" پایا جاتا ہے۔

❶ ایجاز حذف کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں اس محذوف کی تعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

❷ توریہ محسنات معنویہ کی ایک قسم ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا لفظ بولا جائے جس کے دو معنی ہو،ایک معنی قریب جو لفظ بولتے ہی ذہن میں آجائے اور دوسرا معنی بعید جو لفظ بولتے ہی ذہین نشین نہ ہو، بلکہ قرینہ کے مخفی ہونے کی وجہ سے کچھ دیر غور وفکر کرنے کی نوبت پڑ جائے اور یہی معنی بعید کلام میں مراد ہو۔

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾

ترجمہ: ان کے دلوں میں بیماری ہے۔

مذکورہ آیت میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں منافقین کے قلوب میں جامد جہالت و بدعقیدگی کو بیماری سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں منافقین کی جہالت اور بدعقیدگی "مشبه" (مستعار) اور بیماری "مشبه به" (مستعار منہ) ہے۔ آیت میں چونکہ "مَرَضٌ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۱۰)﴾

ترجمہ: اور ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں منافقین کے کذب گوئی کے لئے "يَكْذِبُوْنَ" فعل کیساتھ "كَانُوْا" فعلِ ناقص کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ آیت کا مفہوم اور معنی اس "كَانُوْا" کے علاوہ بھی سمجھ آجاتا ہے، مگر یہاں مندرجہ ذیل نکات کی حصول کے لئے "كَانُوْا" کا اضافہ کیا گیا ہے۔

نمبر ا: "كَانُوْا" کا اضافہ اس لئے ہوا تا کہ کلام کے مفہوم میں تاکید ہو، تاکید کی صورت میں آیت کا معنی یہ ہے کہ منافقین بہت زیادہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

نمبر ۲: یہاں "يَكْذِبُوْنَ" فعل کے ساتھ "كَانُوْا" کا اضافہ اس لئے ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ منافقین کے جھوٹ بولنے میں دوام اور تجدد پایا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین نئے نئے طریقوں سے ہمیشہ نئے نئے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱)﴾

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ مچاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

❶ استعارہ تصریحیہ یہ ہے کہ مشبہ بہ کو لفظوں میں صراحتاً ذکر کردیا جائے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْن" منافقین کے قول کا مقولہ ہے۔ اس مقولہ میں منافقین نے کلمہ حصر "اِنَّمَا" کا استعمال کیا ہے۔ منافقین کے اس قول میں کلمہ حصر اس لئے استعمال ہوا تاکہ اس میں "قصر المصوف علی الصفة" کا فائدہ حاصل ہو۔ ❶ اس میں بھی منافقین نے خود کو صفت اصلاح کیساتھ ایسا مختص کر دیا ہے کہ ان منافقین میں گویا صفت اصلاح کے علاوہ اور کوئی صفت ہی نہیں ہے، چونکہ منافقین نے خود کو صرف صفتِ اصلاح کے ساتھ ہی خاص کر دیا، بقیہ تمام اوصاف کی نفی کر دی ہے، اس لئے اس میں "قصر الموصوف علی الصفة" پایا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ منافقین کا یہ قصر "قصرِ افراد" ہے۔ ❷ یہاں چونکہ منافقین کو مسلمان کہا کرتے تھے کہ اے منافقو! تم کائنات میں فساد مت پھیلاؤ! اس لئے منافقین کو اس بات کا وہم ہوتا تھا کہ شاید مسلمان ہمارے بارے میں اصلاح کیساتھ ساتھ صفتِ فساد کی شرکت کا بھی گمان کرتے ہیں۔ تو منافقین نے کلمہ "اِنَّمَا" حصر لاکر مسلمانوں کو جواب دیا کہ ہم صفتِ اصلاح پر ہی منحصر ہیں، اس صفت اصلاح سے ہم صفت فساد کی طرف نہیں پلٹے، اس لئے تم ہمارے بارے میں اصلاح اور فساد کے اختلاط اور شرکت کا اعتقاد نہ رکھو، اس میں چونکہ منافقین نے شرکت کی نفی کر کے خود کو ایک صفت پر منحصر کر دیا تھا، اس لئے آیت میں "قصرِ افراد" پایا جاتا ہے۔ جب منافقین نے کلمہ حصریہ "اِنَّمَا" لاکر مسلمانوں کو "قصرِ افراد" کی صورت میں جواب دیا تو آگے اللہ سبحانہ نے اگلی آیت میں " اَلَآ

---

❶ مطلقاً قصر کی تعریف یہ ہے کہ کسی شئ کو کسی دوسرے شئ کیساتھ مخصوص انداز میں خاص کر دینا۔ اب قصر الموصوف علی الصفہ یہ ہے کہ موصوف کو کسی خاص صفت پر منحصر کر دیا جائے یعنی موصوف میں اس صفت کے علاوہ گویا دوسری صفت نہیں۔

❷ قصر افراد کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا مخاطب دو چیزوں میں شرکت کا اعتقاد رکھتا ہو، مگر متکلم صفت کو کسی ایک میں منحصر کر کے اعتقادِ شرکت کی تردید کر دے۔

اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفسِدُوْن'' بول کر''قصر قلبی'' کے ذریعہ منافقین کے خیال کی بھر پور تردید فرمائی۔ ❶ یہاں منافقین کا یہ خیال تھا کہ صفتِ اصلاح ان پر منحصر ہے،صفتِ فساد سے ان کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے اللہ سبحانہ نے انکے خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ نہیں تم میں ہرگز اصلاح کی صفت نہیں پائی جاتی،تم میں صرف اورصرف فساد پایا جاتا ہے، اس آیت میں چونکہ اللہ سبحانہ نے منافقین کے خیال کی تردید کرکے دوسری طرف قصر کو پلٹ دیا،اس لئے اس میں ''قصرِ قلبی'' پایا جاتا ہے۔

﴿اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ(۱۲)اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ (۱۳)﴾

ترجمہ:یادرکھو یہی لوگ فساد پھیلانے والے ہیں لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے۔خوب اچھی طرح سن لوکہ یہی لوگ بیوقوف ہیں لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے۔

اہلِ بلاغت کا ایک انداز یہ ہے کہ وہ مخاطب کی حیثیت اورخیال کے موافق جملہ کو بیان کرتے ہیں۔اگرمخاطب خالی الذہن ہوتو جملہ کوسیدھا سادہ بغیرکسی تاکید کے بیان کرتے ہیں،اوراگرمخاطب تردد،شک یاانکارمیں مبتلا ہوتواسی درجہ کی تاکید لاکر جملہ کومؤکد بیان کرتے ہیں۔گذشتہ آیت میں منافقین نے ''اِنَّمَا نَحْنُ مُصلِحُوْن'' کی صورت میں جملہ اسمیہ لاکرتاکیداورحصر کے ساتھ خودکومخلصین اوراصلاح میں منحصرقراردیا تھا۔اس لئے اللہ سبحانہ نے''اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ'' میں منافقین کی تاکید سے بڑھ کرتاکیدات لاکر ان کی تردید کردی کہ تم ہرگز اصلاح کا کام نہیں کرسکتے بلکہ تمہارا کام فساد ہی فساد کرنا ہے۔وہ تاکیدات جواللہ سبحانہ نے منافقین کےقول کی تردیداورنفی میں بیان فرمائی مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر۱:''اَلَا ''حرفِ تنبیہ، یہ حرف کلام میں زوراورتاکید کامعنی پیدا کرنے کے لیے

❶ قصر قلب کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب متکلم کے خلاف خیال رکھتا ہومگرمتکلم اس خیال کی نفی کردے۔

استعمال ہوتا ہے۔

نمبر۲: اِنَّ حرفِ مشبہ بالفعل، یہ بھی تاکید کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

نمبر۳: اِنَّھُم کے بعد دوبارہ " ھم "، ضمیر فصل کا لانا بھی تاکید کے لئے ہے۔

نمبر۴: "اَلْمُفْسِدُوْنَ" اِنَّ کی خبر ہے، اس خبر کو معرفہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ خبر کو معرفہ لانے سے بھی تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح اس آیت " اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ" میں بھی وہی تاکیدات لائی گئی ہیں جو اوپر گذر چکی ہیں، تاکہ منافقین کے خیال کی تردید اور ان کو بیوقوف قرار دینے میں کلام میں قوت اور تاکید پیدا ہو۔

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ(۱۴)﴾

ترجمہ: اور جب یہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو مذاق کر رہے تھے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں منافقین کے اقوال کی حکایت کی گئی ہے۔ منافقین جب اہلِ ایمان کی مجلس میں ہوتے ہیں تب وہ " اٰمَنَّا" کہتے ہیں، اور جب وہ اپنے طاغوتی آقاؤں کے پاس جاتے ہیں تو ان سے "اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْن" کہتے ہیں۔ منافقین کے ان دونوں قولوں کا طرز واسلوب بالکل مختلف ہے۔ وہ اس طرح کہ "اٰمَنَّا" جملہ فعلیہ کی صورت میں استعمال کیا اور "اِنَّا مَعَکُمْ " الخ جملہ اسمیہ بیان ہوا۔ طرز اور اسلوب کا یہ اختلاف اس لئے واقع ہوا تاکہ ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کیا جائے۔ اس نکتہ کو سمجھنے سے پہلے ایک تمہیدی اصول سمجھ لیا جائے، وہ نکتہ یہ ہے کہ جملہ اسمیہ میں بنسبت جملہ فعلیہ کے دوام

واستمرار پایا جاتا ہے، جبکہ یہ چیز جملہ فعلیہ میں نہیں ہے۔ یہاں بھی "اٰمَنَّا" جملہ فعلیہ لاکر یہ بتایا گیا ہے کہ منافقین کا ایمان والوں کے سامنے ایمان کا اظہار کرنا دیرپا نہیں بلکہ انکا ایمان لانا بہت ہی تھوڑے وقت کے لئے تھا، انکا ایمان لانا زیادہ سے زیادہ زبان کی حرکت کی حد تک تھا، یا صرف مسلمانوں سے ملاقات کے دورانیہ تک تھا، اس کے علاوہ منافقین کے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے برعکس "اِنَّا مَعَكُم" جملہ اسمیہ لاکر یہ بتایا گیا ہے کہ منافقوں کا ان کے سرکش طاغوتی آقاؤں سے ملاقات کرنا اوران سے تعلق رکھنا دائمی اور استمراری طور پر تھا اوران کے ان افعال میں تجدد پایا جاتا تھا۔ گویا کفار کے ساتھ منافقین کی معیت دائمی تھی اور مؤمنین کے سامنے ایمان کا اظہار وقتی اوراپنے نفع رسانی کے لئے تھا۔

﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْن(۱۴)اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۵)﴾

ترجمہ: ہم تو مذاق کررہے تھے، اللہ ان سے مذاق (کا معاملہ) کرتا ہےاورانہیں ایسی ڈھیل دیتاہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

مذکورہ مقام میں منافقین کے استہزاء کرنے کو "اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْن" بول کر بیان کیا گیا ہے، اوران کے استہزاء کے بدلے میں اللہ سبحانہ کی طرف سے انہیں سزاء اور بدلہ دیئے جانے کو "اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ" بول کر بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں جملوں میں بھی گذشتہ جملوں کی طرح اسلوب کا اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ ان میں " اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْن" والے جملہ میں " مُسْتَهْزِءُوْن" اسم فاعل کا صیغہ ہے، جبکہ "اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ "میں "يَسْتَهْزِئُ" فعل مضارع کا صیغہ ہے، چونکہ " اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ "منافقین کے عمل کا بدلہ بتانے کے لئے کہا گیا ہے، اس لحاظ سے یہاں بھی "يَسْتَهْزِئُ"فعل مضارع کی جگہ "مُسْتَهْزِئٌ"اسم فاعل کا صیغہ ہونا قرینِ قیاس تھا، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا بلکہ ان میں اختلاف آیا، یہ اختلاف اس

لئے واقع ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ اللہ سبحانہ کی طرف سے منافقین کا استہزاء کرنا وقتاً فوقتاً حالاً بعد حالٍ تجدد اور نئے نئے طریقوں سے ہوتا تھا، اب اللہ رب العزت کی طرف سے ان کے استہزاء کی سزا میں تجدد ہے، یعنی ہر دن نئی نئی سزا، اس سے مجرم کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے، اگر ایک ہی سزا روزانہ دی جائے تو مجرم اس کا عادی ہو جاتا ہے، پھر وہ سزا اس کے لیے سزا نہیں رہتی، اب جب روزانہ نئی نئی سزا ہوگی تو ہر وقت فکر مند ہوگا کہ اگلے دن کون سی سزا ہوگی، اس سے اگلے دن کون سی۔

﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "مشاکلة" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں اللہ سبحانہ کی طرف استہزاء کی نسبت کی گئی ہے، حالانکہ استہزاء دراصل لہو ولعب کی ایک صورت ہے، اللہ کی طرف اس فعل کا منسوب کرنا صحیح نہیں، لہٰذا لامحالہ ہم یہاں "يَسْتَهْزِئُ" کو مشاکلہ پر محمول کرینگے۔ وہ اس طرح کہ اس آیت میں منافقین کو اللہ سبحانہ کی طرف سے ان کے فعلِ استہزاء کے بدلہ میں سزا دیئے جانے کو ان کے استہزاء کے قرب وجوار میں آنے کی وجہ سے اسی غیر کے لفظ یعنی (استہزاء) سے بیان کیا گیا ہے، اسی لئے اس میں "مشاکلة" پایا جاتا ہے۔

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۱۴) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۵)﴾

ترجمہ: اور جب یہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے، اللہ ان سے مذاق (کا معاملہ) کرتا ہے اور انہیں ایسی ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

❶ مشاکلہ یہ ہے کہ کسی معنی کو اس کے لئے وضع شدہ لفظ سے بیان کرنے کے بجائے کسی غیر کے قرب وجوار میں آنے کی وجہ سے اسی غیر کے لفظ سے بیان کیا جائے۔

مذکورہ آیت نمبر (۱۴) اور آیت نمبر (۱۵) کے مابین "فصل" پایا جاتا ہے۔(فصل بلاغت میں ایک اہم ترین باب ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جملہ کا عطف دوسرے جملہ پر نہ کیا جائے۔دو جملوں کے درمیان عطف کو چھوڑنے کے کئی اسباب ہیں، جن میں سے ایک قوی سبب "تَوَسُّطُ بَیْنَ کَمَالِ الْاِنْقِطَاعِ وَکَمَالِ الْاِتِّصَالِ" ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ دو جملوں میں کمالِ انقطاع اور کمال اتصال کے درمیان درمیانی حالت ہو، یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب دو جملوں کے درمیان مناسبت تو ہو مگر کسی مانع اور خرابی کی وجہ سے عطف کو چھوڑ دیا جائے۔) یہاں "اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ" کا جملہ آیا ہے جس سے پہلے دو جملے ہیں۔

نمبر۱: "قَالُوْا" اگر اس پر ہم "اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ" کا عطف کریں تو مطلب غلط ہو جائے گا، کیونکہ اس صورت میں یہ منافقین کا مقولہ بن جاتا ہے، جبکہ حقیقتاً یہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا قول ہے منافقین کا نہیں۔

نمبر۲: دوسرا جملہ "اِنَّا مَعَکُمْ" ہے، اگر ہم "اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ" کا عطف اس جملہ پر کریں تو پھر اللہ سبحانہ کا منافقوں کو استہزاء کا بدلہ دینا اس وقت کے ساتھ مقید ہو جاتا ہے جب وہ اپنے سرداروں کے پاس ہوں، حالانکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا منافقوں کو بدلہ دے کر رسوا کرنا کسی بھی وقت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ مطلق ہے، اللہ تعالی انہیں ہر وقت سزا دے گا، چاہے منافقین اپنے سرداروں کے پاس ہوں یا نہ ہوں۔یہ خرابی اور مانع عطف کرنے میں موجود تھی، اسی لئے ان دونوں آیتوں میں مناسبت کے باوجود عطف ترک کر دیا گیا۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَ مَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ (۱۶)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، لہٰذا نہ ان کی تجارت میں نفع ہوا اور نہ انہیں صحیح راستہ نصیب ہوا۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں منافقین کی طرف اشارہ کرنے کے لئے "اُولٰٓئِكَ" اسمِ اشارہ بعید کا استعمال ہوا ہے، منافقین تو قریب ہی تھے، لیکن آیت میں انکے قریب ہونے کے باوجود اسم اشارہ قریب کی جگہ اسمِ اشارہ بعید کا لایا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ شر اور برائی بہت دوری کا درجہ رکھتی ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور استعارة ترشيحية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ہدایت کے بدلہ گمراہی اپنانے کو خریداری سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں ہدایت کے بدلہ گمراہی اپنانا" مشبه" اور خریداری کرنا" مشبه به" ہے، ان دونوں میں وجہ شبہ "تبادلہ" (یعنی بدل دے کر کوئی چیز لینا) ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح خریدا ی میں خرید نے والا رقم دے کر کوئی چیز اس کے بدلہ میں لیتا ہے، بالکل اس طرح منافقین بھی ہدایت دے کر اس کے بدلہ گمراہی لیتے ہیں۔ آیت میں چونکہ "اِشۡتَرَوُا" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آیت میں "استعارة ترشيحية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں چونکہ "فَمَا رَبِحَتۡ" بول کر نفع کا ذکر کیا گیا ہے اور نفع مشبہ بہ (خریداری) کا مناسب ہے، اس لئے آیت میں "استعارة ترشيحية" پایا جاتا ہے۔

﴿فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ﴾

اس میں "مجاز عقلی" پایا جاتا ہے۔ ❸ یہاں "فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ" بول کر

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ ترشیحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ یعنی مستعار منہ کے مناسبات ذکر کئے گئے ہوں۔

❸ مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل یا معنی فعل کو غیر فاعل حقیقی کی طرف منسوب کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فعل یا معنی فعل کی نسبت ظاہری اعتبار سے غیر ما ہولہ کی طرف کر دی جائے۔

فعل "رَبِحَتْ" کی نسبت تجارت کی طرف کردی گئی ہے، حالانکہ نفع پانا نہ پانا تجارت کا فعل نہیں، بلکہ صاحبِ تجارت کا فعل ہے۔ اس لئے اس فعل کا فاعل حقیقی بھی تاجر (صاحب تجارت) ہے، نفس تجارت نہیں، لیکن چونکہ تجارت نفع کا سبب اور ذریعہ ہے، اس لئے اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے ظاہراً فعل "رَبِحَتْ" کی نسبت فاعل حقیقی (صاحب تجارت) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی (نفسِ تجارت) کی طرف کردی گئی ہے، آیت میں چونکہ فعل کی نسبت بجائے فاعل حقیقی کے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "مجاز عقلی" موجود ہے۔

﴿وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "تتمیم" پائی جاتی ہے۔ (1) یہاں "وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ" کا جملہ بھی ماقبل والے جملہ کے لئے بطور "تتمیم" کے واقع ہوا ہے۔ اس سے پہلے والے جملہ میں خلاف مقصود کا کسی طرح وہم نہیں ہوسکتا، مگر اس کے باوجود قرآن کی آیت میں "وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ" کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے گذشتہ جملہ کی مزید تاکید ہوگئی کہ یہ منافقین تجارت ہو یا غیر تجارت ہرگز یہ لوگ نفع نہیں پاسکتے۔ اس آیت میں تاکید کے خاطر چونکہ "وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ" کا اضافہ کیا گیا ہے، اس لئے اس آیت میں "تتمیم" پائی جاتی ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَه ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (۱۷) اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۱۹)﴾

ترجمہ: ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ روشن کی پھر جب اس

---

(1) تتمیم اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ متکلم ایسے کلام میں جس میں خلاف مقصود کا وہم نہ ہو کوئی لفظ بڑھادے جو معنی میں کوئی نکتہ اور حسن کا اضافہ کردے۔

(آگ نے) اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یا پھر (ان منافقوں کی مثال ایسی ہے) جیسے آسمان سے برستی ایک بارش ہو، جس میں اندھیریاں بھی ہوں اور گرج بھی اور چمک بھی۔ وہ کڑکوں کی آواز پر موت کے خوف سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے ہیں۔ اور اللہ نے کافروں کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔

مذکورہ دونوں آیاتِ کریمہ میں "تشبیہ تمثیل" پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں منافقین کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو شخص آگ جلائے، جیسے ہی آگ بڑھ کر اس کے اردگرد کو روشن کر دے تو اللہ سبحانہ اس روشنی کو ختم کر دے اور اس شخص کو اندھیرے میں ہی چھوڑے رکھے۔ اس تشبیہ میں منافقین کی حالت "مشبہ" اور موصوف شخص کی حالت "مشبہ بہ" ہے۔ ان میں چونکہ وجہ شبہ متعدد امور سے مرکب ہے، اس لئے ان میں "تشبیہ تمثیل" پائی جاتی ہے۔ اس کی دوسری تقریر یوں بھی ہو سکتی ہے کہ پہلی آیت میں منافق کو آگ جلانے والے سے تشبیہ دی گئی، اور منافق کے اظہارِ ایمان کو آگ جلانے والے کی آگ کی روشنی سے تشبیہ دی گئی۔ پھر منافق کے اظہار ایمان سے فائدہ نہ ہونے کو "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ" الخ بول کر آگ کے بجھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں وجہ شبہ متعدد امور سے کشید ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ تمثیل" پائی جاتی ہے۔

اسی طرح دوسری آیت میں بھی "شبیہ تمثیل" پائی جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس آیت میں منافق کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جس شخص پر آسمان سے بارش برس رہی ہوں اور اس سے اندھیرا چھا گیا ہو، بادل گرج رہے ہوں، بجلی کڑک رہی ہو اور یہ شخص کڑک سے ڈر کر موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دینے لگے، یہ اجمالاً تشبیہ کی تقریر تھی۔ اب تفصیلاً تشبیہ کی تطبیق ملاحظہ ہو۔ اس میں اسلام کو بارش سے تشبیہ دی گئی

---

❶ تشبیہ تمثیل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ تشبیہ متعدد امور سے منتزع ہو۔

ہے۔ (وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح بارش سے بنجر زمین زرخیز ہو کر آباد ہو جاتی ہے، اسی طرح اسلام سے بھی لوگوں کے مردہ قلوب زندہ ہو جاتے ہیں۔) پھر اس کے بعد کفار و منافقین کے شبہات کو اندھیروں سے۔ قرآن میں موجود وعدوں اور وعیدوں کو بادل اور بجلی سے، اسی طرح کفار و منافقین کو پہنچنے والے فتنہ فساد اور تکالیف کو بجلی کی کڑک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں وجہ شبہ چونکہ متعدد امور سے منتزع ایک مرکب حالت ہے، اس لئے اس آیت میں بھی "تشبیه تمثیل" پائی جاتی ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَه ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں منافقین کی مثال دینے کے لئے ضمائر کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ اس میں "اِسْتَوْقَد" اور "حَوْلَه" میں ضمیر واحد لائی گئی، پھر اس کے بعد "بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ" میں منافقین کے لئے "هم" ضمیر جمع لائی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ضمائر کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ضمائر کا یہ اختلاف دونوں جگہ الگ الگ حیثیتوں کی بنیاد پر پیش آیا ہے۔ "اِسْتَوْقَد" اور "حَوْلَه" سے پہلے "الَّذِيْ" اسم موصول کا لفظ واحد تھا، اس لفظ واحد "الَّذِي" کا اعتبار کرتے ہوئے آیت میں "اِسْتَوْقَد" اور "حَوْلَه" میں ضمیر مفرد لائی گئی۔ یہ اس لئے ہوا کیونکہ تمام منافقین ایک ہی قول اور فعل پر ڈٹے ہوئے تھے۔ دوسری جگہ جو جمع کی ضمیر لائی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے ہے۔ چونکہ یہ مقام تمام منافقین کے احوال کی قباحت رذائل اور گمراہی کو بیان کرنے کا مقام ہے، لہٰذا حکم منافقین کے ہر ہر فرد پر لگنا چاہیے تا کہ مقام کا تقاضہ پورا ہو۔ حکم کو ہر ہر فرد کے لئے ثابت کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ یہاں ضمیر جمع کی لائی جائے، اس لئے یہاں معنی و مقام کی رعایت کرتے ہوئے ضمیر جمع کی لائی گئی۔

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۱۸)﴾

ترجمہ: وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، چنانچہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور "أصلية" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں منافقین کو گونگے بہرے اور اندھے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں منافقین "مشبه" اور گونگا، بہرا اور اندھا شخص "مشبه به" ہے۔آیت میں چونکہ "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" کے الفاظ سے مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے،اس لئے اس میں " استعاره تصريحية" پایا جاتا ہے۔اس میں "استعاره أصلية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں چونکہ مذکورہ الفاظ غیر مشتقات ہیں اور ان میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت کریمہ "استعارة أصلية" پایا جاتا ہے۔

بعض اہلِ بلاغت فرماتے ہیں کہ اس آیت میں "تشبيه بليغ" بھی پائی جاتی ہے۔ ❸ اس میں منافقین کو گونگے، بہرے اور اندھے شخص سے تشبیہ تو دی گئی ہے،مگر ان دونوں میں وجہ شبہ مذکور نہیں، وجہ شبہ ان دونوں میں "عدم استفادہ" ہے، یعنی جس طرح گونگا، بہرا اور اندھا آدمی اپنے حواس سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح منافقین بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔اسی وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں منافقین کو ایسے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے، آیت میں چونکہ وجہ شبہ اور حرف تشبیہ مذکور نہیں،اس لئے اس میں " تشبيه بليغ" پائی جاتی ہے۔

﴿يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❹ یہاں "أصابع" کا لفظ

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جو اسمِ جامد یعنی الفاظ غیر مشتقات میں واقع ہو۔

❸ تشبیہ بلیغ یہ ہے کہ کلام سے حرف تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں حذف کر دیئے جائے۔

❹ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو، بلکہ سببیت، جزئیت، حالیت یا ما کان علیہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

استعمال ہوا ہے۔اور یہ جمع ہے ”اصبع “ کی۔اس کا حقیقی معنی ”انگلی“ کے ہے اور مجازی معنی ”پورے“ کے ہے۔ یہاں حقیقی معنی مراد نہیں لیا جاسکتا کیونکہ پوری انگلی کان میں ڈالنا ممکن نہیں، اس لئے آیت میں ”أصابع “ کا مجازی معنی یعنی ”پورے“ ڈالنا مراد لیا جائیگا۔اصابع کے ان دونوں (معنی حقیقی اور مجازی) کے درمیان علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ جزئیت اور کلیت کا ہے، کیونکہ ”پوری انگلی“ کل اور ”پورے“ جزء ہے، چونکہ ان کے درمیان علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ کلیت، جزئیت کا ہے،اس لئے آیت میں ” مجاز مرسل “ پایا جاتا ہے۔

﴿اَصَابِعَهُم﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں ”اَصَابِعَ “ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، حالانکہ تمام انگلیوں کو کانوں میں بیک وقت ڈالنا ممکن ہی نہیں، اس لئے یہاں جمع کی جگہ مفرد کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، لیکن یہاں جمع کو مفرد پر اس لئے ترجیح دی گئی تا کہ ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کیا جائے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں انگلی سے کوئی متعین اور مخصوص انگلی مراد نہیں، کیونکہ انگلی ڈالنے کا وقت دہشت اور سختی کا وقت ہے، اس لئے لاعلی التعین جو انگلی بھی منافقین کو میسر ہو، اس سے منافقین اپنے کانوں کو بند کردیتے ہیں اور بغیر کسی ترتیب اور تعیین کے انگلیاں کانوں میں ٹھونسنے کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں مفرد پر جمع کو ترجیح دی گئی ہے۔

﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾

مذکورہ آیت مبارکہ میں لفظ ”رَعْدٌ“ اور ”بَرْقٌ“ مفرد اور ”الصَّوَاعِقِ“ جمع لائے گئے ہیں، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ لفظ ”رَعْدٌ“ اور ”بَرْقٌ“ اپنے اصل کے مطابق ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ الفاظ مصدر ہیں، مصدر ہونیکی دلیل عرب کا یہ قول ہے ”رَعَدتِ السَّمَاءُ

رَعُداً و بَرَقَتُ بَرُقَا" اس قول میں " رَعُدًا" اور " بَرُقًا" مفعول مطلق ہے اور مفعول مطلق مصدر ہوا کرتا ہے۔ اور مصدر کی جمع نہیں لائی جاتی، اسی لئے آیت میں بھی "رَعُدٌ" اور "بَرُقٌ" جمع کی صورت میں ذکر نہیں کئے گئے، بلکہ مصدر کو ان کے اصل کے مطابق مفرد پر چھوڑا گیا تاکہ اصل پر عمل ہو۔

﴿اَوُ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "السَّمَآءِ" میں "الف لام" داخل کر کے اسے معرفہ بنایا گیا ہے، اس کو معرفہ لا کر ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ بارش کا برسنا صرف ایک جانب یا ایک افق سے نہیں ہے، بلکہ ہر ہر افق سے بارش کا برسنا مراد ہے، اور آسمان کا ہر ایک افق گویا مستقل ایک آسمان ہے، اسی لئے " السَّمَآءِ" معرفہ لایا گیا۔ آیت کا مطلب اب یہ ہوگا کہ آسمان سے جو بارش برسی وہ ایسے بادلوں سے برسی تھی جو تمام آسمان کے آفاق واطراف پر چھائے ہوئے تھے۔

﴿اَوُ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيُهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعُدٌ وَّ بَرُقٌ يَجُعَلُوُنَ اَصَابِعَهُمُ فِيٓ اٰذَانِهِمُ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الُمَوُتِ وَاللّٰهُ مُحِيُطٌ بِالُكٰفِرِيُنَ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "وَاللّٰهُ مُحِيُطٌ بِالُكٰفِرِيُنَ" والے جملہ میں "الاظہار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں سے "وَاللّٰهُ مُحِيُطٌ بِالُكٰفِرِيُنَ" سے پہلے منافقین کا ذکر "وَمِنَ النَّاسِ" کی صورت میں ہو چکا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں بھی "وَاللّٰهُ مُحِيُطٌ بِالُكٰفِرِيُنَ" کی جگہ "وَاللّٰهُ مُحِيُطٌ بِهِمُ" بول کر ضمیر لانا چاہئے تھی، تاکہ یہ ضمیر گذشتہ مرجع کی طرف لوٹ جاتی، مگر اس میں " بِهِمُ " بول کر ضمیر کی جگہ "اَلُكٰفِرِيُنَ" اسم ظاہر کا استعمال کیا گیا، اس سے واضح ہوا کہ یہاں " الاظہار فی مقام الاضمار" پایا جاتا

(1) اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو ضمیر کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لایا جائے، اور یہ کسی فائدہ کی غرض سے ہوتا ہے۔

ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ یہاں منافقین کی جو دہشت زدہ حالات اور امور کا بیان ہوا وہ ان کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے، ان کے کفر کے سبب ہی ان پر ایسے حالات ہموار ہوتے ہیں۔

﴿یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَ اَبْصَارِھِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۰)﴾

ترجمہ: ایسا لگتا ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے جائے گی، جب بھی ان کے لئے روشنی کر دیتی ہے وہ اس (روشنی) میں چل پڑتے ہیں اور جب وہ ان پر اندھیرا کر دیتی ہے تو وہ کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے سننے اور دیکھنے کی طاقتیں چھین لیتا، بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں منافقین کے متعلق "مَّشَوْا فِیْهِ" میں بتایا گیا ہے کہ جب انہیں تھوڑی سی روشنی ملتی تو وہ چلنا شروع کر دیتے تھے۔ اس میں " مَّشَوْا فِیْه" بول کر چلنے کا ذکر تو ہوا، مگر "سَعَوْا" یا "عَدَوْا" بول کر چلنے سے بھی زیادہ قوی تر فعل یعنی بھاگنے، دوڑنے کا ذکر چھوڑ دیا گیا، گویا آیت میں چلنے کو دوڑنے کے فعل پر ترجیح دی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ منافقین کمالِ دہشت، خوف اور حیرانگی کی وجہ سے بھاگنے، دوڑنے پر کسی طرح قادر نہیں۔

﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۲۱)﴾

ترجمہ: اے لوگو اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں تا کہ تم متقی بن جاؤ۔

مذکورہ آیت کریمہ میں لوگوں کو عبادت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے لفظ "رَبّ" کی اضافت "کُم" ضمیر کی طرف کرتے ہوئے اپنی صفتِ ربوبیت کے عنوان کو بیان فرمایا ہے۔ یہ عنوان اس لئے بیان کیا گیا تاکہ مخاطبین کی فخامت اور تعظیم بیان ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اے لوگوں تم بہت ہی عظیم اور مرتبہ والے ہو کہ اللہ سبحانہ نے اپنے "رَبّ" ہونے کو تمہاری طرف منسوب کیا۔ اور اللہ تعالی نے اپنی تمام صفات میں سے لفظِ "رب" کا انتخاب کیا، رب کہتے ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ انتہا تک پہنچانے والا، تو رب وہ ہے جو بے جان نطفہ سے انسان بنا کر موت تک تمام انعامات سے نوازتا ہے، لہذا عبادت اسی ذاتِ عالی کی کرو جس کے بے پناہ انعامات اور احسانات ہیں بندے پر۔

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۲)﴾

ترجمہ: (وہ پروردگار) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا، اور آسمان کو چھت اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل نکالے، لہذا اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم (یہ سب باتیں) جانتے ہو۔

مذکورہ آیت کریمہ میں "مقابلة" پایا جاتا ہے۔ (۱) یہاں پہلے "اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا" میں دو موافق معانی بیان کئے گئے ہیں:

نمبر ۱: "اَلْاَرْضَ" بول کر زمین کا ذکر ہو کیا گیا۔

نمبر ۲: "فِرَاشًا" بول کر زمین کا بچھا ہوا ہونا بتایا گیا۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے موافق بایں معنی ہیں کہ ان میں باہمی کوئی تضاد نہیں، آیت میں پہلے ان موافق معنوں کو بیان

(۱) مقابلہ یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو یا زیادہ موافق معنوں کو بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد علی الترتیب ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کی ضد لائی جائے۔ واضح رہے کہ یہاں موافق امور سے مراد وہ امور ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

کرنے کے بعد آگے بالترتیب ان میں سے ہر ایک کی ضد لائی گئی۔ ”وَالسَّمَآءَ“ بول کر زمین کی ضد (آسمان) کا ذکر کیا گیا اور ”بِنَآءً“ بول کر ”فِرَاشًا“ کی ضد (بلندی) کا ذکر کیا گیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”مقابلة“ موجود ہے۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾

ترجمہ: اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو، جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنالاؤ۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ ”عَبْد“ کی اضافت ”نَا“، ضمیرِ متکلم کی طرف کی گئی ہے، جس کا مصداق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اضافت سے کبھی تو مضاف کی تعظیم وتکریم اور شرافت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی مضاف الیہ کی۔ اس آیت میں بھی لفظ ”عَبْد“ کی اضافت اللہ رب العزت نے اپنی طرف کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شرافت کو بیان کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان بندے ہیں۔

﴿اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً...... الخ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا...... الخ﴾

اس مقام میں ”التفات من الغيبة إلى المتكلم“ پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں خلّاقِ عالم نے اپنی قدرت کے دلائل اور نشانیاں بتانے کے لیے ”جَعَلَ“ اور ”أَنْزَلَ“ وغیرہ میں غائب کے الفاظ استعمال کئے تھے، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں نزول

---

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف لانے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو غائب کے الفاظ سے تکلم کے الفاظ کی طرف پھیر دیا جائے، یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو الفاظِ غائب کا تقاضہ کرے مگر کلام میں غائب کی جگہ تکلم کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

قرآن کے لیے ''نَزَّلْنَا''، جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ماقبل کی موافقت کی وجہ سے یہاں بھی غائب کا صیغہ استعمال ہوتا، مگر اس آیت میں غائب کے بجائے متکلم کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام میں ''التفات من الغيبة إلى المتكلم'' پایا جاتا ہے۔ اس میں یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ مُنَزَّل (قرآن کریم) اور مُنَزَّل علیہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت اور فخامتِ شان بیان کی جائے۔ تکلم کے اس صیغہ میں قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور کرامت کا جو مفہوم آشکارا ہوتا ہے وہ غائب کے صیغہ سے نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں اللہ سبحانہ نے نزول قرآن کی نسبت '' نَا''، ضمیرِ تعظیم کے ذریعہ اپنی طرف کی ہے، اسی لئے اس میں غائب کو چھوڑ کر تکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس آیت کا مطلب اب یہ ہوگا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت اونچے مقام و مرتبہ والے ہیں اور وہ ہمارے خاص اور معزز بندے ہیں۔

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (23)﴾

ترجمہ: اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ''فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ'' میں ''فَاْتُوْا'' فعل امر استعمال ہوا ہے۔ فعلِ امر اصل میں اس لئے وضع ہوا تاکہ متکلم علی وجہ الاستعلاء (متکلم خود کو بڑا سمجھ کر) مخاطب سے کوئی فعل طلب کرے۔ یہی فعلِ امر کا اصل مقصد ہے، مگر کبھی کبھی فعل امر اس غرض سے ہٹ کر دوسرے اغراض کے لئے بھی استعمال ہوا کرتا ہے، جس میں سے ایک غرض ''تعجیز'' ہے۔ ❶

❶ تعجیز کا مطلب یہ ہے کہ فعلِ امر کے ذریعہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے سے عاجز قرار دیا جائے۔

اس آیت میں بھی "فَـاْتُـوْا" اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہ "تـعـجیز" کے لئے استعمال ہوا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ "اے قرآن میں شک کرنے والوں تم قرآن کے مثل ایک چھوٹی سی سورت لانے سے بھی عاجز اور مجبور ہو،تم ہرگز اس کی مثل نہیں لا سکتے"۔

﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ ﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "سُـوْرَةٍ" نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی کبھی شئی میں عمومیت اور شمولیت لانا مقصود ہوتا ہے،یعنی یہ بتایا جاتا ہے کہ حکم تمام افراد کو عام اور شامل ہے۔اس آیتِ کریمہ میں بھی "سُوْرَة" کو نکرہ اس لئے لایا تاکہ یہ قرآن کی تمام سورتوں کو عام اور شامل ہوجائے۔اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم قرآن کی کسی بھی سورت کی طرح کوئی سورت لاکر دکھادو،تم ہاتھ اور پیر مار کر خود کو تھکا تو سکتے ہو،مگر کسی بھی سورت کی نظیر نہیں لا سکتے۔

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (۲۴) ﴾

ترجمہ: پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کرسکو اور یقیناً کبھی نہیں کرسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے،وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا" اور "فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" کے درمیان "وَ لَنْ تَفْعَلُوْا" جملہ معترضہ واقع ہوا ہے۔جملہ معترضہ واقع ہونے کو فن بلاغت میں "الاعتراض" کہا جاتا ہے۔❶ یہاں "فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا" اور "فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ" شرط اور جزاء ہونے کی وجہ سے معناً ایک دوسرے سے مربوط کلام ہیں۔آیت میں چونکہ ان دونوں مربوط کلام کے درمیان "وَلَنْ

❶ اعتراض اطناب کی ایک صورت ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ دو مربوط جملوں کے درمیان کسی لفظ یا جملہ کو لایا جائے،اور یہ جملہ معترضہ کسی غرض اور مقصد کے لئے لایا جاتا ہے۔

تَفْعَلُوْا" کا جملہ لایا گیا ہے، اس لئے اس میں "وَلَنْ تَفْعَلُوْا" بطور جملہ معترضہ کے واقع ہوا ہے، اور یہ جملہ معترضہ اس لئے لایا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ سورت کی طرح اپنی طرف سے کوئی کلام لانے سے عاجز ہونا یہ صرف ماضی ہی کی بات نہیں، بلکہ یہ حال اور مستقبل میں بھی اس کا مثل نہیں لا سکتے، لفظِ "لـن" کے ساتھ کلام کو مؤکد کر کے کہا یہ ہرگز مستقبل میں بھی نہیں لا سکتے، اور یہ چیلنج وہی ذات کرسکتی ہے جس کا علم تمام زمانوں میں محیط ہو، اب قرآن کی پیشین گوئی سو فیصد سچی ہے کہ وہ آج تک قرآن کے مثل فصاحت وبلاغت میں کوئی چھوٹی سورت بھی نہیں لا سکے، چہ جائیکہ وہ قرآن کی مثل پوی کتاب بنا کر لائیں۔

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ (۲۴)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ کے "فَاتَّقُوا النَّارَ" والے جملہ میں "ایجاز قصر" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "فَاتَّقُوا النَّارَ" چھوٹی سی عبارت ہے، مگر اس عبارت میں بہت سے معانی اور مفاہیم سمیٹ دے گئے ہیں۔ یہ عبارت اصل میں "فَاِنْ عَجِزْتُمْ عَنِ الْاِتْیَانِ بِمَا ذُکِرَ فِیْ الْحَالِ وَالْمُسْتَقْبِلِ وَالْمَاضِیْ فَاتَّقُوا النَّارَ بِتَصْدِیْقِکُمْ بِالْقُرْآنِ" تھا۔ مطلب اس کا یہ کہ اے منکرینِ قرآن اگر تم حال، مستقبل اور ماضی میں قرآن کی سورتوں کی نظیر لانے سے عاجز ہو گئے ہو تو پھر قرآن کی تصدیق کر کے خود کو ایسی آگ سے محفوظ کر لو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ اس مفہوم میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ "فَاتَّقُوا النَّارَ" چھوٹی سی عبارت ہونے کے باوجود اپنے اندر کتنے معانی سمو ہوئی ہے۔ یہاں چونکہ اس چھوٹی عبارت سے بہت سے معانی بیان کر دئے گئے اور عبارت کی غرض بھی واضح ہوگئی، اس لئے اس میں "ایجاز قصر" پایا جاتا ہے۔

❶ ایجاز قصر یہ ہے کہ عبارت مختصر ہو اور معانی زیادہ ہو، مگر اس مختصر عبارت کے ساتھ ساتھ مقصد کی وضاحت بھی ہو جائے۔

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَ اُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ٭ۙ وَّ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ (۲۵)﴾

ترجمہ: اور جولوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کوخوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغات (تیار) ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جب کبھی ان کو ان (باغات) میں سے کوئی پھل رزق کے طور پر دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا اور انہیں وہ رزق ایسا ہی دیا جائے گا جو دیکھنے میں ملتا جلتا ہوگا اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان (باغات) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

مذکورہ آیت کریمہ کے لفظ "الْاَنْهارُ" میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "الْاَنْهارُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی ہے (نہریں)، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ سب کو یہ بات معلوم ہے کہ نہریں نہیں بہتی بلکہ نہروں میں موجود پانی بہتا ہے، اس لئے لامحالہ آیت میں اس لفظ کا مجازی معنی مراد لیا جائیگا اور وہ مجازی معنی (نہروں کا پانی) ہے۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ حالیت اور محلیت کا ہے، کیونکہ پانی حال اور نہریں محل ہے، گویا آیت میں محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے۔ آیت میں چونکہ ایسا لفظ پایا گیا جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی میں محلیت، حالیت کا علاقہ ہے اس لئے اس میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔

﴿كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ﴾

مذکورہ آیت کریمہ کے جملہ "هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا" میں "تشبیہ بلیغ" پائی جاتی

---

❶ مجاز مرسل وہ ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو، بلکہ سببیت، جزئیت، حالیت، یا ما کان علیہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

ہے۔ ❶ یہاں جنتی کو دیا جانے والے رزق کو پہلے دنیا میں دیئے گئے رزق سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں جنتی کو دیا جانے والا رزق "مشبه" اور دنیا میں ملنے والا رزق "مشبه به" ہے۔ان دونوں میں وجہ شبہ، نام اور رنگ وشکل ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا کے رزق کے نام، رنگ وشکل ہے بالکل اسی طرح جنت کے ان ارزاق کے نام اور رنگ وشکل ہوں گے۔آیت میں چونکہ یہ وجہ شبہ اور حرفِ تشبیہ مذکور نہیں ہے، اس لئے اس میں "تشبیہ بلیغ" پائی جاتی ہے۔پھلوں کے جو نام، رنگ اور شکل وغیرہ ہے، وہی جنت میں بھی ہوں گے، لیکن ذائقہ اور لذت میں بہت فرق ہوگا، صرف نام اور رنگ یکساں ہوگا تاکہ طبیعت اس کی طرف مائل ہو، لیکن اس کا ذائقہ سب سے مختلف ہوگا، اب اللہ چاہے تو نئے پھل بھی پیدا کرسکتا ہے، لیکن پہلی مرتبہ کھانے والا یہ سمجھے گا کہ اس کا ذائقہ ہی اسی طرح ہے، کیونکہ اس نے اِس سے پہلے اس طرح کا پھل نہیں کھایا ہوگا، لیکن جب دنیا کے ہم نام پھل جنت میں دیکھے گا تو طبیعت اس کی طرف مائل ہوگی، جب کھائے گا تو اس کا ذائقہ سب سے مختلف ہوگا۔

﴿وَلَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں جنتیوں کو ملنے والی عورتوں کی صفت "مُّطَهَّرَةٌ" اسم مفعول سے لائی گئی ہے۔اسم فاعل یعنی "طَاهِرَةٌ" یا "مُطَهِّرَةٌ" نہیں کہا گیا، بلکہ اسمِ مفعول استعمال ہوا ہے۔ایسا اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ جنت میں جنتیوں کے لئے عورتوں کو پاک صاف رکھنے والی کوئی ذات ہوگی تو وہ اللہ رب العزت کی ہوگی۔اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حیض ونفاس، بول براز، حسد، کینہ اور بغض ونفرت سے پاک کیا ہوا ہے، یعنی وہ ظاہری اور باطنی عیوب سے پاک ہوں گی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔یہاں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے لئے

---

❶ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں مذکور نہ ہوں۔

"یَسْتَحْیِ" **فعل** استعمال ہوا ہے، اس کا معنی (نفس کا سمٹ جانا اور شرم وحیاء کرنے کے) ہے، مگر یہاں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ حیاء ایسی چیزوں کی صفت ہے جن کے اجسام ہے، اور اللہ رب العزت اس سے پاک ہے، اس لئے یہاں استحیاء کو حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جائیگا، ورنہ اللہ سبحانہ کے لئے جسم کا ثبوت لازم آئے گا۔ لہٰذا لامحالہ آیت میں **فعل** کا مجازی معنی (ترک کرنا) مراد لیا جائیگا۔ ان دونون معنوں میں علاقہ لزوم کا ہے، کیونکہ حیاء کرنا ملزوم اور ترک کرنا اس کا لازم ہے، ظاہری سی بات ہے کہ جب کسی کو کسی کام سے حیاء آتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اس **فعل** کو ترک کردیتا ہے، اسی لئے ترک کرنا حیاء کا لازم ہے، آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا مجازی معنی مراد لیا گیا اور لفظ کے حقیقی ومجازی معنی کے درمیان علاقہ لزوم کا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ چھوٹی چھوٹی مثالیں دینا ترک نہیں کرے گا۔

﴿وَ اَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (۲۶)﴾

ترجمہ: البتہ جو لوگ کافر ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ بھلا اس (حقیر) مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے؟ (اس طرح) اللہ اس مثال سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے (مگر) وہ گمراہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہیں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا" کافروں کے قول کی حکایت ہے، اس قول میں کفار نے "ھٰذَا" اسم اشارہ کا استعمال کیا ہے، اسمِ اشارہ کئی اغراض اور مقاصد کے لئے استعمال ہوا کرتا ہے، ان میں سے ایک غرض ومقصد "تحقیر" ہے۔ ❶ اس قول میں جو "ھٰذَا" استعمال ہوا ہے، وہ بھی مشار الیہ یعنی مچھر یا اس سے چھوٹی چیزوں کی حقارت بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس صورت میں اس قول کا مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ سبحانہ وتعالیٰ بڑی

❶ تحقیر کا مطلب یہ ہے کہ اسمِ اشارہ کے ذریعہ کسی شئی کی حقارت اور ذلت بیان کی جائے۔

عظمت والے ہونے کے باوجود اتنی حقیر اور رزیل چیزوں کی مثال دیکر کیا ارادہ کرتے ہیں؟''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا(۲۶)﴾

ترجمہ: بیشک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ (کسی بات کو واضح کرنے کے لئے) کوئی بھی مثال دے، چاہے وہ مچھر (جیسی معمولی چیز) کی ہو، یا کسی ایسی چیز کی جو مچھر سے بھی زیادہ (معمولی) ہو۔

واضح رہے کہ جب یوں کہا جائے کہ قرآن میں کوئی لفظ اضافی یا زائد ہے، تو اس کا بالکل یہ مطلب نہیں کہ وہ لفظ لغو وفضول ہو، کیونکہ قرآن مکمل طور پر رشد وہدایت اور کمالات کا نام ہے، اس لئے اس میں حشو اور لغو الفاظ آ ہی نہیں سکتے، لہٰذا زائد یا اضافی الفاظ کا معنی یہ ہوگا کہ وہ زائد لفظ قرآن میں کسی متعین اور مخصوص معنی کے لئے وضع نہیں ہوا، البتہ وہ لفظ دوسرے الفاظ کیساتھ ملکر کلام میں قوت اور طاقت دے گا، الفاظ کے اضافی اور زائد ہونے کا یہی مطلب ہے۔ مذکورہ تفصیل کے بعد اب آیت میں موجود نکتہ بلاغت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ آیت میں ''مَثَلًا'' کے بعد لفظ ''مَـــا'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے بڑھایا گیا تاکہ ممثل بہ (یعنی مچھر وغیرہ) کی حقارت اور غیر اہم ہونے کے مفہوم میں خوب تاکید اور قوت پیدا ہو۔ آیت کا اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ مچھر جیسی حقیر یا اس سے بھی زیادہ خسیس اشیاء سے مثال دینا نہیں چھوڑے گا، بلکہ جس شے کی مثال اللہ کو ممثل لہ کے مناسب معلوم ہوتی ہے، اسی شئی کی مثال اللہ تعالیٰ بلاتوقف بیان کردیتے ہیں۔ اصل چیز مثال کا ممثل لہ کے مطابق ہونا ہے نہ کہ مُمثّل کے۔

﴿الَّـذِیْـنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ(۲۷)﴾

ترجمہ: وہ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں اور جن

رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ایسے ہی لوگ بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة مكنية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں عہد و پیمان کو رسی سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں عہد و پیمان "مشبہ" اور رسی "مشبہ بہ" ہے۔ آیت میں "مشبہ به" (رسی) مذکور نہیں، مگر "عَهْدَ اللّٰهِ" بول کر مشبہ (عہد و پیمان) کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں چونکہ مشبہ مذکور اور مشبہ بہ محذوف ہے لیکن "يَنْقُضُوْنَ" بول کر مشبہ بہ (رسی) کے ایک لازم یعنی توڑنے کو ذکر کر کے مشبہ بہ (رسی) کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں "استعارة مكنية" پایا جاتا ہے۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸)﴾

ترجمہ: تم اللہ کے ساتھ کفر کا طرزِ عمل آخر کیسے اختیار کر لیتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اسی نے تمہیں زندگی بخشی پھر وہی تمہیں موت دے گا پھر وہی تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا اور پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

یہاں دوسری آیت میں "التفات من الغيبة إلى الخطاب" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں پہلی آیت میں کفار کے متعلق "كَفَرُوْا" استعمال ہوا ہے جو غائب کا صیغہ ہے، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں کفار کو "تَكْفُرُوْنَ وَكُنْتُمْ" اور "فَاَحْيَاكُمْ" میں خطاب کے الفاظ

---

❶ استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ مذکور ہو اور مشبہ بہ کو حذف کر دیا جائے، البتہ مشبہ بہ کے کسی لازم کو ذکر کر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

❷ یہ مقتضائے ظاہر اور کلام کے سیاق وسباق کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ کرے مگر کلام میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ لائے جائیں۔

سے پکارا گیا ہے، حالانکہ گذشتہ آیت کے مطابق مقتضائے حال کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں بھی "کَیْفَ یَکْفُرُوْن" اور "کَانُوْا" وغیرہ بول کر غائب کے الفاظ استعمال کئے جاتے، لیکن یہاں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اس سے واضح ہوا کہ اس دوسری آیت میں "التفات من الغیبة إلی الخطاب" پایا جاتا ہے، یہ التفات اس لئے ہے تاکہ کفار کی خوب توبیخ اور زجر ہو اور ان کے کفر پر خوب تعجب کا اظہار ہو۔

﴿یُضِلُّ بِهٖ کَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ کَثِیْرًا(۲۶) وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ(۲۷)﴾

یہاں پہلی آیت کے لفظ "یُضِلُّ" اور "یَهْدِیْ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس میں "یُضِلُّ" (ضَلَالٌ) مصدر سے مشتق ہے اور فعل مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے، اس کا معنی (گمراہ کرنے) کے ہے اور "یَهْدِیْ" ہدایت مصدر سے مشتق ہے، فعلِ مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے، اس کا معنی (رشد وہدایت دینے) کے ہے۔ آیت میں چونکہ یہ دونوں مقابل معانی (ہدایت دینا اور گمراہ کرنا) جمع کر دیئے گئے ہیں، اس لئے ان معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿یُضِلُّ بِهٖ کَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ کَثِیْرًا (۲۶)﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گمراہ کرنے کو ہدایت دینے پر مقدم کر دیا ہے، یہ بات واضح رہے کہ جب کسی کلام میں کسی لفظ کو مقدم کیا جاتا ہے، تو اس کے تقدیم کی وجہ ترجیح ہوا کرتی ہے، یہاں بھی گمراہی کو ہدایت پر مقدم کرنے کی وجہ ترجیح پائی جاتی ہے، جس کے سبب گمراہی کو ہدایت پر مقدم کر دیا گیا، وہ یہ ہے کہ کفار اللہ سبحانہ کی پیش کردہ مثال کے بارے میں جو سوال کرتے ہیں اس کے جواب میں ایسی شئی کا ذکر ہونا چاہیے جو

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

دفعتاً سنتے ہی ان کے کانوں کے نقار خانے بجا ڈالے، جواب سن کر انہیں برا لگے اور ان کا دل پارہ پارہ ہو جائے، یہ اس وقت ہو سکتا تھا جب گمراہ کا ذکر پہلے ہو، اسی لئے آیت میں گمراہ کرنے کے ذکر کو ہدایت دینے پر مقدم کیا ہے۔

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا (۲۶)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "يُضِلُّ" اور "يَهْدِیْ" فعل مضارع ہیں، حالانکہ اس مقام میں ماضی کے صیغے بھی ہو سکتے تھے، مگر اس آیت میں مضارع کو ماضی کے صیغوں کے پر اس لئے ترجیح دی گئی تا کہ گمراہ کرنے اور ہدایت دینے کے معنی میں استمرار اور تجدد کا معنی پیدا ہو، اور یہ فائدہ فعل ماضی سے حاصل نہیں ہوتا، اسی لئے ان کو چھوڑ دیا گیا۔ استمرار اور تجدد کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالی اس مثال کے ذریعہ بہتوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں اور بہتوں کو ہدایت دیتے رہتے ہیں، یعنی یہ افعال وقتاً فوقتاً جاری رہتے ہیں۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰)﴾

ترجمہ: اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ کہنے لگے کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ "رَبُّ" کی اضافت (کاف) ضمیر خطاب کی طرف کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی صفتِ ربوبیت کے عنوان کو بیان فرمایا ہے۔ اس میں کاف ضمیرِ مخاطب سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت ہے۔ آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف "رَبُّ" کی اضافت کرتے ہوئے اللہ کی صفتِ ربوبیت کا عنوان

اس لئے بیان ہوا، تا کہ آپ کے عظیم الشان مقام کو دیکھ کر آپ کی تکریم وشرافت بیان کی جائے۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾

اس آیتِ کریمہ میں نحوی ترکیب کی رو سے "قَالَ رَبُّكَ" کا جملہ قول اور "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" قول کا مقولہ ہے۔ اصول کے مطابق قول کے بعد متصلاً مقولہ ذکر کرنا چاہئے تھا، مگر اس آیت میں مقولہ سے پہلے "لِلْمَلٰٓئِکَةِ" بول کر جار مجرور کو مقدم کر دیا گیا ہے۔ ایسا مندرجہ ذیل نکات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

نمبر۱: ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ فرشتوں کی اہمیت اور مقام معلوم ہو۔

نمبر۲: قول کے بعد مقولہ سے پہلے جار مجرور کو اس لئے مقدم کیا تا کہ سامعین کو اگلی بات سننے کا شوق ہو اور سامع یہ جستجو کرے کہ بات فرشتوں سے کہی جا رہی ہے، جس کا مطلب ہے کہ بات بڑی اہم ہوگی، اس لئے سماعت پر توجہ دینی چاہئے۔

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ فرشتوں کے قول کی حکایت ہے، اس میں "اَتَجْعَل" کا ہمزہ ہمزۂ استفہامیہ ہے۔ حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں جاننے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، لیکن کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اپنے اصل معانی کے لئے استعمال نہیں ہوتے بلکہ اصل معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی واغراض کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی "تعجب" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہامیہ کو تعجب کے لئے استعمال کیا جائے۔ مذکورہ آیت میں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں نہیں ہے کیونکہ فرشتوں کو یقینی طور پر معلوم تھا کہ اللہ سبحانہ انسانوں کو بنانے والا ہے، اس لئے یہاں ہمزہ استفہامیہ اصل معنی میں نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہمزہ استفہامیہ تعجب کے لیے ہے، تعجب کی صورت میں آیت

کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! آپ بہت عجیب مخلوق کو بنانے والے ہیں جو زمین میں فساد اور خون بہائے گی، ہمیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے۔

﴿ لِلْمَلٰٓئِكَةِ ﴾

مذکورہ لفظ میں "إطلاق العام و إرادة الخاص" کا اصول پایا جاتا ہے۔❶ یہاں آیت میں "مَلٰٓئِكَة" کا اطلاق ہوا ہے اور یہ عام ہے، کیونکہ اس کا اطلاق یکساں طور پر تمام فرشتوں کے لئے ہوتا ہے، مگر اس عام لفظ سے یہاں وہ خاص فرشتے مراد لئے گئے ہیں جو جنات کے بعد زمین میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "إطلاق العام و إرادة الخاص " پایا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ان کے قول کے مطابق ہے جنہوں نے فرشتوں کو خاص قرار دیا، اس کے برعکس دوسرا قول بھی پایا جاتا ہے، جس میں "مَلٰٓئِكَة" سے عام فرشتے ہی مراد لئے گئے ہیں، اگر یہ دوسرا قول یہاں مان لیا جائے تو پھر "إطلاق العام و إرادة الخاص" آیت میں نہیں ہوگا۔

﴿ مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "عطف الخاص على العام" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں پہلے "يُّفْسِدُ" فعل استعمال ہوا ہے، جس کا معنیٰ (فساد) کے ہے اور یہ عام ہے، کیونکہ اس میں ہر خرابی داخل ہے۔ آیت میں اس عام کو ذکر کرنے کے بعد "وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ" بول کر عام فساد میں داخل ایک خاص یعنی (خون بہانے) کا عطف اس عام پر کر دیا گیا ہے، تاکہ یہ بتایا جائے کہ تمام خرابیوں اور فسادات میں بدترین فساد خون بہانا ہے۔ اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "عطف الخاص على العام" پایا جاتا ہے۔

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں عام لفظ کا اطلاق کیا جائے مگر اس سے مراد خاص ہو۔

❷ یہ اطناب کی ایک شکل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے عام کو ذکر کیا جائے، پھر اس کے بعد اس عام میں شامل کسی خاص شئی کا عطف اسی عام پر کر دیا جائے تاکہ خاص کی اہمیت بیان ہو۔

﴿وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "نُقَدِّس"، فعل کا عطف "نُسَبِّحُ"، فعل پر ہوا ہے۔ یہ عطف اس لئے ہوا تا کہ " نُسَبِّحُ" کے معنی میں تاکید اور قوت پیدا ہو سکے، وہ اس طرح کہ "نُسَبِّحُ" "تَسْبِيح" مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (برائی اور خرابی سے منزہ قرار دینا) ہے۔ اور "نُقَدِّس" کا معنی بھی تقریباً اسی کے قریب قریب (پاک کرنے کے معنی میں) ہے۔ یہ معنی بالکل پہلے معنی کے قریب قریب ہے، اس لئے "نُقَدِّس"، فعل "نُسَبِّحُ" کی تاکید ہے۔

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۳۱)﴾

ترجمہ: اور آدم کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیئے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور (ان سے) کہا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتلاؤ۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "أَنْبِئُونِي"، فعل امر کا صیغہ ہے، امر اصل میں خود کو بڑا سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، مگر کبھی کبھی فعل امر اس معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوا کرتا ہے۔ یہاں بھی "أَنْبِئُونِي" فعلِ امر اپنے اصل غرض کے لئے مستعمل نہیں، بلکہ یہ "تعجیز" کے لئے ہے۔ تعجیز کا معنی یہ ہے کہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے سے عاجز اور درماندہ قرار دیا جائے، یعنی فعل امر کے ذریعہ یہ کہا جائے کہ تم اس کام کی طاقت اور قدرت نہیں رکھتے، تم اس کے کرنے سے عاجز اور لاچار ہو۔ یہاں بھی "أَنْبِئُونِي" فعلِ امر سے فرشتوں کو یہ کہا گیا ہے کہ تم اِن اشیاء کا نام بتانے سے عاجز ہو۔

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "الْأَسْمَاءَ" کا اطلاق کر کے ناموں کا ذکر کیا، مگر اس لفظ سے مسمّیات مراد ہیں۔ یہ عبارت اصل میں "وَعَلَّمَ آدَمَ مُسَمَّيَاتِ الْأَسْمَاءَ"، تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کے مسمیات اور

خواص سکھا دیئے تھے۔اس عبارت میں "مُسَمِّیات" مضاف اور "اَلْأَسْمَاء" مضاف الیہ ہے،آیت کریمہ سے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔

﴿قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ(۳۳)﴾

ترجمہ:اللہ نے کہا آدم تم ان کو ان چیزوں کے نام بتا دو، چنانچہ جب اس نے ان کے نام ان کو بتا دیئے تو اللہ نے (فرشتوں سے) کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں؟ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو مجھے ان سب کا علم ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں اس جملہ سے پہلے "فَأَنبَأَهُم بِهَا" محذوف ہے۔ یہ اصل میں "فَأَنبَأَهُم بِهَا فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ اے آدم ان اشیاء کے ناموں کے بارے میں تم فرشتوں کو بتا دو، جب آدم نے فرشتوں کو ان اشیاء کے نام بتا دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہوں۔ اس آیت سے چونکہ "فَأَنبَأَهُم بِهَا" کا جملہ حذف کر دیا گیا اور اس کی تعین گذشتہ عبارت میں موجود "أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِم" کرتا ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ(۳۱)﴾

مذکورہ آیت میں "تغلیب" پائی جاتی ہے۔❷ یہاں "عَرَضَهُمْ" میں "هم" ضمیر

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام سے کوئی کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں محذوف کو متعین کرنے والا قرینہ بھی موجود ہو۔

❷ تغلیب مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دو ملی جلی اور مشابہ چیزوں میں سے ایک کو دوسرے پر غلبہ دے دیا جائے، اس طریقہ پر کہ ایک ہی لفظ کا اطلاق دونوں چیزوں پر ہو جائے۔

سے جنت میں موجود اشیاء کے نام مراد ہیں۔ان چیزوں میں عقلاء اور غیر عقلاء سب داخل ہیں،اس اعتبار سے آیت میں " ثُمَّ عَرَضَهَا وَعَرَضَهُمْ" بولنا چاہیے تھا،تا کہ عقلاء اور غیر عقلاء دونوں کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو جاتا،مگر آیت میں "عَرَضَهُمْ" بول کر عقلاء اور غیر عقلاء دونوں پر "هم" ضمیر کا اطلاق کر دیا تا کہ لفظی طور پر عقلاء کو غیر عقلاء پر غلبہ دیدیا جائے۔یہاں عقلاء کو غلبہ دینے پر دلیل "هم" ضمیر ہے،جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتی ہے،اس آیت میں چونکہ "هم" ضمیر کا اطلاق کر کے عقلاء اور غیر عقلاء دونوں میں سے عقلاء کو غلبہ دے دیا گیا ہے۔اس لئے اس میں "تغلیب" پائی جاتی ہے۔

﴿فَقَالَ أَنۢبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۱)﴾

ترجمہ: اور (ان سے) کہا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتلاؤ۔

مذکورہ آیت کریمہ میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔ایجاز حذف کی تعریف میں گزر چکی ہے،اس میں "إِنْ كُنتُمْ صَادِقِين" کے بعد "إِنْ" شرطیہ کا جوابِ شرط محذوف ہے،یہ اصل میں "إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ أَنۢبِئُونِي" تھا،جس کا مطلب یہ ہے کہ اے فرشتو! اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو مجھے ان اشیاء کے نام بتادو۔آیت سے چونکہ "أَنۢبِئُونِي" (جواب شرط کا جملہ) حذف کر دیا گیا ہے اور اسکی تعین آیت میں موجود گذشتہ لفظِ "أَنۢبِئُونِي" کرتا ہے،اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۳۲)﴾

ترجمہ: وہ بول اٹھے آپ ہی کی ذات پاک ہے،جو کچھ علم آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ کے لفظ "عِلْمَ" اور "عَلَّمْتَنَا" کے مابین "جناس اشتقاق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "عِلْمَ" اور "عَلَّمْتَنَا" کا اصل مادہ اشتقاق (عِلْماً) ہے۔اور ان کا

---

❶ جناس اشتقاق یہ ہے کہ کلمات اصل مادہ اشتقاق اور معنی میں ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہوں۔

اصل معنی (جاننے) کے ہے۔ان دونوں چیزوں میں یہ الفاظ ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں،اس لئے ان میں "جناس اشتقاق" پایا جاتا ہے۔

﴿قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ (۳۳)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "اطناب" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنا "عَلِيم" ہونا بتانا چاہتے ہیں،اس مقصودی معنی کو بیان کرنے کے لئے ایک مرتبہ "أَعْلَمُ" کہہ دینا کافی ہے، کیونکہ اس سے مقصد حاصل ہوجاتا ہے،مگراس آیت میں "أَعْلَمُ" کا تکرار لاکرزائدعبارت لائی گئی ہے،اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "اطناب" پایا جاتا ہے۔اطناب کے لئے یہ زائدعبارت اس لئے لائی گئی ہے تاکہ اللہ سبحانہ کے "عَلِيم" ہونے کی خبر اہتمام کے ساتھ بیان ہو،اوراس بات پر تنبیہ ہو کہ اللہ سبحانہ کا علم ناقص نہیں، بلکہ اس کا علم کامل اور تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

﴿أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾

اس آیت مبارکہ میں "السَّمَاوَات" اور "الْأَرْض" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "السَّمَاوَات" بمعنی (آسمانوں) کے ہےاور "الْأَرْض" بمعنی (زمینوں) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیاہے،اس لئے ان میں "طباق" پایا جاتا ہے۔اسی طرح اگلے جملہ میں "تُبْدُو" (بداء) مصدر سے مشتق ہے،جس کا معنی (ظاہر کرنے) کے ہے۔اور "تَكْتُمُون" (کتم)

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنی مقصود کو بیان کرنے کے لئے اس معنی مقصود سے زائد عبارت لائی جائے، تاکہ اس زائد عبارت سے کوئی نہ کوئی غرض حاصل کی جائے۔اطناب کی ایک صورت تکرار ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی جملہ یا کلمہ کو مکرر ذکر کیا جائے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

مصدر سے مشتق ہے، جس کا معنی (چھپانے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ اس آیت میں ان مقابل معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۳۰) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۳۴)﴾

یہاں دوسری آیت میں "التفات من الغائب إلى التكلم" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں آیت نمبر ۳۰ میں اللہ سبحانہ نے اپنے لئے "قَالَ" کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، یہ غائب کا صیغہ ہے، پھر اس کے بعد آیت نمبر ۳۴ میں "قُلْنَا" کہہ کر اپنے لئے تکلم کا صیغہ استعمال کیا، حالانکہ گذشتہ آیت کے لفظ "قَالَ" کے مطابق یہاں بھی غائب کا لفظ ہونا چاہیے تھا، مگر یہاں غائب کی جگہ خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "التفات من الغيبة إلى الخطاب" پایا جاتا ہے، یہ التفات اس لئے واقع ہوا تا کہ اللہ سبحانہ کی جلالت شان کا اظہار کیا جائے اور اللہ سبحانہ کی عظمت وہیبت فرشتوں کے دلوں میں راسخ ہو جائے۔

اس کے علاوہ دوسری آیت میں نکتہ کی ایک بات اور پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے باوجود وحدہ لاشریک لہ ہونے کے خود کے لئے "قُلْنَا" بول کر جمع کا صیغہ استعمال کیا، ایسا اس لئے کیا تا کہ اللہ سبحانہ اپنی عظمت اور کبریائی کا اظہار کرے، جب بڑوں کو اپنی عظمت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے تب وہ عموماً اپنے لئے جمع کے صیغے استعمال

❶ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو غائب کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں غائب کے بجائے تکلم کے الفاظ استعمال کر لئے جائیں۔

کرتے ہیں، یہی بڑی ہستیوں کا طرز واسلوب رہا ہے، یہاں بھی اللہ سبحانہ نے اپنی عظمت کا اظہار کرنے کے لئے یہ طرز اپنایا۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ الخ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ کے لفظِ "فَسَجَدُوا" میں (فاء) عاطفہ لایا گیا ہے، جو "تعقیب" کے لئے ہوا کرتا ہے۔ ❶ یہاں (فاء) عاطفہ تعقیب کا لاکر اس بات پر دلالت کی گئی ہے کہ فرشتوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت بہت جلدی کی اور وہ سرعت کیساتھ سجدہ ریز ہوئے، سجدہ کرنے میں انہوں نے تاخیر نہ کی، یہ نکتہ (فاء) عاطفہ "تعقیب" سے حاصل ہوا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں "فَسَجَدُوا" کے بعد "له" محذوف ہے اوراس پر قرینہ "له" میں موجود لام جارہ ہے۔ یہ اصل میں "فَسَجَدُوا لَه" تھا۔ اسی طرح اس آیت میں "أَبَى" کا مفعول محذوف ہے، یہ اصل میں "اَبیٰ السُّجُودَ" تھا، ان دونوں جگہوں سے چونکہ "لَه" اور "السُّجُودَ" کے کلمات حذف کردئے گئے ہیں، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (۳۵)﴾

ترجمہ: اور ہم نے کہا آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس بھی مت جانا ورنہ تم ظالموں میں شمار ہو گے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کھانے سے روکنے کے لئے "لَا تَقْرَبَا" بول کر "قرب" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہاں مقصود قریب جانے سے روکنا نہیں، بلکہ کھانے سے روکنا مقصود ہے، اور عربی میں کھانے سے روکنے کے لئے "اَکْلٌ"

❶ تعقیب کا مطلب یہ ہے کہ حرف عطف کے ذریعہ یہ بتایا جائے کہ حرف عطف کا مدخول فوری طور پر پایا گیا اور اس کے کرنے میں دیر نہیں لگی۔

کا لفظ استعمال ہوتا ہے قرب کا نہیں، اس لئے یہاں بھی قیاساً "لَا تَقْرَبَا" کی جگہ "لَا تَاْکُلَا" کہنا زیادہ مناسب تھا، مگر آیت میں کھانے سے روکنے کی تعبیر 'لَا تَقْرَبَا" بول کر کی گئی، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ کھانے سے روکنے کے مفہوم میں مبالغہ ہو اور یہ مبالغہ براہ راست "لَا تَاْکُلَا" بولنے میں نہیں پایا جاتا، اسی لیے اس میں "اَکْلٌ" کی جگہ قرب کی نفی ہوئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ" درخت کے پھل کو کھانا تو درکنار آپ اس درخت کے قریب بھی نہ جائیں تاکہ کھانے کا سبب و وسیلہ ہی ختم ہو کر رہ جائے"۔ معنی میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ "لَا تَقْرَبَا" کے الفاظ میں کتنی تاکید پائی جاتی ہے، یہ ایسا ہے جیسے فعل زنا کے ارتکاب کرنے سے روکنے کرنے کے لئے "لَاتَقْرَبُوا الزِّنٰی" بول کر قرب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ زنا کے قریب مت جاؤ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زنا مت کرو، مگر آیت میں فعل زنا کے مرتکب ہونے سے روکنے کے لئے مبالغہ مقصود تھا، اس لئے "لَا تَزْنُوا" کی جگہ "لَا تَقْرَبُوا" بول دیا گیا کہ لوگوں زنا کرنا تو کبیرہ گناہ ہے تم اس زنا کے قریب تک نہ جاؤ تاکہ اس کے ذرائع اور اسباب کا بھی سدباب ہو۔

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ(۳۶)﴾

ترجمہ: پھر ہوا یہ کہ شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے ڈگمگا دیا اور جس (عیش) میں وہ تھے اس سے انہیں نکال کر رہا، اور ہم نے (آدم، ان کی بیوی اور ابلیس سے) کہا: اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، اور تمہارے لئے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر فائدہ اٹھانا (طے کر دیا گیا) ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں موجود بلاغت کے نکتہ سمجھنے سے پہلے ایک بات بطور تمہید ملاحظہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ اہل بلاغت کو جب کسی شئی کی فخامت، عظمت اور بلندی پر دلالت کرنا مقصود

ہوتو اس شئی کی تعبیر مبہم سے کر دیتے ہیں، تاکہ سامع اور مخاطب کا ذہن جہاں تک ممکن ہو اس شے کی عظمت اور بلندی کی وسعتوں کا تصور کر سکے۔ اب آیت میں موجود بلاغت کا نکتہ پیش خدمت ہے، اس آیت میں "مِمَّا كَانَا فِيهِ" میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء جس مقام سے نکال دیئے گئے اس کی وضاحت نہیں ہوئی یعنی "مِمَّا كَانَا مِنَ الْجَنَّةِ اَوِ النِّعْمَةِ" وغیرہ کے الفاظ نہیں استعمال کئے گئے، بلکہ اس مقام کو مبہم چھوڑا گیا، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ تمہید میں گذرے ہوئے فائدہ کو حاصل کیا جائے۔ یعنی یہ بتایا جائے کہ حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کو جس مقام سے شیطان نے نکالا وہ بہت عظیم الشان اور شاندار جگہ تھی۔

﴿فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ(۳۷)﴾

ترجمہ: پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) کچھ الفاظ سیکھ لیے (جن کے ذریعے انہوں نے توبہ مانگی) چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی، بیشک وہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "التَّوَّابُ" اور "الرَّحِيمُ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے صفتی نام ہیں، ان میں سے "التَّوَّابُ" (فَعَّالٌ) کے وزن پر اور "الرَّحِيمُ" (فَعِيلٌ) کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں، اس لئے "التَّوَّاب" کا معنی ہوگا کہ ''اللہ سبحانہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والے ہیں'' اور "الرَّحِيمُ" کا معنی ہوگا کہ ''اللہ سبحانہ تعالیٰ بہت وسیع رحمت والے ہیں''۔ گویا آیت میں معنی کی زیادتی کے لئے یہ الفاظ مبالغہ کے اوزان پر لائے گئے ہیں۔

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ(۳٦) قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸)﴾

ترجمہ: اور ہم نے (آدم، ان کی بیوی اور ابلیس سے) کہا: اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اور تمہارے لئے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر فائدہ اٹھانا (طے کر دیا گیا) ہے۔ ہم نے کہا اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہیں پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں دوسری آیت میں "تکرار" پایا جاتا ہے، اس مقام میں ایک مرتبہ آیت نمبر ۳۶ میں "قُلْنَا اهْبِطُوا" بول کر حضرت آدم اور حواء علیہا السلام کو بہشت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، پھر اس کے بعد دوبارہ آیت نمبر ۳۸ میں "قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا" کہہ کر اسی جملہ کو مکرر ذکر کیا گیا، اس سے واضح ہوا کہ دوسری آیت میں تکرار موجود ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ آدم و حواء علیہا السلام کو جنت سے نکلنے کا جو حکم پہلے دیا گیا تھا اس میں تاکید ہو اور بعد میں آنے والے عنوان (یعنی زمین پر اتر کر خدا کے حکم کی اطاعت کرنے) کی تمہید ہو۔

﴿يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ (۴۰)﴾

ترجمہ: اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔

مذکورہ آیتِ کریمہ کے لفظ "نِعْمَتِي" میں (نِعْمَةٌ) کی اضافت اللہ سبحانہ نے اپنے طرف کی ہے، کبھی کبھی کسی شئی کو عظیم ذات یا عظیم شئی کی طرف منسوب کر کے اس شئی کی عظمت، قدر و منزلت کو بیان کیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل پر ہونے والی نعمتوں کو اپنی طرف منسوب کر کے ان کی عظمت کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ نعمتیں بہت عظیم اور کثرت کے ساتھ تھیں۔

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (۴۰)﴾

ترجمہ: اور تم مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو تاکہ میں بھی تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں، اور تم (کسی اور سے نہیں، بلکہ) صرف مجھی سے ڈرو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "فنُ التعطف" پایا جاتا ہے۔اس کا دوسرا نام اہلِ بلاغت نے فنِ مشارکہ رکھا ہے۔ ❶ یہاں "أُوفِ بِعَهْد" میں موجود الفاظ بالکل وہی الفاظ ہیں جو "أَوْفُوا بِعَهْدِي" میں گذر چکے ہیں۔آیت میں چونکہ گذشتہ الفاظ کو بعینہ لوٹایا گیا ہے،اس لئے اس میں "فن التعطف" موجود ہے۔

﴿وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ (۴۱)﴾

ترجمہ:اور جو کلام میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ جبکہ وہ اس کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق بھی کررہا ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ۔

مذکورہ آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے،یہاں "أَوَّلَ كَافِرٍ" کے درمیان (فَرِيْقٍ) کا لفظ محذوف ہے۔اصل میں "وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ فَرِيْقٍ كَافِرٍ بِهِ" تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کفر کرنے والے پہلے فریق اور جماعت نہ بنو۔اس میں فریق موصوف اور کافر صفت ہے،آیت میں موصوف کو حذف کر کے صفت کو اسکے قائم مقام کردیا گیا ہے، اس آیت میں چونکہ "فَرِيْقٍ" کا لفظ حذف کردیا گیا ہے،اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ (۴۱)﴾

ترجمہ:اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دل میں رکھو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارۃ تصریحیۃ" اور "استعارۃ تبعیۃ" پائے جاتے ہیں، ❷ یہاں "استبدال" (بدلنے) کو "اشتراء" (خریداری) سے تشبیہ دی گئی ہے،اس تشبیہ میں

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں موجود کسی لفظ کو بعینہ لوٹایا جائے۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کو لفظوں میں صراحتاً ذکر کردیا جائے۔

"استبدال" مشبہ اور "اشتراء" مشبہ بہ ہے۔ ان میں وجہ شبہ "عوض لینا" ہے، یعنی جس طرح خریداری میں خریدنے والا ثمن کے بدلہ میں عوض لیتا ہے، بالکل اسی طرح یہود کے علماء کتمانِ علم اور تحریف کر کے فصل، پھل اور نقدی کی صورت میں اس فعل کا عوض لیتے تھے، اس وجہ شبہ کی وجہ سے یہود کے اس "استبدال" کو "اشتراء" سے تشبیہ دی گئی ہے، آیت میں چونکہ "لَا تَشْتَرُوا" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارہ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔ اس آیت میں "استعارہ تبعیۃ" بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں "لَا تَشْتَرُوا" فعل مشتق ہے، چونکہ اس فعل مشتق میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارہ تبعیۃ" پایا جاتا ہے

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۲)﴾

ترجمہ: اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو، اور نہ حق بات کو چھپاؤ جبکہ (اصل حقیقت) تم اچھی طرح جانتے ہو۔

مذکوہ آیتِ کریمہ میں اطناب کی ایک قسم "تکرار" پایا جاتا ہے، یہاں ایک مرتبہ "لَا تَلْبِسُوا" کے بعد "الْحَقَّ" کا ذکر ہوا پھر اس کے بعد دوبارہ "تَكْتُمُوا" فعل کیساتھ اسی لفظ کو مکرر ذکر کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں لفظِ "الحَقَّ" کا اعادہ اور تکرار ہوا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ تلبیس حق اور کتمانِ حق کی زیادہ سے زیادہ قباحت بیان ہو اور اس میں تاکید ہو۔ اور یہ ظاہری بات ہے کہ کسی بھی جملہ میں کسی شئی کو ایک بار اسم سے ذکر کرنے کے بعد دوبارہ اسم ظاہر سے ذکر کرنے میں جو تاکید اور قوت پائی جاتی ہے، وہ اسمِ ضمیر سے ذکر کرنے کی صورت میں نہیں پائی جاتی، یہی وجہ ہے کہ آیت میں حق کا ذکر دوبارہ "الْحَقَّ" بول کر اسمِ ظاہر کی صورت میں کیا گیا۔

---

❶ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۴۳)﴾

ترجمہ: اورنماز قائم کرواورزکوٰۃ ادا کرواوررکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "ارْكَعُوا" فعل امر استعمال ہوا ہے۔ یہ "رُكُوعًا" مصدر سے مشتق ہے۔اس کا حقیقی معنی (رکوع کرنے) کے ہے، مگر یہ حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ یہ واضح بات ہے کہ اللہ سبحانہ صرف رکوع کرنے کا حکم نہیں دیتے، اس لیے یہاں اس لفظ کا مجازی معنی مراد لیا جائے گا۔ وہ مجازی معنی (نماز پڑھنے) کے ہے۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ کلیت اور جزئیت کا ہے تشبیہ کا نہیں، کیونکہ ان میں رکوع جزء ہے اور نماز کل ہے، اسی لئے ان میں کلیت جزئیت کا علاقہ پایا جاتا ہے۔ گویا آیت میں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے، آیت میں چونکہ ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان کلیت، جزئیت کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ ﴿وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾

مذکورہ دونوں آیات میں "إِيَّايَ" معمول کو عاملوں پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ اصول کے مطابق عموماً عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں، مگر جب کبھی کوئی خاص مقصود ہو تو تب معمول کو عامل پر مقدم کر دیا جاتا ہے۔ ان آیتوں میں بھی "حصر" کے فائدہ کے لئے عاملوں (فَارْهَبُونِ، فَاتَّقُونِ) پر ان کے معمولوں کو مقدم کر دیا گیا ہے۔ ❷ یہاں بھی معمول کو عاملوں پر مقدم کر کے ڈرنے کے استحاق کو اللہ سبحانہ کیساتھ مختص کر دیا گیا ہے، اس لئے ان آیتوں میں "حصر" موجود ہے۔ حصر کی صورت میں آیتوں کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "تم

---

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی میں تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، کلیت، حالیت یا ما کان علیہ وغیرہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

❷ حصر کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی دوسرے شئی کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

خاص مجھ ہی سے ڈرتے رہو اور خاص مجھ ہی سے خوف رکھو"۔

﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ ﴿وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾

یہ دونون اصل میں "فَارْهَبُونِي اور فَاتَّقُونِي" تھے، پھر ان سے مفعول کی یائے متکلم حذف کردی گئی اور نون وقایہ کو باقی رکھا گیا۔ یہاں مفعول کو اس لئے حذف کیا گیا تاکہ ان دونوں آیتوں کا کلمہ فاصل بھی دوسری آیتوں کی طرح "نون" پر ختم ہو۔ اگر یہاں مفعول کی "یاء" باقی رہتی تو ان کا کلمہِ فاصل یعنی آخری کلمہ "یاء" پر ختم ہوتا "نون" پر نہیں، جب کہ دوسری آیتیں "وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِين" اور "أَفَلَا تَعْقِلُون" وغیرہ کا کلمہ فاصل نون پر ختم ہو رہا ہے، اسی لئے ان آیتوں میں مفعول کی یائے متکلم حذف کردی گئی تاکہ دیگر آیتوں کی طرح ان کا کلمہ فاصل بھی نون پر ختم ہو اور تمام آیتوں کے آخری کلمات میں موافقت رہے۔

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۴۴)﴾

ترجمہ: کیا تم (دوسرے) لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو، کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ کی ابتداء میں ہمزہ استفہامیہ واقع ہوا ہے۔ حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حروف استفہامیہ اس معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہ توبیخ اور انکار کے لئے ہے۔ ❶ یہاں بھی ہمزہ استفہامیہ کے ذریعہ مخاطب کو ڈانٹا گیا ہے کہ تم عجیب قسم کے لوگ ہو جو اَوروں

❶ توبیخ کا مطلب یہ ہے کہ حروف استفہامیہ کے ذریعہ ڈانٹا جائے اور انکار کا مطلب یہ ہے کہ حروف استفہامیہ کے ذریعہ کسی بات، عنوان یا مضمون وغیرہ کی نفی اور انکار کیا جائے۔

کو نیکی کا حکم کرتے ہومگر خود کو بھول جاتے ہو۔ انکار کی صورت میں ہمزہ استفہامیہ کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ایسا مت کرو بلکہ جیسے تم دوسروں کو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو ویسے ہی تم خود بھی نیکی کا کام بجالاؤ۔

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاس﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "أَتَأْمُرُون" فعل کے مخاطب مدینہ کے احبار ورہبان تھے، جن کی عادت یہ تھی کہ وہ دوسروں کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم دیتے، مگر خود ایمان نہ لاتے۔ اللہ سبحانہ نے اس آیت میں ان کے اس فعل پر قباحت بیان کی ہے، اس میں فعلِ مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو حال یا استقبال پر دلالت کرتا ہے۔ مگر جس وقت یہ آیت اتری تھی تب ماضی میں بھی اِن کے احبار ورہبان سے اس کام کا حکم دینا صادر ہو چکا تھا، اس لحاظ سے ماضی کا صیغہ آیت میں مناسب معمول ہوتا ہے، لیکن اللہ سبحانہ نے ماضی کی جگہ مضارع کو ترجیح دی ہے، ایسا اس لئے کیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ اِن کے اس فعل میں تجدد اوراستمرار پایا جاتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ یہ کام وقتاً فوقتاً، موقع بموقع کرتے رہتے تھے۔

﴿وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ترک عمل کی تعبیر "تَنْسَوْن" بول کر کی گئی، جو "نسیان" سے مشتق ہے۔ یہود کے علماء نیکی (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا) چھوڑ دیتے تھے، وہ یہ نیکی بھولتے نہیں تھے، کیونکہ ان کو نیکی کا کام اچھی طرح یاد تھا، بلکہ وہ نیکی پر عمل کرنا چھوڑ دیتے تھے، اور چھوڑنے کے معنی کو ادا کرنے کے لئے عربی میں "تَرَكَ" استعمال ہوتا ہے "نسیان" نہیں، اس لحاظ سے آیت میں "تَتْرُكُونَ أَنْفُسَكُم" کہنا زیادہ بہتر اور مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر آیت میں ترک کی تعبیر "تَتْرُكُونَ" سے نہیں ہوئی، بلکہ "تَنْسَوْن" سے ہوئی ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تا کہ یہود کے احبار کے ترکِ نیکی کے بیان میں خوب مبالغہ

ہو، گویا کہ یہ لوگ ایسے بے کار اور فضول تھے کہ عمل کرنا تو دور کی بات ہے ان کے دل و دماغ میں نیکی کا جذبہ بھی نہیں گذرتا تھا اور نہ ہی ان کے ذہنوں میں اس کا خیال آتا۔ اس نکتہ کی طرح اشارہ کرنے کے لئے آیت میں ترک کی تعبیر نسیان سے ہوئی ہے۔

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ☆وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ﴾

یہاں دوسری آیت میں "ذکر الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں "أَوْفُوا بِعَهْدِي" میں ایفائے عہد کا ذکر ہوا ہے۔ یہ عام ہے، کیونکہ ایفائے عہد میں بشمول تسلیمِ قرآن کے تمام احکام داخل ہیں۔ آیت میں اس عام کو ذکر کرنے کے بعد اگلی آیت میں "وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ" کہہ کر اس عام میں شامل ایک خاص کا حکم دیا، اور وہ خاص حکم قرآن پر ایمان لانا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں دوسری آیت میں "ذکر الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے۔ یہاں ایفائے عہد میں (ایمان قرآن) کے داخل ہونے کے باوجود انفرادی طور پر اس کا ذکر اس لئے ہوا کہ یہ ایفائے عہد کا افضل ترین حصہ ہے، اسی لئے اس کو مستقلاً انفرادی طور پر ذکر کیا گیا۔

﴿وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں یہودیوں کو مُنَزَّل بہ (قرآن کریم) پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم میں اللہ سبحانہ نے مُنَزَّل بہ (یعنی قرآن کریم) کو "مُصَدِّق" بول کر صفتِ تصدیق کیساتھ مقید کر دیا، حالانکہ یہ اس قید کے بغیر بھی استعمال ہوسکتا تھا، ایسا اس لئے کیا تا کہ یہود کو قرآن پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس حکم کی اطاعت کے وجوب میں

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے عام کو ذکر کیا جائے، پھر اس کے بعد اس میں عام میں شامل کسی خاص شئی کو ذکر کیا جائے، ایسا اس لئے ہوتا ہے تا کہ خاص کی عظمت وعمدگی وغیرہ کا اظہار کیا جائے۔

خوب تاکید ہو اور بات ان کے دلوں پر جلد اثر کر جائے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ قرآن وہی کتاب ہے جو تمہارے پاس موجود کتاب (تورات جسے تم مانتے بھی ہو) کی تصدیق کرتا ہے۔ جب تم اپنے پاس موجود کتاب کو مانتے ہو تو پھر اس کتاب کی تصدیق کرنے والی کتاب (قرآن) کو بھی مان لو، ورنہ تم اپنی کتاب کے انکار کے مرتکب ہو جاؤ گے، کیونکہ یہ کتاب تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

﴿يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (۴۷)﴾

ترجمہ: اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "عطف الخاص علی العام" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کو عطاء کرنے والے تمام نعمتوں کا تذکرہ "نِعْمَتِيَ" بول کر فرمایا ہے۔ یہ لفظ عام ہے، کیونکہ اس میں افراد بنی اسرائیل کی فضیلت سمیت دیگر تمام نعمتیں داخل ہیں۔ آیت میں اس عام کو بیان فرمانے کے بعد (واو) عاطفہ کے ذریعہ اس عام میں داخل بنی اسرائیل کی فضیلت کو "وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِين" بول کر بیان فرمایا۔ بنی اسرائیل کی یہ فضیلت نعمتوں میں سے ایک خاص نعمت ہے، جس کا ذکر "نِعْمَتِيَ" کے ضمن میں ہونے کے بعد پھر دوبارہ مستقلاً ذکر کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں "عطف الخاص علی العام" پایا جاتا ہے۔ اس میں فضیلت کا عطف عام نعمتوں پر اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ نعمتوں میں فضیلت کی نعمت تمام نعمتوں سے اشرف اور اکمل ہے، اور بنی اسرائیل کو یہ جو فضیلت ملی وہ ان کے دوسرے ہم عصروں کو نہیں ملی۔

❶ یہ اطناب کی ایک شکل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کسی عام کو ذکر کیا جائے پھر اس عام میں داخل خاص شئی کو ذکر کیا جائے اور یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ خاص کی فضیلت، اہمیت، مقام ومرتبہ واضح ہو۔

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۴۷)﴾

ترجمہ: اوراس دن سے ڈروجس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا، نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی، نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایاجاتاہے۔❶ اس آیت کریمہ میں "یَوْم" کا لفظ استعمال ہواہے، جس کا حقیقی معنی (دن) کے ہے۔ مگر یہ معنی یہاں مرادنہیں، بلکہ اس کا مرادی معنی دن میں ملنے والا عذاب ہے جو "یَوْم" کا مجازی معنی بھی ہے۔ لفظِ "یَوْم" کے ان دونوں یعنی حقیقی اور مجازی معنوں میں علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ حالیت اور محلیت کا ہے، کیونکہ عذاب حال اوردن محل ہے، آیت میں گویا محل بول کرحال مرادلیا گیاہے۔ آیت میں چونکہ ایسا لفظ استعمال ہواہے جس کے معنی حقیقی اور مجازی میں تشبیہ کا علاقہ نہیں بلکہ حالیت اورمحلیت کا علاقہ ہے، اس لئے اس میں "مجازمرسل" موجودہے۔ مجازمرسل کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے بنی اسرائیل اس دن کے عذاب سے ڈروجس دن کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئیگا۔

﴿لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں لفظِ "نَفْسٌ" اورلفظِ "شَيْئًا" نکرہ استعمال ہوئے ہیں، نکرہ سے کبھی کبھی شئی میں عمومیت اورشمولیت پیدا کرنا مقصود ہوتاہے، یعنی نکرہ کے ذریعہ کبھی کسی شئی کوعام کردیا جاتاہے، تاکہ اس میں شئی کے تمام افراد شامل ہوجائیں۔ اس آیت میں بھی "نَفْسٌ" اور "شَيْئًا" کونکرہ لاکران کے معنوں میں عموم لایا گیاہے تاکہ یہ دونوں چیزیں اپنے

❶ مجازمرسل وہ ہے جس کے معنی حقیقی اورمعنی مجازی میں تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، کلیت، حالیت، یا ما کان علیہ وغیرہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

تمام افراد کو شامل ہوں اور کوئی فرد ان سے خارج نہ ہو۔ عموم کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''قیامت کے روز کوئی بھی کسی کا کچھ کام نہ آئیگا''۔

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ''وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ'' جملہ اسمیہ لایا گیا ہے، اور اس کے جملہ اسمیہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی ابتداء ''ھم'' ضمیر سے ہوئی ہے جو اسم کی قسم ہے، لیکن اس جملہ کے برعکس اس سے پہلے موجود جملے ''وَاتَّقُوا يَوْمًا، وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ''اور ''لَا يُؤْخَذُ'' وغیرہ سب کے سب جملہ فعلیہ ہیں۔ ان جملوں کی مناسبت سے آخری جملہ بھی جملہ فعلیہ ہونا چاہیے تھا، تاکہ تمام جملے ایک جیسے ہوجاتے، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ مندرجہ ذیل نکات کے حصول کی خاطر آیت میں ''وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ'' کا جملہ دوسرے جملوں سے مختلف جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا۔ وہ نکات درج ذیل ہیں۔

نمبر ۱: اس کو جملہ اسمیہ بنا کر اس لئے لایا گیا تا کہ اس میں مبالغہ حاصل ہو۔ مبالغہ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''لوگوں کو اس دن کسی طرح کی کوئی مدد حاصل نہ ہوگی''۔

نمبر ۲: اس جملہ کو جملہ اسمیہ کی صورت میں اس لئے بیان فرمایا تا کہ اس کے مفہوم میں دوام حاصل ہو، دوام و ثبات کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے روز ان لوگوں کی ہمیشہ کے لئے مدد نہ کی جائیگی، عارضی طور پر انہیں اگر کچھ فائدہ ملے تو اس کا اعتبار نہیں۔

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (۴۹)﴾

ترجمہ: اور وہ (وقت یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تمہیں بڑا عذاب دیتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس ساری صورت حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور "تبعية" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں عذاب چکھانے کوفروخت کے لئے کسی شئ کو پیش کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں عذاب چکھانا "مشبہ"اور فروخت کرنے کے لئے کوئی شئ پیش کرنا" مشبہ به" ہے۔آیت میں "يَسُومُونَكُم" بول کر چونکہ مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔اسی طرح آیت میں "استعارة تبعية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "يَسُومُونَكُم" فعل مشتق ہے،اس میں چونکہ استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

﴿سُوءَ الْعَذَاب﴾

اہلِ بلاغت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ کبھی موصوف صفت کو ان کی اصل ترتیب کے خلاف پیش کردیتے ہیں۔موصوف صفت کو عربی میں بیان کرنے کی اصل ترتیب یہ کہ موصوف کو پہلے پھر اس کے بعد صفت کو پیش کیا جائے،لیکن اہل بلاغت بات میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے کبھی صفت کی اضافت موصوف کی طرف کردیتے ہیں،جس کی بناء پر صفت پہلے اور موصوف بعد میں آجاتا ہے۔آیت کریمہ میں بھی بالکل یہی طریقہ اپنایا گیا ہے،یہ اصل میں "الْعَذَابُ السُّوءُ" تھا،اس میں "العذاب"موصوف اور"السوء"صفت ہے۔مگر آیت میں "السوء" صفت سے "الف لام" ہٹا کر اس کی اضافت العذاب موصوف کی طرف کردی گئی،جس سے عبارت "سُوءَ الْعَذَابِ" بن گئی،ایسا اس لئے ہوا تاکہ اس کے مفہوم میں مبالغہ ہو۔مبالغہ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "آل فرعون بنی اسرائیل کو جو عذاب دیتے تھے وسراپا دردناک اور ذلت آمیز عذاب تھا"۔

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کو لفظوں میں صراحتاً ذکر کردیا جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل،حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَائَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ(۴۹)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "التفصيل بعد الاجمال" یا بالفاظِ دیگر "الايضاح بعد الابهام" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں آیت میں پہلے "يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَاب" میں آلِ فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کو دیئے جانے والے عذاب کا ذکر تو فرمایا گیا، مگر اس جملہ میں عذاب کیسا تھا؟ اس کی کیفیت کیا تھی؟ کون کون سا عذاب انہیں دیا گیا؟ ان باتوں کو مبہم ومجمل رکھا گیا، پھر اس کے بعد آگے" يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَائَكُم" بول کر اس مبہم کی وضاحت کردی گئی کہ عذاب اس طرح دیا گیا کہ بنی اسرائیل کے بچوں اور لڑکوں کو تو فرعون قتل کرڈالتا، مگر ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو خادمہ اور باندیاں بنانے کی غرض سے چھوڑ دیا کرتا تھا، اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں اجمال کے بعد تفصیل پائی جاتی ہے۔

﴿وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ﴾

مذکورہ جملہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں خدمت کے لئے عورتوں کو باقی چھوڑ دینے کو "استحياء" یعنی زندہ کرنے کے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں خدمت کے لئے باقی چھوڑنا "مشبه" اور استحیاء "مشبه به" ہے۔ آیت میں چونکہ "يَسْتَحْيُونَ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کوئی شئی یا بات مبہم اور مجمل انداز سے بیان کی جائے، پھر اس کے بعد اس مبہم ومجمل کی وضاحت اور تفصیل بیان کردی جائے۔ اس طرز سے بات سامعین کے دل ودماغ پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، اسی لئے اہلِ بلاغت اس طریقہ کو اپناتے ہیں۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

﴿وَفِی ذٰلِکُم بَلاءٌ مِّنْ رَبِّکُمْ عَظِیمٌ﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''بَلَاءٌ''اور''عَظِیم''، نکرہ استعمال ہوئے ہیں،نکرہ سے کبھی شے کی فخامت اور بھیانک ہونا بیان کیا جاتا ہے، یہاں بھی ان دونوں چیزوں کی فخامت اور خطرناک ہونے کو واضح کرنے کے لئے انہیں بصورتِ نکرہ بیان کیا گیا۔اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''عورتوں کو خدمت کے لئے باقی رکھنے میں اے بنی اسرائیل تمہارے لئے بہت بڑی اور خطرناک آزمائش تھی''۔

﴿یُذَبِّحُونَ﴾

آیتِ کریمہ میں''یُذَبِّحُون'' کا لفظ''تذبیح'' سے مشتق ہے، جو بابِ تفعیل کے وزن پر ہے، باب تفعیل کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ ماخذ کے کثرت کو بتاتا ہے،مطلب یہ کہ ماخذ کو فاعل نے بہت کثرت سے سرانجام دیا۔آیت میں بھی'' یُذَبِّحُون'' کو تشدید کیساتھ باب تفعیل سے لاکر یہ بتایا گیا ہے کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں اور لڑکوں کو کثرت سے قتل کرتے تھے۔

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَاقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ(۵۴)﴾

ترجمہ:اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم! حقیقت میں تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے،لہٰذا اب اپنے خالق سے توبہ کرو اور اپنے آپ کو قتل کرو تمہارے خالق کے نزدیک یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، اس طرح اللہ نے تمہاری توبہ قبول کرلی۔ بیشک وہی ہے جو اتنا معاف کرنے والا، اتنا رحم کرنے والا ہے۔

مذکورہ آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت کی گئی ہے، اس قول میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو'' یَاقَوْم'' بول کر پکارا ہے۔ یہ لفظ اصل میں''یَاقَوْمِی'' تھا، اس

میں سے (یائے متکلم) کو حذف کر کے حرف میم میں موجود کسرہ کو یائے متکلم کے حذف ہونے پر دلیل بنا دیا گیا ہے۔اس میں موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی اضافت یائے متکلم کے ذریعہ اپنی طرف کی ہے،تا کہ اس اضافت کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنی قوم پر بیحد شفیق،مہربان اوران کا خیر خواہ تھے۔

﴿فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ﴾

مذکورہ قول میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو توبہ کی تلقین کی ہے،اس میں موسیٰ علیہ السلام نے توبہ کی تلقین کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہ کے بہت سے اوصاف میں سے "بَارِئ" کا وصف بیان فرمایا ہے، جو خالق (پیدا کرنے والا) کے معنی میں ہے۔دیگر اوصاف کو چھوڑ کر توبہ کے باب میں رب کی خالقیت کے عنوان کو پیش کرنے میں ایک عمدہ نکتہ کی طرف اشارہ مقصود ہے،اسی لئے یہاں "بَـــارِئ" کا وصف بیان ہوا ہے،وہ نکتہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل بغاوت، جہالت اور تاریکی کے بامِ عروج تک پہنچ چکے تھے،یہ اتنے جاہل اور تاریک پسند لوگ تھے کہ انہوں نے اس علیم وحکیم ذات کی عبادت کو چھوڑ کر جس نے ان کو محض اپنی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ تامہ سے پیدا فرمایا اوران کی تربیت کی ،ایسے بچھڑے کی عبادت میں لگ گئے جو غباوت اور بے وقوفی میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی جہالت اور غباوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے خالق کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری سے منہ موڑ کر ایک غبی جانور کی عبادت پرستی میں لگ گئے۔

﴿فَتُوبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "اُقْتُلُوا" بطور "مجاز مرسل" واقع ہوا ہے۔یہاں "اقْتُلُوا" فعلِ امر کا صیغہ ہے،اس کا حقیقی معنی خود کو فوراً قتل کرنے کے ہے،مگر یہاں یہ معنی مراد نہیں، بلکہ اس کا مجازی معنی مراد ہے اوراس کا مجازی معنی قتل کے لئے خود کو پیش کرنا ہے۔اس میں

حقیقی معنی مراد لینا اس لئے درست نہیں کیونکہ بنی اسرائیل فوراً اپنے گناہ کے پاداش میں قتل نہیں کئے گئے تھے، اس لئے یہاں فوراً قتل ہونا مراد نہیں ہوسکتا، لہٰذا لامحالہ آیت میں لفظ کو مجازی معنی (قتل کے لئے خود کو حوالہ کرنے) پر محمول کیا جائیگا۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ ما یکون علیہ کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنی اور مجازی معنی کے درمیان زمانہ مستقبل کا اعتبار ہے، یہاں بنی اسرائیل فوراً قتل نہیں ہوئے، زمانہ مستقبل میں گناہوں کے توبہ کے لئے یہ قتل ہونگے اس اعتبار سے یہاں قتل کے لئے خود کو حوالہ کرنے کو "اقتُلُوا" کہا گیا، ان دونوں معنوں میں چونکہ تشبیہ کا علاقہ نہیں بلکہ "مایکون علیہ" کا علاقہ ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔

﴿فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔ (1) اس آیت میں "فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ" سے پہلے "ثُمَّ فَعَلۡتُمۡ مَااُمِرۡتُمۡ بِهٖ فَوَفَّقۡتُكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ الخ" محذوف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں جس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا تم نے وہ کام کرلیا، تو میں نے تمہیں توبہ کی توفیق دی اور تمہاری توبہ قبول کرلی۔ اس آیت سے "ثُمَّ فَعَلۡتُمۡ مَااُمِرۡتُمۡ بِهٖ فَوَفَّقۡتُكُمۡ" کا جملہ حذف کردیا گیا ہے اور اس محذوف پر دلیل فتاب کی "فاء" ہے جو ماقبل فعل کے وقوع پر دلالت کرتی ہے۔ آیت سے چونکہ مذکورہ جملہ حذف کردیا گیا، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔ واضح رہے کہ یہاں "فَتَابَ عَلَيۡكُم" کا جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ نہیں ان کا قول تو "ذَلِكُمۡ خَيۡرٌ لَكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ" پر ختم ہوچکا ہے، بلکہ یہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ذاتی قول ہے۔ اس آیت کریمہ میں "التفات من التکلم الی الغیبة"

---

(1) ایجاز حذف یہ ہے کہ کلام سے کوئی کلمہ، جملہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں اس محذوف کی تعین کرنے والا قرینہ بھی موجود ہو۔

بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کے محذوف جملہ "فَوَفَّقْتُكُمْ" میں "فَوَفَّقْتُ" متکلم کا صیغہ ہے، اور "فَتَابَ عَلَيْكُمْ" غائب کا صیغہ ہے۔ "وَفَّقْتُكُمْ" کے مطابق آیت میں بھی "فَتَابَ" کے بجائے "تُبْتُ عَلَيْكُمْ" بولنا چاہیے تھا، تاکہ یہ بھی "وَفَّقْتُ" کی طرح تکلم کا لفظ ہوتا، مگر آیت میں تکلم چھوڑ کر "تَابَ" کی صورت میں غائب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "التفات من التكلم إلى الغيبة" پایا جاتا ہے، یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ کلام میں تاکید ہو۔

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُم ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ضمیرِ خطاب کی طرف عدول ہوا ہے، یہ جملہ چونکہ زمانہ ماضی کے بنی اسرائیل کے بارے میں آیا ہے، اس لحاظ سے یہاں "عَلَيْكُم" کے بجائے "عَلَيْهِم" بول کر "هم" غائب کی ضمیر بنی اسرائیل کے ان اسلاف کی طرف لوٹانا چاہیے تھی، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی ضمیر کے بجائے "كم" خطاب کی ضمیر لائی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہاں قبول توبہ کی نعمت کے تذکرہ سے بنی اسرائیل کے گذشتہ اسلاف کو نصیحت کرنا یا احسان جتلانا مقصود نہیں بلکہ یہاں عصر حاضر کے موجود یہود کو مخاطب بنا کر انہیں نصیحت کرنا مقصود ہے۔

﴿ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ(٥٦)﴾

ترجمہ: پھر ہم نے تمہیں تمہارے مرنے کے بعد دوسری زندگی دی تاکہ تم شکرگزار بنو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں بلاغت کے نکتہ کو سمجھنے سے پہلے مختصر تفسیر پڑھ لی جائے، تفسیر یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہارا یقین نہ کریں گے کہ یہ اللہ کا

❶ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو تکلم کے الفاظ کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں تکلم کے الفاظ کی جگہ غائب کے الفاظ استعمال کردیئے جائیں۔

کلام ہے جب تک کہ آنکھوں سے صراحتاً خدا تعالیٰ کو دیکھ نہ لیں، اس گستاخی کی وجہ سے آسمانی بجلی نے اِن سب کو ہلاک کردیا، پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اِن سب کو زندہ کیا، یہ اس وقت کا حال ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو منتخب فرما کر کوہِ طور پر کلام الٰہی سننے کی غرض سے لے گئے تھے، پھر جب انہوں نے کلام الٰہی کو سنا تو انہی ستر نے کہا: اے موسیٰ! پردے میں سننے کا ہم اعتبار نہیں کرتے، آنکھوں سے خدا کو دکھاؤ۔ اس پر ان ستر آدمیوں کو آسمانی بجلی نے ہلاک کردیا تھا۔ (تفسیر عثمانی: ص ۱۱)

اب آیت میں موجود بلاغت کا نکتہ ملاحظہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ اس آیت میں "بَعَثَ" (دوبارہ زندہ کرنا) کو "مِنۡ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ" کے قید سے مقید کردیا، حالانکہ بظاہر اس قید کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ "بَعَثَ" (دوبارہ زندہ کرنا) تو موت کے بعد ہی ہوتا ہے، اس لئے اس کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، مگر آیت میں یہ قید اس لئے لگائی گئی تاکہ اس بات میں خوب تاکید ہو کہ ان پر جو موت طاری ہوئی وہ حقیقی موت تھی، اس لئے کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ بنی اسرائیل کا دوبارہ اٹھایا جانا بے ہوشی، غنودگی یا نیند سے تھا؟ بلکہ ان کا دوبارہ اٹھایا جانا حقیقتاً موت کے بعد تھا۔ (باقی یہ موت، موتِ اجل نہیں تھی بلکہ موتِ عقوبت تھی۔)

﴿كُلُوا مِنۡ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقۡنَاكُمۡ وَ مَا ظَلَمُونَا وَ لَكِنۡ كَانُوا أَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُونَ(۵۷)﴾

ترجمہ: (اور کہا کہ) جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں بخشا ہے (شوق سے) کھاؤ اور یہ (نافرمانیاں کرکے) انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے رہے۔

مذکورہ آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں "كُلُوا" سے پہلے "قُلۡنَا لَهُمۡ" اور "وَمَاظَلَمُونَا" سے پہلے "فَظَلَمُوا أَنۡفُسَهُم بِكُفۡرِهِمۡ تِلۡكَ النِّعۡمَةِ" اور "وَمَا ظَلَمُونَا" کے بعد "بِذَلِكَ الۡكُفۡرِ" محذف ہیں۔ گویا اصل عبارت یہ "قُلۡنَالَهُمۡ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ

مَا رَزَقْنٰكُمْ فَظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ بِكُفْرِهِمْ تِلْكَ النِّعْمَةِ وَمَا ظَلَمُوْنَا بِذٰلِكَ الْكُفْرِ وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ" تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ جو حلال پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں عطا کیا ان میں سے کھاؤ، مگر انہوں نے ان نعمتوں کو جھٹلا کر اپنے نفسوں پر ظلم کیا، کفر کر کے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ہی ظلم کیا ہے۔ مذکورہ بالا آیت سے "قُلْنَا لَهُمْ" اور "فَظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ بِكُفْرِهِمْ تِلْكَ النِّعْمَةِ" وغیرہ کے جملے حذف کر دیے گئے ہیں، اوراس پر دلیل آیت میں موجود جملہ "وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ" ہے۔ آیت سے چونکہ یہ جملے حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فعل ماضی اور مضارع دونوں کو جمع لایا ہے، "ظَلَمُوْنَا" بول کر فعلِ ماضی کا ذکر کر دیا، جو زمانہ گذشتہ میں کسی کام کے وقوع پر دلالت کرتا ہے، اور "يَظْلِمُوْن" بول کر فعل مضارع کو ذکر کر دیا جو زمانہ حال اور مستقبل میں کسی کام کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیت میں ماضی (ظَلَمُوْنَا) اور مضارع (يَظْلِمُوْن) کو اس لئے جمع لایا گیا تاکہ مندرجہ ذیل نکات پر دلالت ہو۔

نمبر۱: مختلف زمانوں کے یہ دو صیغے اس لئے جمع لائے گئے تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ بنی اسرائیل ظلم وستم گری پر ڈٹے ہوئے تھے، وہ کسی طرح اسکے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

نمبر۲: یہ دونوں صیغے اس لئے جمع لائے گئے تاکہ یہ بتایا جائے کہ بنی اسرائیل کے کفر میں استمرار پایا جاتا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل ہر زمانہ میں کفر پر اتراتے رہتے تھے۔

﴿وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "أَنْفُسَهُمْ" فعل کا مفعول ہو کر معمول مقدم اور "يَظْلِمُوْنَ"

اس کا عامل مؤخر ہے، اصول کے مطابق عامل معمول پر مقدم ہوا کرتا ہے، لیکن جب کوئی خاص غرض مطلوب ہو تو معمول کو عامل مقدم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی "قصر" کے افادہ کی خاطر "أَنفُسَهُمْ" معمول کو اس کے عامل "یَظْلِمُونَ" پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ ❶ آیت مذکورہ میں بھی عامل پر معمول کی تقدیم سے حکم ظلم کو بنی اسرائیل کے نفسوں کے ساتھ مختص کر دیا گیا، اس لئے یہ تقدیم "قصر" کا فائدہ دیتی ہے۔ قصر کی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "بنی اسرائیل نے اپنے نفسوں پر ہی ظلم کیا ہے، وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑ پائے"۔ اس آیت میں بنی اسرائیل پر ایک قسم کا تہکم اور استہزاء بھی ہے کہ یہ کتنے بے عقل اور نادان لوگ ہیں جو اپنے اوپر ہی ظلم کرتے جا رہے ہیں۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۵۹)﴾

ترجمہ: مگر ہوا یہ کہ جو بات ان سے کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر ایک اور بات بنالی، نتیجہ یہ کہ جو نافرمانیاں وہ کرتے آرہے تھے ہم نے ان کی سزا میں ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "الاظہار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے۔ ❷ اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں موجود جملہ "ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ" میں ان بنی اسرائیل کا ذکر ہو چکا ہے جنہوں نے ظلم و نافرمانی کی۔ اس اعتبار سے اگلی آیت میں ان کے لئے ضمیر لانا ہی کافی ہے، اسم ظاہر لانے کی ضرورت نہیں، مگر آیت میں "فَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ" بول کر ضمیر لانے کے بجائے "عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا" بول کر اسمِ ظاہر کا استعمال کر دیا گیا، اس سے واضح

❶ قصر کی تعریف یہ ہے کہ کسی شئی کو دوسرے شئی کے ساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

❷ یہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا جائے۔

ہوا کہ آیت میں ”الاظہار فی مقام الاضمار“ پایا جاتا ہے۔ یہاں مقتضائے حال کے خلاف ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اس لئے لایا گیا تا کہ بنی اسرائیل کی قباحت میں زیادتی، مذمت اور ڈانٹنے میں شدید مبالغہ پیدا ہو۔

﴿رِجْزًا﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ ”رِجْزًا“ نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کی فخامت اور ہولناکی کو بیان کیا جاتا ہے، یہاں بھی ”رِجْزًا“ کو نکرہ لاکر یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل پر آسمان سے جو عذاب اتارا گیا وہ بہت ہی بڑا اور خطرناک عذاب تھا۔

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (٦٠)﴾

ترجمہ: (ہم نے کہا) اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ، اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرنا۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ ”رِزْق“ کی اضافت لفظِ ”اللّٰہ“ کی طرف کردی گئی ہے، یہ اضافت مندرجہ ذیل فوائد کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہوئی ہے۔

نمبر۱: بنی اسرائیل کو جو نعمتیں دی گئی اور جو احسانات اللہ نے ان پر کئے وہ بہت عظیم الشان تھے۔

نمبر۲: بنی اسرائیل کو جو رزق ملا وہ محض اللہ کے فضل وکرم سے بلا محنت ومشقت کے حاصل ہوا ہے، اس کے حصول میں بنی اسرائیل کا کوئی ذاتی عمل دخل نہیں۔

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (٦٠)﴾

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کو زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے گھومنے پھرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ گھومنا، پھرنا زمین پر ہی ہوا کرتا ہے کہیں اور نہیں، اس لحاظ سے بظاہر آیت میں ”فِي الْأَرْض“ کی ضرورت نہیں، اس کے بغیر بھی ”تَعْثَوْا“ سے (زمین پر گھومنے پھرنے) کا مفہوم سمجھ آجاتا ہے۔ مگر آیت میں ”تَعْثَوْا“ کیساتھ ”فِي

الْأَرْضِ" کا اس لئے اضافہ کیا گیا تا کہ بنی اسرائیل کے فساد پھیلانے کی قباحت کو مبالغے اور زیادتی کیساتھ بیان کیا جائے۔

﴿مُفْسِدِينَ﴾

مذکورہ لفظ آیت میں موجود "لَا تَعْثَوْا" فعل کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے، آیت میں "لَا تَعْثَوْا" فعل کو "مُفْسِدِينَ" حال سے اس لئے مقید کیا تا کہ اس فعل میں مبالغہ ہو، یعنی بنی اسرائیل کو فساد پھیلاتے ہوئے گھومنے پھرنے سے روکنے میں مبالغہ ہو۔

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ (۶۱)﴾

ترجمہ: اور (وہ وقت بھی) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے لہٰذا اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کریں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ کے کلمہ "رَبَّكَ" میں لفظ "رب" کی اضافت "کاف" ضمیرِ خطاب کی طرف کردی گئی ہے، اضافت سے کبھی کبھی مضاف الیہ کی شرافت اور عظمت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی مضاف کی۔ یہاں بھی اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کے قول میں لفظ "رب" کی اضافت "کاف" ضمیر کی طرف کر کے موسیٰ علیہ السلام کی عظمت اور شرافت کا اظہار کیا ہے۔

﴿يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ (۶۱)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مجاز عقلی" (اسناد مجازی) پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "تُنْبِتُ"، فعل "اِنْبَات" مصدر سے مشتق فعل واحد مونث غائب کا صیغہ ہے، اس کا معنی

❶ مجاز عقلی یہ ہے کہ کسی کلام میں فعل یا معنیٰ فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات کی اضافت فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو نسبت جس چیز کی طرف کی جارہی ہے، وہ حقیقت کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ ظاہری طور پر وہ نسبت کی جارہی ہو۔

(اگانے) کے ہے، آیت میں اس فعل کی نسبت زمین کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ یہ حقیقتاً اللہ سبحانہ کا فعل ہے زمین کا نہیں، اس لئے اس کا فاعل حقیقی اللہ ہے زمین نہیں، زمین تو اس کا فاعل غیر حقیقی ہے، مگر چونکہ نباتات وغیرہ کے اگنے کا محل زمین ہے، اس لئے ان میں محلیت کی مناسبت پائی جاتی ہے، اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے آیت میں "تُنۡبِتُ" فعل کی مناسبت فاعل حقیقی (اللہ سبحانہ) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی "الۡأَرۡض" کی طرف کردی گئی ہے، اسی لئے آیت میں "اسناد مجازی" پایا جاتا ہے۔

﴿يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡبِتُ الۡأَرۡضُ مِنۡ بَقۡلِهَا وَ قِثَّائِهَا وَ فُومِهَا وَ عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا(۶۱)﴾

ترجمہ: وہ ہمارے لئے کچھ وہ چیزیں پیدا کرے جو زمین اگایا کرتی ہے یعنی زمین کی ترکاریاں، اس کی ککڑیاں، اس کا گندم، اس کی دالیں اور اس کی پیاز۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "التفصیل بعد الاجمال" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں پہلے "مِمَّا تُنۡبِتُ الۡأَرۡضُ" میں اجمالاً زمین سے اگنے والی چیزوں کا بیان ہوا ہے، مگر وہ کونسی چیزیں ہیں؟ کیسی ہیں؟ اس بارے میں کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی، اس کے بعد آیت میں آگے "مِنۡ بَقۡلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا" کے ذریعہ اس اجمال کی تفصیل بیان کردی گئی کہ زمین سے اگنے والی چیزوں میں سے ترکاری، ککڑی،، گیہوں، مسور اور پیاز وغیرہ مراد ہیں۔ اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفصیل بعد الاجمال" پایا جاتا ہے۔

﴿قَالَ أَتَسۡتَبۡدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدۡنَى بِالَّذِي هُوَ خَيۡرٌ اهۡبِطُوا مِصۡرًا فَإِنَّ لَكُمۡ مَا سَأَلۡتُمۡ (۶۱)﴾

---

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں اوّل کسی بات کو اجمالاً بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل کردی جائے۔ یہ طریقہ چونکہ سامعین کے دل ودماغ پر زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس لئے اہلِ بلاغت یہ طریقہ اپنے کلام میں اپنایا کرتے ہیں۔

ترجمہ: موسیٰ نے کہا جو (غذا) بہتر تھی کیا تم اس کو ایسی چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو جو گھٹیا درجے کی ہیں؟

مذکورہ آیتِ کریمہ موسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے، اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ہمزہ استفہامیہ استعمال کیا ہے، حروفِ استفہامیہ ویسے تو کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اس معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوا کرتے ہیں۔ یہاں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں ہے، بلکہ یہ انکار اور توبیخ کے لئے ہے، ❶ یہاں بھی ہمزہ استفہام سے بنی اسرائیل کے مطالبہ کا انکار اور نفی کی گئی اور انہیں ان کے مطالبہ پر ڈانٹا گیا ہے۔ انکار کی صورت میں اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اے بنی اسرائیل تمہیں من وسلویٰ جیسی بابرکت اشیاء کے بدلہ ادنیٰ چیزوں کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے''۔ توبیخ کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ''تمہارا یہ فعل بہت غلط ہے، تمہیں تو اس پر شرم آنی چاہیے کہ خوامخواہ افضل رزق کو چھوڑ کر غیر افضل کی طرف بھاگے جاتے ہو''۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۶۱)﴾

ترجمہ: اور ان (یہودیوں) پر ذلت اور بیکسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ''کنایة'' پایا جاتا ہے ❷ یہاں ''ضُرِبَتِ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس کا معنی مارنا، ذلت اور رسوائی کے ہے، یہی اس کا معنی اصلی یعنی ملزومی معنی ہے، مگر یہاں ضرب ذلۃ اور مسکنہ سے اس کا معنی لازم مراد لیا گیا ہے، اورا

---

❶ انکار کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہامیہ کے ذریعہ کسی بات کا انکار یا اس کی نفی کی جائے اور توبیخ کا مطلب یہ ہے کہ حروف استفہامیہ کے ذریعہ کسی کو ڈانٹا جائے۔

❷ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا ملزومی معنی یعنی حقیقی معنی مراد لینا بھی درست ہو۔

س کا معنی لازم (ذلت ورسوائی کا مسلط ہونا اور احاطہ کرنا) ہے۔آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا معنی لازم مرادلیا گیا ہے،اس لئے اس میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔

﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ (۶۱)﴾

ترجمہ: ایک شہر میں جا اترو تو وہاں تمہیں وہ چیزیں مل جائیں گی جو تم نے مانگی ہیں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "اِهْبِطُوا" فعلِ امر ہے، فعلِ امر ویسے تو متکلم کا خود کو بڑا سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنے کا نام ہے، لیکن کبھی کبھی فعل امر اس معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنوں کے لئے بھی استعمال ہوا کرتا ہے۔ان میں سے ایک معنی "تعجیز" ہے۔❶ دوسرا معنی (اہانت) ہے۔❷ مذکورہ مقام میں بھی فعلِ امر ان ہی دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ تعجیز کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ "بنی اسرائیل وادی تیہ سے نکل کر کسی دوسرے شہر یا جگہ میں جانے سے عاجز اور مجبور ہیں، ان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی اور ملک یا شہر میں سکونت اختیار کریں اور وادی تیہ سے نکل جائیں، کیونکہ ان پر تمام شہروں کے دروازے بند کردئے گئے تھے،کوئی راستہ اور جگہ ایسی نہ تھی جس کے ذریعہ یہ نکل کر کسی شہر میں چلے جائیں، دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ چالیس سال کے عرصہ دراز تک اسی وادی تیہ میں حیران وسرگرداں پڑے رہے،انہیں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملا،اس سے واضح ہوا کہ "اهْبِطُوا" فعلِ امر سے بنی اسرائیل کو عاجز قرار دیا گیا ہے۔اہانت کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ذلیل اور رسوا ہو جاؤ،تمہیں یہاں سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملے گا۔

﴿وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ﴾

ترجمہ: اور وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ "غَضَبٍ" نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی کسی شے کی

❶ تعجیز کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کو متکلم کسی کام کرنے سے عاجز اور درماندہ قرار دے۔

❷ اہانت کا مطلب یہ ہے کہ متکلم فعلِ امر کے ذریعہ مخاطب کی تذلیل اور رسوائی کرے۔

عظمت، فخامت اور شدت بیان کی جاتی ہے، اس لئے آیت کریمہ میں بھی "غَضَبٍ" کونکرہ لاکر بنی اسرائیل پر ہونے والے غضب کے بڑے ہونے اور شدت کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "بنی اسرائیل اللہ سبحانہ کے بہت بڑے غضب میں مبتلاء ہوئے تھے"۔

﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۶۱)﴾

ترجمہ: اور پیغمبروں کو ناحق قتل کردیتے تھے۔

بنی اسرائیل میں ایک حد درجہ کی خرابی اور گناہ یہ بھی پایا جاتا تھا کہ وہ انبیاء کا قتل بڑی بے دردی اور تشدد سے کیا کرتے تھے، انہوں نے حضرت زکریا اور یحیی علیہما السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا، اسی بات کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں نکتہ کی بات یہ ہے کہ یہاں قتل انبیاء کو "بِغَيْرِ الْحَق" کی قید سے مقید کردیا گیا ہے، حالانکہ انبیاء کے قتل کا ناحق ہونا سب کو معلوم ہے، اس لئے کہ انبیاء معصوم ہیں اور معصوم کوئی جرم نہیں کرتے کہ اس جرم کے پاداش میں انہیں قتل کی جائے۔ اس لئے انبیاء کو اگر کوئی قتل کرے تو وہ ناحق ہی ہوگا، لہٰذا "بِغَيْرِ الْحَقِّ" کی قید کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں، لیکن آیت کریمہ میں اس کے باوجود صراحت کیساتھ "بِغَيْرِ الْحَقِّ" کی قید لائی گئی، یہ ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ انبیاء کے قتل کا ناحق ہونا عام لوگوں کے معلومات تک ہی محدود نہیں بلکہ خود انبیاء کے قاتلوں کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ان کا انبیاء کو قتل کرنا ناحق ہی ہے۔ ان انبیاء سے کسی بھی لمحے ایسے فعل کا صدور نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ مستحقِ قتل بنیں، انہیں جب بھی قتل کیا جائے گا وہ ناحق ہی ہوگا، انہیں اس فعلِ بد پر حبِ دنیا اور نفسانی خواہشات نے ابھارا تھا۔ گویا ان کا دوہرا جرم تھا، ایک انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا اور نمبر ۲ جانتے بوجھتے ناحق طور پر۔ اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے "بِغَيْرِ الْحَقِّ" کی قید آیت میں صراحت کیساتھ بیان کی گئی ہے۔

﴿ذَٰلِکَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (۶۱)﴾

ترجمہ: یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کردیتے تھے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ بے حد زیادتیاں کرتے تھے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں اطناب کی ایک قسم "تکرار" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ" میں "ذَٰلِكَ" اسم اشارہ کا ذکر ہوا، پھر دوبارہ "ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا" میں اسم اشارہ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں "ذلك" اسم اشارہ کا تکرار پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ مشار الیہ یعنی بنی اسرائیل پر ہونے والے غضب کی تاکید بیان ہو۔ واضح رہے کہ یہ تکرار اس صورت میں ہوگا جب دونوں اسم اشارہ کا مشار الیہ ایک ہو۔ اور وہ (غضب الٰہی) ہے، اگر ان دونوں کا مشار الیہ علیحدہ علیحدہ ہو یعنی پہلے اسم اشارہ کا مشار الیہ (غضب الٰہی) اور دوسرے اسم اشارہ کا مشار الیہ (انکار آیت اور قتل انبیاء) ہو تو یہ تکرار کے قبیل سے نہ ہوگا۔

﴿ذَٰلِکَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل (یہود) کے افعال شنیعہ کی روئیداد سنائی گئی ہے، ان کے مذکورہ افعال گذشتہ زمانہ میں وقوع پذیر ہو چکے ہیں، اور جب کوئی کام زمانہ گذشتہ میں ہو جائے تو اس کے لئے عربی میں ماضی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے، جو فعل کے زمانہ ماضی میں واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کریمہ میں بھی "يَكْفُرُونَ، يَقْتُلُونَ، يَعْتَدُونَ" کے بجائے ماضی کے صیغے ہونے چاہیے تھے، کیونکہ یہ افعال گذشتہ زمانہ میں واقع

❶ تکرار کا مطلب یہ ہے کہ کسی فائدہ کی غرض سے کوئی کلمہ یا جملہ مکرر ذکر کیا جائے۔

ہو چکے ہیں، مگر آیت میں ان کو ماضی کی جگہ مضارع کی شکلوں میں بیان کیا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ ان افعال کے معنوں میں دوام اور استمرار کا مفہوم حاصل ہو۔ استمرار اور کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل کفر، قتل انبیاء، اور سرکشی کرتے رہتے تھے۔ یعنی یہ ان کا وقتی اور عارضی فعل نہیں تھا، بلکہ انہیں جب بھی ایسا موقع ملتا تو وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (٦٣)﴾

ترجمہ: اور وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے (تورات پر عمل کرنے کا) عہد لیا تھا، اور کوہ طور کو تمہارے اوپر اٹھا کھڑا کیا تھا (کہ) جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اس کو مضبوطی سے تھامو) اور اس میں جو کچھ (لکھا) ہے اس کو یاد رکھو، تا کہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت کریمہ میں "ایجاز حذف" واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں "خُذُوا" فعل امر سے پہلے "قُلْنَا لَهُمْ" کا جملہ محذوف ہے، یہ اصل میں "قُلْنَا لَهُمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لے لیا اور ان کے سروں پر پہاڑوں کو اٹھا لیا تو ہم نے ان سے کہا کہ اے لوگو! جو احکام ہم نے تمہیں دیئے ہیں انہیں مضبوطی سے تھام لو اس آیت کریمہ سے چونکہ "قُلْنَا لَهُمْ" کا جملہ حذف کر دیا گیا، اور اس محذوف کی تعین "إِذْ أَخَذْنَا" متکلم کا صیغہ کر رہا ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ (٦٤)﴾

ترجمہ: اس سب کے باوجود تم دوبارہ (راہ راست سے) پھر گئے۔

---

❶ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی جملہ یا کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں اس محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارۃ تصریحیۃ" اور " استعارۃ تبعیۃ" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں احکام اور اعتقاداتِ حقہ کے ترک کرنے کو پیٹھ پھیر کر بھاگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ احکام اور اعتقاداتِ حقہ کا ترک کرنا "مشبہ" اور پیٹھ پھیر کر بھاگنا "مشبہ بہ" ہے۔ آیت میں چونکہ "تَوَلَّیْتُمْ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارہ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت میں " استعارہ تبعیۃ" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "تَوَلَّیْتُمْ" فعل مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارۃ تبعیۃ" موجود ہے۔

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ(٦٥)﴾

ترجمہ: چنانچہ ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم دھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "کُوْنُوْا" فعل "کَانَ" سے امر کا صیغہ ہے۔ امر کی اصل وضع تو اس لئے ہوئی تا کہ متکلم خود کو بڑا سمجھ کر مخاطب سے کوئی کام طلب کرے، لیکن کبھی کبھی فعل امر اپنے اس اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ان معنوں میں سے ایک معنی "اہانت و تحقیر" ہے۔ ❸ یہاں فعل امر کے ذریعہ بنی اسرائیل کو رسوا کیا گیا ہے کہ تمہاری حرکتیں بڑی ہی عجیب ہے، اس لئے تم بہت ذلیل اور رسوا قوم ہو۔ اس میں حقیقتاً فعلِ امر سے بندر بننے کا فعل اللہ کو مطلوب نہیں، کیونکہ بنی اسرائیل میں بندر بنے کی طاقت نہیں کہ اَز خود وہ بندر بن جائیں۔ اس لئے یہاں فعل امر ذلت اور رسوائی کے لئے ہے۔

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف اور اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❸ اس کا مطلب یہ ہے کہ امر سے مقصود کوئی کام مطلوب نہ ہو بلکہ مخاطب کو رسوا اور ذلیل کرنا مقصود ہو۔

﴿فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ (٦٦)﴾

ترجمہ: پھر ہم نے اس واقعے کو اس زمانے کے اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت اور ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کا سامان بنا دیا۔

اس آیت کریمہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں زمانہ ماضی کو کسی چیز کے اگلے حصہ سے اور زمانہ مستقبل کو کسی چیز کے پچھلے حصہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں زمانہ ماضی اور مستقبل" مشبه" اور کسی چیز کا اگلا پچھلا حصہ "مشبه به" ہے۔ آیت میں چونکہ "يَدَی اور خَلْفَ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے۔ اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ (٦٨) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ (٦٩)﴾

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو کہ نہ بہت بوڑھی ہو نہ بالکل بچی (بلکہ) ان دونوں کے بیچ بیچ میں ہو۔ بس اب جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اس پر عمل کرلو۔ کہنے لگے آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے تیز زرد رنگ کی گائے ہو جو دیکھنے والوں کا دل خوش کر دے۔

مذکورہ آیات کریمہ میں اور اسی طرح ان کے بعد آنے والی آیات میں اطناب کی ایک قسم "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے، اس بارے میں سوال وجواب مکرر لایا گیا ہے، بار بار بنی اسرائیل کی طرف سے اس گائے

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

کہ بارے میں سوال ہوتا، کبھی تو وہ اس گائے کی حقیقت پوچھتے، کبھی اس کے رنگ کے متعلق سوال کرتے اور کبھی اس کی کیفیت کا پوچھتے، موسیٰ علیہ السلام بار باران کے سوالوں کے جوابات دیتے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں سوال وجواب کا "تکرار" پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ جس گائے کے ذبح کا حکم بنی اسرائیل کو ملا تھا اس کی ذاتی کنہ اور حقیقت خوب واضح ہو جائے۔

﴿قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ (۷۱)﴾

ترجمہ: انہوں نے کہا: ہاں! اب آپ ٹھیک ٹھیک پتہ لے کر آئے، اس کے بعد انہوں نے اسے ذبح کیا، جبکہ لگتا نہیں تھا کہ وہ کر پائیں گے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں "فَذَبَحُوهَا" سے پہلے "فَطَلَبُوهَا وَوَجَدُوهَا عِنْدَ فَتىً بَارًّا لِوَالِدَتِهِ فَاشْتَرُوهَا" محذوف ہے، گویا اصل عبارت "قَالُوا الآنَ جِئتَ بِالْحَقِّ فَطَلَبُوهَا، وَوَجَدُوهَا عِنْدَ فَتىً، بَارًّا لِوَالِدَتِهِ فَاشْتَرُوهَا، فَذَبَحُوهَا" تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب گائے کے بارے میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے تمام اوصاف وصفات بیان کر دی گئیں، تو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب آپ نے ساری باتیں درست بتا دی، پھر اسکے بعد بنی اسرائیل نے گائے تلاش کی، وہ گائے انہیں ایسے نیکوکار جوان لڑکے کے پاس ملی جو اپنی والدہ کا خدمت گار اور مطیع تھا، انہوں نے وہ گائے خرید لی پھر اسے ذبح کر ڈالا۔ اس آیت سے چونکہ "فَطَلَبُوهَا وَوَجَدُوهَا" کا جملہ حذف کر دیا گیا اور "فَذَبَحُوهَا" کی "فا" اس محذوف کو متعین بھی کرتی ہے، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (۷۲) فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُحْيِ اللَّهُ الْمَوْتَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۷۳)﴾

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اور اس کے بعد اس کا الزام ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے، اور اللہ کو وہ راز نکال باہر کرنا تھا جو تم چھپائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے کہا کہ اس (مقتول) کو اس (گائے) کے ایک حصے سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور تمہیں (اپنی قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

مذکورہ مقام میں "وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ" بطور جملہ معترضہ کے واقعہ ہوا ہے۔ جملہ معترضہ لانے کو بلاغت کی اصطلاح میں "الاعتراض" کہا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "فَادَّارَأْتُمْ" اور "فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ" معطوف، معطوف علیہ ہے اور معطوف، معطوف علیہ حکم میں معناً مربوط ہوتے ہیں، ان دونوں جملوں کے درمیان آیت میں "وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ" کا جملہ لایا گیا ہے، چونکہ یہ جملہ آیت میں دو معناً مربوط جملوں کے درمیان واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "اعتراض" پایا جاتا ہے۔ اور یہ جملہ معترضہ اس لئے لائے تاکہ یہ بتایا جائے کہ بنی اسرائیل آخر جتنا بھی واقعہ قتل کو مخفی رکھنے کی کوشش کریں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ حقیقت حال کو لامحالہ روشن کر کے رہے گا، تاکہ قاتل کی مکمل وضاحت ہو جائے۔

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (۷۴)﴾

ترجمہ: اس سب کے بعد تمہارے دل پھر سخت ہو گئے، یہاں تک کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی زیادہ۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور "استعارة تبعية" پائے جاتے ہیں۔ ❷ یہاں "عدم ایقان" (یقین نہ دلانے) کو سختی سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں عدمِ ایقان "مشبه" اور سختی "مشبه به" ہے، ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح سختی والی شئی کسی اثر کو قبول

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ ایک جملہ کے اجزاء کے درمیان یا ایسے دو جملوں کے درمیان کسی لفظ یا جملہ کا لانا جو معناً ایک دوسرے سے مربوط ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

نہیں کرتی، اسی طرح عدم ایقان کی صورت میں کوئی بات اثر نہیں کرتی، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر یہاں عدمِ ایقان کو سختی سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن چونکہ آیت میں "قَسَتْ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

اسی طرح آیت میں "استعارة تبعية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "قَسَتْ" فعل مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

بعض علمائے بلاغت کے نزدیک آیت میں "استعارة مكنية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کے قلوب کو عدمِ قبول نصیحت کی بناء پر پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو سختی اور صلابت رکھتے ہیں، "بنی اسرائیل کے قلوب "مشبه" اور پتھر "مشبه به" ہے، وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح پتھر اپنی صلابت و سختی کی وجہ سے کوئی اثر نہیں لیتا، اسی طرح بنی اسرائیل کے قلوب بھی کسی بات کا اثر نہیں لیتے۔ اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں بنی اسرائیل کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آیت میں چونکہ "قُلُوْبُكُمْ" بول کر مشبہ کو ذکر کر دیا گیا اور مشبہ بہ (پتھر) کو حذف کر دیا گیا ہے لیکن "قَسَتْ" بول کر مشبہ بہ کی ایک لازم وصف (سختی و صلابت) کا ذکر کر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، اس لیے اس میں "استعارة مكنية" موجود ہے۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (۷۴)﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی زیادہ۔

اس آیت میں "تشبيه مرسل" اور "تشبيه مجمل" پائے جاتے ہیں۔ ❸ یہاں

---

❶ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❷ استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ مذکور ہو اور مشبہ بہ حذف کر دیا جائے، مگر مشبہ بہ کے کسی لازم کو ذکر کر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

❸ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ موجود ہو۔

"کَالْحِجَارَۃِ" میں چونکہ کاف حرف تشبیہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ مرسل" پائی جاتی ہے۔اس طرح اس آیت کریمہ میں "تشبیہ مجمل" بھی پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں بنی اسرائیل کے قلوب کو حق سے روگردانی اور اس پر مضبوطی سے جمے رہنے پر سخت پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں بنی اسرائیل کے قلوب "مشبہ" اور سخت پتھر "مشبہ بہ" ہے، اور ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح پتھر سختی کے سبب جما ہوا ہے کسی کے اثر کو قبول نہیں کرتا بالکل اسی طرح ان کے دل بھی ایک ہی حالت پر جمے ہوئے ہیں اور حق بات کے اثر کو قبول نہیں کرتے۔آیت میں چونکہ یہ وجہ شبہ مذکور نہیں اس لئے اس میں "تشبیہ مجمل" پائی جاتی ہے۔اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کی شناعت اور قباحت کو تاکید سے بیان کرنے کے لئے تشبیہ میں اعلیٰ اور ارذل کی طرف ترقی بھی ہوئی، پتھر سے بھی گئے گذرے ہیں، پتھر تو ان کے دل سے کچھ بہتر ہے، ان کے دل پتھروں سے زیادہ سخت ہیں، جبکہ پتھروں میں ان کے مقابلہ میں نرمی اور فوائد پائے جاتے ہیں، بعض سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں، بعض سے پھٹ جانے کے سبب پانی نکل پڑتا ہے اور بعض اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں، لیکن بنی اسرائیل کے قلوب بڑے سخت ہیں، ان پر ہدایت کی کوئی بات اثر نہیں کرتی، خود بھی فائدہ نہیں لیتے اور کتمانِ حق اور تلبیس کے ذریعے دوسروں کو بھی روکتے۔

﴿وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ (۷۴)﴾

ترجمہ: پتھروں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ بہتی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "الْأَنْهَارُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (نہروں) کے ہے، مگر یہ معنی یہاں مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ پتھروں

---

❶ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ محذوف ہو مذکور نہ ہو۔

❷ مجاز مرسل وہ ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، کلیت، حالیت، یا ما کان علیہ وغیرہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

سے نہریں نہیں پھوٹتیں بلکہ پانی پھوٹتا ہے، اس لئے یہاں مجازی معنی مراد لیا جائے گا اور اس کا مجازی معنی (پانی) ہے۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ محلیت حالیت کا ہے، نہر محل اور پانی حال ہے۔ گویا آیت میں محل کا اطلاق کر کے حال مراد لیا گیا ہے، اسی لئے ان میں محلیت، حالیت کا علاقہ پایا جاتا ہے، چونکہ آیت میں ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا نہیں، بلکہ حالیت ومحلیت کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۷۴)﴾

ترجمہ: اور انہی میں وہ (پتھر) بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے لڑھک جاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں "مجاز عقلی" (اسناد مجازی) پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "خَشْيَة" مصدر استعمال ہوا ہے اور مصدر معنی فعل کے قبیل سے ہے۔ آیت کریمہ میں اس "خَشْيَة" کی نسبت پتھروں کی طرف کر دی گئی ہے، حالانکہ خشیت اور ڈرنا پتھروں کا کام نہیں، بلکہ ذی روح (جانداروں) کا کام ہے، اس لحاظ سے "خَشْيَة" کا فاعل حقیقی ذی روح ہے پتھر نہیں، مگر آیت میں بنی اسرائیل پر تنقید کرنے کے لئے ظاہری طور پر فعل خشیت کی نسبت فاعلِ حقیقی (ذی روح) کی طرف کرنے کے بجائے فاعلِ غیر حقیقی (پتھروں) کی طرف کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "اسناد مجازی" موجود ہے۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ (۷۵)﴾

ترجمہ: (مسلمانو!) کیا اب بھی تمہیں یہ لالچ ہے کہ یہ لوگ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟

❶ مجاز عقلی اصل میں نسبت میں مجاز واقع ہونے کو کہتے ہیں، اس کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ فعل یا معنی فعل یعنی فعلِ مجہول اور اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعلِ غیر حقیقی کی طرف کر دی جائے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ہمزہ استفہامیہ واقع ہوا ہے۔ ❶ یہ ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی کے لئے مستعمل نہیں بلکہ یہ بھی انکار کے لئے استعمال ہوا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اے مسلمانوں تم ان یہود سے قبول ایمان کی آس وامید نہ لگائے رکھو''۔ یہاں ہمزہ استفہامیہ انکار کے لئے واقع ہوا تا کہ مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں:

نمبر۱: یہ استفہام انکار کے لئے اس لئے واقع ہوا تا کہ یہ معلوم ہو کہ ان یہود کا ایمان لانا بعید از عقل ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ سبحانہ کے دلائل واضحہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اس کے باوجود بھی یہ کلام اللہ کی تحریف کرنے میں لگ گئے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ ایمان قبول نہیں کرینگے۔

نمبر۲: چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شفقت کی وجہ سے اور اہل ایمان حسن ظن کی بنیاد پر یہود کے قبول ایمان پر بہت زیادہ حریص تھے، جس کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان بہت غمزدہ رہتے کہ کاش یہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اللہ سبحانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو تسلی دینے کے لئے ہمزہ استفہام انکاری آیت میں بیان فرمادیا کہ آپ اپنے آپ کو ان کے ایمان کے لئے تھکا کر غمزدہ نہ کریں، یہ لوگ اپنے ہٹ دھرمی کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۷۵)﴾

ترجمہ: پھر اس کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد بھی جانتے بوجھتے اس میں تحریف کرڈالتے تھے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں ''وَهُمْ يَعْلَمُونَ'' کا جملہ ''يُحَرِّفُونَ'' کے فاعل سے حال واقع

❶ حروف استفہامیہ اصل میں تو کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اصل معنی کے علاوہ دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں، جن میں سے ایک معنی ''انکار'' کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ مخاطب کے سامنے کلام کے عنوان ومضمون کی نفی کی جائے یا انکار کیا جائے۔

ہورہا ہے اور حال ذوالحال کے لئے قید ہوکرتا ہے، یہاں اس قید کے بغیر بھی یہود کا تورات میں تحریف کا مرتکب ہونا معلوم ہوجاتا ہے،لیکن کچھ اہم نکات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ قید بڑھادی گئی ہے، وہ نکات یہ ہیں۔

نمبرا: یہ قید اس لئے بڑھائی گئی تاکہ یہود کے اس فعل تحریف کی خوب قباحت ومذمت واضح ہو:

نمبر۲: یہ قید اس لئے بڑھائی گئی تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہود کا تورات میں تحریف ورد وبدل سے کام لینا ارادے اور قصدِ صمیم سے تھا، وہ جہالت اور نسیان کی وجہ سے ایسانہیں کرتے تھے، بلکہ جان بوجھ کرتورات میں تحریف کرتے تھے۔اور جوشخص جان بوجھ کرکسی معصیت کا مرتکب ہووہ ایسے شخص سے زیادہ توبیخ اور مذمت کا مستحق ہوتا ہے جو جہالت یانا واقفیت کی بنیاد پر کرجائے، یہود چونکہ علم کے باوجود تحریف کرتے تھے،اس لئے وہ توبیخ وزجر کے زیادہ مستحق ہیں۔

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ(٧٦)﴾

ترجمہ: اور جب یہ لوگ ان (مسلمانوں) سے ملتے ہیں جو پہلے ایمان لاچکے ہیں تو (زبان سے) کہہ دیتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں، اور جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں جاتے ہیں تو (آپس میں ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ کیا تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ (مسلمان) تمہارے پروردگار کے پاس جاکر انہیں تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کریں؟ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں؟

مذکورہ آیتِ کریمہ کے کلمہ ”أَتُحَدِّثُونَهُمْ“ میں ہمزہ استفہامیہ واقع ہوا ہے، حروفِ

استفہامیہ اصل میں اس لئے وضع ہوئے تا کہ ان کے ذریعہ کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں، لیکن کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اس معنی کے علاوہ دوسرے معنی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ان میں سے ایک معنی نہی کے بھی ہے،مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کو کلام میں نہی کا معنی لینے کے لئے استعمال کیا جائے۔اس آیت کریمہ میں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ نہی کے لئے استعمال ہوا ہے،اس صورت میں جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ ’’تم اہل ایمان سے ایسی بات مت کرو جس کے سبب اللہ سبحانہ تعالیٰ تمہارے خلاف مسلمانوں کی حجت قائم کردے اور وہ تم پر غالب آجائے‘‘۔

﴿بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ﴾

مذکورہ جملہ یہود کے روساء کا قول ہے جو وہ منافق یہودیوں سے کہا کرتے تھے۔اس قول میں روساءِ یہود نے اللہ سبحانہ کے ظاہر کردہ اور بیان کردہ باتوں کے بارے میں ’’فَتَحَ‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے۔حالانکہ ظہور اور بیان کے لئے عربی میں ’’اَظْهَرَ‘‘ اور ’’بَيَّنَ‘‘ استعمال ہوتا ہے،لیکن سردارانِ یہود نے ’’اَظْهَرَ‘‘ اور ’’بَيَّنَ‘‘ کے بجائے ’’فَتَحَ‘‘ کی تعبیر استعمال کی، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ یہ تاثر دیا جائے کہ ان باتوں کو اللہ کے سواء کوئی نہیں جانتا، وہ بالکل پوشیدہ راز ہیں اور وہ ایسا بند دروازہ ہے جسے اللہ کے سوا کوئی کھولنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

مذکورہ جملہ بھی سردارانِ یہود کا قول ہے،اس میں ہمزہ استفہام واقع ہوا ہے۔حروف استفہامیہ اصل میں اس لئے وضع ہوئے تا کہ ان کے ذریعہ کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں، لیکن کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اس معنی کے علاوہ دوسرے معنی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔اس جملہ میں ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ

یہ توبیخ اور عتاب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ❶ یہاں بھی ہمزہ استفہام کے ذریعہ یہود کے سرداروں نے منافق یہودیوں کو ان کے فعل پر عتاب کیا اور ان کی توبیخ کی۔

﴿أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۷۷)﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ (جو ایسی باتیں کرتے ہیں) یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو ان ساری باتوں کا خوب علم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں؟

مذکورہ آیتِ کریمہ کے لفظِ "یُسِرُّوْنَ" اور "یُعْلِنُوْنَ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "یُسِرُّوْنَ" "اسرار" مصدر سے مشتق جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، جو بمعنی (چھپانے اور خفیہ رکھنے) کے ہے۔ اسی طرح "یُعْلِنُوْنَ" "اعلان" مصدر سے مشتق جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، جو بمعنی (واضح کرنے اور ظاہر کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے اس لئے ان کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ (۷۹)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں اخبار یہود کی سزا سنائی گئی ہے، احبار یہود تورات کو اپنے ہاتھوں سے بدل کر کچھ اضافہ کر دیتے اور کچھ کمی کر دیتے، ان کے اس فعل پر اللہ سبحانہ نے انکی سزا سنائی کہ ان لوگوں کے لئے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر اس کے اصل مضامین کو بدل ڈالتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں "یَکْتُبُوْنَ" فعل مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، یہ "کتابۃ" مصدر سے مشتق ہے جو (لکھنے کے) معنی میں ہے۔ آیتِ کریمہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ فعل کتابت کیساتھ "بِأَیْدِیْهِمْ" بول کر ہاتھوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے،

❶ توبیخ اور عتاب کا مطلب یہ ہے کہ حروف استفہام کے ذریعہ کلام کے مخاطب کو ڈانٹا جائے اور ان پر عتاب کیا جائے۔

❷ طباق کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

حالانکہ کتابت ہوتی ہی ہاتھوں سے ہے،اس لئے بظاہر "أَیْد" (ہاتھوں) کا ذکر کرنا ضروری نہیں تھا،مگر آیت میں دو نکات کے حصول کے لئے فعلِ کتابت کے ساتھ لفظِ "أَیْدِ" (ہاتھوں) کی قید بڑھادی گئی ہے،وہ دو نکات یہ ہیں:

نمبر۱:اس آیت کریمہ میں صرف لفظِ "یَکْتُبُوْنَ" سے اس کے مجازی معنی (دوسرے سے املاء کروانے) کی طرف ذہن کے منتقل ہونے کا قوی امکان تھا،اس لئے آیت میں فعلِ "یَکْتُبُوْنَ کیساتھ "أَیْد" کی قید بڑھا کر یہ امکان ختم کردیا کہ یہاں" یَکْتُبُون" اپنے اصل معنی میں ہی ہے مجازی معنی میں نہیں۔

نمبر۲: یہاں" یَکْتُبُون" فعل کے ساتھ "أَیْد" کی قید اس لئے بڑھائی تاکہ باس بات میں تاکید اور زور پیدا ہو کہ یہ لوگ خود ہی فعلِ کتابت کے ذریعے تحریف کرتے تھے۔اس آیت کریمہ میں "اطناب" بھی پایا جاتا ہے۔ (1) اس آیتِ کریمہ کی غرضِ اصلی اور معنی مقصود یہ بتانا ہے کہ جو احبارِ یہود تورات کی کتابت کر کے اس میں تحریف کرتے تھے ان کے لئے بڑی خرابی ہے،یہ معنی مقصود "یَکْتُبُونَ الْکِتَاب" کے جملہ سے سمجھ آجاتا ہے،لیکن آیت میں "بِأَیْدِیھِم" بول کر مقصود سے زائد عبارت لائی گئی ہے،اس سے واضح ہوا کہ اس آیت کریمہ میں "اطناب" پایا جاتا ہے۔یہ اطناب اس لئے واقع ہوا تاکہ مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں:

نمبر۱:احبارِ یہود کی حالتِ کتابت اچھی طرح سامعین کے ذہنوں میں نقش ہو جائے۔

نمبر۲:احبارِ یہود کی فعلِ کتابت کو سامع کے سامنے اس قدر اہمیت سے بیان کیا جائے گویا وہ اپنی آنکھوں سے علمائے یہود کے اس برے عمل کو دیکھ رہے ہیں۔

نمبر۳: یہ اطناب اس لئے واقع ہوا تاکہ یہودِ احبار پر اس فعل کی مہر لگ جائے۔

---

(1) اطناب یہ ہے کہ کسی معنی مقصود کو اس سے زائد عبارت لاکر پیش کیا جائے اور یہ زائد عبارت کسی مقصد و فائدے کے تحت ہو۔

﴿لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا(۷۹)﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "استعارة تصريحية و تبعية" واقع ہوئے ہیں۔ ❶ یہاں "استبدال" (ادلی بدلی کرنے) کو "اشتراء" (خریداری کرنے) سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں استبدال "مشبہ" اور اشتراء "مشبہ بہ" ہے، اور ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح خریداری میں خریدار ثمن دے کر اس کے بدلہ میں کچھ لیتا ہے، بالکل اسی طرح احبارِ یہود اپنے ہاتھوں سے کتابت کر کے تورات کی تحریف کرتے ہیں اور اس کے بدلے اِن سے معمولی رقم لیتے تھے۔ اس وجہ شبہ کی وجہ سے آیت میں "استبدال" کو "اشتراء" سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر آیت میں چونکہ "لِيَشْتَرُوا" بول کر صراحتاً لفظوں میں مشبہ بہ کو ذکر کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ(۷۹)﴾

ترجمہ: لہٰذا تباہی ہے ان لوگوں کی جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تا کہ اس کے ذریعے تھوڑی سی آمدنی کما لیں۔ پس تباہی ہے ان لوگوں پر اس تحریر کی وجہ سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی، اور تباہی ہے ان پر اس آمدنی کی وجہ سے بھی جو وہ کماتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اطناب کی ایک قسم "تکرار" پایا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایک مرتبہ "وَيْل" کا لفظ "لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ" کیساتھ ذکر ہوا، پھر اس کے بعد دوبارہ "فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ" میں "وَيْل" کا ذکر ہوا، پھر سہ بارہ آخر میں "وَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ" میں "وَيْل" کا ذکر ہوا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں لفظِ "وَيْل" کا تکرار پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ احبارِ یہود کو ان کے کرتوتوں پر خوب ڈانٹا جائے، ان کی

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

توبیخ بیان کی جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ انکا جرم قباحت وشناعت کے آخری منزل تک پہنچا ہوا ہے۔

﴿بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۱)﴾

ترجمہ: جو لوگ بھی بدی کماتے ہیں اور ان کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "کَسَبَ" بطور "تھکم" استعمال ہوا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں برائی کرنے والے کے لئے "کَسَبَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "کَسَبَ" حقیقت میں جلبِ منفعت کو کہا جاتا ہے، اور یہ واضح بات ہے کہ برائی کے راستہ سے کبھی نفع کا حصول ممکن نہیں، مگر اس آیت میں برائی اختیار کرنے والوں کا استہزاء اور مذاق اڑانے کے لئے "کَسَبَ" فعل کو منفعت کے بجائے مضرت (سیئہ) کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں " تھکم " سے کام لیا گیا ہے۔

﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور " تبعية" پائے جاتے ہیں۔ ❷ یہاں گناہ اور معصیت کو اس دشمن سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی قوم پر پڑاؤ ڈال دے اور ہر جانب سے دیواروں کی مانند ان کا گھیراؤ کرلے۔ اس میں گناہ ومعصیت "مشبہ" اور موصوف دشمن "مشبہ بہ" ہے، آیت میں "خَطِيئَتُه" بول کر چونکہ مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" ہے۔ اسی طرح استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔) یہاں "خَطِيئَتُه" اسم مشتق ہے، اس میں استعارہ

❶ تہکم کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا لفظ یا انداز اپنایا جائے جس سے کسی کا مذاق اور استہزاء ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" پایا جاتا ہے۔ اس آیت میں استعارہ کی وضاحت کے لئے "أَحَاطَت" بول کر احاطہ سے آیت کی تعبیر اس لئے بیان ہوئی تاکہ اس بات کی طرف اشارہ کیا جائے کہ سئیات نے مکمل حسنات پر غلبہ حاصل کرلیا ہے، گویا تمام جہات سے گناہوں نے بندہ کا احاطہ کرلیا ہے۔

﴿بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۱)﴾

ترجمہ: جولوگ بھی بدی کماتے ہیں اوران کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں موجود نکتہ کو سمجھنے سے پہلے اہل بلاغت کے اسلوب کے متعلق ایک تمہید پڑھ لی جائے، وہ یہ ہے کہ اہلِ بلاغت ضمائر اور الفاظ کے جمع اور مفرد لانے میں کبھی معنی کا اعتبار کرتے ہیں اور کبھی لفظ کا، مطلب یہ کہ وہ کبھی کسی لفظ کو دیکھ کر اس کے لئے صفت، ضمیر یا کوئی دیگر چیز مفرد ذکر کردیتے ہیں اور کبھی اس کے معنی کے عموم کو دیکھ کر اس کے لئے صفت اور ضمائر وغیرہ جمع ذکر کردیتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد آیت میں موجود بلاغت کو سمجھ لیا جائے، وہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں بھی "كَسَبَ، بِهِ، خَطِيئَتُهُ" میں موجود ضمائر لفظِ "مَنْ" موصولہ کے لفظی اعتبار سے مفرد لائے گئے اور "فَأُولَئِكَ" "مَنْ" موصولہ کے معنی کی عمومیت کی وجہ سے جمع لایا گیا ہے۔

﴿فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۱)﴾ ﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۲)﴾

ان میں سے پہلی آیت میں "أُولَئِكَ" کیساتھ "فا" سببیہ پایا جاتا ہے، جو گذشتہ فعل یا امر کے سبب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور دوسری آیت میں "أُولَئِكَ" کیساتھ "فا" سببیہ

نہیں پایا جارہا۔اس طرز واسلوب میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جہنم میں ہمیشہ رہنا کفر کے سبب ہے، کفر نے ہی کافروں کو ہمیشہ کے لئے جہنم کا قیدی بنا ڈالا ،اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے پہلی آیت میں ''فا'' سببیہ داخل کیا گیا، جبکہ جنت میں ہمیشہ رہنا ایمان کے سبب سے نہیں، بلکہ اللہ رب العزت کے فضل سے ہوگا، اسی لئے اس میں ''فا'' داخل نہیں ہوا۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۸۲)﴾

ترجمہ: اور جولوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں تو وہ جنت کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

مذکورہ دونوں آیتوں کے درمیان ''مقابلہ'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلی آیت میں دو امور کا بیان ہوا ہیں:

نمبر۱:''مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُه'' سے اعمال بد کا ذکر ہوا۔

نمبر۲:''فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ'' سے اعمال بد کے مرتکب کا جہنمی ہونا بتایا گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق معانی ہیں، اور یہ موافق بایں معنی کہ ان میں باہمی کوئی ضد نہیں، آیت میں ان موافق معنوں کو بیان کرکے اگلی آیت میں ان سے ہر موافق کی بالترتیب ضد لائی گئی ،اعمال بد کی ضد یعنی اعمال خیر کا ذکر اگلی آیت میں ''وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ'' سے ہوا اور پھر اہل جہنم کی ضد یعنی اہل جنت کا ذکر ''أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُون'' سے ہوا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں آیات میں ''مقابلة'' پایا جاتا ہے۔

❶ مقابلہ یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو یا زیادہ موافق معنوں کو بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کی ضد بالترتیب لائی جائے، واضح رہے کہ یہاں موافق امور سے مراد وہ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ(۸۴)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "لَاتَعْبُدُوْن" جملہ فعلیہ خبریہ کا جملہ ہے، مگراس سے مراد(نہی) ہے۔گویا یہ جملہ "لَاتَعْبُدُو" تھا،جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔مگرآیت میں فعل نہی کی جگہ جملہ فعلیہ خبریہ اس لئے لایا گیا کہ یہ جملہ صریح نہی سے زیادہ فصیح وبلیغ ہوتا ہے،اس لئے کہ اس میں منہی عنہ(جن چیزوں سے روکا جائے) کی حالت زیادہ اہمیت سے بیان ہوتی ہے،اسی طرح جملہ فعلیہ میں حکمِ اطاعت کی تاکید زیادہ پائی جاتی ہے کہ گویا وہ کام کرلیا گیا ہے، پھر کام ہونے کے بعداس کے بارے میں خبر دے دی گئی ہے۔اسی لئے نہی کو جملہ فعلیہ سے بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ (۸۳)﴾

ترجمہ:اور(وہ وقت یاد کرو)جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروگے،اور والدین سے اچھا سلوک کروگے،اور رشتہ داروں سے بھی اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔اور لوگوں سے بھلی بات کہنا،اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ دینا۔(مگر) پھر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی سب(اس عہد سے)منہ موڑ کر پھر گئے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "التفات من الغيبة إلى الخطاب" پایا جاتا ہے۔❶ اس

❶ یہ کلام کومقتضائے ظاہر کے خلاف بیان کرنے کی ایک صورت ہے،یعنی کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ کرے،مگر وہاں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ استعمال کردیئے جائیں،یہ طریقہ اس لئے اپنایا جاتا ہے کیونکہ اس میں کلام خوشنما معلوم ہوتا ہے،اور لوگوں کی سماعت تھکاوٹ وملال سے محفوظ رہتی ہے اور لوگوں کا مزاج بھی سماعت کے بارے میں کچھ اس طرح ہے کہ ان کی فطرت ایک طریقہ سے دوسرے طریقہ کی طرف منتقل ہونے کو پسند کرتی ہے،اس لئے وہ التفات کے طریقہ سے بور نہیں ہوتے۔

آیت سے قبل اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کا ذکر "وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ......فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ" وغیرہ کے ذریعہ کیا ہے، اس میں اللہ سبحانہ نے غائب کے الفاظ استعمال کئے، مگر ہماری متعلقہ آیت میں "لَا تَعْبُدُونَ" اسی طرح "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ" وغیرہ میں خطاب کے صیغے استعمال ہوئے ہیں، حالانکہ گذشتہ آیت کے الفاظ کے اعتبار سے یہاں بھی غائب کے الفاظ ہونے چاہیے تھے، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ استعمال کئے گئے، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں "التفات من الغيبة إلى الخطاب" واقع ہوا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ سامع کلام کو سنے اور وہ اکتائے نہیں، اسی طرح بنی اسرائیل کی زیادہ سے زیادہ شناعت بیان ہوسکے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ (۸۴)﴾

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالو گے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ یہاں "لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ" استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (اپنا خون بہانے) کے ہے، مگر یہ معنی یہاں مراد نہیں کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ اپنا خون کوئی نہیں بہاتا۔ اس لئے آیت میں اس لفظ کا مجازی معنی مراد لیا جائیگا اور اس کا مجازی معنی دوسروں کے خون بہانے کے ہے، گویا آیت میں (اپنا خون بہانا) بول کر (دوسروں کا خون بہانا) مراد لیا گیا ہے، ان دونوں معنوں میں علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ سببیت، مسببیت کا ہے۔ کیونکہ دوسروں کا خون بہانا سبب اور اپنا خون بہانا مسبب ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کو قتل کریگا تو بدلہ میں خود بھی مارا جائیگا، اس لئے دوسرے کو مارنا خود کے مرنے کا سبب ہے۔ آیت میں گویا مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے، اس

لئے ان میں سببیت ،مسببیت کا علاقہ ہے،آیت میں چونکہ ایسا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان سببیت ،مسببیت کا علاقہ ہے،اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (٨٤)﴾

ترجمہ: پھر تم نے اقرار کیا تھا اور تم خود اس کے گواہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں ''استعارة تصريحية و تبعية'' پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں عہد وعدہ کی قبولیت کو اقرار کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے،اس میں عہد وعدہ کو قبول کرنا اوران پر راضی رہنا''مشبه''اور اقرار کرنا ''مشبه به'' ہے،آیت میں چونکہ ''أَقْرَرْتُم'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے آیت میں''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ''استعارة تبعية''بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''أَقْرَرْتُم'' فعلِ مشتق ہے،اس میں چونکہ استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں''استعارة تبعية'' پایا جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''اسناد عقلی''(مجازی عقلی) پایا جاتا ہے۔ ❸ یہاں فعل ''أَقْرَرْتُم'' میں اقرار کرنے کی نسبت موجودہ بنی اسرائیل کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ میثاق کو انہوں نے نہیں، بلکہ ان کے اسلاف نے قبول کیا تھا،اس لئے وہی اس کا فاعل حقیقی ہے،اخلافِ بنی اسرائیل نہیں۔لیکن چونکہ یہ موجود اخلافِ بنی اسرائیل اپنے اسلافِ بنی اسرائیل کے کرتوتوں پر راضی اور خوش تھے،اس لئے ان میں ظاہری مناسبت موجود ہے،اس لئے مناسبت

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل،حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❸ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں فعل یا معنیٰ فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت کسی ظاہری ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے فاعلِ حقیقی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی جائے۔

کی وجہ سے آیت میں فعلِ "اقـــرار" کی نسبت فاعل حقیقی (اسلافِ بنی اسرائیل) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی (اخلافِ بنی اسرائیل) کی طرف کردی گئی ہے، آیت میں چونکہ فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "اسناد مجازی" پایا جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ (۸۵)﴾

ترجمہ: اس کے بعد (آج) تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرتے ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "مـجـاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں "تَـقْـتُلُونَ أَنْـفُسَـكُمْ" استعمال ہوا ہے، اس کا معنی ہے (خود کو قتل کرنا) اور یہ اس کا حقیقی معنی ہے، مگر یہ معنی آیت میں مراد نہیں کیونکہ کوئی خود کو قتل نہیں کرتا، اس لئے یہاں اس لفظ کا مجازی معنی مراد لیا جائے گا اور اس کا مجازی معنی دوسروں کو قتل کرنے کے ہے، گویا آیت میں خود کے قتل کرنے سے دوسروں کو قتل کرنا مراد لیا گیا ہے، ان دونوں معنوں میں علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ مسببیت سببیت کا علاقہ ہے، خود کو قتل کرنا مسبب اور دوسروں کو قتل کرنا سبب ہے، ظاہر ہے جب کوئی کسی کو قتل کرے تو وہ خود بدلہ میں قتل کیا جائیگا، اس لئے دوسروں کو قتل کرنا اپنے قتل کا سبب ہے، آیت کے اس لفظ کے معنوں میں چونکہ تشبیہ کا علاقہ نہیں بلکہ سببیت، مسببیت کا علاقہ ہے اس لئے اس میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (۸۵)﴾

ترجمہ: تو کیا تم کتاب (تورات) کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ہمزہ استفہامیہ واقع ہوا ہے، حروف استفہامیہ اصل میں کسی شئ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حرفِ

استفہام اصل معنی کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ دوسرے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ان معانی میں سے ایک معنی (انکار) کا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حروف استفہام کے ذریعہ کلام میں موجود عنوان کی نفی کی جائے، دوسرا معنی (توبیخ) کا ہے۔اس کا مطلب یہ کہ حروف استفہامیہ کے ذریعہ کلام کے مخاطب کو ڈانٹا جائے۔یہاں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ بھی انکار اور توبیخ کے لئے ہے،انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اے بنی اسرائیل کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لانا اور بعض کا انکار کرنا نہیں ہونا چاہیے، کتاب کے بعض حصوں کو ماننا ہرگز ایمان نہیں بلکہ کتاب کے تمام حصوں کو ماننا ایمان کا جزء لازم ہے''۔توبیخ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''بنی اسرائیل کو شرم کرنا چاہیے کہ وہ کتاب کے بعض حصوں پر تو ایمان لائے اور بعض حصوں کو چھوڑ دیا''۔

﴿فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۸۵)﴾

ترجمہ:اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیوی زندگی میں اس کی رسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف بھیج دیا جائے گا۔اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ''قصر'' پایا جاتا ہے۔ (۱) اس آیت کریمہ میں بھی دنیاوی رسوائی اور ذلت کو بعض کتاب پر ایمان لانے والے اور بعض کتاب کے انکار کرنے والے کیساتھ مختص کر دیا گیا ہے،قصر کی صورت میں آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ ''ان ہی لوگوں کو دنیا میں رسوائی ملے گی جو بعض کتاب پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں''۔اس آیت کریمہ میں مذکورہ فعل قبیح کی سزا قصر کیساتھ اس لئے بیان ہوئی تا کہ ان دو نکتوں کی طرف اشارہ کیا جائے:

(۱) قصر کا مطلب یہ کہ کلام میں کسی شئی کو کسی شئی کیساتھ خاص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

نمبر۱: بنی اسرائیل کا یہ خیال تھا کہ ان کا بعض کتاب پر ایمان لانا انہیں فائدہ دیگا، یعنی وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ بعض کتاب پر ایمان لانے سے ان کی نجات ہوگی۔ آیت میں قصر کے ساتھ ان کے فعل کی سزاء بتا کر ان کے اس امید وخیال کو دفع کر دیا گیا کہ تمہاری امیدیں بیکار اور فضول ہیں، کیونکہ بعض حصے پر ایمان لانا نجات کے لئے کافی نہیں۔

نمبر۲: قصر کیساتھ بنی اسرائیل کی سزا اس لئے بیان ہوئی تا کہ یہ بات ظاہر کی جائے کہ بعض کتاب کا کفر کرنا اور بعض پر ایمان لانا اللہ تعالی کے ہاں معتبر نہیں ہے۔

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ﴾

اس آیت کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔❶ آیت میں بلاغت کا نکتہ سمجھنے سے پہلے اس کی مختصر تفسیر ملاحظہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود کے دو فریق تھے اور دونوں فریق میں باہمی ناچاکی تھی۔ ان دونوں فریقوں نے مشرکین کے لوگوں کو اپنا حلیف بنا رکھا تھا۔ یہود ایسا کرتے تھے کہ وہ اپنے ہی یہود کے دوسرے فریق کو قتل کرتے اور ان کو گھروں سے باہر نکالتے، اسی طرح ان کاموں میں وہ اپنے حلیف (مشرکین) کی مدد کرتے، مگر جب ان دونوں فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا آدمی مشرکین کے یہاں قید ہوجاتا تو یہی یہود فدیہ دے کر اسے چڑھا لیتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو وہ فوراً بولتے کہ تورات میں ہمیں فدیہ دیکر اپنے قیدیوں کو چڑھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ تورات کے بعض حکموں کو مانتے ہیں۔ جیسے فدیہ دینا اور بعض حکموں کو نہیں مانتے، جیسے قتل واخراج سے دور رہنا۔ اب آیت میں موجود "مجاز مرسل" کی تفصیل پیش خدمت ہے۔ اس آیت میں "تُؤْمِنُونَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ دیگر علاقوں میں سے کوئی علاقہ ہو۔

معنی (ایمان لانے) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں، کیونکہ تفسیر میں گذر چکا ہے کہ یہود بعض احکام پر عمل کرتے تھے اور بعض کو ترک کر دیتے تھے، اس لئے یہاں ایمان لانا مراد نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مجازی معنی مراد لیا جائے اور وہ مجازی معنی احکام پر عمل کرنا ہے، گویا آیت میں ایمان لانا بول کر ایمان کے تقاضوں (احکام) پر عمل کرنا مراد لیا گیا ہے۔ ان دونوں معنی میں علاقہ لزوم کا ہے، ایمان لانا ملزوم اور احکامات پر عمل کرنا اس کا لازم ہے، اسی لئے ان میں لزوم کا علاقہ موجود ہے، آیت میں چونکہ لفظ کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان لزوم کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔ مجاز مرسل کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے یہود تم تورات کے بعض احکام پر عمل کرتے ہو جیسے فدیہ دے کر اپنے مخالف فریق کے آدمی کو چھڑا لیتے ہو اور بعض احکام پر عمل نہیں کرتے جیسے تم قتل سے نہیں رکتے اور اپنے فریقِ مخالف کو گھروں سے نکالتے ہو۔

﴿إِلَّا خِزْيٌ﴾

اس آیت کریمہ میں لفظِ "خِزی" نکرہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی کبھی شئی کی فخامت اور خطرناک ہونا بیان کیا جاتا ہے، اس آیت میں بھی "خِزی" کو نکرہ لا کر بنی اسرائیل کو ملنے والی رسوائی کی فخامت اور بھیانک ہونا بیان کیا گیا ہے، مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ "بنی اسرائیل کو جرم کے پاداش میں دنیا میں ملنے والی رسوائی بہت بڑی اور خطرناک ہوگی، جو انہیں کہیں کا نہ چھوڑ ےگی"۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ(٨٦)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دُنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں "استعارة تصريحية و تبعية" پائے جاتے ہیں۔ (1) یہاں بنی اسرائیل کے "استبدال" (یعنی آخرت کے بدلہ دنیا لینے) کو "اشتراء" (خریداری کرنے)

---

(1) استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دیا جائے۔

سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں بنی اسرائیل کا استبدال "مشبه " اور اشتراء "مشبه به" ہے اور ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح خریداری میں خریدنے والا ثمن دے کر اس کے بدلہ کوئی چیز خریدتا ہے، بالکل اسی طرح یہ بدبخت بنی اسرائیل آخرت کے بدلے دنیا لیتے ہیں، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں "استبدال" کو "اشتراء" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آیت میں چونکہ "اشْتَرَوُا" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس میں "استعارة تبعية" بھی پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں "اشْتَرَوُا" فعل مشتق ہے، اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" پایا جاتا ہے۔

﴿فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ (۸۷)﴾

ترجمہ: چنانچہ بعض (انبیاء) کو تم نے جھٹلایا، اور بعض کو قتل کرتے رہے۔

اس آیت کریمہ میں یہود کی ایک اور شناعت بیان ہوئی ہے، وہ یہ کہ یہود بعض انبیاء کو قتل کرتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے، اس میں نکتہ کی بات یہ ہے کہ "فَفَرِيقًا" ترکیبی لحاظ سے "كَذَّبْتُمْ" اور "تَقْتُلُونَ" کا معمول ہے۔ "كَذَّبْتُمْ" اور "تَقْتُلُونَ" عامل ہیں، اصول کے رو سے عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں، مگر اس آیت میں معمول کو عامل پر مقدم کردیا گیا ہے، اس میں درج ذیل نکات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے:

نمبر۱: یہاں "فَرِيقًا" معمول کو ان کے عاملوں پر اس لئے مقدم کیا تاکہ اس سے انبیاء کرام کی اہمیت واضح ہو، یہاں انبیاء کی اہمیت کا معنی "فَرِيقًا" سے کشید ہو رہا ہے کیونکہ "فَرِيقًا" سے انبیاء مراد ہیں، انہوں نے مستقلاً انبیاء کرام کو جھٹلایا بھی اور بعض کو شہید بھی کیا۔

نمبر۲: یہاں معمولوں کو عامل پر اس لئے مقدم کیا تاکہ سامع آیت کی اگلی بات کو سننے کا خواہشمند ہو اور اسے اگلی بات کے سماعت کا شوق دلایا جائے۔

نمبر۳: اس میں معمولوں کو عاملوں پر اس لئے مقدم کیا گیا تاکہ اس آیت کا کلمہِ فاصل

---

(1) استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

یعنی ''تَقْتُلُونَ'' دیگر آیتوں کی طرح مثلاً ''وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ...... وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ'' وغیرہ کی طرح نون پر ختم ہو، تاکہ کلمات کے اواخر اور وزن میں یکسانیت ہو۔

﴿فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں موجود بلاغت کے نکتہ کو سمجھنے سے پہلے ایک تمہید پڑھ لی جائے وہ یہ ہے کہ اہلِ بلاغت کے اسالیب میں ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی زمانہ ماضی کے کاموں کے لئے مضارع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، اس کو اہلِ بلاغت کی اصطلاح میں ''حكاية حال ماضية'' کہا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ماضی کے واقعہ کو تکلم کے وقت جاری تصور کیا جائے اور اس واقعہ کی خبر بجائے فعلِ ماضی کے فعل مضارع سے دی جائے جو حال پر دلالت کرتا ہے، اس تمہید کے بعد آیت میں موجود نکتہ بلاغت ملاحظہ ہو۔ یہاں قتل انبیاء کو بیان کرنے کے لئے ''تَقْتُلُونَ'' مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، حالانکہ قتلِ انبیاء بھی کذبِ انبیاء کی طرح ماضی میں ہو چکا ہے، اس لحاظ سے آیت کے ''فَفَرِيقًا كَذَّبْتُم'' میں ''كَذَّبْتُم'' ماضی کی طرح ''قَتَلْتُمْ'' ماضی ہونا چاہیے تھا، تاکہ آیت واقع کے مطابق ہو جاتی، مگر یہاں ایسا نہیں کیا گیا بلکہ ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ لایا گیا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ آیت میں حکایت حالِ ماضیہ حاصل ہو، یعنی قتل انبیاء جیسے فعل قبیح کی صورت سامع کے سامنے تکلم کے وقت ایسے حاضر کر دی گئی ہو جیسے سامع اس عظیم گناہ کو اپنی آنکھوں سے گویا دیکھ رہا ہے، اس لئے سامع (موجودہ یہود ومخاطبین) کو بتلایا گیا کہ تمہارے اسلاف نے انبیاء علیہم السلام جیسی مقدس جماعت کو شہید کیا، گویا تم اس فعل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو پھر بھی تم ان کی پیروی کرتے ہو۔

﴿وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (۸۷)﴾

ترجمہ: اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔

آیتِ کریمہ میں "إضافة الموصوف إلى الصفة" پایا جاتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ موصوف کی اضافت صفت کی طرف کردی جائے۔ یہاں حقیقتاً "رُوح" موصوف اور "القُدُس" صفت ہے، موصوف صفت کے درمیان دیگر چیزوں (اعراب، تذکیر وتانیث) کی طرح معرفہ نکرہ ہونے میں مطابقت لازمی ہے، مگر اس آیت میں "رُوح" نکرہ اور "اَلقُدُس" معرفہ ہے، اس لئے اس میں موصوف صفت کے شرائط نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا یہاں "رُوح" موصوف مضاف ہوگا اور "اَلقُدُس" صفت مضاف الیہ، چونکہ اس میں موصوف کی اضافت صفت کی طرف کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "إضافة الموصوف إلى الصفة" پایا جاتا ہے۔ یہاں "رُوحُ القُدُس" سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ اس میں حضرت جبریل امین پر "رُوح القُدُس" کا اطلاق کرنا بطور "استعارة تصريحية" کے ہے۔ [1] اس میں حضرت جبریل امین کو (روح حقیقی) سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں حضرت جبریل "مشبه" اور حقیقی روح "مشبه به" ہے، اوران دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح حقیقی روح ایک لطیف نورانی جسم اور مادہ حیات ہے، اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام لطیف نورانی جسم اوروحی وعلوم لانے کے سبب لوگوں کے حیاتِ قلوب کا مادہ ہیں، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں حضرت جبرئیل کوروح سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن چونکہ آیت میں "رُوح" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجو ہے۔

﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ (۸۸)﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں۔

مذکورہ جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہودیوں کے قول کی حکایت ہے، اس

[1] استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

میں ”استعارۃ تصریحیۃ“ پایا جاتا ہے۔[1] اس جملہ میں یہودیوں نے اپنے دلوں کو غیر مختون عضو سے تشبیہ دی ہے، مذکورہ تشبیہ میں یہود کے دل ”مشبہ“ اور غیر مختون عضو ”مشبہ بہ“ ہے۔ ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح غیر مختون عضو کا سرا جلد سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح یہود کے دل گمراہی کے پردہ سے ڈھکے ہوئے تھے، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر ان دونوں میں استعارہ واقع ہوا ہے، لیکن چونکہ آیت میں ”غُلْفٌ“ بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ”استعارۃ تصریحیۃ“ پایا جاتا ہے۔

﴿فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ (۸۸)﴾

ترجمہ: اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں ”فَقَلِيلًا“ کے بعد لفظ ”مَا“ کا اضافہ کیا گیا ہے، آیت میں یہ لفظ اس لئے بڑھایا گیا ہے تاکہ ”فَقَلِيل“ میں موجود معنیٰ قلت میں خوب مبالغہ کیا جائے۔ مبالغہ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ یہود بہت کم ایمان لاتے ہیں جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ یعنی چند ایک باتوں کو جو اِن کی منشا کے موافق ہو اُسے تسلیم کرتے ہیں، اکثر کا انکار کرتے ہیں، نیز ان میں ایمان لانے والے بھی چند ایک لوگ ہیں۔

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ (۸۹)﴾

ترجمہ: اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی (یعنی قرآن) جو اس (تورات) کی تصدیق بھی کرتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ ”كِتَابٌ“ سے مراد قرآن کریم ہے، اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ”كِتَابٌ“ کو ”مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ کے صفت سے بیان کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ایسی کتاب ہے جو اللہ کے پاس سے نازل ہوئی ہے۔ یہ صفت اللہ نے اس لئے بیان فرمائی

[1] استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

تاکہ قرآن مجید کی تکریم وشرافت کا بیان ہو، اس صورت میں "کِتَابٌ" کا مطلب یہ ہوگا کہ "قرآن مجید بہت ہی مکرم اور مشرف کتاب ہے، جو اللہ سبحانہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے"۔

﴿ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ (۸۹)﴾

ترجمہ: مگر جب وہ چیز ان کے پاس آ گئی جسے انہوں نے پہچان بھی لیا، تو اس کا انکار کر بیٹھے۔ پس پھٹکار ہے اللہ کی ایسے کافروں پر۔

اس آیتِ کریمہ میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں یہود کا کفر کرنا "كَفَرُوا بِهِ" میں گذر چکا ہے، اس لحاظ سے آیت میں آگے "فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ" کے بجائے "فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ" بول کر ضمیر لانا چاہیئے تھی تاکہ ضمیر گذشتہ مرجع کی طرف لوٹ جاتی، مگر اس میں ایسا نہیں ہوا بلکہ "ھم" ضمیر کی جگہ "اَلْكَافِرِينَ" بول کر اسمِ ظاہر کا استعمال کیا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس آیت میں "الاظهار في مقام الاضمار" پایا جاتا ہے، یہاں ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہود پر اللہ کی لعنت اس لئے ہوئی کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور وہ اپنے کفر کے سبب لعنت کے مستحق ہوئے۔

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۸۹)﴾

ترجمہ: بری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، یہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا صرف اس جلن کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنے فضل کا کوئی حصہ (یعنی وحی) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہ رہا ہے (کیوں) اتار رہا ہے؟

مذکورہ آیتِ کریمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود کی قباحت بیان کی گئی ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود کے کفر کرنے کو "أَنْ يَكْفُرُوا" کہہ کر فعل

❶ یہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے ظاہر اور کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کر دیا جائے۔

مضارع سے بیان کیا گیا ہے جو حال یا استقبال میں کام کے وقوع پر دلالت کرتا ہے، حالانکہ ان یہود کا کفر مذکورہ آیت کے نزول سے پہلے ہی واقع ہو گیا تھا، اس لحاظ سے آیت میں فعلِ مضارع کی جگہ ماضی ہونا چاہیے تھا، لیکن آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ حکایتِ حال ماضیہ کا فائدہ حاصل ہو، مطلب یہ ہے کہ آیت میں فعلِ مضارع لاکر ماضی کے واقعہ کو اس طرح بیان کیا جیسے گویا یہود سامع کے سامنے قرآن کا کفر کر رہے ہوں، اور کفر کا واقعہ سامعین کے سامنے ہو رہا ہے۔

﴿وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ (۹۰)﴾

ترجمہ: اور کافر لوگ ذلت آمیز سزا کے مستحق ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، اس آیت سے قبل گذشتہ آیت "أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوْا" اور "فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ" کی صورت میں کفار کا ذکر ہو چکا ہے، اس لحاظ سے ہماری متعلقہ آیت میں "لِلْكَافِرِينَ" کی صورت میں اسمِ ظاہر کے بجائے "لهم" بول کر "هم" ضمیر "الَّذِينَ اشْتَرَوْا" یا "عَلَى الْكَافِرِينَ" وغیرہ کی طرف لوٹانا چاہئے تھی، مگر آیت میں ضمیر کی جگہ "الْكَافِرِينَ" بول کر اسمِ ظاہر کا استعمال کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، آیت میں ایسا اس لئے ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے دردناک عذاب میں مبتلاء ہونگے۔ انکا کفر ہی اِن کے رسوا کن عذاب کا سبب ہے۔

﴿عَذَابٌ مُهِينٌ﴾

اس آیت کریمہ میں "مجازِ عقلی" پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں "مُهِينٌ" اسمِ فاعل کا صیغہ ہے، اس کا معنی (ذلیل کرنے) کے ہے۔ آیتِ کریمہ میں اس معنی فعل کی نسبت

(1) مجازِ عقلی یہ ہے کہ فعل یا معنی فعل یعنی فعلِ مجہول، اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت کسی ادنی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعلِ حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے فاعلِ غیر حقیقی کی طرف کر دی جائے۔

"عَـذَابٌ" کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ اہانت کرنا اللہ سبحانہ کا فعل ہے، عذاب کا نہیں، اس لئے اللہ سبحانہ ہی اس فعل کا فاعل حقیقی ہے عذاب نہیں، لیکن چونکہ اللہ کافروں کو عذاب کے ذریعہ ذلیل کرینگے اس لئے عذاب اہانت کا سبب ہوگا، اس سبب کے ظاہری مناسبت کی وجہ سے آیت میں معنی فعل "مُهِيـنٌ" کی نسبت فاعلِ حقیقی (اللہ سبحانہ) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی (عذاب) کی طرف کردی گئی ہے۔ آیت میں چونکہ معنی فعل کی نسبت ظاہراً فاعلِ حقیقی کے بجائے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "مجاز عقلی" پایا جاتا ہے۔

﴿قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ (۹۱)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) تم ان سے کہو کہ اگر تم واقعی (تورات) پر ایمان رکھتے تھے تو اللہ کے نبیوں کو پہلے زمانے میں کیوں قتل کرتے رہے؟

اس آیتِ کریمہ میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود سے ہے، انہوں نے تو انبیاء کو قتل نہیں کیا تھا، مگر چونکہ ان کے بڑوں نے انبیاء کو قتل کیا اور یہ اپنے بڑوں کے اس فعل پر راضی تھے، اس لئے آیت میں قتل کی نسبت ان معاصر یہود کی طرف کی گئی ہے، اس آیت میں قابل غور بات یہ کہ یہود نے گذشتہ زمانہ میں انبیاء کا قتل کیا تھا اس لحاظ سے آیت میں ماضی کا صیغہ ہونا چاہیے تھا، مگر یہاں ماضی کی جگہ "تَقْتُلُونَ" مضارع استعمال ہوا ہے، اس میں ماضی کے بجائے مضارع سے اس لئے تعبیر بیان ہوئی تا کہ آیت میں حکایت حال ماضیہ کا فائدہ حاصل ہو، یعنی قتل انبیاء کے واقعہ کو یوں بیان کیا جائے جیسے گویا مخاطب کے سامنے قتل کا منظر موجود ہو۔

﴿وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ(۹۳)﴾

ترجمہ: اور (دراصل) ان کے کفر کی نحوست سے ان کے دلوں میں بچھڑا بسا ہوا تھا۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة مكنية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں بچھڑے کی عبادت کو ایسے لذیز مشروب سے تشبیہ دی گئی ہے جو پینے والے کو بھا جائے، اس تشبیہ میں "مشبــه" (بچھڑے کی عبادت ومحبت) کا ذکر "اَلْعِجْل" کے ذریعہ کردیا گیا، اور "مشبـه بـه" (لذیز مشروب) کو آیت سے حذف کردیا گیا، مگر چونکہ "أُشْرِبُوا" بول کر مشبہ بہ کے لازم (پلانے) کا ذکر کر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کردیا گیا، اس لئے آیت میں "استعارة مكنية" موجود ہے، اس آیت میں استعارہ مکنیہ کے ذریعہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے محبت میں مبالغہ بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا دل گوسالہ پرستی کی محبت سے اتنا بھرپور تھا، جیسے گویا انہوں نے اس گوسالہ پرستی کی محبت کو مشروب کی طرح پی لیا، ان کے دلوں میں گوسالہ پرستی ایسے رچ بس گئی جیسے کسی کے اندر مشروب پینے کے بعد اُس کے اثرات جسم میں سرایت کر جائیں، اور یہ گوسالہ پرستی کی محبت سے ایسے محظوظ ہوئے جیسے کوئی ذائقہ دار اور لذیز شئی سے ہوتا ہے۔

بعض مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں "تشبيـه بليغ" پائی جاتی ہے۔❷ اس میں بنی اسرائیل کے دلوں میں گوسالہ پرستی کی محبت ڈال دیئے جانے کو کسی کو کوئی مشروب پلانے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں پہلا مشبہ اور دوسرا مشبہ بہ ہے، مگر آیت میں نہ تو حرف تشبیہ مذکور ہے اور نہ ہی وجہ شبہ، اس لئے اس میں "تشبيه بليغ" پائی جاتی ہے۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں نکتہ کی ایک بات اور پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیت میں استعارہ کے لئے "شُـرْب" (پینا) کا ذکر کیا گیا ہے، "اَكَـل" (کھانے) سے استعارہ کی تعبیر نہیں ہوئی، چونکہ پانی بہت سہولت اور آسانی سے اندر چلا جاتا ہے، اس میں کوئی دقت

---

❶ استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ مذکور ہو اور مشبہ بہ حذف کردیا جائے، البتہ مشبہ بہ کے کسی لازم کا ذکر کر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کردیا جائے۔

❷ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں حروف تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں محذوف ہو۔

نہیں ہوتی اس کے برعکس کھانا کھانے میں دقت ہوتی ہے، کھانا فوراً پیٹ کے اندر نہیں جاتا، نیز اس کا تعلق معدے کے ساتھ ہوتا ہے، جب کہ پینے میں سہولت ہوتی ہے اور یہ جسم کے اکثر حصے میں سرایت کر جاتا ہے، اس لئے آیت میں "اَكَلَ" کے بجائے "شُرْبُ" سے تعبیر بیان ہوئی، اردو محاورے میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں کی محبت تمہیں گھول کر پلا دی گئی ہے، اس میں اشارہ محبت کی کثرت کی طرف ہے، ایسی رچی بسی محبت کے بعد ہدایت کی بات عموماً اثر نہیں کرتی، کیونکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

﴿قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۹۳)﴾

ترجمہ: آپ (ان سے) کہیے کہ اگر تم مؤمن ہو تو کتنی بری ہیں وہ باتیں جو تمہارا ایمان تمہیں تلقین کر رہا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے معاصر یہود سے خطاب کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اے نبی! آپ ان یہود سے کہیں کہ تمہارا ایمان تمہیں جن امور کے کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ بہت ہی برے ہیں، اس آیتِ کریمہ میں "تهكم" کا اسلوب اپنایا گیا ہے، اس آیت میں یہود کی طرف ایمان کی اضافت "إِيمَانُكُم" بول کر کی گئی ہے، حالانکہ یہود کے پاس ایمان تھا ہی نہیں، مگر ان کے غلط کاموں کے بنیاد پر ایمان نہ ہونے کے باوجود یہود کے لئے ایمان کا اطلاق کیا گیا، ایسا اس لئے ہوا تا کہ یہود کا استہزاء کیا جائے، مطلب یہ ہے کہ تمہارے ان جیسے کرتوتوں کو ایمان تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن بزعم خود تم اِن کو ایمان سمجھتے ہو، اسی طرح لفظ "يَأْمُرُ" کی نسبت ایمان کی طرف کرنے میں بھی یہود کا استہزاء ہے، کیونکہ ایمان ہمیشہ لوگوں کو بھلائی، عبادت، خیر خواہی اور حقیقی رب کی عبادت کی دعوت دیتا ہے، لیکن پتہ نہیں کہ یہود کا ایمان کیسا عجیب اور بے کار ہے جو انہیں رب کی عبادت سے کاٹ کر بلادت میں مشہور جانور (بچھڑے) کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔

﴿ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (٩٤) ﴾

ترجمہ: آپ (ان سے) کہیے کہ اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے مخصوص ہے۔ (جیسا کہ تمہارا کہنا ہے) تو موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ، اگر واقعی سچے ہو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "تَمَنَّوُا" فعل امر کا صیغہ ہے، امر اصل میں متکلم کا خود کو بڑھا سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنے کا نام ہے، لیکن کبھی کبھی امر اپنے اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے معانی میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک معنی "تعجیز" کا ہے۔ [1] یہاں بھی فعلِ امر اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ "تعجیز" کے طور پر استعمال ہوا ہے، تعجیز کی صورت میں آیت کا مطلب ہوگا کہ اے یہود! تم موت کی تمنا کرنے سے عاجز ہو، یہ تمہارے بس کی بات نہیں، کیونکہ یہ ابرار ومقربین کا خاصہ ہے تمہارا نہیں، مقربین جانتے ہیں کہ موت سے اللہ رب العزت کا لقاء نصیب ہوتا ہے، اور یہ لوگ اللہ کی ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں، لیکن اے یہود تمہیں اپنے افعالِ بد کی سزا کا علم ہے، نیز تم محبت کے دعوے میں جھوٹے ہو اس لیے تم کبھی اس کی تمنا نہ کرو گے۔

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ (٩٦) ﴾

ترجمہ: یقیناً تم ان لوگوں کو پاؤ گے کہ انہیں زندہ رہنے کی حرص دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظ "حَيَاةٍ" نکرہ استعمال ہوا ہے۔ اس میں "حَيَاةٍ" کو نکرہ لا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہود جس حیات کے خواہش مند ہیں وہ ایک خاص

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ امر کے ذریعہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے سے عاجز ودرماندہ قرار دیا جائے اور اِسے بے بس قرار دیا جائے۔

حیات ہے وہ کوئی معمولی حیات نہیں، بلکہ وہ اتنی لمبی حیات چاہتے ہیں جس میں انسان ہزار برس زندگی گذار سکے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ الخ﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ نے یہود کی خواہش کا بیان فرمایا ہے کہ یہود میں سے ہر ایک کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ ہزار سال جیئے۔اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بہت سی تعداد میں سے بالخصوص ''ألف سنة'' بول کر ہزار کی تعداد کا ذکر فرمایا ہے، چونکہ یہود اپنے معاشرہ اور سوسائٹی میں سلام وکلام کے دوران عموماً ''عِشْ اَلْفَ سَنَةٍ'' اور اَلْفَ مَهْرَجَان'' کہا کرتے تھے جس سے کثرت مراد ہوتی تھی اس لئے اللہ سبحانہ نے بھی انکے معاشرہ اورسوسائٹی کے لحاظ سے اس آیت میں دیگر عدد کو چھوڑ کر ''اَلْفَ ''(ہزار) کی تخصیص کی ہے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا(۹۶)﴾

ترجمہ:یقیناً تم ان لوگوں کو پاؤ گے کہ انہیں زندہ رہنے کی حرص دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے، یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔

اس آیت کریمہ کے ''أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاة'' میں ''ایجاز'' واقع ہوا ہے۔ ❶

اس آیت کریمہ میں ''أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاة'' میں ایجاز اس طرح ہے کہ زندگی پر حرص کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو ہمیشہ کی زندگی کا حرص ہو، اوراس کا حرص گذشتہ زندگی یا عارضی زندگی تک محدود نہ ہو، یہ دونوں قسم کی زندگی تو ان کو حاصل ہے اس لئے آیت میں یہ زندگی مراد نہیں، بلکہ یہاں زندگی پر حرص سے مراد دائمی اور مستقبل کی لمبی زندگی ہے۔یعنی یہاں ''حَيَاةٍ'' سے مراد مطلق حیات نہیں، بلکہ اس سے خاص حیات مراد ہے، اسی لئے اس میں حیات کو نکرہ استعمال کیا گیا ہے۔اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں

❶ ایجاز یہ ہے کہ الفاظ معنی مقصود سے کم ہو،لیکن مقصود مکمل طریقہ سے واضح ہوجائے،یعنی وہی مختصر عبارت معنی مقصود کی وضاحت کے لئے کافی ہو۔

"أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ" کے مختصر الفاظ نے پورے معنی مقصود کو ادا کر دیا اس لئے اس میں "ایجاز" پایا جاتا ہے۔

اس ایجاز میں یہود کی بہت بڑی توبیخ بھی پائی جاتی ہے، وہ ایسے کہ جو لوگ معاد کو نہیں مانتے اور زندگی کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، وہ لوگ حرصِ زندگی سے علیحدہ نہیں ہوتے، ان لوگوں کا زندگی پر فریفتہ وحریص ہونا کسی حد تک معقول بھی ہے، پر یہود تو بعث بعد الموت معاد اور سزا و جزاء کے قائل ہیں، ان میں کیسے زندگی کا حرص اس قدر پایا تا ہے، یہ تو یہود کے لئے بڑے ننگ و عار کی بات ہے۔

﴿يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾

مذکورہ آیت کریمہ میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں "أَلْفَ سَنَة" کا اصلی اور معنی لزوم ہزار سال ہے، جبکہ اس کا معنی لازم کثرت ہے۔ آیت میں "أَلْفَ سَنَة" بول یہی معنی لازم مراد لیا گیا ہے، اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ ہزار کو کثرت لازم ہے، آیت میں چونکہ لفظ "أَلْفَ" بول کر اس کا معنی لازم مراد لیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ (۹۸)﴾

ترجمہ: اگر کوئی شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں اور رسولوں کا، اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

اس آیت کریمہ میں "مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّه" سے "مِيكَالَ" تک جملہ شرط ہے اور "إِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ" جوابِ شرط ہے، یہ جوابِ شرط اللہ سبحانہ تعالیٰ نے جملہ اسمیہ کی صورت میں بیان کیا ہے، جملہ اسمیہ کی صورت میں جواب شرط اس لئے بیان ہوا تا کہ یہود

(1) کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا معنی لازم مرد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا معنی اصلی (یعنی معنی ملزوم) مراد لینا بھی درست ہو۔

کی زیادہ سے زیادہ شناعت وقباحت بیان ہو،اس جملہ اسمیہ سے شناعت وقباحت کی زیادتی اس طرح حاصل ہوئی ہے کہ جملہ اسمیہ دوام اور ثبوت پر دلالت کرتا ہے، یہاں بھی جملہ اسمیہ استعمال ہوا ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ کی دشمنی کفار کے ساتھ دائمی اور استمراری ہے، جب اللہ سبحانہ کسی سے دائمی دشمنی رکھے تو ظاہری بات ہے کہ اس کی قباحت اور شناعت میں زیادت ہی ہوگی کمی نہیں۔

﴿فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ (۹۸)﴾

اس آیت کریمہ میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس جملہ سے پہلے "مَنْ كَانَ" صورت میں کافر کا ذکر ہو چکا ہے جو بعد میں آنے والی کسی بھی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے،اس لحاظ سے متعلقہ جملہ میں "عَدُوٌّ لِلْكَافِرِين" کی جگہ "عَدُوٌّ لَهُمْ" بول کر "هم" ضمیر لانا چاہیے تھی،تاکہ ضمیر "من" کی طرف لوٹ جاتی،مگر اس میں ضمیر کی جگہ "لِلْكَافِرِين" بول کر اسم ظاہر کا استعمال کر کیا گیا،اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، یہاں ایسا اس لئے ہوا تاکہ یہود پر کفر کی مہر لگ جائے اور یہ بتایا جائے کہ یہود فرشتوں سے عداوت رکھنے کے سبب کافر ہوئے ہیں۔

﴿فَإِنَّ اللَّهَ﴾

اس جملہ میں بھی "الاظهار في مقام الاضمار" پایا جاتا ہے،اس جملہ سے قبل "مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ" میں اللہ سبحانہ کا ذکر ہو چکا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے لئے بعد میں آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے،اس لحاظ سے مذکورہ جملہ میں "فَإِنَّ اللَّهَ" کے بجائے "فَإِنَّه" بول کر ضمیر لانا چاہیے تھی تاکہ یہ ضمیر گذشتہ لفظ اللہ کی طرف لوٹ جاتی،لیکن جملہ میں ایسا نہیں کیا گیا بلکہ ضمیر کی جگہ "فَإِنَّ اللَّهَ" بول کر اسم ظاہر کا استعمال کر دیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے

❶ یہ مقتضائے ظاہر ہے کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کا استعمال کیا جائے۔

کہ اس جملہ میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، یہاں ایسا اس لئے کیا گیا کہ اگر اس میں "فَإِنَّ اللّٰهَ" کی جگہ "فَإِنَّه" بولتے تو اس بات کا عین امکان تھا کہ کوئی ضمیر کو میکائل اور جبرئیل علیہ السلام کی طرف لوٹا دے، اس وہم سے بچنے کے لئے آیت میں "فَإِنَّ اللّٰهَ" بول کر اسمِ ظاہر کا استعمال کیا گیا، اور آیت میں اس اشتباہ کے خدشہ کو ختم کر دیا گیا، نیز لفظِ اللہ میں عظمت اور ہیبت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو اللہ رب العزت سے دشمنی رکھے گا تو اس کا انجام ہولناک ہوگا۔

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ (۹۸)﴾

اس آیت کریمہ میں "ذكر الخاص بعد العام" موجود ہے۔ [1] یہاں پہلے "مَلَائِكَتِهِ" بول کر عام ذکر کیا، یہ عام اس لیے کیونکہ یہ جبریل اور میکائل سمیت تمام فرشتوں کو شامل ہے، اس کے بعد آیت میں داخل خاص فرشتے جبریل اور میکائل کا ذکر کیا، تا کہ جبرئیل اور میکائیل کے مقام وفضیلت کی طرف اشارہ کیا جائے، اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں "ذكر الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے۔

﴿أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۰)﴾

ترجمہ: یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ ان لوگوں نے جب کوئی عہد کیا، ان کے ایک گروہ نے اسے ہمشیہ توڑ پھینکا؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان لاتے ہی نہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب کبھی بھی یہودیوں سے رسول پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تو ان میں سے بعض فریق نے وعدہ کو پس پشت ڈال دیا اور وعدہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اس میں فعل "نَبَذَهُ" کی نسبت "فَرِيقٌ مِنْهُمْ" کی طرف کی گئی ہے، اس نسبت کے

[1] یہ اطناب کی ایک شکل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے عام شئی کو بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد اس عام میں شامل خاص شئی کو بیان کیا جائے۔

ذریعہ آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہود کا ایک فریق ایسا بھی تھا جو وعدہ کو پس پشت نہیں ڈالتے، بلکہ وہ اپنے وعدہ پر پابند رہتے تھے۔

﴿وَلَمَّا جَاءَ هُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ(۱۰۱)﴾

ترجمہ: اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آئے جو اس (تورات) کی تصدیق کررہے تھے جو ان کے پاس ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "رَسُولٌ" نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی کبھی شئی کی عظمت، فخامت اور بلندی شان کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی لفظِ "رَسُولٌ" کو نکرہ لاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان، فخامت اور بلندی مرتبہ کو بیان کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت عظیم اور بلند مرتبہ پیغمبر ہیں۔

﴿رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّه﴾

اس آیت میں "مِنْ عِنْدِ اللّٰہ" ترکیبی لحاظ سے لفظِ "رَسُولٌ" کی صفت ہے، یہ صفت لفظِ "رَسُولٌ" کی اس لئے بیان ہوئی تاکہ "رَسُولٌ" کو نکرہ لانے سے جو عظمت وفخامت حاصل ہوئی تھی، اس میں مزید اضافہ اور مبالغہ ہو، اب مطلب یہ ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنے عظیم الشان اور بلند مرتبہ والے رسول ہیں جن کی آمد اللہ سبحانہ کی طرف سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے کی وجہ سے رسول کی عظمت دوبالا ہوگئی۔

﴿نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ(۱۰۱)﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "کِتَابَ" کی اضافت لفظِ "اللّٰہِ" کی طرف کی گئی ہے، اضافت سے کبھی مضاف کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، یہاں بھی کتاب کی اضافت لفظِ "اللّٰہِ" کی طرف کرکے تورات کی تکریم، فضیلت، عظمت وشرافت کا اظہار کیا گیا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ تورات بہت مشرف ومکرم کتاب ہے۔

﴿نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۰۱)﴾

ترجمہ: تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (تورات وانجیل) کو اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا وہ کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ (کہ اس میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کیا ہدایات دی گئی تھیں۔)

اس آیت کریمہ میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں یہود کا کتاب اللہ کو چھوڑنے، کلی طور پر اس سے اعراض کرنے اور عناد کی وجہ سے اس پر عمل نہ کرنے کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو شخص کسی چیز کو قلت توجہ اور بے نیازی کی وجہ سے پیٹھ کے پیچھے گرادے۔ یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ اور مثال ہے، اس لئے اس میں "استعارة تمثيلية" موجود ہے۔

﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَى مُلْكِ سُلَيْمَانَ (۱۰۲)﴾

ترجمہ: اور یہ (بنی اسرائیل) ان (منتروں) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زمانے میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں عہد نبوی کے علماء یہود اور احبار کی شناعت بیان کی گئی ہے کہ وہ تورات کے اصل احکام کو چھوڑ کر ان ہزلیات وجادو کی اتباع کرنے لگے جنہیں شیاطین سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے، یہ آیت کی اختصاراً تفسیر تھی، اب اس میں موجود بلاغت کا نکتہ ملاحظہ ہو۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ شیطان کا جادو وہزلیات وغیرہ کا پڑھنا زمانہ ماضی میں وقوع پذیر ہوا تھا، اور ماضی کے کاموں کے لئے عربی زبان میں ماضی ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے مضارع کا نہیں، اس لحاظ سے آیت کریمہ میں "تَتْلُو الشَّيَاطِين" کی جگہ "تَلَتِ الشَّيَاطِينُ" ہونا چاہیے تھا، مگر آیت میں ماضی کی جگہ "تَتْلُوا"

❶ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے مثال دے دی جائے۔

مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ آیت میں ''حکایتِ حالِ ماضیہ'' کا فائدہ حاصل ہو، مطلب یہ ہے کہ آیت میں ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ اس لئے واقع ہوا تا کہ شیطان کے منتر پڑھنے کو زمانہ حال میں مخاطب کے سامنے ایسے پیش کیا جائے جیسے سامع اس منظر کو اپنی آنکھوں سے بالفعل دیکھ رہا ہے۔

﴿وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (۱۰۲)﴾

ترجمہ: یہ دو فرشتے کسی کو اس وقت تک کوئی تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک اس سے یہ نہ کہہ دیں گے کہ ہم محض آزمائش کے لیے (بھیجے گئے) ہیں، لہٰذا تم (جادو کے پیچھے لگ کر) کفر اختیار نہ کرنا۔

اس آیتِ کریمہ میں ''أَحَدٍ'' نکرہ ہے اور نکرہ عموم واستغراق کا فائدہ دیتا ہے، لہٰذا یہاں ''أَحَدٍ'' میں بھی استغراق ہوگا، ترکیبی لحاظ سے درحقیقت یہ لفظِ ''یُعَلِّمَان'' فعل کا مفعول ہے، لیکن اس مفعول میں ''مِنْ'' حرفِ جارہ کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں ''مِن'' کا اضافہ اس لئے ہوا تا کہ ''أَحَدٍ'' کو نکرہ لانے سے استغراق کا جو فائدہ حاصل ہوا تھا اس میں مزید تاکید ومبالغہ ہو۔ ایسی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہاروت ماروت کسی ایک کو بھی جادو نہیں سکھاتے تھے یہاں تک کہ وہ بول دے کہ ہم تمہارے لئے آزمائش ہیں۔

﴿إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾

یہ جملہ ہاروت وماروت کے قول کا مقولہ ہے، اس میں ''إِنَّمَا'' کے ذریعہ ''قصر'' لایا گیا ہے۔ (۱) اس میں ہاروت وماروت نے کلمہ حصر ''إِنَّمَا'' لاکر آزمائش کو اپنے ساتھ مختص کردیا ہے، اس لئے آیت میں ''قصر'' موجود ہے، یہ قصر آیت میں اس لئے واقع ہوا تا کہ یہ بیان کیا جائے کہ جو فن ہاروت وماروت لوگوں کو سکھاتے تھے اس سے آزمائش کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں تھا، یہ بات وہ لوگوں کو اس لئے بتاتے تا کہ لوگ اس فن کو سیکھ کر

(۱) قصر کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی دوسری کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کردیا جائے۔

معجزے اور جادو میں فرق سمجھیں، اپنا دفاع کرسکیں اور اس کے غلط استعمال سے بچیں۔

﴿مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ (۱۰۲)﴾

اس آیت کریمہ میں "طباق" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "يَضُرُّ" ضرر سے مشتق ہے، جس کا معنی (نقصان دینے) کے ہے اور "يَنفَعُ" نفعًا سے مشتق ہے، اس کا معنی (فائدہ دینے) کے ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۱۰۲)﴾

ترجمہ: اور وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جو شخص ان چیزوں کا خریدار بنے گا، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز بہت بری تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچ ڈالیں۔ کاش کہ ان کو (اس بات کا حقیقی) علم ہوتا۔

اس آیت کریمہ میں "تنزيل العالم منزلة الجاهل" پایا جاتا ہے۔❷ اس آیت کریمہ میں "وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ" کا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہود کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جادو اور شعبدہ بازی سکھانے والی کتابوں کو خریدنے اور اللہ کی کتاب پر ان کتابوں کے ترجیح دینے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس جملہ سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ یہود عالم کے درجہ میں ہیں کیونکہ وہ جادو سیکھنے اور جادوئی کتابوں کے خریدنے کے نقصانات کو جانتے ہیں، ہدایت اور گمراہی سے واقف ہیں، مگر چونکہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتے، اس

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

❷ یہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص فائدہ خبر یا لازم فائدہ خبر کو جانتا ہو پھر بھی اپنے علم کے مطابق اس پر عمل نہ کرتا ہو، تو اسے جاہل کے درجہ میں اتار کر ایسے کلام کیا جاتا ہے جیسے کسی جاہل سے کلام کیا جا رہا ہو۔

لئے اللہ سبحانہ نے اسی آیت کے آخر میں "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُون" کا جملہ لاکر کہا کہ یہ لوگ اس فعل بد کے انجام کو نہیں جانتے، کاش کہ یہ لوگ اس حقیقت کو جان لیتے، یہ لوگ اس بات سے جاہل کے درجہ میں ہیں۔ یہود کو اللہ سبحانہ نے عالم کے درجہ سے اتار کر جاہل کے درجہ میں ڈال دیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "تنزيل العالم منزلة الجاهل" پایا جاتا ہے۔ باقی "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُون" سے ہم نے جاہل کا معنی اس طور پر لیا کہ اس میں کلمہ لَوْ استعمال ہوا ہے اور کلمہ لَو فعل کے عدم وجود پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں بھی لَوْ سے معلوم ہوا کہ یہود حقیقت کو نہیں جانتے۔

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۱۰۳)﴾

ترجمہ: اور (اس کے برعکس) اگر وہ ایمان اور تقوی اختیار کرتے تو اللہ کے پاس سے ملنے والا ثواب یقیناً کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ کاش کہ ان کو (اس بات کا بھی حقیقی) علم ہوتا۔

مذکورہ آیت کریمہ میں "لَوْ" حرف شرط ہے اور "لَمَثُوبَة" اس شرط کا جوابِ شرط ہے۔ لَوْ کے جواب میں عموماً جملہ فعلیہ ہوا کرتا ہے، لیکن یہاں "لَمَثُوبَة" جملہ اسمیہ ہے، اس آیت میں جملہ فعلیہ کی جگہ جملہ اسمیہ "لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ" اس لئے لایا گیا تاکہ آیت میں استمرار و دوام کا فائدہ حاصل ہو۔ دوام واستمرار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر یہود اپنے کرتوتوں سے تائب ہوکر ایمان لاتے اور تقویٰ کی زندگی گذارتے رہتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں دائمی طور پر صلہ ملتا رہتا۔

﴿لَمَثُوبَةٌ﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "مَثُوبَةٌ"، نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی کسی شئی کی قلت بتائی جاتی ہے۔ یہاں بھی "مَثُوبَةٌ"، نکرہ لاکر (ثواب) کی قلت بیان کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے پر اللہ سبحانہ کی طرف سے ملنے والا تھوڑا سا اجر بھی خیر سے خالی نہیں۔

﴿خَیْرٌ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں لفظِ "خَیْرٌ" اسم تفضیل کا صیغہ ہے، یہ اصل میں "اَخْیَر" تھا، خلاف قیاس ہمزہ کی حرکت خا کی طرف منتقل کردی گئی اور ہمزہ کو گرادیا گیا تو یہ "خَیْـرٌ" بن گیا۔ اسمِ تفضیل ہمیشہ دو چیزوں میں سے کسی ایک میں معنی مصدری کے زیادتی بیان کرنے کے لئے آتا ہے، اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "خَیْـــرٌ" کے ذریعہ اللہ سبحانہ کی طرف سے ملنے والے اجر کی فضیلت اور بہتر ہونا بیان ہوا ہے، مگر کس چیز کے مقابلے میں یہ فضیلت (اجرکو) دی گئی؟ اس مفضل علیہ (جس پر فضیلت دی گئی) کا بیان نہیں ہوا بلکہ وہ حذف کردیا گیا، وہ مفضل علیہ یہاں "السحر" (جادو) ہے، گویا آیت "لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ السِّحر" تھی۔ اس آیت سے مفضل علیہ کو حذف کردیا گیا تاکہ مفضل یعنی (اجروثواب) کی خوب قدرومنزلت اجاگر کی جائے کہ ثواب کے مقابلہ جادو کی اتنی بھی حیثیت نہیں کہ وہ یہاں ثواب کے قرب جوار میں ذکر کیا جائے۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۱۰۵)﴾

ترجمہ: کافر لوگ خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی تم پر نازل ہو، حالانکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص فرمالیتا ہے، اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "مَا یَوَدُّ" کا لفظ استعمال ہوا

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا معنی لازم مراد لیا جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا حقیقی معنی یعنی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

ہے، اس کا حقیقی معنی (محبت کی نفی) ہے، لیکن آیت میں اس کا معنی لازم مراد لیا گیا ہے اور وہ معنی لازم کراہت (ناپسند کرنے) کے ہے۔ ظاہر ہے جب کسی سے کسی کو محبت نہ ہو تو وہاں کراہت آجاتی ہے، اس لئے عدمِ محبت کو کراہت لازم ہے، آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں "کنایۃ" پایا جاتا ہے، آیت کا مطلب کنایہ کی صورت میں یہ ہوگا کہ مشرکین اور یہود میں سے کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مسلمان امتی پر رب کی طرف سے انعامات و برکات کے نزول کو ناپسند کرتے ہیں۔

﴿مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ﴾

اس آیت کریمہ میں لفظِ "رَبِّ" کی اضافت "کم" ضمیر کی طرف کی گئی ہے، جس کے مخاطب تمام عالم اسلام کے مسلمان ہیں۔ اضافت سے کبھی کبھی مضاف الیہ کی عظمت و شرافت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، یہاں بھی لفظِ "رَبِّ" کی اضافت "کم" ضمیر کی طرف کر کے امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شرافت بیان کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم بڑے عظیم اور مشرف امت ہو۔

﴿وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۱۰۵)﴾

یہاں دونوں جملوں کا آغاز لفظِ "اللّٰہُ" سے ہوا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ اس عنوان کی اہمیت اور عظمت بیان ہو کہ اللہ سبحانہ اپنی مرضی سے ہی جسے چاہے اپنے رحمت اور اپنے بڑے فضل کے ساتھ مختص کر لیتے ہیں، اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۰۴)﴾

ترجمہ: ایمان والو! (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مخاطب ہو کر) راعنا نہ کہا کرو، اور انظرنا کہہ دیا کرو، اور سنا کرو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

آیت کریمہ میں "فن التھذیب" پایا جاتا ہے۔ ❶ آیت میں "فن تھذیب" کی تطبیق سے پہلے اختصاراً آیت کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضراتِ صحابہ سے کوئی علمی بات فرماتے تو صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے "رَاعِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" مطلب یہ ہے کہ اے اللہ کے رسول! ہماری رعایت کریں، ہماری طرف توجہ کریں، ہمیں اتنی مہلت دیں کہ ہم آپ کے ارشادات سمجھ سکیں، لیکن یہودیوں کی زبان عبرانی تھی، ان کے یہاں "رَاعِنَا" بطور گالی استعمال ہوتا تھا۔ یہود کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی یہ لفظ استعمال کرتے تھے، لیکن ایمان والوں کی مراد یہ ہوتی کہ اے اللہ کے رسول! ہماری رعایت کریں، ہماری طرف متوجہ ہوں، انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ لفظ گالی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، نیز یہود لفظِ "راعینا" یاء کے ساتھ پڑھتے تو اس سے ان کے ہاں چرواہا مراد ہوتا، اس طرح یہود اِن مذموم مقاصد کے لیے اس لفظ کو استعمال کرتے تھے، تو اب کبھی کوئی مسلمان یہ لفظ کہتا تو یہ خوش ہوتے اور ہنستے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ کلمہ یہود کی زبان سے سنا، وہ چونکہ عبرانی زبان سمجھتے تھے اس لئے ان کو یہودیوں کی مراد کا پتہ چل گیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اللہ کے دشمنو تم پر اللہ کی لعنت ہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میں دوبارہ تم میں سے کسی کی زبان سے یہ کلمہ سنوں تو ضرور میں اس کی گردن کاٹ دونگا۔ یہ سنتے ہی جواب میں یہودیوں نے کہا کہ یہ کلمہ تو تم مسلمان بھی کہتے ہو، تو اس پر اللہ سبحانہ نے آیت نازل فرمادی اور مسلمانوں کو منع کردیا کہ "رَاعِنَا" مت کہو۔ مسلمانوں کا استعمال اگرچہ درست معنی میں تھا لیکن سداًللذرائع انہیں روک دیا گیا۔

اب آیت میں "فن التھذیب" ملاحظہ ہو، اس میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں مہذب وشائستہ طریقہ سے تکلم کی تعلیم دی جائے اور مخاطب کو شبہ، تردد، طعن وغلطی سے محفوظ انداز میں کلام اپنانے کی ترغیب دی جائے۔

"رَاعِنَا" کہنے سے منع فرما کر اپنے مراد کو پورا کرنے کے لئے "اُنظُرنَا" بولنے کی تلقین کی ہے۔اس میں چونکہ پہلا کلمہ شک وشبہ، بے ادبی، طعن وتشنیع سے محفوظ نہیں، اس لئے مسلمانوں کو اس کلمہ پر تکلم کرنے سے منع کر دیا اور ان چیزوں سے محفوظ کلمہ "اُنظُرنَا" بولنے کی تعلیم دی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا تا کہ امت کو تہذیب وتمدن اور آداب سے آراستہ انداز میں خطاب کی تعلیم ہو، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "فن التهذيب" موجود ہے۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُم﴾

اس آیتِ کریمہ میں نفی کا معنی "مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا" میں موجود "مَا" نافیہ سے حاصل ہو جاتا ہے، اس کے باوجود آیت کریمہ میں "وَلَا الْمُشْرِكِين" میں "لَا" نافیہ کا اضافہ کیا گیا ہے، آیت میں "مَـــا" سے نفی کا معنی کشید ہونے کے باوجود "لَا" نافیہ کا اضافہ اس لئے ہوا تا کہ "مَا" میں موجود نفی کی مزید تاکید اور مبالغہ ہو سکے۔

﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (١٠٧)﴾

ترجمہ: کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ وہ ذات ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت تنہا اسی کی ہے، اور اللہ کے سوا نہ کوئی تمہارا رکھوالا ہے نہ مددگار؟

اس آیتِ کریمہ میں "تَعْلَمْ" کا مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ دیگر تمام انسان بھی ہیں۔ دلیل اس پر "وَمَا لَكُم" میں "كم" جمع کی ضمیر ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کے خطاب کے لئے ہے، لیکن "تَعْلَمْ" کے خطاب میں دوسرے لوگوں کے داخل ہونے کے باوجود بھی اس لفظ کو مفرد لا کر خطاب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ خاص کر دیا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تا کہ اس نکتہ پر دلالت ہو کہ یہاں خطاب سے مقصود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم

کوثابت کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔اسی لئے آیت میں خطاب کوآپ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ خاص کردیا گیا ہے، اگرچہ اس خطاب میں دیگرافراد بھی شامل ہیں۔

﴿أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ کی بادشاہت اور ملکیت کے ساتھ آسمان وزمین کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ اللہ کی ملکیت و بادشاہت صرف ان ہی تک محدودنہیں بلکہ دنیاوآخرت کے تمام امورواشیاء پر محیط ہے،لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے کارکردگی میں وجود پانے والے اشیاء میں سب سے بڑی مصنوعات اورانوکھے طرز پر بنائی گئی اللہ کی نعمتوں میں زمین وآسمان ہیں،اس لئے دیگرامور کے مقابلہ میں اِن کی تخصیص کی گئی ہے۔

﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (١٠٦)﴾

ترجمہ: کیاتمھیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟

اس آیتِ کریمہ کے شروع میں ہمزہ استفہامیہ واقع ہوا ہے،حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں،لیکن کبھی کبھی حروفِ استفہام اصل معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں،ان میں سے ایک معنی"تقریر" ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ عنوان کو ثابت اورمثبت قراردیا جائے۔یہاں بھی ہمزہ استفہام اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ "تقریر" کے لئے ہے،تقریر کی صورت میں آیت کا مطلب ہوگا کہ"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قدرت رکھتے ہیں"۔

﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

ان آیات میں ”الاظھار فی مقام الاضمار“ پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلی آیت میں ”أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“، میں اللہ تعالیٰ کا ذکر صراحت کیساتھ کر دیا گیا ہے، جو بعد میں لفظ اللّٰہ کے لئے آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے اگلی آیت میں ”أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ“ کی جگہ ”أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ لَهُ“ بول کر ضمیر کا ذکر کرنا چاہیے تھا، تا کہ ضمیر گذشتہ لفظِ اللّٰہ کی طرف لوٹ جاتی، مگر اس میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ ”أَنَّ اللَّهَ لَهُ“ بول کر اسمِ ظاہر کا ذکر کر دیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”الاظھار فی مقام الاضمار“ پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ انسان کے دل میں خوب اللہ تعالی کی قدرت اور بادشاہت راسخ ہو جائے۔

﴿أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ (۱۰۸)﴾

ترجمہ: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی قسم کے سوال کرو جیسے پہلے موسیٰ سے کیے جا چکے ہیں؟ اور جو شخص ایمان کے بدلے کفر اختیار کرے وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اس آیتِ کریمہ میں ” تشبیہ“ پائی جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس میں یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دفعۃً نزولِ قرآن کے مطالبہ کرنے کو یہود کے اسلاف کے ان مطالبات سے تشبیہ دی گئی ہے جو وہ موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے، مثلاً علانیہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا، براہِ راست کلام سننا وغیرہ، یہ تشبیہ اس لیے واقع ہوئی تا کہ کلام میں تاکید اور قوت پیدا ہو۔

---

❶ یہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر ذکر کر دیا جائے۔

﴿كَمَا سُئِلَ مُوسَى مِنْ قَبْل﴾

یہود کے اسلاف کا موسیٰ علیہ السلام سے مطالبات کرنا زمانہ کے اعتبار سے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کا ہے اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے، کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے نبی ہیں، اس لحاظ سے بظاہر لفظِ "قَبْلُ" کی صراحت کی ضرورت نہیں، کیونکہ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ "قبلیت" کا معنی اس کے بغیر بھی سمجھ آجاتا ہے، لیکن اس کے باوجود آیت میں لفظ "قَبْلُ" کی صراحت کردی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ کلام میں مزید تاکید ہو، اور عنوان کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

﴿وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَان﴾

اس آیتِ کریمہ میں کے لفظِ "الْكُفْرَ" اور "الْإِيمَان" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "الْكُفْرَ" بمعنی (کفر کرنے) کے ہے اور "الْإِيمَان" بمعنی (ایمان لانے) کے ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے اس میں "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيل﴾

اس آیتِ کریمہ میں "سَوَاءَ السَّبِيل" اصل میں "السَّبِيل السَوَاءَ" تھا۔ اس میں "السَّبِيل" موصوف اور "السَوَاءَ" صفت ہے، بعد میں "السَوَاءَ" صفت سے (الف لام) ہٹا کر اس کی اضافت اپنے موصوف "السَّبِيل" کی طرف کردی گئی ہے، جس سے یہ جملہ "سَوَاءَ السَّبِيل" بن گیا اور صفت کی اضافت اپنے موصوف کی طرف ہوگئی، آیت میں صفت کی اضافت اپنے موصوف کی طرف کرتے ہوئے تعبیر اس لئے بیان ہوئی تا کہ حق کے ظہور کے بعد حق سے منہ موڑنے والے کی خوب شناعت اور قباحت بیان ہو، اور اس کے انتہائی درجہ

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

کے بے مروتی پر ہونا واضح کیا جائے۔

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (١١٠)﴾

ترجمہ: اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو بھلائی کا عمل بھی تم خود اپنے فائدے کے لیے آگے بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پاؤ گے، بیشک جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "ذکر العام بعد الخاص" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلے "أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ" بول کر خاص اشیاء یعنی نماز و زکوٰۃ کو بیان کیا گیا ہے، ان خاص اشیاء کو بیان کرنے کے بعد آگے آیت میں "وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ" میں (خیر) کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ عام ہے، کیونکہ اس میں خاص اشیاء (نماز و زکوٰۃ) سمیت تمام اعمالِ خیر شامل ہیں، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "ذکر العام بعد الخاص" پایا جاتا ہے۔ خیر میں نماز و زکوٰۃ کے داخل ہونے کے باوجود آیت میں بالخصوص ان کا ذکر اس لئے ہوا تاکہ ان دونوں عمل کے عظیم الشان ہونے پر اور عند اللہ ان کی قدر و منزلت پر دلالت ہو، یعنی یہ بتایا جائے کہ نماز و زکوٰۃ بہت ہی عظیم الشان عبادت ہے اور اللہ کے یہاں ان کا اونچا مقام ہیں، کیونکہ ان میں نماز بدنی عبادت کا مرکز اور زکوٰۃ مالی عبادت کا مرکز ہے۔

﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ﴾

اس آیتِ کریمہ میں عمل کرنے کی تعبیر "تُقَدِّمُوا" (تقدیم) سے کی ہے، حالانکہ عربی میں عمل کرنے کو بیان کرنے کے لئے "تَعْمَلُوا" کہا جاتا ہے، اس میں "تَعْمَلُوا" کے بجائے "تُقَدِّمُوا" سے تعبیر ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کی گئی ہے، وہ نکتہ یہ کہ اللہ

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے خاص شئی کو بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد ایسے عام کو ذکر کیا جائے جس میں ماقبل والی خاص شے داخل ہو۔

سبحانہ نے دنیا میں مکلفین کے لئے جتنی نعمتیں اتاری ہیں ان سب کا مقصودِ اصلی اور حکمتِ کلی یہ ہے کہ جو نعمتیں اور بھلائیاں اللہ نے ان کو نصیب کیں ان سب کو اپنے معاد کے لئے آگے بھیجیں اور انہیں اپنے فائدہ کے خاطر روزِ محشر کا سرمایہ بنائیں۔

﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ(۱۱۱)﴾

ترجمہ: اور یہ (یعنی یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ جنت میں سوائے یہودیوں یا عیسائیوں کے کوئی بھی ہرگز داخل نہیں ہوگا، یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں، آپ ان سے کہے کہ اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اپنی کوئی دلیل لے کر آؤ۔

اس آیتِ کریمہ میں "تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ" جملہ معترضہ ہے۔ ❶ یہاں "وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ" میں یہود ونصاری کا دعوی بیان ہوا ہے کہ یہود اور نصاریٰ ہی جنت جائیں گے اور "قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ" میں یہود ونصاریٰ سے ان کے دعویٰ کی دلیل مانگی گئی ہے، دعویٰ ودلیل معناً مربوط شئی ہیں، اس لئے یہ دونوں جملے معناً ایک دوسرے سے مربوط ہیں، معناً مربوط ان دونوں جملوں کے درمیان "تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ" کا جملہ لایا گیا ہے، یہ جملہ چونکہ معناً مربوط جملوں کے درمیان داخل ہوا ہے، اس لئے آیت میں "اعتراض" پایا جاتا ہے۔ ان دونوں جملوں کے درمیان یہ جملہ معترضہ اس لئے واقع ہوا تاکہ یہود ونصاریٰ کے دعویٰ کے بطلان کو واضح کیا جائے کہ انکا دعویٰ ہرگز درست نہیں، یہ فضول میں امید لگائے بیٹھے ہیں، یہ جنت میں بغیر ایمان کے داخل نہیں ہو سکتے۔

❶ جملہ معترضہ لانے کو اصطلاح بلاغت میں "اعتراض" کہا جاتا ہے۔ اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ ایک جملہ کے اجزاء کے درمیان یا معناً دو مربوط جملوں کے درمیان کوئی جملہ یا لفظ کسی خاص مقصد کے تحت بڑھا دیا جائے۔

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾

اس جملہ میں "هَاتُوا" فعل امر واقع ہوا ہے، امر اصل میں متکلم کا خود بڑا سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنے کا نام ہے، لیکن کبھی کبھی امر اپنے اصل غرض سے ہٹ کر دوسرے اغراض ومعانی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک معنیٰ "تعجیز" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فعلِ امر کے ذریعہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے سے عاجز اور بے بس قرار دیا جائے۔ یہاں بھی "هَاتُوا" فعل امر اپنے اصل معنیٰ میں مستعمل نہیں بلکہ یہ بھی "تعجیز" کے لئے استعمال ہوا ہے، تعجیز کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ "اے یہود ونصاریٰ تم جنت کے دعویٰ پر دلیل لانے سے عاجز وقاصر ہو، تم اپنے اس دعویٰ کی دلیل نہیں لاسکتے"۔

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

اس آیت مبارکہ میں "إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" کے جملہ میں "تعریض" پائی جاتی ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں "إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" کا جملہ استعمال ہوا ہے، اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ (اگر تم سچے ہو) یہاں اسی معنیٰ کی طرف کلام کو مائل کیا گیا ہے، مگر چونکہ یہ خطاب یہود ونصاریٰ سے ہے جن کے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس کلام کے دوسری جانب مراد لی گئی ہے اور وہ یہود ونصاریٰ کا جھوٹا ہونا، اسی طرح ان کے دعویٰ کا باطل ہونا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تعریض" پائی جاتی ہے۔ تعریض کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا "اے یہود ونصاریٰ تم جھوٹے اور تمہارے دعوے باطل ہیں، اگر تم سچے ہو تو اپنی صداقت پر کوئی دلیل پیش کرو"۔

---

❶ تعریض کنایہ کی ایک قسم ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام سے اشارہ ایک جانب ہو اور مراد دوسری جانب ہو، تعریض کے لئے کلام کے سیاق وسباق کا سہارا بھی لینا پڑھتا ہے۔

اس آیت میں "ایجا ز بالحذف" بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں "إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" شرط ہے، مگراس کا جوابِ شرط حذف کر دیا گیا ہے، یہ اصل میں "إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِين فِيْ دَعْوَاكُمْ فَهَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ" تھا،اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہوتو پھراس کی دلیل لے آؤ۔ آیت سے "فِيْ دَعْوَاكُمْ" اور "هَاتُوْا" کا جملہ حذف کر دیا گیااوراس کے محذوف ہونے پر گذشتہ جملہ "قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ" قرینہ ہے۔آیت سے چونکہ یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے،اس لئے اس میں "ایجاز حذف " موجود ہے۔

﴿بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ(۱۱۲)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ ❷ اس میں نفس کو چہرے سے تشبیہ دی گئی ہے،اس تشبیہ میں نفس "مشبہ" اور چہرہ "مشبہ بہ" ہے،ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح چہرہ انسان کا اشرف جزء ہے،اسی طرح نفس بھی انسانی جسم کا ایک اشرف حصہ ہے،اس وجہ شبہ کی وجہ سے آیت میں نفس کو چہرے سے تشبیہ دی گئی ہے،مگر آیت میں مشبہ بہ کی صراحت "وَجْهَهُ" بول کرلفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

اسی طرح لفظِ وَجْهَهُ "مجاز مرسل" کے قبیل سے بھی ہوسکتا ہے۔ ❸ یہاں لفظِ "وَجْهَهُ" استعمال ہوا ہے،اس کا حقیقی معنی چہرے کے ہے،مگر یہ معنی یہاں مرادنہیں، بلکہ مکمل طور پر اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہونا مراد ہے، لہٰذا یہاں صرف چہرہ مراد لینا

❶ ایجاز بالحذف یہ ہے کہ کلام سے کوئی کلمہ، جملہ یااس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں اس محذوف کی تعیین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❸ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ کلیت، جزئیت، سببیت، مسببیت، یادیگر علاقوں میں سے کوئی علاقہ ہو۔

درست نہ ہوگا، بلکہ اس لفظ کا مجازی معنی مرادلیا جائے گا،اوروہ مجازی معنی نفس کے ہے،یعنی جمیع اعضاء کے ساتھ اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہونا اور فرماں برداری مراد ہے۔اب ان دونوں معنوں میں علاقہ کلیت ، جزئیت کا ہے کیونکہ چہرہ (جزء)اورنفس (کل) ہے، اسی لئے ان کے درمیان علاقہ جزئیت ،کلیت کا ہے،آیت میں جزء بول کر گویا کل مرادلیا گیا ہے، چونکہ آیت میں ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے حقیقی ومجازی معانی میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے،اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔بہرحال آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' ہو یا''مجازمرسل'' دونوں کی صورت میں انسانی دیگراعضاء میں سے بالخصوص''وَجهَه'' (چہرہ) کا ذکر فرمایا گیا ہے، چونکہ انسانی اعضاء میں یہ سب سے اشرف وافضل ہے،اوراسی کے ذریعے تعارف ہوتا ہے، اسی لئے اس کو دیگراعضاء پر ترجیح دیتے ہوئے آیت میں خصوصیت کیساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

﴿بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ(۱۱۲)﴾

ترجمہ: کیوں نہیں؟ (قاعدہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنا رخ اللہ کے آگے جھکا دے، اوروہ نیک عمل کرنے والا ہو،اسے اپنا اجر اپنے پروردگار کے پاس ملے گا۔اورایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اورنہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیتِ کریمہ میں ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والے کے لئے اللہ سبحانہ نے مستحق اجرہونا بیان فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام کے لئے اللہ کے سامنے خود کو جھکائے اور نیک عمل کرتا رہے تو اللہ اسے اپنے پاس سے اجر عطاء فرمائنگے۔اس آیتِ کریمہ میں اجر ملنے والے کو''عِنْدَ رَبِّهِ'' کی قید سے مقید کر دیا گیا ہے، حالانکہ اجر اللہ کی طرف سے ملتا ہے، یہ بات سب کو معلوم ہے،اس لئے بظاہر قید ہذا کی ضرورت نہیں،مگرآیت میں اس قید کو اس لئے بڑھایا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ جو اجر ایسے شخص کو ملے گا وہ بہت اشرف وافضل ہوگا۔

علاوہ ازیں آیت میں "الإظھار فی مقام الإضمار" بھی پایا جاتا ہے، یہاں ایک مرتبہ "بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّه" میں لفظِ اللہ کا ذکر ہو چکا ہے، جو بعد میں لفظ "اللّٰه" کے لئے آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں "عِنْدَ رَبِّهِ" میں لفظِ "رَبّ" کی اضافت "مَنْ أَسْلَمَ" کی طرف لوٹنے والی ضمیر کی طرف کرتے ہوئے کلام کو ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا، بلکہ لفظِ "رَبّ" کی جگہ "عِنْده" بول کر ضمیر لانا چاہئے تھی، تا کہ ضمیر گذشتہ لفظ "اللّٰه" کی طرف لوٹ جاتی، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لفظ "رَبّ" کا استعمال کیا گیا، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ بار بار لفظِ اللہ کے ذکر سے سامع کو لطف حاصل ہو۔ اگر یہاں لفظِ "رَبّ" کی جگہ ضمیر لاتے تو اللہ کے صفتی نام کا ذکر نہ ہوتا جس کی وجہ سے سامع کو لطف نہ آتا، اسی لئے یہاں ضمیر کی جگہ لفظِ "رَبّ" استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے ناموں میں روحانیت ولطف پایا جاتا ہے، اس کی حقیقت کو حقیقت شناس عارفین ہی جان سکتے ہیں جن کی کل زندگی کا سرمایہ ہی اللہ کی یاد ہے۔

﴿كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۱۱۳)﴾

ترجمہ: اسی طرح وہ (مشرکین) جن کے پاس کوئی (آسمانی) علم ہی سرے سے نہیں ہے، انہوں نے بھی ان (اہل کتاب) کی جیسی باتیں کہنی شروع کر دی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں "كَذَلِكَ" جار مجرور ملکر "لَا يَعْلَمُون" کے بعد محذوف لفظِ "قَوْلًا" کے متعلق ہے، یہ آیت اصل میں "كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ قولًا مِثْلَ قَوْلِهِمْ" تھی۔ اس میں سے لفظِ "قول" کو حذف کر دیا گیا ہے، جو ترکیب میں "مِثْلَ قَوْلِهِمْ" کی صفت ہے، اس میں "كَذَلِكَ" معمول اور "قَوْلًا" محذوف عامل ہے۔ اصول کے مطابق عموماً عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں، مگر جب کوئی خاص غرض مقصود ہو تو معمول کو عامل پر مقدم کر دیا جاتا ہے، یہاں بھی "حصر" کے لئے معمول "كَذَلِكَ" کو عامل "قَوْلًا"

پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ ❶ اس آیتِ کریمہ میں آسمانی کتاب کا علم نہ رکھنے والے مشرکین کے قول کو تشبیہ میں یہود ونصاریٰ کے قول کے ساتھ خاص کر دیا ہے، اسی لئے اس میں "حصر" پایا جاتا ہے۔ حصر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس قسم کی باتیں یہود ونصاریٰ کرتے تھے بعینہ اسی قسم کی باتیں مشرکین بھی کرتے ہیں، یہود ونصاریٰ کے قول سے ہٹ کر مشرکین علیحدہ قول نہیں اپناتے۔ اس آیتِ کریمہ میں کسی حد تک یہود ونصاریٰ پر توبیخ پائی جاتی ہے، وہ ایسے کہ یہود ونصاریٰ نے آسمانی کتابوں سے علمی باتیں معلوم کرنے کے بعد بھی خود کو ان مشرکین کے زمرے میں داخل کر دیا جن کے پاس نہ علم ہے نہ کوئی کتاب، اس سے بڑھ کر یہود ونصاریٰ کے لئے اور کیا جہالت اور کم علمی ہو سکتی ہے؟

﴿فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۱۳)﴾

ترجمہ: چنانچہ اللہ ہی قیامت کے دن ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "فِيهِ" معمول اور "يَخْتَلِفُونَ" اس کا عامل ہے، قاعدہ کی رو سے عموماً عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتا ہے، لیکن جب کوئی خاص غرض مقصود ہو تو معمول کو عامل پر مقدم کر دیا جاتا ہے، یہاں بھی "فِيهِ" معمول کو اس کے عامل "يَخْتَلِفُونَ" پر مقدم کر دیا گیا ہے، ایسا اس لیے کیا تاکہ اس آیت کا اختتام گذشتہ آیتوں کی طرح حرفِ (نون) پر ہو۔ اگر یہاں "يَخْتَلِفُونَ" کو مقدم اور "فِيهِ" کو موخر کرتے تو یہ آیت گذشتہ آیتوں کی طرح نون پر ختم نہ ہوتی بلکہ ہا پر ختم ہوتی اور آیت ایک دوسرے کے موافق نہ ہوتیں، اسی لئے معمول کو عامل پر مقدم کر دیا گیا۔

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا (۱۱۴)﴾

---

❶ حصر کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی شئی کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

ترجمہ: اوراس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں پر اس بات کی بندش لگا دے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے، اوران کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔

اس آیت کریمہ کی ابتداء میں ''مِمَّنْ'' حرفِ استفہام واقع ہوا ہے۔ ویسے تو حروفِ استفہام کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، لیکن کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اپنے اصل معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک معنی (انکار ونفی) ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ کسی عنوان کی نفی کی جائے، آیت کریمہ میں بھی ''مَنْ'' استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ بھی (انکار) کے لئے ہے۔ انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''جو مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے لوگوں کو روکے اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں''۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ(۱۱۴)﴾

ترجمہ: ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور انہی کو آخرت میں زبردست عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں ''خِزْيٌ'' نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی کبھی شئی کی ہولنا کی اور فخامت بیان کی جاتی ہے۔ یہاں بھی ''خِزْيٌ'' کو نکرہ لاکر ذلت ورسوائی کی ہولنا کی اور بڑا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''مسجد میں اللہ کا نام لینے سے روکنے والوں کے لئے دنیا میں بڑی اور ہولناک رسوائی اور ذلت ہوگی، جس کی صفت بیان نہیں کی جاسکتی''۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ(۱۱۹)﴾

ترجمہ: یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا بنایا ہوا ہے۔ (حالانکہ) اس کی ذات (اس قسم کی چیزوں سے) پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ سب

کے سب اس کے فرمانبردار ہیں۔

اس آیت کریمہ میں "الاعتراض" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" یہود ونصاریٰ اور مشرکین کا قول ہے جس میں وہ اللہ کے لئے اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، آگے " بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ "والے جملے سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دعویٰ پر رد کیا، دعویٰ اور ردّ دعویٰ معناً مربوط شے ہیں، اس لئے یہ دونوں جملے معناً مربوط ہیں، چونکہ ان دونوں مربوط جملوں کے درمیان "سُبْحَانَه" کا لفظ لایا گیا ہے، اس لئے آیت میں "الاعتراض" پایا جاتا ہے، یہ جملہ معترضہ اس لئے لایا گیا تاکہ اللہ ان ظالموں کے دعویٰ کو باطل قرار دے جنہوں نے اللہ کے لئے اولاد تصور کیا۔

﴿بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ﴾

اس آیت کریمہ میں "تغلیب" پائی جاتی ہے۔ ❷ اس آیت کریمہ میں عقلاء کو غیر عقلاء پر غلبہ دیا گیا ہے، وہ اس طرح کہ آسمان وزمین میں عقلاء اور غیر عقلاء دونوں پائے جاتے ہیں، اس لحاظ سے آیت میں "كُلٌّ لَهُ" کے بعد "قَانِتُونَ" اور "قَانِتَاتٌ" یا "قَانِتَةٌ" ہونا چاہیے تھا، تاکہ "قَانِتَاتٌ" یا "قَانِتَةٌ" سے غیر عقلاء کا بھی ذکر ہو جاتا، مگر آیت میں دونوں (عقلاء اور غیر عقلاء) کے لئے ایک ہی لفظ "قَانِتُونَ" کا اطلاق کر دیا گیا ہے، جو بالخصوص عقلاء کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہ اس لئے کیا تاکہ "قَانِتُونَ" کے لفظ سے عقلاء کو غیر عقلاء پر غلبہ دے دیا جائے۔ یہاں چونکہ عقلاء اور غیر عقلاء دونوں چیزوں پر ایک ہی لفظ کا اطلاق کر کے عقلاء کو غلبہ دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "تغلیب" پائی جاتی ہے۔

---

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کسی جملہ کے اجزاء یا معناً دو مربوط جملوں کے درمیان کوئی لفظ یا جملہ لایا جائے۔

❷ تغلیب مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ کہ کسی کلام میں دو چیزوں میں سے ایک چیز کو غلبہ دے دیا جائے اس طور پر کہ دو چیزوں پر ایک ہی لفظ کا اطلاق کر دیا جائے۔

﴿بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَاقَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۱۱۷)﴾

ترجمہ: وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بارے میں بس اتنا کہتا ہے کہ ہوجا، چناچہ وہ ہوجاتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں کسی بھی تکوینی شئی سے اللہ کے ارادہ کے تعلق کے سبب حاصل ہونے والی حالت کو، اسی طرح تکوینی شئی کے سرعت کے ساتھ ایجاد ہوجانے کی حالت کو اس حاکم کے حکم سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا تصرف واَمر اپنے اطاعت گذاروں پر نافذ ہوجاتا ہو، بلاتوقف مطیع افراد اس حاکم کی بات مان لیتے ہوں۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی کام کے کرنے کے ارادہ کی حالت ہے، یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری حالت سے تشبیہ ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَ نَذِيرًا وَ لَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ (۱۱۹)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) بیشک ہم نے تمھیں کو حق دے کر اس طرح بھیجا ہے کہ تم (جنت کی) خوشخبری دو اور (جہنم سے) ڈراؤ اور جو لوگ (اپنی مرضی سے) جہنم (کا راستہ) اختیار کر چکے ہیں ان کے بارے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔

اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کیساتھ (جنت کی) خوشخبری دینے والا اور (جہنم سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کا کام مؤمنوں کو خوشخبری سنانا اور منکرین کو ڈرانا ہے، اگر یہ کفار ومکذبین آپ کی دعوت کے بعد ایمان نہ لائے تو کوئی بات نہیں، آپ سے اس کی باز پرس نہ ہوگی، یہ تو آیت کی مختصر سی وضاحت ہے، اس میں بحیثیت بلاغت قابلِ غور بات یہ ہے کہ کفار اور مکذبین کے لئے "اَلْكَافِرِيْنَ" یا "اَلْمُكَذِّبِيْنَ"

---

❶ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ دی جائے۔

ہوا کرتا ہے، اس لحاظ سے آیت میں ”لَا تُسْئَلُ عَنِ الْکَافِرِیْنَ اَوِ الْمُکَذِّبِیْنَ“ ہونا چاہیے تھا، لیکن آیت میں کفار اور مکذبین کی تعبیر ”أَصْحَابِ الْجَحِیْمِ“ (جہنم والے) کے الفاظ سے کی گئی ہے، یہاں ایسا اس لئے ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اسلام کے ان معاندین سے جن کے دلوں پر کفر وگمراہی کی مہر لگا دی گئی ہے، کسی طرح یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ یہ کفر وضلال سے ایمان ویقین کی طرف رجوع کرینگے۔

﴿وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى (۱۲۰)﴾

ترجمہ: اور یہود ونصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہیں کرو گے۔ کہہ دو کہ حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظ ”اَلْھُدَی“ معرفہ استعمال ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ”ھُوَ“ ضمیر فصل بھی لائی گئی ہے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ آیت میں ”قصر الصفة علی الموصوف“ کا فائدہ حاصل ہو۔ ❶ اس میں صفتِ ہدایت کو اسلام کے ساتھ مختص کر دیا گیا اور یہ صفت حقیقی معنوں میں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب وملت میں نہیں پائی جاتی، چونکہ اس میں ہدایت کو اسلام کیساتھ منحصر کر دیا گیا اور دوسرے سے اس صفت کی نفی کر دی گئی، اس لئے آیت میں ”قصر الصفة علی الموصوف“ پایا جاتا ہے۔ قصر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مکمل اسلام ہی ہدایت ہے، اس کے علاوہ باقی مذاہب وادیان گمراہی ہیں ہدایت نہیں۔

﴿يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (۴۷)﴾

❶ قصر الصفہ علی الموصوف کی دو قسمیں ہیں۔ ۱: حقیقی۔ ۲: اضافی۔ یہاں قصر الصفہ علی الموصوف سے حقیقی قصر مراد ہے، اس کی تعریف یہ ہے کہ صفت موصوف کے سواء کسی اور میں حقیقی طور پر نہ پائی جائے۔

﴿یَا بَنِی إِسْرَائِیلَ اذْکُرُوا نِعْمَتِیَ الَّتِی أَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَأَنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِینَ (۱۲۲)﴾

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی۔

یہاں دوسری آیت کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے، اس سورت کی آیت نمبر ۴۷ میں ایک مرتبہ "یَابَنِی إِسْرَائِیلَ اذْکُرُوا نِعْمَتِیَ الَّتِی أَنْعَمْتُ" سے اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو عطاء کی جانے والی نعمتوں کا ذکر کر دیا، پھر دوبارہ مکرر اسی جملہ کو آیت نمبر ۱۲۲ میں دہرایا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ دوسری آیت میں "تکرار" واقع ہوا ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ بنی اسرائیل کو تاکید کی جاسکے اور ان کو عطاء ہونے والی نعمتوں کو خوب یاد دلایا جائے۔

﴿وَإِذِ ابْتَلَی إِبْرَاهِیمَ رَبُّهُ بِکَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِی قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظَّالِمِینَ (124)﴾

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے کئی باتوں سے آزمایا، اور انہوں نے وہ ساری باتیں کیں، اللہ نے (ان سے) کہا: میں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے پوچھا: اور میری اولاد میں سے؟ اللہ نے فرمایا میرا (یہ) عہد ظالموں کو شامل نہیں ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کے مضمون کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہ نے "رَبُّهُ" بول کر اپنی ربوبیت کو بیان کیا، ابراہیم علیہ السلام کی اس ازمائش کے ساتھ ربوبیت کے عنوان کو دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بیان کیا ہے:

نمبر ۱: ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش و تکلیف کسی اور غرض سے نہ تھی، بلکہ صرف اور صرف ان کی تربیت کی غرض سے ان کی آزمائش ہوئی۔

نمبر۲: ابراہیم علیہ السلام کی یہ آزمائش ان کے حق میں ایک پرخطر اور عظیم الشان ذمہ داری کی تیاری کا پیش خیمہ ہے۔ یہ دونوں نکتہ لفظِ "رَبُّـهُ" سے معلوم ہوتے ہیں، اس جلیل القدر اور اولی العزم پیغمبر کیساتھ آزمائش کا معاملہ اپنایا اور انہیں اوامر ونواہی کا مکلّف بنایا، ایسا اس لئے کیا تا کہ ابراہیم علیہ السلام کا امامتِ عظمیٰ کا مستحق ہونا ظاہر کیا جائے۔

﴿رَبُّهُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "رَبُّـهُ" کی اضافت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹنے والی ضمیر کی طرف کی گئی ہے، اضافت سے کبھی مضاف الیہ کی عظمت وشرافت کا اظہار کیا جاتا ہے، یہاں بھی لفظِ "رَبُّـهُ" کی اضافت سے ابراہیم علیہ السلام کی عظمت وشرافت بیان کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر ہیں۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (125)﴾

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے ایسی جگہ بنایا جس کی طرف وہ لوٹ لوٹ کر جائیں اور جو سراپا امن ہو۔ اور تم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو یہ تاکید کی کہ تم دونوں میرے گھر کو ان لوگوں کے لیے پاک کرو جو (یہاں) طواف کریں اور اعتکاف میں بیٹھیں اور رکوع اور سجدہ بجالائیں۔

اس آیت کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں "أَمْنًا" سے پہلے "ذا" محذوف ہے، یہ اصل میں "وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وذَا أَمْنًا" تھا، چونکہ اس سے "ذا" کا لفظ حذف کردیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ اس میں مجازی طور پر اسم فاعل "آمِنًا" کی جگہ "أَمْنًا" مصدر کا اطلاق کردیا گیا ہے، تاکہ بیت اللہ کے پرامن ہونے کے معنی میں مبالغہ ہو، گویا بیت اللہ سراپا امن کی جگہ ہے۔

﴿أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾

اس آیت کریمہ میں لفظِ "بَیْت" کی اضافت اللہ سبحانہ تعالیٰ نے یائے متکلم کے ذریعہ اپنی طرف کردی ہے، جس طرح اضافت کے ذریعہ کبھی مضاف الیہ کی فضیلت وشرافت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی طرح اضافت کے ذریعہ مضاف کی بھی کبھی شرافت وفضیلت ظاہر کی جاتی ہے۔ یہاں بھی اضافت کے ذریعہ مضاف یعنی خانہ کعبہ کی عظمت وشرافت کا اظہار کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ بہت ہی عظیم الشان اور شرافت والی جگہ ہے۔

﴿لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ﴾

اس آیت کریمہ میں "لِلطَّائِفِین" پر "اَلْعَاکِفِین" کا عطف کیا گیا ہے، یہ دونوں صفت ہیں، ان کے درمیان عطف اس لئے واقع ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ طواف اور اعتکاف دو علیحدہ علیحدہ مستقل عبادات ہیں، ان میں مغائرت موجود ہے۔

﴿وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾

"لِلطَّائِفِینَ وَالْعَاکِفِین" کی طرح "الرُّکَّع السُّجُود" کے درمیان عطف واقع نہیں ہوا، بلکہ ان کے درمیان عطف چھوڑ دیا گیا، ایسا اس لئے ہوا تا کہ اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان دونوں اوصاف سے ایک ہی عبادت مراد ہے اور وہ عبادت نماز ہے، ان سے علیحدہ علیحدہ عبادات مراد نہیں، اگر ان دونوں کے درمیان عطف ہوتا تو سامع کے ذہن میں دونوں کا مستقل علیحدہ علیحدہ عبادت ہونے کا وہم ہوتا، ترکِ عطف سے اس وہم کو ختم کردیا گیا کہ یہ مستقلاً علیحدہ علیحدہ عبادات نہیں بلکہ ایک ہی عبادت (نماز) ہے۔

﴿لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾

یہاں "لِلطَّائِفِینَ وَالْعَاکِفِینَ" جمع مذکر سالم کے صیغہ ہیں، کیونکہ ان کے واحد کا وزن سلامت ہے، اور اسی طرح "الرُّکَّعِ السُّجُود" جمع مکسر مذکر کے صیغہ ہیں، کیونکہ ان

کے واحد کی بنا سلامت نہیں، آیتِ کریمہ میں شروع کے دونوں اوصاف کو سالم اور دوسرے دونوں کو مکسر اس لئے لائے تا کہ لفظی طور پر ان کے درمیان مقابلہ واضح ہو۔

﴿الرُّکَّعِ السُّجُودِ﴾

اس آیت کریمہ میں "رُکَّع" **فُعَّلٌ** کے وزن پر اور "سُجُود" **فُعُولٌ** کے وزن پر آیا ہے، مگر اس میں "فُعُوْلٌ" پر آنے والے لفظِ "سُجُود" کو **فُعَّلٌ** کے وزن پر آنے والے "رُکَّع" کے بعد ذکر کیا ہے، ایسا اس لئے کیا کیونکہ نماز کی ترتیب میں سجدہ آخر میں ہی ہوتا ہے، اسی لئے یہ "رُکَّع" سے مؤخر ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا (۱۲۶)﴾

ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ اے میرے پروردگار! اس کو ایک پر امن شہر بنا دیجیے۔

اس آیتِ کریمہ میں "اسناد مجازی" (مجاز عقلی) پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "آمِنًا" (اَمِــن) مصدر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی (امن میں ہونا، مطمئن ہونا) ہے۔ آیتِ کریمہ میں اس معنیٔ فعل کی نسبت "بَلَدًا" (مکہ شہر) کی طرف کر دی گئی ہے، حالانکہ مطمئن ہونا شہر کا وصف نہیں بلکہ شہر میں رہنے والے لوگوں کا وصف ہے، اس لئے اس معنی فعل کا فاعل حقیقی اہلِ بلد ہیں، بلد (شہر) مراد نہیں۔ لیکن چونکہ لوگ شہر میں رہا کرتے ہیں اس لئے شہر اور اہل شہر میں حالیت ومحلیت کی نسبت ہے، اس ظاہری نسبت کی وجہ سے آیت مذکورہ میں معنیٔ فعل کی نسبت فاعل حقیقی (اہل شہر) کی طرف کرنے کے بجائے فاعلِ غیر حقیقی (بلد) کی طرف کر دی گئی ہے، چونکہ آیت میں معنیٔ فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی جگہ فاعلِ غیر حقیقی کی طرف کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "اسناد مجازی" موجود ہے۔

❶ مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل یا معنیٔ فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعلِ غیر حقیقی کی طرف کر دی جائے۔

﴿ثُمَّ أَضْطَرُّهُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں معمولی نفع پانے والے کافر کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسی چیزوں سے خود کو روک نہ سکے جن کے کرنے پر وہ مجبور ہو۔ اس میں کافر کی حالت "مشبہ" اور مذکورہ وصف سے متصف شخص "مشبہ بہ" ہے، آیت میں چونکہ "أَضْطَرُّ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت میں "استعارة تبعية" بھی موجود ہے۔❷ یہاں "أَضْطَرُّ" فعلِ مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ(۱۲۷)﴾

ترجمہ: اور اس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اسماعیل بھی (ان کے ساتھ شریک تھے، اور دونوں یہ کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے۔ بیشک تو اور صرف تو ہی ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کو جاننے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ کہا گیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادہ اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادوں کو بلند کیا تو انہوں نے رب سے اس کی قبولیت وغیرہ کی دعا کی۔ اس آیت کریمہ میں بلاغت کا نکتہ یہ ہے کہ اس میں "يَرْفَعُ" فعل مضارع استعمال ہوا ہے، جو فعل کے حال یا مستقبل میں ہونے پر دلالت کرتا ہے، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے اسماعیل علیہ السلام کا تعمیرِ کعبہ کا کام ماضی میں ہوا ہے، اس لحاظ سے

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف، یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

آیت میں ماضی کا صیغہ استعمال ہونا چاہیے تھا، لیکن یہاں ماضی کے بجائے "یَرۡفَعُ" بول کر مضارع سے تعبیر بیان کی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ حکایتِ حالِ ماضیہ کا فائدہ حاصل ہو۔ ❶ بالکل یہی کام مذکورہ آیت میں ہوا ہے، گویا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے کا تعمیرِ کعبہ کرنا آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے اور سامع ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے، یہ اُن کے اخلاص کے ثمرات ہیں وہ بیت اللہ آج بھی موجود اور آباد ہے اور جس پتھر پر کھڑے ہو کر انہوں نے تعمیر کیا وہ بھی "مقام ابراہیم" کے نام سے موجود ہے، جسے دیکھ کر ماضی کے واقعات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا﴾

اس آیت کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہاں "رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا" سے پہلے "یَقُوۡلَانِ" کا جملہ محذوف ہے، یہ اصل میں "یَقُوۡلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادہ نے تعمیرِ کعبہ مکمل کر لی تو وہ دعا کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اے ہمارے رب! اسے ہماری طرف سے قبول فرما۔ آیت میں چونکہ "یَقُوۡلَانِ" کا جملہ حذف کر دیا گیا اور اس پر قرینہ کلمہ اذ دلالت کرتا ہے، اس لئے اس میں " ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ (۱۳۰)﴾

ترجمہ: اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے؟ سوائے اس شخص کے جو خود اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر چکا ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "مَنۡ" استفہامیہ واقع ہوا ہے، حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، لیکن بسا اوقات

❶ حکایتِ حالِ ماضیہ یہ ہے کہ ماضی کے واقع کو تکلم کے وقت جاری سمجھا جائے اور اس کی تعبیر مضارع سے کی جائے۔

حروفِ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے معانی واغراض کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں، ان میں ایک معنی "انکار" ہے۔ انکار کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہامیہ کے ذریعہ عنوان کی نفی کی جائے اور سامع کو اس کے کرنے پر ڈانٹا جائے۔ یہاں بھی "مَنْ" استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہ بھی انکار کے لئے ہے۔ انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ "ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے روگردانی نہ کیا جائے"۔ یہاں "مَنْ" استفہامیہ کے انکاری ہونے پر دلیل یہ ہے کہ استفہام کافروں کی توبیخ کے لئے واقع ہوئی ہے، اور توبیخ کے موقع پر سوال کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی غلط کام سے روکنا مقصود ہوتا ہے۔

﴿وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ (۱۳۰)﴾

ترجمہ: حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں انہیں (اپنے لیے) چُن لیا تھا، اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ کے دو جملے ہیں:

نمبر۱: "وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا"

نمبر۲: "وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" پہلے جملہ میں ایک تاکید لائی گئی ہے اور وہ "لَقَد" میں موجود لام ہے۔ دوسرے جملہ میں دو تاکیدات لائی گئی ہیں۔ ایک "إِنَّهُ" میں حرف إِنَّ اور دوسرا "لَمِنَ الصَّالِحِين" میں لام ہیں۔ پہلے جملے میں ایک تاکید دوسرے جملہ میں دو تاکیدات لانا یقیناً کسی نکتہ سے خالی نہیں، اس میں بہترین نکتہ پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرا جملہ تاکید کے لئے پہلے جملہ سے زیادہ محتاج ہے، کیونکہ پہلے جملہ میں ابراہیم علیہ السلام کا دنیا میں چنیدہ اور منتخب بندہ ہونا بتایا گیا ہے اور ان کا دنیا میں منتخب ہونا واضح بات تھی، اس لئے اس میں زیادہ تاکید کی ضرورت نہیں پڑی، ایک ہی سے مقصد پورا ہوگیا،

اس کے برعکس دوسرے جملہ میں ابراہیم علیہ السلام کا آخرت میں صالح ہونا بیان کیا گیا ہے ،اور آخرت کا معاملہ انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہے، اس لئے اس کی خبر دینے کے لئے زیادہ تاکید کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دوسرے جملہ میں دو تاکیدات لائی گئی۔

﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۳۱)﴾

ترجمہ: جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ سرِ تسلیم خم کردو! تو وہ (فوراً) بولے: میں نے رب العالمین کے (ہر حکم کے) آگے سر جھکا دیا۔

یہاں دوسری آیت میں ”التفات من التكلم إلى الغيبة“ واقع ہوا ہے۔❶ یہاں پہلی آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ”اصْطَفَيْنَاه“ میں نا تکلم کا لفظ استعمال کیا، اس لحاظ سے اگلی آیت میں اللہ سبحانہ کو ”إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ“ کی جگہ ”اذْقُلْنَا“ بول کر خطاب کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر اس دوسری آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ ”قَالَ لَهُ رَبُّهُ“ میں لفظ رَبّ اسم ظاہر استعمال ہوا ہے، جو غائب کے قبیل سے ہے، اس سے واضح ہوا کہ دوسری آیت میں ”التفات من التكلم إلى الغيبة“ پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے کیا تا کہ سامع کو کلام سننے میں زیادہ لطف حاصل ہو۔ اسی طرح لفظِ ”رَبُّهُ“ کی وساطت سے حاصل ہونے والے التفات سے اللہ سبحانہ کی ربوبیت کے عنوان کی اہمیت اجاگر ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں ”الإظهار في مقام الإضمار“ پایا جاتا ہے۔❷ یہاں آیت

❶ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے ظاہر اور کلام کا سیاق وسباق تو الفاظِ تکلم کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں الفاظِ تکلم کے بجائے غائب کے الفاظ ذکر کردیئے جائیں۔

❷ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک شکل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر استعمال کردیا جائے۔

میں ایک مرتبہ ”إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ“ میں لفظ رَبّ کا ذکر ہوا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں ”أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ“ کے بجائے ”لِرَبكَ“ بول کر ضمیرِ مخاطب لانا چاہیے تھا تاکہ اللہ رب العزت سے ضمیر کے ذریعہ خطاب ہو جاتا، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ لفظِ (رَبّ) کی صورت میں اسم ظاہر کا اظہار کیا گیا، ایسا مندرجہ ذیل فوائد کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے:

نمبرا: ابراہیم علیہ السلام کا اسلام کامل درجہ میں قوت رکھتا تھا۔

نمبر۲: دوسرا یہ بتانے کے لئے کہ جو عالمین کا رب ہو وہ اس کے لائق ہے کہ اسی کی بات مانی جائے، اور اسی پر یقین کیا جائے اس کے مقابلے میں کسی اور کی پرواہ نہیں۔

﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ(۱۳۳)﴾

ترجمہ: یا اس وقت تم خود موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ ان سب نے کہا تھا کہ ہم اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود ہے اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے۔ اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ”فن اطراد“ پایا جاتا ہے۔ (1) اس میں ابراہیم علیہ السلام کا نام سب سے پہلے لیا گیا، کیونکہ ان کی ولادت پہلے ہوئی تھی، پھر اس کے بعد اسحاق سے پہلے اسماعیل علیہ السلام کا نام لیا گیا، کیونکہ ان کی ولادت اسحاق علیہ السلام سے پہلے ہوئی تھی، پھر اس کے بعد سب سے آخر میں اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی اس لئے سب سے

(1) اس کا مطلب یہ ہے کہ متکلم مخاطب کے آبا و اجداد کے نام ولادت کی ترتیب سے ذکر کرے۔

آخر میں ان کا نام لیا گیا، مذہب وملت پر قائم رہنے کے لئے یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے سامنے آباواجداد کا نام چونکہ پیدائش کی ترتیب سے لیا اس لئے آیت میں "فن اطراد" پایا جاتا ہے۔

﴿إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ (۱۳۳)﴾

اس آیت کریمہ میں "فن المساواۃ" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے ناموں کو الفاظ ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں، بلکہ یہ تمام الفاظ من حیث الالفاظ برابر ہیں، اس لئے کلام میں "فن المساواۃ" موجود ہے۔

﴿إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ﴾

اس میں "حسنِ بیان" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو دین، مذہب وملت پر ثابت قدم رہنے کے لئے آباواجداد کا نام لیکر کلام کو سمجھنے کے لئے آسان بنادیا ہے، اس کو سنتے ہی ان کے بیٹوں کو صحیح دین سمجھ آگیا اور اس کے سمجھنے میں توقف کی ضرورت نہیں پڑی، اس لئے اس میں "حسنِ بیان" موجود ہے۔

﴿نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "احتراض" واقع ہوا ہے۔ ❸ یہاں یعقوب علیہ السلام کی

---

❶ فنِ مساوات یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائے جن کو ایک دوسرے پر بحیثیتِ الفاظ فوقیت حاصل نہ ہو بلکہ سارے الفاظ برابر ہوں۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کلام میں ایسا اندازِ بیان اپنایا جائے جس کے سمجھنے میں کسی کو توقف کرنا نہ پڑے، بولتے ہی بات سمجھ آجائے۔

❸ احتراض کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں جس سے مقصود کے خلاف کا وہم ہو ایسا لفظ لانا جو اس وہم کو دور کردے۔

اولاد نے اپنے والد (یعقوب) سے جواب دیا" نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰـهَ آبَـائِكَ" ہم آپ کے معبود اور آپ کے آبا واجداد کے معبود کی عبادت کرینگے۔ یہ ایسا کلام ہے جس میں خلاف مقصود کا وہم ہورہا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب "وَإِلٰـهَ آبَائِكَ" کہا گیا تو یہ وہم پیدا ہوا کہ "آبَـاءِ" اپنے والد سے لیکر آدم علیہ السلام تک تمام آبا واجداد کو شامل ہیں، اس لئے ان کو تمام آبا واجداد کے ملت کی پیروی کرنا ہوگا، حالانکہ یہ مقصود کے خلاف ہے، کلام کا مقصود تو قابلِ اتباع آبا واجداد کے ملت ومذہب کی پیروی کرنا ہے سب کی نہیں، کیونکہ یعقوب علیہ السلام کے آبا واجداد میں یقیناً کچھ ایسے بھی ہیں جن کے مذہب وملت کی پیروی لازم نہیں، اس لئے سب کے مذہب کی اتباع مراد لینا خلاف مقصود ہوگا، مقصود کے خلاف اس وہم کو دور کرنے کے لئے آگے آیت میں بطورِ بدل "ابـراهيـم و اسماعيل واسحاق" کے الفاظ بڑھا دیئے جس سے یہ وہم دور ہوگیا کہ یہاں تمام آبا واجداد کے ملت کی پیروی مقصود نہیں، بلکہ ان مخصوص آبا واجداد کے مذہب کی پیروی مراد ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "احتراض" پایا جاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تغلیب" بھی پایا جاتا ہے۔ (1) ابراہیم علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام کے دادا تھے اور اسماعیل علیہ السلام چچا تھے اور اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام کے والد تھے، اس اعتبار سے آیت میں "وَإِلٰـهَ آبَائِكَ وأَجْدَادِكَ وأَعْمَامِكَ" ہونا چاہیے تھا، مگر آیت میں "اَبٌ" (والد) کو دادا و چچا پر غلبہ دینے کے لئے والد (اسحاق) پر، چچا (اسماعیل) پر اور دادا (ابراہیم) سب کے سب پر "آبَـائِكَ" کا اطلاق کردیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تغلیب" واقع ہوئی ہے۔

---

(1) تغلیب بھی مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کی ایک صورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر غلبہ دیا جائے اس طور پر کہ دونوں پر ایک ہی لفظ کا اطلاق کردیا جائے۔

﴿فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُم مُسْلِمُونَ (۱۳۲)﴾

ترجمہ: لہٰذا تمہیں موت بھی آئے تو اس حالت میں آئے کہ تم مسلم ہو۔

مذکورہ جملہ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی نصیحت کا حصہ ہے جو قرآن کی آیت بنا کر اتارا گیا ہے۔ اس میں ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو مرنے سے منع کیا ہے، حالانکہ موت وحیات انسان کے اختیار میں نہیں ہے، یہ تو اللہ کی قدرت کا نمونہ ہے، اس کے باوجود آیت میں غیر اسلام پر مرنے سے اس لئے روکا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ خلاف اسلام پر موت بالکل خیر سے خالی موت ہے، وہ اشرف اور سعادت مندوں کی موت نہیں، سعادت مندوں کی موت اسلام پر ہوتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ زندگی نیک اعمال پر گزارو، تاکہ خاتمہ بالخیر ہو۔

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۳۵)﴾

ترجمہ: اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ راہ راست پر آ جاؤ گے۔ کہہ دو کہ نہیں بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دین کی پیروی کریں گے جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ پر تھے، اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں "كُونُوا" سے پہلے "قَالَتِ الْيَهُودُ" اور نَصَارَىٰ" سے پہلے "قَالَتِ النَّصَارَىٰ كُونُوا" محذوف ہے۔ یہ اصل میں "قَالَتِ الْيَهُودُ كُونُوا هُودًا وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ كُونُوا نَصَارَىٰ" تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہود کہا کرتے تھے یہودی بن جاؤ اور نصاریٰ کہا کرتے تھے نصاریٰ بن جاؤ۔ آیت سے "قَالَتِ الْيَهُودُ" اور "قَالَتِ النَّصَارَىٰ" وغیرہ کو حذف کر دیا گیا اور اس پر

قرینہ "قَالُوا" ہے،اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔اس آیت کا معنی یہ نہیں کہ یہود اور نصاریٰ دونوں فریقوں نے مشترکہ لوگوں کو یہودی،عیسائی بننے کی تلقین کی، یہ معنی یہاں مراد نہیں ہوسکتا ، کیونکہ یہود ونصاریٰ ایک دوسرے کے دین کو باطل سمجھتے تھے، پھر وہ کس طرح اپنے عقیدہ کے خلاف باطل دین کی طرف کسی کو دعوت دیتے ؟اس لئے آیت کا معنی وہ نہیں ہوگا جو ابھی بیان کیا گیا، بلکہ آیت کا معنی وہی ہوگا جو "ایجاز حذف" کی صورت میں گذر چکا ہے،یعنی یہودی یہودیت کی طرف اور نصاریٰ نصرانیت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۳۷)﴾

ترجمہ:اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہ راست پر آجائیں گے۔اور اگر یہ منہ موڑ لیں تو درحقیقت وہ دشمنی میں پڑ گئے ہیں۔ اب اللہ تمہاری حمایت میں عنقریب ان سے نمٹ لے گا،اور وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں "وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" والا جملہ بطورِ "تذلیل" واقع ہوا ہے۔❶ یہاں "وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" سے پہلے والے جملہ میں اللہ سبحانہ نے یہود ونصاریٰ کے خلاف مسلمانوں سے غلبہ کا وعدہ کیا ہے، پھر اس وعدہ والے جملہ کی تاکید کے لئے "وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" لائے کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے،اس لئے تم سے جو وعدہ ہوا ہے،اس کی حکمت اللہ خوب جانتا ہے۔یہ دوسرا جملہ چونکہ پہلے جملہ میں موجود وعدے کی تاکید کے غرض سے لایا گیا ہے،اس لئے آیت کریمہ میں "تذلیل" موجود ہے۔

❶ تذلیل یہ ہے کہ ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ بغرض تاکید لایا جائے۔

﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾

اس جملہ مبارکہ میں ”ایجاز حذف“ پایا جاتا ہے۔ یہاں ”شَرِّهِمُ“ کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں ”فَسَيَكْفِيكَ مِنْ شَرِّهِمِ اللّٰهُ“ تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے شر سے بچنے کے لئے اللہ آپ کو کافی ہے۔ آیت سے چونکہ لفظ ”شَرِّ“ کو حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں ”ایجاز حذف“ پایا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایک نکتہ کی بات اور ہے وہ یہ ہے کہ یہاں جملہ کا آغاز (سین) سے ہوا ہے (سوف) سے نہیں، حالانکہ فعل مضارع میں (سین) کی طرح (سوف) کا داخل ہونا بھی درست ہے، مگر آیت میں (سوف) پر (سین) کو ترجیح دی گئی ہے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی قریب زمانہ میں یہود ونصاریٰ پر غلبہ مل جائے گا۔ نیز دشمنوں کے مکر وفریب اور شر سے بچنے کے لیے اللہ کی مدد دور نہیں بلکہ قریب ہے۔ لفظ ”سین“ کا فعل مضارع پر دخولِ فعل کے قریب ہونے اور مؤکد ہونے پر دلیل ہوتا ہے۔

﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (۱۳۷)﴾

ترجمہ: اور اگر یہ منہ موڑ لیں تو درحقیقت وہ دشمنی میں پڑ گئے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ”فِي شِقَاقٍ“ بول کر دشمنی، عداوت اور دین ورسول کی مخالفت کو یہود ونصاریٰ کے لئے ظرف بنایا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تا کہ یہود ونصاریٰ میں موجود دین دشمنی، مخالفتِ رسول کے معنی میں خوب مبالغہ ہو، گویا ان لوگوں پر رسول اور دین کی مخالفت ودشمنی اس قدر حاوی تھی جیسے یہ لوگ سرتا پا دشمنی، عداوت اور مخالفت کے سمندر میں غرق ہوں۔ یہ مبالغہ ”هُمْ مُشَاقُّوْنَ“ میں نہیں پایا جاتا، اس لئے قرآن کی تعبیر ”فِي شِقَاقٍ“ ”هُمْ مُشَاقُّوْنَ“ سے زیادہ فصیح وبلیغ ہے۔

﴿شِقَاقٍ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''شِقَاقٍ'' نکرہ استعمال ہوا ہے، اس کو نکرہ اس لئے لائے تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ یہود و نصاریٰ میں اتفاق بالکل نہیں پایا جاتا، ان میں مخالفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ﴾

اس آیت میں ''تعجیز و تبکیت'' واقع ہے۔ ❶ یہاں یہود و نصاریٰ کو حق کے اعتراف پر ابھارنے کے لئے اور انہیں الزام دینے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت بازی سے روکنے کے لئے کہا گیا ہے کہ اگر تم مسلمانوں کے دین کی مانند کسی دوسرے دین پر ایمان لاؤ تو تمہیں شاید ہدایت مل جائے، مگر افسوس کہ تم کو ہدایت مل نہیں سکتی، کیونکہ تم مسلمانوں کے دین پر ایمان تو لاتے نہیں اور دین اسلام کی مانند کوئی دین بھی نہیں کہ جس پر تم ایمان لاؤ، اس لئے تمہارا ایمان لانا تمہارے زیرِ طاقت معلوم نہیں ہوتا، اگر تم دین اسلام پر ایمان نہ لاؤ تو تم ایمان لانے سے عاجز اور بے بس ہو، یہاں ایسا انداز اپنایا گیا ہے جس میں یہود ونصاریٰ کو ایمان لانے سے عاجز قرار دیا گیا، اس لئے آیت میں ''تعجیز'' پائی جاتی ہے۔

﴿صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ(۱۳۸)﴾

ترجمہ: (اے مسلمانو! کہہ دو) ہم پر تو اللہ نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہے، اور کون ہے، جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے؟ اور ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارة تصريحية، أصلية'' پائے جاتے ہیں۔ ❷ یہاں دین

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا انداز اپنایا جائے جس سے مخاطب کو کسی کام کے کرنے سے عاجز اور بے بس ثابت کیا جائے۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

اسلام کو رنگ سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں دین اسلام "مشبه" اور رنگ "مشبه به" ہیں۔ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح رنگ سے کسی شئی میں زینت وآراستگی آتی ہیں، بالکل اسی طرح دینِ اسلام پر عمل پیرا ہونے سے انسان میں زینت وکمال آتے ہیں۔ اسی وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں دین اسلام کو رنگ سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن چونکہ آیت میں مشبہ بہ (رنگ) کی صراحت لفظوں میں "صِبْغَةَ اللّٰهِ" بول کر کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔اسی طرح آیت میں "استعارة أصلية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں لفظ "صِبْغَةَ" اسمِ غیر مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة أصلية" موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "فن المشاكلة" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ فنِ مشاکلت سے آیت کی تطبیق سے قبل آیت کی مختصر تفسیر ملاحظہ ہو، تاکہ آیت میں موجود "فنِ مشاكلة" کا سمجھنا آسان ہو۔تفسیر یہ ہے کہ نصاریٰ کے یہاں جب بچوں کی ولادت ہوتی تو وہ ولادت کے ساتھویں دن ختنہ کی جگہ اپنے بچوں کو ایک قسم کے زرد پانی میں ڈبو کر رنگ دیتے، اس پانی کو نصاریٰ "بپتسمہ" (Baptisma) کہا کرتے تھے۔اس زرد پانی سے بچوں کو رنگنے کے بعد نصاریٰ کہتے کہ اب یہ نصرانی بن گیا، کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ہر بچہ ماں کے پیٹ سے گنہگار پیدا ہوتا ہے اور جب تک وہ بپتسمہ نہ لگالے گنہگار رہتا ہے اور یسوع مسیح کے کفارے کا حق دار نہیں ہوتا۔اس کے مقابلے میں اللہ نے فرمایا نصاریٰ کا یہ رنگ کسی کام کا نہیں ہے۔اصل رنگ تو اللہ کا ہے یعنی دین اسلام سے بڑھ کر کوئی بہتر رنگ نہیں

---

❶ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جو جامد یعنی الفاظِ غیر مشتقات میں واقع ہو۔

❷ فنِ مشاکلت یہ ہے کہ کسی بھی شئی کو غیر کے قرب وجوار میں آنے کی وجہ سے اپنے اصل لفظ کے بجائے غیر کے لفظ سے بیان کیا جائے، چاہیے وہ غیر کلام میں صراحتاً موجود ہو یا نہ ہو۔

ہوسکتا۔اب ”فنِ مشاکلة“ سے آیت کی تطبیق ملاحظہ ہو۔دین اسلام کا ذکر نصاریٰ کے رنگینی اور رنگ و رسم کے قرب وجوار میں واقع ہوا ہے۔اس لئے دینِ اسلام کو اپنے اصل لفظ سے بیان کرنے کے بجائے مقابلۃً نصاریٰ کے عمل کے لئے استعمال ہونے والا لفظ ”صِبْغَةَ“ سے بیان کردیا گیا ہے، یہاں چونکہ دینِ اسلام کو اس کے غیر کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے،اس لئے اس میں ”مشاکلة“ پایا جاتا ہے،اگرچہ آیت میں صراحتاً غیر یعنی نصاریٰ کے عمل کا ذکر نہیں ۔امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں مجازاً ایمان کی پاکی پر لفظِ ”صِبْغَةَ“ کے مادہ کے اطلاق کرنے میں تشبیہ پائی جاتی ہے، وہ اس طرح کہ آیت میں ایمان کے ذریعہ کفر سے پاک ہونے کو اس شئی سے تشبیہ دی گئی ہے جو شئی حسی رنگ میں ڈال کر رنگا گیا ہو۔ان دونوں میں وجہ شبہ (ظہورِ اثر) ہے،یعنی جس طرح رنگ کا اثر کسی شئی پر ظاہری طور پر نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح ظاہری طور پر ایمان کی پاکی کی وجہ سے اہل ایمان پر عمل صالح ،اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ عالیہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔اسی لئے ان دونوں میں تشبیہ پائی جاتی ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ تشبیہ سے آیت میں موجود ”مشاکلة“ پر کوئی حرف نہیں پڑتا۔❶

﴿وَ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡن (۱۳۶) وَ نَحۡنُ لَهٗ عَابِدُوۡن (۱۳۸) وَ نَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ (۱۳۹)﴾

ان تینوں جملوں میں ”لَهٗ“ معمول اور ”مُسْلِمُون، عَابِدُون، مُخْلِصُونَ“ عامل ہیں۔ویسے تو عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں،لیکن جب کوئی خاص غرض مطلوب ہو تو معمول کو عامل پر مقدم کردیا جاتا ہے۔یہاں بھی چند اغراض کے خاطر معمولوں کو ان کے عاملوں پر مقدم کردیا گیا ہے۔وہ اغراض یہ ہیں:

❶ تفسیر البغوی: سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۳۸ کے تحت، ج۱ص۱۷۳

نمبر۱: ایسا اس لئے ہوا تا کہ تمام آیتوں کا اختتام نون پر ہو، اگر ان آیتوں میں عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوتے تو ان کا اختتام حرف ھا پر ہوتا، جبکہ دوسری آیتیں "وَلَا تُسأَلُونَ عَمَّا کَانُوا یَعمَلُونَ، وَمَا کَانَ مِنَ المُشرِکِینَ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعمَلُونَ" وغیرہ نون پر ختم ہو رہے ہیں، ان کی موافقت کے لئے مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں "لَہ" معمول کو عاملوں پر مقدم کر دیا گیا ہے۔

نمبر۲: ان تینوں جملوں میں "لہ" کی ضمیر لفظِ اللہ کی طرف راجع ہے۔ عامل سے پہلے معمول کو اس لئے مقدم کیا تا کہ اللہ کی طرف لوٹنے والی ضمیر کا ذکر پہلے کر کے اللہ رب العزت کی عظمت اور اہمیت بیان کی جائے۔

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً (۱۳۸) قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۱۳۹) قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ (۱۴۰)﴾

یہاں پہلی آیت میں "مَن" اور دوسری آیتوں میں ہمزہ استفہامیہ استعمال ہوئے ہیں۔ حروفِ استفہام اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی استفہام اپنے اصل معنی کے لئے استعمال نہیں ہوتے بلکہ دوسرے اغراض کے لئے استعمال ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

نمبر۱: انکار: اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ عنوان کی نفی کی جائے۔

نمبر۲: توبیخ: اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ ڈانٹا جائے۔

نمبر۳: تقریر: اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ کلام میں موجود عنوان کو مثبت قرار دیا جائے۔ ان آیتوں میں موجود حروفِ استفہامیہ بھی اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ پہلی آیت میں "مَن" استفہامیہ "انکار" کے لئے ہے، انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے دین سے اچھا کوئی دین نہیں۔ دوسری آیت میں ہمزہ استفہامیہ توبیخ اور زجر کے لئے ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بڑے

نادان اور بے مروت انسان ہو جو مجھ سے اللہ کے بارے میں حجت بازی کرتے ہو۔ حالانکہ اللہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمہارا بھی رب ہے، پھر بھی تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو یہ بڑے شرم کی بات ہیں۔ تیسری آیت میں ہمزہ استفہامیہ "تقریر" کے لئے ہے۔ تقریر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۴۰)﴾

ترجمہ: اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تھدید" پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں بھی یہود اور نصاریٰ کو حق بات کے چھپانے پر دھمکی دی گئی ہے کہ اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں، اس لئے اگر تم اپنے غلط کردار سے باز نہ آئے تو تمہیں اللہ ضرور سزا دے گا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تھدید" موجود ہے۔

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۴۱)﴾

ترجمہ: (بہرحال) وہ ایک امت تھی جو گزر گئی۔ جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کا ہے، اور جو کچھ تم نے کمایا وہ تمہارا ہے، اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے؟

یہاں دوسری آیت میں "تکرار" پایا جاتا ہے، اس سے ماقبل آیت نمبر ۳۹ میں ایک مرتبہ "وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ" بول کر یہود و نصاریٰ کو خطاب ہوا کہ تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں، پھر اس کے بعد مذکورہ آیت میں بعنیہ اسی عنوان کو "وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ" بول کر مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ دوسری آیت میں "تکرار" پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنے آباواجداد پر گھمنڈ و فخر کرنے اور ان کے بھروسہ پر اعمال سے ہاتھ دھو بیٹھنے پر زجر کرنے میں خوب مبالغہ اور تاکید ہو۔

---

❶ تھدید کا مفہوم یہ ہے کہ مخاطب کو دھمکی دی جائے۔

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۴۲)﴾

ترجمہ: اب یہ بیوقوف لوگ کہیں گے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے ان (مسلمانوں) کو قبلے سے رخ پھیرنے پر آمادہ کر دیا جس کی طرف وہ منہ کرتے چلے آ رہے تھے؟ آپ کہہ دیجیے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دیتا ہے۔

یہ آیتِ کریمہ یہود ونصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے قول کی حکایت ہے، اس جملہ میں "ایجاز بالحذف" موجود ہے۔ ❶ "علی اور ھا" ضمیر کے درمیان "اِسْتِقْبَال" یا "اِعْتِقَاد" کے الفاظ محذوف ہیں، یہ اصل میں "مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي عَلَىٰ اِسْتِقْبَالِهَا" یا "عَلَىٰ اِعْتِقَادِهَا" تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کس نے اس قبلہ سے روک دیا جس کی طرف وہ قبلہ رخ ہوتے تھے یا جس قبلہ کا وہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس آیت سے چونکہ "اِسْتِقْبَال" یا "اِعْتِقَاد" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

اس میں "استعارة تصريحية" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں قبلہ کی اہل ایمان کی طرف سے محافظت کی پابندی کرنے کو کسی شخص کے کسی چیز پر چڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں قبلہ کی حفاظت پر پابندی کرنا "مشبہ" اور کسی چیز پر چڑھنا "مشبہ بہ" ہے، ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح کسی چیز پر چڑھنے والا آدمی اس چیز پر متمکن ہو جاتا ہے، اسی طرح اہلِ ایمان بھی قبلہ کی محافظت کی پابندی کرنے پر متمکن ہے، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں

❶ ایجازِ حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی کلمہ، جملہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں محذوف پر دلالت کرنے والا کوئی قرینہ موجود ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

ان کے درمیان تشبیہ دی گئی ہے، چونکہ آیت میں ”عَلَیْهَا“ بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس آیت میں ”استعارة تصريحية“ پایا جاتا ہے۔اسی طرح آیت میں ”استعارة تبعية“ بھی پایا جاتا ہے۔❷ یہاں عَلَىٰ حرف ہے۔اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ”استعارة تبعية“ موجود ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا(۱۴۳)﴾

ترجمہ: اور (مسلمانو) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔

اس آیت کریمہ میں ”مجاز مرسل“ پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ”وَسَطًا“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی وہ جگہ جو تمام اطراف کے بیچ میں ہو، مگر آیت میں یہ حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ یہ لفظ یہاں امت کی صفت بنی ہے اور ظاہر ہے کہ امت کوئی جگہ نہیں کہ جس پر ”وَسَطًا“ (مکان) کا اطلاق کیا جائے، اس لیے آیت میں ”وَسَطًا“ سے مجازی معنی مراد لیا جائے اور اس کا مجازی معنی (معتدل) ہے۔ ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ لزوم کا ہے۔ ”وَسَطًا“ کا حقیقی معنی (درمیانی جگہ) ملزوم اور (معتدل ہونا) اس کا لازم ہے، آیت میں گویا ملزوم بول کر لازم مراد لیا گیا ہے، چونکہ ان معنوں کے درمیان علاقہ لزوم کا ہے، اس لئے آیت میں ”مجاز مرسل“ موجود ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ(۱۴۳)﴾

---

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❷ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی میں تشبیہ کا علاقہ نہ ہو، بلکہ سببیت، کلیت، آلیت، حالیت، ما کان علیہ یا لزوم وغیرہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

ترجمہ: اور جس قبلے پر تم پہلے کاربند تھے، اسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لیے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں ”التفات من الخطاب إلى الغيبة“ پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے ”كُنتَ عَلَيۡهَا“ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ”كُنتَ“ بول کر مخاطب کے صیغے سے کیا گیا ہے، اس لحاظ سے آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت کے لئے ”إِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ يَتَّبِعك“ بول کر خطاب کی (کاف) ضمیر لانا چاہیے تھی، تاکہ یہ بھی ”كُنتَ“ کی طرح خطاب کا لفظ ہو جاتا، مگر آیت میں خطاب کے لفظ کی جگہ ”الرَّسُولَ“ اسم ظاہر کا استعمال کر دیا گیا ہے جو غائب کے درجہ میں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت کریمہ میں ”التفات من الخطاب إلى الغيبة“ پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسالت کے عنوان کو ذکر کر کے آپ کی اتباع کی علت بیان کی جائے کہ آپ رسول ہیں، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع لازمی ہے۔

﴿مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيۡهِ(۱۴۳)﴾

اس آیت کریمہ میں ”استعارة تمثيلية“ پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں دینِ اسلام سے اعراض کرنے والے کی حالت کی تشبیہ اس شخص کی حالت سے دی گئی ہے جو الٹے پیروں سے بھاگے، یہ تعبیر مکمل بے رخی اور عدم توجہ پر دلالت کرتی ہے۔ یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے مثال اور تشبیہ ہے، اس لئے آیت میں ”استعارة تمثيلية“ پایا جاتا ہے۔

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو خطاب کے الفاظ کا تقاضہ کرے مگر کلام میں الفاظِ خطاب کی جگہ غائب کے الفاظ ذکر دیئے جائیں۔

❷ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے مثال وتشبیہ دی جائے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۴۳)﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ درحقیقت اللہ لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ" والے جملہ میں اللہ سبحانہ نے ماضی نافیہ کے ذریعہ اس عنوان میں مبالغہ کیا کہ اللہ ایمان والوں کے ایمان کو ہرگز ضائع نہیں کریں گے۔ جب اس جملہ میں مبالغۃً نفی کی گئی تو اب مناسب ہوا کہ آیت کے اختتامی جملہ کو بھی مبالغہ کیساتھ بیان کیا جائے، اس مناسبت کے لئے اللہ سبحانہ نے اگلا جملہ اثباتیہ کو کئی تاکیدات سے بیان فرمایا، تاکہ اس اختتامی مثبت جملہ میں بھی گذشتہ منفی جملوں کی طرح خوب مبالغہ ہوجائے۔ وہ تاکیدات یہ ہیں:

نمبر۱: "إِنَّ اللّٰهَ" میں حرف (إِنَّ) تاکید کے لئے آیا کرتا ہے۔

نمبر۲: "لَرَءُوفٌ" میں موجود (لام)۔

نمبر۳: "رَءُوفٌ رَحِيمٌ" بھی (فَعُولٌ اور فَعِيلٌ) کے وزن پر مبالغہ اور تاکید کے لئے ہے۔ یہ سب تاکیدات اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت اور مخلوق پر شفقت پر دلالت کے لئے ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ بڑے وسیع رحمت اور کثرتِ رافت والے ہیں"۔

علاوہ ازیں اس آیت میں "بِالنَّاسِ" معمول ہے اور "رَءُوفٌ رَحِيمٌ" اس کا عامل ہے، اس میں معمول کو عامل پر مقدم کردیا گیا ہے، حالانکہ عموماً عامل اپنے معمول پر مقدم ہوا کرتا ہے، مگر یہاں معمول کو عامل پر مقدم کردیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا تاکہ مرحوم اور مرؤف (جس پر رحم وشفقت کی گئی ہو) اس کی اہمیت واضح کی جائے۔ اسی طرح اس آیت میں رحم کی صفت کو رؤف کے بعد لائے ہے حالانکہ اس کا برعکس بھی ہوسکتا تھا، مگر آیت میں کلمہِ فاصل (آخری کلمہ) کی رعایت کرتے ہوئے رحم کو مؤخر ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا

یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے والی آیت کا آخری کلمہ "مُسۡتَقِیمٍ" تھا جو (میم) پر ختم ہو رہا ہے۔ اُس آیت کی طرح اِس آیت میں بھی رحم کو آخر میں لایا گیا تا کہ یہ بھی "مُسۡتَقِیمٍ" کی طرح (میم) پر ختم ہو۔

﴿قَدۡ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضَاهَا فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (۱۴۴)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) ہم تمہارے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں چناچہ ہم تمہارا رخ ضرور اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جو تمہیں پسند ہے۔ لو اب اپنا رخ مسجد حرام کی سمت کرلو۔

اس آیت کریمہ میں "وَجۡه" (چہرہ) اپنے حقیقی معنی میں بھی ہوسکتا ہے، یعنی اس لفظ سے اس کا ظاہری مدلول مراد ہوسکتا ہے۔ امام قتادہ اور امام سدی رحمہما اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت میں اپنا چہرہ انور اللہ سے دعا کے دوران آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ امام قتادہ اور سدی کے اس قول کے مطابق "وَجۡه" اپنے ظاہری معنی پر محمول ہوگا۔

مگر بعض علماء بلاغت نے یہاں "وَجۡهَكَ" کو بطور "مجاز مرسل" لیا ہے۔ اس میں "وَجۡه" کا حقیقی معنی (مکمل چہرہ) ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں، کیونکہ پورے چہرے کو عموماً دعا کے وقت آسمان کی طرف نہیں اٹھایا جاتا، اس لئے ہم اس کا مجازی معنی مراد لیں گے اور اس کا مجازی معنی (آنکھیں اور چہرے کا بعض حصہ) ہے۔ ان دونوں میں علاقہ تشبیہ کا نہیں بلکہ کلیت اور جزئیت کا ہے، کیونکہ چہرہ (کل) اور آنکھ اس کا (جزء) ہے گویا آیت میں کل بول کر جزء مراد لیا گیا ہے، لہٰذا یہاں معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان کلیت اور جزئیت کا علاقہ ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱۴۴)﴾

اس آیت کریمہ میں بھی "مجاز مرسل" موجود ہے، یہ اس صورت میں جب کہ مسجد حرام سے خانہ کعبہ مراد لیا جائے۔ اس صورت میں پوری مسجد حرام حقیقی معنی اور خانہ کعبہ مجازی معنی ہوگا، ان دونوں معنوں میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، کیونکہ مسجد حرام (کل) اور خانہ کعبہ اس کا ایک جزء ہے، چونکہ ان کے درمیان علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (145)﴾

ترجمہ: اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اگر تم ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آؤ تب بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور نہ تم ان کے قبلے پر عمل کرنے والے ہو، نہ یہ ایک دوسرے کے قبلے پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو علم تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر کہیں تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کر لی تو اس صورت میں یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں "الإظهار فی مقام الإضمار" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت سے پہلے آیت نمبر (۱۴۲) میں "سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ" میں "السُّفَهَاءُ" کے ضمن میں اہلِ کتاب کا ذکر ہو چکا ہے، اس لحاظ سے متعلقہ آیت میں ان کے لئے "وَلَئِنْ أَتَيْتَهُمْ" بول کر (هم) ضمیر لانا چاہیے تھی، تاکہ یہ ضمیر "السُّفَهَاءُ" کی طرف لوٹ جاتی، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا بلکہ (هم) ضمیر کی جگہ "أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ" میں اسمِ موصول کی صورت میں اسم ظاہر کا اظہار کر دیا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "الإظهار فی مقام الإضمار" پایا جاتا

❶ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کر دیا جائے۔

ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ اہلِ کتاب کے بغض وعناد کے کمال وانتہاء کو بتایا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ کے رسول! یہ اہلِ کتاب بغض وعناد میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ آپ ان کے سامنے تمام معجزات بھی ظاہر کردیں تب بھی آپ کی پیروی نہیں کرینگے اور نہ ہی آپ کے راستہ کو اپنائیں گے۔

﴿مَا تَبِعُوا قِبْلَتَکَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ (۱۴۵)﴾

یہاں اہل کتاب کی عدم اتباع کی خبر "مَا تَبِعُوا قِبْلَتَکَ" سے دی گئی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے قبلہ کی پیروی نہ کرنے کی خبر "وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُم" سے دی گئی ہے، پہلے جملے کی طرح دوسرے جملہ کو "وَمَاأَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ" بول کر بیان کیا گیا، جس میں پہلے جملہ میں موجود "تَبِعُوا" کی طرح فعلِ ماضی نہیں لائے، بلکہ اس دوسرا جملہ میں پہلے جملہ سے مختلف اور ممتاز صیغہ "تَابِع" لایا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا کیونکہ دوسرا جملہ کئی وجوہ سے پہلے جملہ سے بزیادہ بلیغ ہے۔ وہ وجوہ یہ ہیں:

نمبر۱: "وَمَا أَنْتَ" والا جملہ جملہ اسمیہ ہے اور "مَاتَبِعُوا" جملہ فعلیہ ہے، جملہ فعلیہ کے مقابلے میں جملہ اسمیہ میں تاکید زیادہ ہوتی ہے، اس لئے یہ جملہ پہلے سے مختلف لایا گیا۔

نمبر۲: اس جملہ اسمیہ میں لفظِ "قِبْلَةَ" کا تکرار بھی ہوا ہے، اس لئے یہ پہلے جملہ سے زیادہ بلیغ ہے۔

نمبر۳: اس جملہ میں "بِتَابِعٍ" کے ذریعہ نفی کے معنی میں بھی تاکید لائی گئی، اس لیے بھی یہ جملہ پہلے جملہ سے زیادہ بلیغ ہے۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّکَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (۱۴۵)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "فن التهيج و الهاب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ اے رسول حق کا علم ہو جانے کے بعد اگر آپ نے اہلِ کتاب کے خواہشات کی پیروی کی تو آپ ظالم شمار کئے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فعل کا صدور ممکن نہیں، لیکن آیت میں یہ انداز اس لئے اپنایا گیا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق پر ثابت قدم رہنے پر ابھارا جائے، نیز اس میں ''تعریض'' بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو معصوم ہیں انہیں کہا گیا کہ اگر بالفرض آپ ان کی پیروی کریں تو آپ کا شمار ظالمین میں سے ہوگا، اب اگر امت میں سے کوئی ان کی پیروی کرے تو اس کا شمار تو بطریقِ اولی ظالمین میں سے ہوگا، یہاں خطاب حضور کو کیا گیا لیکن مراد امت ہے۔

﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (١٤٦)﴾

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو اتنی اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور یقین جانو کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے حق کو جان بوجھ کر چھپا رکھا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تشبيه مرسل" اور "تشبيه مفصل" پائے جاتے ہیں۔ ❷ یہاں "كَمَا" میں (کاف) حرفِ تشبیہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبيه مرسل" موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں "تشبيه مفصل" بھی پائی جاتی ہے۔ ❸ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

❶ یہ اہل بلاغت کا ایک طریقہ ہے جس میں متکلم اپنے مخاطب کو کسی کام کے کرنے پر ابھارتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو متکلم اس انداز سے بیان کرے کہ مخاطب خود ہی کام کے کرنے پر اور اس کے کرنے پر ابھر جائے۔

❷ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❸ تشبیہ مفصل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور ہو۔

ذات بابرکت کو معرفت میں ابناء اہلِ کتاب سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم "مشبہ" اور ابنائے اہل کتاب "مشبہ بہ" ہے، ان میں وجہ شبہ معرفت ہے، یعنی جس طرح اہل کتاب اپنے نسبی ابناء (بیٹوں) کو جانتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جانتے ہیں، یہ وجہ شبہ چونکہ آیت میں "یَعْرِفُوْن" بول کر ذکر کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ مفصل" پائی جاتی ہے۔ اس تشبیہ میں لفظِ "بَنَات" (لڑکیاں) یا "اَولَاد" کا انتخاب نہیں ہوا، بلکہ ان دونوں کو چھوڑ کر صرف لفظِ "أَبْنَاء" ہی آیت میں تشبیہ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، چونکہ نرینہ اولاد (بیٹے) بیٹیوں سے زیادہ مشہور ومعروف ہوتے ہیں، اور والد کی صحبت زیادہ بیٹے اپناتے ہیں۔ اسی طرح والد کا دل بیٹوں کی طرف زیادہ مرغوب ہوتا ہے، اس لئے آیت میں "أَبْنَاء" بول کر تشبیہ کے لئے بیٹوں کا ہی انتخاب ہوا۔

اس آیتِ کریمہ میں "التفات من الخطاب إلى الغيبة" بھی پایا جاتا ہے، اس آیت سے قبل والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وَمَا أَنْتَ، لَئِنِ اتَّبَعْتَ وغیرہ سے خطاب فرمایا ہے، اس لحاظ سے متعلقہ آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "یَعْرِفُونَكَ كَمَا يَعْرِفُون" بول کر خطاب کی (کاف) ضمیر لانا چاہیے تھا، تاکہ یہ آیت گذشتہ آیت کی طرح ہو جاتی، مگر اس میں "یَعْرِفُونَهُ" بول کر غائب کی ضمیر لائی گئی ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من الخطاب إلى الغيبة" پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ اہلِ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت نسب جانتے ہیں، بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ اہلِ کتاب کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننا ان کی کتابوں میں موجود اوصاف وکمالات کے اعتبار سے ہے، دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ اُن میں سے ایک وصف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذو قبلتین (دو قبلہ والا) ہونا ہے۔ اب التفات سے حاصل ہونے والے فائدہ کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اہلِ

کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اوصاف کے اعتبار سے ایسا جانتے ہیں جیسے یہ اپنی صلبی اولاد کو جانتے ہیں۔

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ (١٥١)﴾

ترجمہ: (یہ انعام ایسا ہی ہے) جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے لئے "أَرْسَلْنَا" کا صیغہ استعمال کیا ہے، اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لاشریک ہے، اور واحد کے لئے واحد کا صیغہ استعمال ہوتا ہے، مگر اللہ رب العزت نے اپنے لئے "أَرْسَلْنَا" جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جو اللہ رب العزت کی عظمتِ شان اور مقام ومرتبہ کے لیے ہے۔

﴿أَرْسَلْنَا ...... رَسُولاً﴾

ان دونوں الفاظ میں "جناس اشتقاق" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "أَرْسَلْنَا" اور "رَسُولا" دونوں کا مادہ اشتقاق (رسل) ہے۔ اسی طرح ان دونوں کا اصل معنی (بھیجنا) ہے، ان دونوں چیزوں میں چونکہ مذکورہ بالا الفاظ ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان کے درمیان "جناس اشتقاق" موجود ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (١٥١)﴾

ترجمہ: اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت کریمہ میں "ذکر العام بعد الخاص" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں پہلے "الْكِتَاب

---

❶ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمات اصل مادہ اشتقاق اور اصل معنی میں ایک دوسرے کے موافق ہوں۔

❷ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کسی خاص شئی کو ذکر کیا جائے، پھر اس کے بعد ایسا عام ذکر کیا جائے جس میں گذشتہ خاص موجود ہو، اور یہ کسی فائدہ کی غرض سے ہوتا ہے۔

وَ الْحِکْمَةَ" سے خاص خاص شئی کو بیان کیا گیا ہے، وہ خاص شئی قرآن وسنت کی تعلیم ہے۔ آیت میں ان خاص کو ذکر کرنے کے بعد آگے "مَا لَمْ تَکُونُوا تَعْلَمُونَ" کہا گیا جو کہ عام ہے، کیونکہ اس جملہ کے لفظ (مـــا) میں کتاب وسنت سمیت ہروہ چیز داخل ہوگئی جس کا علم امت کو نہ تھا، اس میں خاص کے بعد عام کو اس لئے بیان کیا تا کہ آیت میں عموم اور شمول کا فائدہ حاصل ہو، یعنی آیت ایسی ہر ہر شئی کو شامل ہو جس کا علم امت کو نہیں ہے۔

﴿وَ لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَ لَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۱۵۴)﴾

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو، دراصل وہ زندہ ہیں، مگر تم کو (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہاں "أَمْوَات" سے پہلے (ھم) اور (بَلْ) کے بعد بھی (ھم) ضمیر حذف کردی گئی ہے، یہ آیت اصل میں "وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ هُمْ أَمْوَاتٌ بَلْ هُمْ أَحْيَاءٌ" تھی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں قتل ہونے والے کے بارے میں یہ مت کہو کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ تو زندہ ہیں، لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں، اس آیت سے چونکہ (هُمْ) ضمیر دو جگہوں سے حذف کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ (۱۵۵)﴾

ترجمہ: اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) خوف سے اور (کبھی) بھوک سے۔

اس آیتِ کریمہ میں کئی تاکیدات لائی گئی ہیں:

نمبر ۱: "لَنَبْلُوَنَّ" میں موجود (لام) جملہ میں تاکید کا معنی دیتا ہے،

نمبر ۲: یہ جملہ فعلیہ خبریہ ہے۔

نمبر۳: اس جملہ کے فعل کے آخر میں نون تاکید ثقیلہ لایا گیا ہے، یہ بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے، آیت میں یہ تاکیدات اس لئے لائی گئیں تاکہ اس عنوان کی خوب وضاحت ہو کہ جہاد میں آزمائش وامتحان ضرور ہوگا۔ اس آیت کریمہ میں "لَنَبْلُوَنَّكُمْ" بول کر اللہ سبحانہ نے فعل کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اس فعل کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف اس لیے ہے کہ آزمائش اور تکالیف کے اسباب اللہ کے امر سے ہیں، اور بسا اوقات یہ انسان کے درجات کی بلندی اور گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس میں "بِشَيْءٍ" کی (باء) حرف جارہ الصاق کے لئے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش کسی نہ کسی شئی (یعنی خوف، بھوک، پیاس وغیرہ) سے ملی ہوئی ہوگی۔

اس آیتِ کریمہ میں نکتہ کی بات یہ ہے کہ آیت میں "بِشَيْءٍ" مفرد واقع ہوا ہے، "أشياء" بول کر جمع نہیں لایا گیا، بلکہ "بِشَيْءٍ" کو جمع کے بجائے مفرد اس لئے ذکر کیا تاکہ قلت پر دلالت کرے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ تھوڑی سی شئی کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرینگے، چاہیے وہ ذکر ہونے والے انواع وتکالیف یعنی خوف، بھوک، پیاس، جان ومال اور پھلوں کی کمی میں سے کسی بھی شکل میں ہو۔ اگر آیت میں "أشياء" بول کر جمع لاتے تو یہ احتمال ہوتا ہے کہ مذکورہ اقسامِ تکالیف میں سے ہر ایک سے ترتیب وار آزمائش کی جائیگی، حالانکہ یہ مقصود کے خلاف ہے، اس خلافِ مقصود سے بچنے کے لئے بھی "بِشَيْءٍ" کو مفرد لایا گیا۔

﴿وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (١٥٥)﴾

ترجمہ: (کبھی) مال وجان اور پھلوں میں کمی کر کے اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں ان کو خوشخبری سنادو۔

اس آیتِ کریمہ میں "ذکر الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے، یہاں پہلے "الْأَمْوَالِ" کا

ذکر ہوا ہے، یہ عام ہے کیونکہ لفظِ "اَلْأَمُوَالِ" انسان کے تمام انواع واقسامِ اموال کو شامل ہے، جس میں پھل بھی شامل ہیں۔ آیت میں اس عام کو ذکر کرنے کے بعد اس میں شامل ایک خاص شئی (پھلوں) کا ذکر "الثَّمَرَات" سے کیا گیا ہے، اموال میں ثمرات کے داخل ہونے کے باوجود اس کا ذکر اس لئے ہوا تا کہ اموال کی تمام اقسام پر پھلوں کی فضیلت اور اہمیت کو ظاہر کیا جائے، اموال سے خریدی گئی اشیاء میں پھل بہترین اور افضل ترین مال ہے۔ اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں "ذکر الخاص بعد العام" موجود ہے۔

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۱۵۶)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "أَصَابَتْهُمْ" اور لفظِ "مُصِيبَةٌ" کے درمیان "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "اَصَابَتْ" فعل اور "مصيبة" اسم ہے، یہ دونوں ہم جنس الفاظ دو الگ الگ مختلف نوع میں سے ہیں، کیونکہ ان میں ایک فعل اور دوسرا اسم ہے، اور دونوں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔

بعض علماء نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس آیت میں "اَصَابَتْ" فعل کی نسبت "مصيبة" کی طرف کی گئی ہے، اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف اس فعل کی نسبت نہیں ہوئی تا کہ "مصيبة" کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچنے والی مصبتیں اور غیر اللہ کی طرف سے آنے والی مصبتیں دونوں کو شامل ہو جائے، اس میں اگر فعلِ "اَصَابَتْ" کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی تو آیت میں صرف اللہ کی طرف سے آنے والے مصائب کا ذکر ہوتا، وہ مصائب داخل نہ ہوتے جو غیر اللہ کی طرف سے پہنچیں۔ جب لفظِ "مصيبة" کی طرف "اَصَابَتْ" کی نسبت کر دی گئی تو یہ

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو ہم جنس لفظ دو نوع کے ہوں، مثلاً ایک اسم ایک حرف، یا ایک اسم ایک فعل، یا ایک فعل ایک حرف کے درمیان جناس ہو۔

شبہ دور ہوا، اور مصیبت من جانبِ اللہ اور مصیبت من غیر جانبِ اللہ دونوں کو آیت شامل ہے، اللہ کی طرف سے جو مصیبت پہنچے وہ "إِنَّـا لِلَّـهِ" کے تحت داخل ہے، کیونکہ یہ عبدیت کا اقرار ہے اور عبدیت کے اقرار میں امور کو اللہ ہی کی طرف سونپا جاتا ہے، مصیبت من جانبِ اللہ "إِنَّـا لِلَّـهِ" کے تحت داخل ہے اور غیر اللہ کی طرف سے پہنچنے والی مصیبتیں "وَإِنَّـا إِلَيْـهِ رَاجِعُونَ" کے تحت داخل ہیں، گویا اس صورت میں "إِنَّا لِلَّه" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اللہ کے بندے ہیں، اس لئے وہ جیسا چاہے ہمارے لئے تدبیر کرے۔ "وَإِنَّـا إِلَيْـهِ رَاجِـعُونَ" کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کی طرف سے انسان کو جو تکالیف پہنچتی ہیں، تو ایک دن روزِ جزاء کا آنے والا ہے، جس دن میں اللہ رب العزت ظالم کو سزا اور مظلوم کو بدلہ دلوائیں گے۔

﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (١٥٧)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں، اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "صَلَوَاتٌ" نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کی فخامت اور عظمت بیان کی جاتی ہے، یہاں بھی "صَـلَـوَاتٌ" کو نکرہ لا کر اہلِ صبر و استقامت پر ہونے والی مغفرت کی عظمت اور بڑے ہونے کا بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صبر کرنے والوں پر اللہ کی طرف سے بڑی عظیم الشان مغفرت ہے، اس میں لفظِ "صَـلَـوَاتٌ" جمع لایا گیا ہے مفرد نہیں، اسے جمع لا کر اس نکتہ کی طرف دلالت کی گئی ہے کہ یہاں مغفرت سے مطلق مغفرت مراد نہیں، بلکہ مغفرت کی کثرت اور انواع مراد ہیں۔ جس کا مطلب ہوگا کہ اللہ کی طرف سے ان صابرین پر مغفرت کے بعد مغفرت ہوگی اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ اور اِن کے لیے مغفرت کی مختلف انواع ہیں، گناہوں کی معافی، درجات کی بلندی، اعزاز و اکرام اور بلند و بالا درجات وغیرہ۔ آیت میں "صَـلَـوَات" کی صفت "مِـنْ

رَبِّهِمْ" کے الفاظ سے لائی گئی ہے، تاکہ حرفِ (مِنْ) کے ذریعہ یہ معلوم ہو جائے کہ صابرین پر ہونے والی مغفرت کی ابتداء اللہ کی طرف سے ہوگی، یہ اس صورت میں ہے جب (مِنْ) ابتدائیہ ہو، اگر اس حرفِ (مِنْ) کو مِنْ ابتدائیہ فرض نہ کریں بلکہ اسے تبعیضیہ مراد لیا جائے تو اس میں وہ معنی حاصل نہیں ہوگا جو (مِنْ) کو ابتدائیہ ماننے سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ اس صورت میں (مِنْ) کے بعد لفظِ "صَلَوَاتٌ" محذوف ہوگا اور اصل عبارت یوں ہوگی "أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ صَلَوَات رَبِّهِمْ" جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ صبر پر اللہ کی مغفرتوں میں سے بعض مغفرت ہوگی، اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "رَبّ" کی اضافت (ھم) ضمیر کی طرف کی گئی ہے، یہ اضافت اس لئے کی گئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انسان اپنی زندگی میں ابتداءِ تخلیق سے آخر تک نشو ونما، مصالح زندگی اور معاملات میں اللہ رب العزت کا محتاج ہے۔

﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ(۱۵۷)﴾

اس آیتِ کریمہ میں (ھم) ضمیرِ فصل اور "الْمُهْتَدُونَ" کے (الف لام) کے ذریعہ "قصر الصفة على الموصوف" کا فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔ ❶ یہاں ہدایت کو صابرین کے ساتھ غیر صابرین کے اعتبار سے خاص کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت صابرین میں ہی پائی جاتی ہے غیر صابرین میں نہیں، لیکن غیر صابرین کے علاوہ دیگر موصوف میں ہدایت کی صفت ہے یا نہیں اس سے آیت کی کوئی غرض نہیں، اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں "قصر الصفة على الموصوف إضافي" پایا جاتا ہے، اس آیتِ کریمہ میں اہلِ صبر کے ہدایت یافتہ ہونے کی خبر "اَلْمُهْتَدُونَ" اسم فاعل سے دی گئی ہے، اس خبر کے لئے فعل

❶ قصر الصفہ علی الموصوف کی دو صورتیں ہیں۔ نمبر ۱: اضافی۔ نمبر ۲: حقیقی۔ یہاں "قصر الصفة على الموصوف" اضافی واقع ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفت کو ایک موصوف کیساتھ کسی دوسرے موصوف کے اعتبار سے خاص کیا جائے، خواہ اس دوسرے موصوف کے علاوہ دیگر موصوفوں میں صفت پائی جائے یا نہ پائی جائے۔

استعمال نہیں ہوا، یہاں فعل کو چھوڑ کر اسمِ فاعل استعمال ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ صبر کرنے والوں میں جو ہدایت پائی جاتی ہے وہ وقتاً فوقتاً تجدد کے ساتھ نہیں کہ کبھی ہو اور کبھی نہ ہو، بلکہ ہدایت کی صفت ان صابرین کے لیے استمرار کے ساتھ ثابت ہے اور یہ صفت اِن کے دل و دماغ میں رچ بس چکی ہے۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (158)﴾

ترجمہ: بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس کے لیے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے اور جو شخص خوشی سے کوئی بھلائی کا کام کرے تو اللہ یقیناً قدردان (اور) جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہاں یا تو ابتداء میں جملہ محذوف ہے یا پھر آخر میں۔ ابتداء میں جملہ محذوف ہونے کی صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی "إِنَّ السَّعْىَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ اَحْكَامِ شَرِيْعَةِ اللّٰهِ الَّتِى شَرَعَهَا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا اللہ کے ان شرعی احکامات میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع کر دیا ہے، یہ تو ابتداء میں محذوف ماننے کی صورت میں ہے، اب آخر میں حذف ماننے کی صورت میں آیت کی تقدیری عبارت یوں ہوگی "إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ اَعْلَامِ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَحُدُوْدِهَا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفا مروہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے جگہوں اور حدود میں سے ہیں۔ دونوں تقدیری عبارتوں سے چونکہ آیت کے کچھ الفاظ و جملے حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (۱۵۸)﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ کی ذات کے لئے "شَاکِرٌ" کا اطلاق ہوا ہے، شکر کرنا بندوں کی صفت ہے خالق کی نہیں، اس لئے شکر یہاں حقیقی معنی میں نہیں ہے، بلکہ ان دو معنوں میں سے کسی ایک معنی پر محمول ہوگا۔

نمبر۱: اللہ شاکر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بندے کے اعمال کی قدردانی کرتے ہوئے اس کا بدلہ دیتے ہیں۔

نمبر۲: اللہ کے شاکر ہونے کا مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ بندہ کے اچھے اعمال پر انکی تعریف کرتے ہیں۔

امام ابوالسعو درحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اجر دینے یا تعریف کرنے کی تعبیر "شَاکِرٌ" کے لفظ سے اس لئے کی تاکہ بندوں پر اللہ کے جو احسانات ہیں ان میں مبالغہ ہو، گویا آیت میں مبالغہ مقصود تھا، اس لئے لفظِ "شَاکِرٌ" کا اطلاق کر کے مجازاً اس سے بدلہ دینے کا معنی مراد لیا گیا ہے، اللہ رب العزت بڑا قدردان ہے کہ اعمال کا بدلہ عطا کرتے ہیں، آیت میں "عَلِیْمٌ" بول کر اللہ سبحانہ کے صفتِ علم کو بیان کیا گیا ہے۔ یہاں اللہ رب العزت کے علیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت خوب جانتے ہیں انسان کے اعمال کو اور اس کی نیت کو، ہر ایک کو اُس کی حسنِ نیت اور اعمال کے بقدر پورا پورا بدلہ عطا فرمائی گے، اللہ رب العزت سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ ہر عمل کا جاننے والا ہے، اور قدر دان ہے اعمال سے بڑھ کر بدلہ عطا فرماتا ہے۔

اس مقام میں صفتِ "شَاکِرٌ" اور صفتِ "عَلِیْمٌ" کا انتخاب ایک بہترین انتخاب ہے، کیونکہ یہ دونوں اوصاف بالکل موقع محل کے مناسبت سے ہیں، وہ اس طرح کہ "تطوع خیر" (نفلی اعمال) میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں:

نمبر۱: فعل (کوئی کام)۔ نمبر۲: قصدِ فعل (کام کرنے کا ارادہ کرنا)۔

فعل کے اعتبار سے شکر زیادہ مناسب ہے،اس لئے اس کی رعایت کرتے ہوئے صفتِ "شَاکِرٌ" استعمال کیا گیااور قصد (ارادہ) سے علم کا تعلق زیادہ ہے، کیونکہ وہ مخفی چیز ہے،اس لئے قصد کی رعایت کرتے ہوئے آیت میں "عَلِیمٌ" کی صفت لائی گئی۔اس میں صفتِ "شَاکِرٌ" مقدم اور صفتِ "عَلِیمٌ" کو مؤخر کیا گیا ہے، حالانکہ تطوعِ خیر میں موجود دو چیزیں یعنی نیت وفعل کے اعتبار سے "عَلِیمٌ" پہلے اور "شَاکِرٌ" بعد میں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ فعل سے پہلے نیت مقدم ہوتی ہے،اس لئے نیت کے اعتبار سے "عَلِیمٌ" ہی مقدم ہونا چاہئے، پھراس کے بعد فعل (کام کرنے) کا مرحلہ آتا ہے،اس اعتبار سے "شَاکِرٌ" کا ذکر بعد میں ہی ہونا چاہئے،مگر آیت میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا، بلکہ نیت وفعل کے ترتیب کے خلاف "شَاکِرٌ" اور "عَلِیمٌ" کا ذکر کیا گیا ہے،یعنی "شَاکِرٌ" کو "عَلِیمٌ" پر مقدم کردیا گیا ہے، گویا بندہ صرف عمل کا ارادہ کرتا ہے،تو اللہ رب العزت اتنے قدردان ہیں کہ عمل کرنے سے پہلے بدلہ عطا کردیتے ہیں، نیک ارادے کی صورت میں ایک نیکی مل جاتی ہے اور عمل کرنے کے بعد بقدرِ اخلاص اس میں اضافہ ہوجاتا ہے۔نیز اس لیے بھی کہ تاکہ اس آیت کا کلمہ فاصل یعنی آخری کلمہ دوسری آیت "وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیمُ" کے کلمۂ فاصل "الرَّحِیمُ" کی طرح (میم) پر ختم ہو۔

﴿مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ...... فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ(۱۵۸)إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ (۱۵۹)﴾

یہاں دوسری آیتِ کریمہ میں "التفات من الغیبة إلی التکلم" پایا جاتا ہے، یہاں پہلی آیت میں اللہ سبحانہ کی ذاتِ بابرکت کے لئے "مِنْ شَعَائِرِ اللَّه" اور "فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ" دو مرتبہ لفظِ "اللّٰه" کا ذکر ہوا، یہ اسم ظاہر ہے اور اسمِ ظاہر غائب کے حکم میں ہوتا ہے، اس لحاظ سے اگلی آیت میں اللہ سبحانہ کو اپنے لئے "مَا أَنْزَلْنَا" میں متکلم کی جگہ "أَنْزَلَ" بول کر

غائب کا صیغہ لانا چاہئے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ "أَنْزَلَ" غائب کی جگہ "أَنزَلنَا" متکلم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من الغیبة إلی التکلم" پایا جاتا ہے، یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ علمائے یہود پر تورات کے احکامات اور بشارتوں کے کتمان پر خوب توبیخ اور زجر کی جائے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۱۵۹)﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم انہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے تورات کے احکام وآیات کے لئے بابِ تفعیل سے "بَیَّنّاہُ" کا صیغہ استعمال کیا ہے جو تبیین مصدر سے مشتق ہے، اس فعل کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تورات کے احکام ومسائل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بشارتوں کو اتنا واضح طور پر بیان کیا کہ یہود کا ہر فرد بلا کسی شک وشبہ ان کو سمجھ سکتا ہے، لیکن ان کے علماء نے کتمانِ علم کیا، نیز یہاں یہ انتخاب اس لئے کیا کہ یہ عنوان اُس عنوان کے مغائر ہے جس میں تورات کے احکام کے بیان کی نسبت اللہ رب العزت نے اپنی طرف کی ہے کہ ہم نے خوب واضح کر کے بیان کیا ہے، تاکہ اہلِ کتاب میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ احکامات واضح نہیں تھے، اور اپنی طرف نسبت کر کے اُن احکامات کی اہمیت اور وضاحت کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ اس آیت میں (ہدایت) کی بھی تاکید پائی جاتی ہے، وہ اس طرح کہ ہدایت کا کتمان بہت بری بات ہے، اس لئے کہ اللہ رب العزت نے ہدایت کو تورات میں بیان کر دیا، وقت کے پیغمبر کے ذریعے ہدایت کی وضاحت بھی کر دی، اب بھی اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو ایسے شخص پر اللہ رب العزت کی لعنت ہے۔

﴿ أُولَئِکَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۱۵۹) ﴾

اس آیتِ کریمہ میں بلاغت کے کئی نکات ہیں:

نمبرا: اس آیتِ کریمہ میں "أُولَـئِكَ" مبتداء ہے، آگے اس مبتداء کی خبر دو جملوں میں بیان کی گئی، ایک "يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ" سے اور دوسرا "وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ" سے۔ ایک مبتداء کی خبر میں دو جملہ اس لئے لائے گئے تا کہ یہود کے علماء پر لعنت کی تاکید ہو، ایک اللہ رب العزت کی طرف سے لعنت، اور دوسری لعنت کرنے والوں کی طرف سے لعنت، اب لعنت کرنے والے کوئی ایک دو نہیں بلکہ وہ بے شمار ہیں، گویا کتمانِ علم کرنے والا ایسے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے جس کی وجہ سے وہ بے شمار لوگوں کی لعنت کا مستحق بن رہا ہے۔

نمبر۲: چونکہ "يَكْتُمُونَ"، فعل کو مضارع لانے میں یہود کے فعل کتمانِ حق میں تجدد کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ بار بار کتمان کرتے تھے، اور ہر مرتبہ نئے نئے طریقہ کے ساتھ تلبیسِ حق اور کتمانِ حق کرتے، چونکہ ان کے فعل میں تجدد تھا، اس لئے ضروری تھا کہ ان کی سزاء میں بھی تجدد ہو، تا کہ برابری ہو سکے، اس برابری کے حصول کے لئے آیت میں ان کی سزاء یعنی لعنت کو بھی "يَلْعَن"، فعلِ مضارع سے بیان کیا، تا کہ لعنت میں بھی تجدد ہو۔

نمبر۳: یہاں پہلے جملے میں اللہ سبحانہ کی طرف "يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ" بول کر لعنت کرنے کی نسبت کی گئی ہے، اس کو پہلے اس لئے بیان کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی گناہوں کا بدلہ دیتے ہیں، پھر اس کے بعد دوسرے جملہ میں یہود علماء پر عام لعنت کرنے والوں کی طرف فعلِ لعنت کی نسبت کی گئی، یہ جملہ دوسرے درجہ میں اس لئے ہے کہ عام لعنت کرنے والوں کی لعنت کا ترتب اللہ کی لعنت پر ہے، یعنی اللہ نے لعنت کی ہے، اس لئے عام لوگ بھی لعنت کرتے ہیں۔ اس ترتیب کی وجہ سے "وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ" دوسرے نمبر پر آیا ہے۔

نمبر۴: اس آیت کریمہ "التفات من التكلم إلى الغيبة" بھی پایا جاتا ہے، اس آیت

میں "أَنزَلنَا، بَيَّنَّا" جمع متکلم کے صیغے ہیں، اس لحاظ سے "يَلعَنُهُمُ اللّٰه" میں "يَلعَن" فعل غائب جگہ کی "نَلعَنُهُم" بول کر جمع متکلم کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ "نَلعَنُ" متکلم کی جگہ "يَلعَنُ" غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من التكلم إلى الغية" پایا جاتا ہے، یہاں "يلعنهم" صیغہ غائب کے ساتھ اُس کے فاعل لفظِ اللہ کو ذکر کیا، "نلعنهم" صیغہ جمع متکلم کے ساتھ نہیں لایا، اس لیے کہ لفظِ اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں میں اس فعل قبیح کی نفرت ڈالنی ہے کہ یہ کتمانِ حق ایسا فعل ہے کہ رب العالمین خود اس کے ارتکاب کرنے والے پر لعنت کرتے ہیں، اب جس پر اللہ لعنت کرے اُس کا کیا حال ہوگا، لفظِ اللہ میں عظمت وہیبت کی طرف اشارہ ہے کہ خود خالقِ کائنات لعنت کررہا ہے، پھر آگے "ويلعنهم اللاعنون" میں فاعل لعنت کرنے والوں کا نام ذکر نہیں کیا، بلکہ فرمایا "لعنت کرنے والے" اس تعبیر سے لعنت کرنے والوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، اور جملہ فعلیہ سے لعنت کے تجدد کی طرف اشارہ ہے۔

نمبر۵: اس آیت کریمہ میں لفظِ "يَلعَنُ" اور "لَاعِنُونَ" میں "جناس مغائر" موجود ہے۔ ❶ یہاں "يَلعَنُ" فعل اور "لَاعِنُونَ" اسم ہے، اس لئے یہ دونوں مختلف نوع کے کلمے ہیں۔ چونکہ ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں "جناس مغائر" موجود ہے۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَئِكَ أَتُوبُ عَلَيهِم وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (١٦٠)﴾

ترجمہ: ہاں وہ لوگ جنھوں نے توبہ کرلی ہو اور اپنی اصلاح کرلی ہو (اور چھپائی ہوئی باتوں کو) کھول کھول کر بیان کردیا ہو تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرلیتا ہوں، اور میں توبہ قبول کرنے کا خوگر ہوں بڑا رحمت والا۔

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو ہم جنس کلمہ دو مختلف نوع سے ہوں، مطلب یہ کہ اسم فعل یا اسم وحرف یا فعل وحرف کے درمیان جناس ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "وَأَنَــا التَّوَّابُ الرَّحِيُمُ" بطورِ "تذییل" کے واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں اللہ سبحانہ نے "فَأُولَئِكَ أَتُوبُ عَلَيُهِمُ" سے توبہ کرنے، اپنی اصلاح اور احکام کو واضح طور پر بیان کرنے والے شخص کی توبہ کے قبولیت کی خبر دی ہے۔ اس جملہ کے بعد "وَأَنَــا التَّــوَّابُ الــرَّحِيُمُ" لایا گیا جو بالکل پہلے جملہ کی طرح قبولیتِ توبہ کا معنی ادا کر رہا ہے۔ یہ جملہ جو پہلے جملہ کے معنی میں ہے، چونکہ تاکید کی غرض سے لایا گیا ہے، اس لئے اس آیت میں "تذییل" پائی جاتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "التفات من الغيبة إلى التكلم" پایا جاتا ہے۔ اس آیت سے پہلے والی آیت "أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّهُ" میں اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے لئے "يَلْعَنُ" غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس لحاظ سے متعلقہ آیت میں "أَتُــوبُ" متکلم کی جگہ "يَتُــوبُ" غائب کا صیغہ ہونا چاہیے تھا، مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے غائب کی جگہ متکلم کا صیغہ "أَتُوبُ" استعمال کیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من الغيبة إلى التكلم" موجود ہے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ قرآن کے نظم والفاظ میں تفنن سے کام لے کر سامعین کی توجہ کو سماعت پر برقرار رکھا جائے، اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ کے دو فعلوں میں اختلاف کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ وہ دو فعل یہ ہیں:

نمبر۱: لعنت جو پہلی آیت میں گذر چکی۔ نمبر۲: دوسرا فعلِ رحمت ہے۔

اس اشارہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بادل نخواستہ اگر کوئی اللہ کی رحمت سے دور اور محروم بھی ہو تو پریشانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ اگر توبہ کرے تو لعنت سے دوری اور رحمت کی محرومی ختم ہو جاتی ہے، اسی لئے "التَّــوَّابُ الــرَّحِيُــمُ" کی صفت کو لعنت کے بعد لائے۔ "اَلتَّــوَّابُ" مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی نہایت توبہ قبول کرنے والا ہے، توبہ کرتے ہی فوراً وہ گناہ معاف کر دیتا ہے، اور "اَلــرَّحِيُــمُ" اور نہایت رحم کرنے والا ہے، یعنی توبہ کے سبب اس کی

❶ تذییل یہ ہے کہ ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ تاکید کی غرض سے لایا جائے، جو پہلے کے معنی میں ہو۔

رحمت متوجہ ہوتی ہے، اور یہ "الرحیم" صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے اور مبالغہ کا، اور یہ دائمی صفات کے لیے استعمال ہوتا ہے "إن صيغة فعيل تستعمل على الصفات الدائمة" لہٰذا "یلعن" فعل میں سزا عارضی ہے، اور اللہ رب العزت کی صفتِ رحمت دائمی ہے، صیغہ مبالغہ اور "فعیل" کے وزن کی وجہ سے اس میں مبالغہ ہے، اور فعلِ لعنت میں فعل کی وجہ سے تجدد ہے۔

﴿خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ (۱۶۲)﴾

ترجمہ: وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے، نہ ان پر سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

اس آیتِ کریمہ میں "يُنظَرُونَ" اَنظَار مصدر سے مشتق ہے، نَظَر مصدر سے نہیں، اس لئے یہ مہلت دینے کے معنی میں ہوگا۔ ایسی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کفر پر مرنے والا ہمیشہ جہنم میں ہوگا، ان سے عذاب کی تخفیف بھی نہ ہوگی، نہ ہی انہیں عذاب سے راحت کے لئے مہلت ملے گی۔ اس میں "وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ" جملہ اسمیہ خبریہ ہے، کیونکہ اس کی ابتداء میں (هم) ضمیر اسم ہے۔ اس جملہ کو فعلیہ کے بجائے اسمیہ اس لیے بنایا گیا تاکہ اس کے مفہوم اور معنی میں دوام اور استمرار کا فائدہ حاصل ہو۔ استمرار اور دوام کی صورت میں اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ "کفار جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، نہ دخول سے پہلے انہیں مہلت دی جائے گی، اور نہ دخول کے بعد ان کے عذاب میں کوئی تخفیف ہوگی"۔

﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ (۱۶۳)﴾

ترجمہ: اور تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے اصل مخاطب کفار ہیں، اور کفار اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے منکر ہیں۔ منکرین کے خطاب کے لئے کلام میں تاکیدات وغیرہ لائی جاتی ہیں، مگر یہاں مخاطب منکر ہونے کے باوجود "إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ" میں کوئی تاکید نہیں لائی گئی، بلکہ تاکید سے خالی

جملہ منکرین پر رد کے لئے لایا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ منکرین کو غیر منکرین کے درجہ میں اتار کر ان کی خوب مذمت اور شناعت بیان کی جائے کہ گویا یہ کفار اللہ کی واحدانیت کو جانتے بھی ہیں پھر بھی یہ انکار کریں تو ان کے لئے اس سے بڑے خسارے کی اور کیا بات ہوسکتی ہے؟ ان منکرین کو آیت میں غیرِ منکرین کے درجہ میں اس لئے اتارا کیونکہ ان کے سامنے اللہ کی توحید پر تمام دلائل موجود ہیں، جن میں اگر یہ غور فکر کریں تو ان دلائل کی روشنی میں یہ لوگ توحید کو صحیح طرح سے سمجھ سکتے ہیں، لیکن یہ لوگ جانتے بوجھتے بھی انکار کرتے ہیں۔اس لیے یہ غیر منکرین کے درجہ میں ہیں۔

اس آیت میں "إِلَـهٌ" إِلَهُكُمْ مبتداء کی خبر ہے اور "وَاحِدٌ" إِلَـهٌ کی صفت ہے، مگر درحقیقت یہاں "إِلَـهٌ" خبر نہیں بلکہ اصل خبر "وَاحِدٌ" ہی ہے، کیونکہ آیت کا اصل مقصد لفظِ "وَاحِدٌ" سے ہی پورا ہوتا ہے، اور آیت کا اصل مقصد واحدانیت کا بیان ہے جو لفظِ "وَاحِدٌ" بیان کررہا ہے، "إِلَهٌ" نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اگر یہاں "إِلَهُكُمْ" کے بعد "إِلَهٌ" نہ ہو بلکہ براہ راست "إِلَهُكُمْ" کے بعد "وَاحِدٌ" لگا کر "إِلَهُكُمْ وَاحِدٌ" کہا جائے تب بھی اللہ کی وحدانیت اس جملہ سے معلوم ہوجاتی ہے، لیکن "إِلٰهُكُمْ" کے بعد "إِلٰـهٌ" لاکر اور پھر اس کی صفت "واحد" لاکر کلام کو نہایت مؤکد کردیا ہے کہ "تمہارا معبود صرف ایک اللہ ہی معبود ہے" اس کے علاوہ عبادت کے کوئی لائق نہیں۔

﴿ لَا إِلَهَ إِلَّا هُو (۱۶۳) ﴾

یہ جملہ استثنائیہ ہے، یہ جملہ آیت میں اس لئے واقع ہوا تاکہ اس سے گذشتہ جملہ میں رب کی وحدانیت کا جو عنوان بیان ہوا، اس کو مزید تاکید کیساتھ ثابت کیا جائے۔گذشتہ جملہ میں موجود واحدانیت کے عنوان کی یہ تاکید اور تقریر اس طور پر ہے کہ جملہ استثنائیہ میں اللہ سبحانہ کا یکتا طور پر معبود ہونا بیان کیا گیا ہے، یہ جملہ گذشتہ جملہ کے لئے بدل کے منزلہ میں

ہے، بدل، مبدل منہ میں بدل ہی اصل ہوتا ہے اور وہ بدل یہاں اللہ تعالیٰ کا اکیلا معبود ہونا ہے، جو بعینہ پہلے جملہ میں موجود وحدانیت کی تاکید اور تقریر ہے۔ اس آیت کے "الرحمن الرحیم" میں اشارہ ہے کہ تمام چھوٹی بڑی نعمتیں وہی عطا کرنے والا ہے، پھر اس کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود کیوں مانتے ہو؟

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ(۱۶۴)﴾

ترجمہ: بیشک آسمان اور زمین کی تخلیق میں رات دن کے لگاتار آنے جانے میں ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لیکر سمندر میں تیرتی ہیں اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں کئی تاکیدات پائی جاتی ہیں:

نمبر۱: "إِنَّ" حرفِ تاکید۔

نمبر۲: "لَآيَاتٍ" إِنَّ کی خبر ہے، اس میں بھی (لام) تاکید کے لئے ہے۔

نمبر۳: اس میں "فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" إِنَّ کی خبر مقدم اور "لَآيَاتٍ" اسمِ مؤخر ہے، خبر کو اسم پر مقدم کرنے سے بھی آیت میں تاکید کا معنی پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ان تین تاکیدات سے آیت کو مؤکد کیا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت

کے دلائل کی خوب وضاحت ہو۔اس آیت کی تقدیری عبارت ''إِنَّ آیاتٍ لَکائِنَۃٌ فِیُ خَلُقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرُض '' تھی۔ بعد میں اس عبارت کو بدل کر آیت میں خبر کو مقدم اور اسم کو مؤخر کردیا گیا ہے،اس میں ''فِیُ خَلُقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرُضِ '' خبر کو اسم پر مقدم اس لئے کیا تا کہ اس ترکیب سے یہ فائدہ حاصل ہو کہ ان مجرورات (تخلیق الارض والسماء وغیرہ) میں سے ہر ایک میں اللہ کی قدرت کے متعدد دلائل موجود ہیں۔

﴿لآیَاتٍ لِقَوُمٍ یَعُقِلُونَ﴾

اس آیت کریمہ میں ''لآیَـاتٍ'' کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی شئی کی عظمت وفخامت بیان کی جاتی ہے، یہاں بھی ''لآیَـاتٍ''کو نکرہ لاکر آسمان وزمین کی پیدائش، رات اور دن کا بدل بدل کر آنا، تنکے جیسی کشتیوں کا پہاڑوں جیسی سمندر کی موجوں میں چلنا، زمین کے بنجر ہونے کے بعد آسمان سے پانی اتار کر اُسے آباد کرنا، انسان کی نفع رسانی کے لیے مختلف انواع کے جانوروں کو زمین پر پھیلانا، ہواؤں کو چلانا اور زمین وآسمان کے درمیان منوں پانی سے لدے بادلوں کو مسخر کرنا، یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنُ یَتَّخِذُ مِنُ دُونِ اللّٰہِ أَنُدَادًا یُحِبُّونَھُمُ کَحُبِّ اللّٰہِ﴾

ترجمہ:اور (اس کے باوجود) لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی خدائی میں اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت (رکھنی چاہئے)۔

اس آیتِ کریمہ میں '' تشبیہ مرسل '' اور '' تشبیہ مجمل ''پائی جاتی ہے۔❶ یہاں ''کَحُبِّ''میں (کاف) حرفِ تشبیہ موجود ہے،اس لئے آیت میں '' تشبیہ مرسل '' پایا جاتا ہے۔اسی طرح آیت میں ''تشبیہ مجمل''بھی پائی جاتی ہے۔❷ یہاں مشرکین کا

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو۔

غیر اللہ سے محبت کرنے کو اللہ سے محبت کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں غیر اللہ سے محبت کرنا "مشبہ" اور اللہ سے محبت کرنا "مشبہ بہ" ہے۔ ان دونوں کے درمیان وجہ شبہ کیا ہے؟ وہ چونکہ آیت میں مذکور نہیں، اس لئے آیت میں "تشبیہ مجمل" پائی جاتی ہے۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ(١٦٥)﴾

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اہل ایمان کا اللہ سے زیادتِ محبت کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے، اس عنوان کو بیان کرنے کے لئے "وَالَّذِينَ آمَنُوا اَحَبُّ لِلَّهِ" بھی کہا جا سکتا تھا، کیونکہ اس جملہ سے بھی زیادتِ محبت سمجھ آ جاتی ہے، لیکن آیت میں "اَحَبُّ لِلَّهِ" کے بجائے "أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ" سے تعبیر اختیار کی گئی ہے، اس لیے کہ "أَشَدُّ" صیغہ اسم تفضیل ہے اور "حُبًّا" مصدر ہے، اور "لِلّٰهِ" میں لام اختصاص کے لیے ہے، مطلب یہ ہے کہ کائنات میں سب سے زیادہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہو تو وہ اللہ رب العزت کی ذات سے ہو، اور اس محبت میں کوئی اور شریک نہ ہو، یہاں "زیادت" کے بجائے "شدت" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، یہ نہایت مبالغہ کے لیے، اور عشق کے بجائے لفظِ محبت لایا گیا ہے، یعنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ رب العزت کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کر ایمان والوں کو اللہ رب العزت سے دل و جان سے محبت ہوتی ہے، اور یہ عشق کی طرح عارضی نہیں بلکہ دائمی محبت ہوتی ہے۔

﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ(١٦٥)﴾

ترجمہ: اور کاش کہ یہ ظالم جب (دنیا میں) کوئی تکلیف دیکھتے ہیں اسی وقت یہ سمجھا لیا کریں کہ تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب (آخرت میں) اس وقت بڑا سخت ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں ”الإظهار فى مقام الاضمار“ پایا جاتا ہے، اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں ”وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ“ میں ”النَّاس“ کی صورت میں ظلم کرنے والوں کا ذکر ہو چکا ہے، یہ بعد میں آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے ”وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا“ میں ”الَّذِينَ ظَلَمُوا“ بول کر اسم ظاہر نہیں لانا چاہیئے تھا، بلکہ ”وَلَوْ يَرَوْنَ“ بول کر ضمیر لانا چاہیے تھی، تاکہ جمع کی ضمیر ”النَّاس“ کی طرف لوٹ جاتی، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ ”الَّذِينَ ظَلَمُوا“ کی صورت میں اسم ظاہر کو لایا گیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”الإظهار فى مقام الاضمار“ موجود ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ مشرکین کے ظلم کی صورت کو سامع کے ذہن میں مستحضر کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ مشرکین کو عذاب ان کے ظلم کی وجہ سے ملے گا۔

﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ (١٦٦)﴾

ترجمہ: جب وہ (پیشوا) جن کے پیچھے یہ لوگ چلتے رہے ہیں، اپنے پیروکاروں سے مکمل بے تعلقی کا اعلان کریں گے اور یہ سب لوگ عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیں گے، اور ان کے تمام باہمی رشتے کٹ کر رہ جائیں گے۔

اس آیتِ کریمہ کے دو جملوں میں ”ترصیع“ پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں دو جملوں میں سے پہلا جملہ ”إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا“ ہے، اس میں پہلا ”اتُّبِعُوا“ اور دوسرا ”اتَّبَعُوا“ وزن میں برابر ہے اور ساتھ ساتھ ان کا آخری حرف بھی ایک دوسرے کے موافق ہے۔ اسی طرح دوسرا جملہ ”وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ“ ہے، اس میں (الْعَذَابَ) اور (الْأَسْبَاب) تقریباً ہم وزن ہیں، کیونکہ ان کا تلفظ تقریباً ملتا جلتا ہے،

❶ ترصیع یہ ہے کہ کلام کے الفاظ کا وزن برابر ہو، اور اس کے ساتھ اُن کے آخری کلمات بھی ایک دوسرے کے موافق ومتقارب ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کے اعجاز (آخری حرف) بھی موافق ہیں، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں "فن ترصیع" پایا جاتا ہے، جس سے کلام مسجع اور مقفہ بھی رہتا ہے اور کلام میں قوت بھی رہتی ہے۔

﴿وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ (١٦٧)﴾

ترجمہ: اور اب وہ کسی صورت دوزخ سے نکلنے والے نہیں ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں مذکورہ جملہ جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے، اسی طرح اس میں (هم) کے بعد "يُخْرِجُوْنَ" کی جگہ "خَارِجِينَ" بول کر اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا ہے تاکہ آیت کے مفہوم اور معنی میں دوام واستمرار حاصل ہو۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرکین جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور کبھی جہنم سے نہ نکالے جائیں گے، یعنی اُن کا جہنم میں رہنا وقتی نہیں ہوگا، بلکہ دائمی ہوگا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (١٦٨)﴾

ترجمہ: اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقین جانو کہ وہ تمہارے لیے ایک کھلا دشمن ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے، یہاں شیطان کی پیروی کرنا "مشبه" اور اس کے قدموں کے آثار پر چلنا "مشبه به" ہے، آیت میں چونکہ مشبہ کی صراحت "خُطُوَاتِ الشَّيْطَان" بول کر لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔ اس آیت میں شیطان کی پیروی کرنے سے روکنے کے لئے "لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَان" کی تعبیر لائی گئی ہے، حالانکہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "حَذِّرُوا مِنْ طَاعَةِ الشَّيْطٰنِ فِيْهَا" یا "فِيْمَا يَامُرُ بِهِ وَقَبُوْلَ قَوْلِهِ، فِيْمَا يَدْعُوْ اِلَى فِعْلِهِ" بھی کہا جا سکتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگوں شیطان تمہیں جن کاموں کا کہتا ہے ان کاموں میں شیطان کی پیروی سے بچو اور جس کے کرنے کی طرف وہ پکارتا ہے اس کے قبول کرنے

سے بچتے رہو۔آیت میں یہ تعبیر نہیں لائی گئی بلکہ استعارۃً "لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّیْطَان" کی تعبیر اپنائی گئی ہے، کیونکہ یہ تعبیر دوسری تعبیر سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے، نیز ''پیروی'' کا لفظ عام ہے جو قول وفعل دونوں کو شامل ہے،نشاناتِ قدم پر چلنا یہ اس کی ہو بہو پیروی کرنا ہے، اور جو ایسے واضح گمراہ کے پیچھے چلے گا تو وہ گمراہ ہوگا۔یہاں ''عَدُوٌّ'' کی صفت ''مُبِیْنٌ'' لائی گئی تاکہ یہ بتایا جائے کہ اس کی دشمنی پوشیدہ نہیں، بلکہ بالکل واضح ہے،اس کے باوجود بھی کوئی اس کی پیروی کرے تو یقیناً وہ گمراہ ہوگا۔

﴿إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (١٦٩)﴾

ترجمہ: وہ تو تم کو یہی حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصریحیة" اور "استعارة تبعیة " پائے جاتے ہیں۔ ❶ اس آیتِ کریمہ میں شیطان کے برائی کو مزین کرنے کو برائی کے حکم دینے سے تشبیہ دی گئی ہے،اس میں شیطان کا برائی کو مزین کرنا "مشبـه" اور برائی کرنے کا حکم دینا "مشبـه بـه" ہے،آیت میں چونکہ مشبہ بہ کی صراحت "یَـأْمُرُکُمْ" بول کر لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تصریحیة" پایا جاتا ہے۔شیطان کفریہ عقائد اور باطل اقوال وافعال اور خواہشات کو مزین کرکے پیش کرتا ہے، باطل کو ملمع سازی کرکے پیش کرتا ہے،اس کی اس تزئین کو حکم دینے سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ براہِ راست حکم نہیں دیتا بلکہ معصیت کے کاموں کو مزین کرکے پیش کرکے گناہ کی دعوت دیتا ہے۔اس آیت میں "استعارة تبعیة" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "یَـأْمُرُ" فعل مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تبعیة" پایا جاتا ہے۔

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہو۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل،حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

﴿بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”ذکر الخاص بعد العام“ پایا جاتا ہے، یہاں پہلے ”السُّوءِ“ کا ذکر کیا گیا جوکہ عام ہے، یہ عام اس لئے ہے کہ یہ تمام گناہوں کو جامع اور شامل ہے۔ آیت میں اس عام کو ذکر کرنے کے بعد اس میں موجود ایک خاص گناہ ”الْفَحْشَاءِ“ کا ذکر کیا گیا۔ ”فَحْشَاء“ بے حیائی کا گناہ زیادہ قبیح وشنیع ہے، یہ خاص ہے، آیت میں ”السُّوءِ“ (عام) کے بعد اس میں داخل خاص گناہ ”فَحْشَاءِ“ کا ذکر کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ”ذکر الخاص بعد العام“ پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ لوگ خاص طور پر بے حیائی کے گناہ سے زیادہ سے زیادہ بچیں۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۱۷۱)﴾

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کو اپنا لیا ہے ان (کو حق کی دعوت دینے) کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے کوئی شخص ان (جانوروں) کو زور زور سے بلائے جو ہانک پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے، گونگے اندھے ہیں، لہٰذا کچھ نہیں سمجھتے۔

اس آیت کریمہ میں ”تشبیہ مرسل“ اور ”تشبیہ مجمل“ دونوں پائے جاتے ہیں۔ ❶ آیت میں چونکہ ”کَمَثَلِ“ میں (کاف) حرف تشبیہ مذکور ہے، اس لئے اس میں ”تشبیہ مرسل“ پائی جاتی ہے۔ اس طرح آیت میں ”تشبیہ مجمل“ بھی پائی جاتی ہے۔ ❷ یہاں کفار کو ان جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو صرف منادِی کی آواز کو سن لیں، اس میں کفار ”مشبہ“ اور جانور ”مشبہ بہ“ ہیں۔ ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح جانور پکارنے والے کی آواز کو سن کر کلام کو سمجھتے نہیں، بالکل اسی طرح کفار احکامات کو سنتے تو ہیں مگر مانتے نہیں،

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ محذوف ہو۔

آیت میں چونکہ یہ وجہ شبہ مذکور نہیں، اس لئے اس میں ”تشبیہ مجمل“ موجود ہے۔

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۱۷۱)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”تشبیہ بلیغ“ پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں کفار کو (اندھے، بہرے اور گونگے شخص) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں کفار ”مشبہ“ اور اندھا، گونگا، بہرہ شخص ”مشبہ بہ“ ہے۔ ان میں وجہ شبہ (عدم انتفاع) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اندھا، گونگا، بہرہ شخص کچھ فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، بالکل اسی طرح یہ کفار قرآن کو سن کر اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے، آیت میں یہ وجہ شبہ اسی طرح حرف تشبیہ مذکور نہیں اس لئے اس میں ”تشبیہ بلیغ“ پائی جاتی ہے۔ آیت میں ”ایجاز حذف“ بھی ہے، ”صم، بکم، عمی“ میں سے ہر ایک سے پہلے ”ھم“ ضمیر محذوف ہے۔ انہیں گونگا، بہرہ اور اندھا اس لیے کہا گیا کہ جس مقصد کے لیے انہیں یہ اعضاء دیئے گئے انہوں نے اس میں استعمال نہیں کئے، کان دیئے گئے حق سننے کے لئے، زبان حق بولنے کے لئے، اور آنکھیں حق دیکھنے کے لئے، جب انہوں نے ان اعضاء کو اپنے اصل کاموں میں استعمال نہیں کیا، تو گویا کہ یہ اعضاء اِن کے پاس ہے ہی نہیں۔ آخر میں ”لا یعقلون“ فرمایا کہ ان میں عقل بھی نہیں، اگر کوئی شخص اندھا، بہرہ ہو لیکن صاحبِ عقل ہو اُسے بھی بات تحریر اور اشاروں کے ذریعے سمجھائی جاسکتی ہے، لیکن ان میں عقل بھی نہیں، گویا کہ کفر و معصیت کر کے انہوں نے ہدایت کے سارے راستے اپنے اوپر مسدود کر دیئے، اب یہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۱۷۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں، ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو۔

❶ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں مذکور نہ ہوں۔

اس آیتِ کریمہ میں ”التفات من التکلم إلی الغیبة“ پایا جاتا ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ نے اپنے لئے ”رَزَقْنَاکُمْ“ میں ”رَزَقْنَا“ بول کر متکلم کا لفظ استعمال کیا۔ اس لحاظ سے آگے ”وَاشْکُرُوا لِلّٰہِ“ کی جگہ ”وَاشْکُرُوْا نَا“ بول کر ضمیر تکلم لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ (نا) ضمیرِ متکلم کی جگہ آیت میں ”اللّٰہ“ اسمِ ظاہر کا استعمال کیا گیا، جو الفاظِ غائب کے قبیل سے ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”التفات من التکلم إلی الغیبة“ واقع ہوا ہے، یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ اللہ کا نام لیکر مؤمن کو لطف ومحبت اور اطمینان نصیب ہو، اور محبوب کے تذکرے سے فرحت محسوس ہو۔

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۷۳)﴾

ترجمہ: اس نے تو تمہارے لئے بس مردار جانور، خون اور سور حرام کیا ہے، نیز وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا، ہو ہاں اگر کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو (اور ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) جبکہ اس کا مقصد نہ لذت حاصل کرنا ہو اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

مذکورہ آیتِ مبارکہ میں کلمہِ (إِنَّمَا) ”قصر“ کے لئے ہے۔ ❶ یہاں آیت کریمہ کے مخاطب قبیلہ ثقیف، بنی عامر بن صعصعہ، خزاعہ، بنی مدلج وغیرہ ہیں۔ ان کے وہم وگمان میں چار چیزیں ”مردار، دم مسفوح (بہتا ہوا خون)، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ جانور کو کھانا حلال تھا“ اللہ سبحانہ نے ان کے اعتقاد کے خلاف اپنا حکم ظاہر کیا کہ حرام وہ نہیں جنہیں تم حرام کہتے ہو، اور نہ ہی حلال وہ ہے جن کو تم حلال سمجھتے ہو، چونکہ اس آیت

❶ قصر کے کئی اقسام ہیں، جن میں سے ایک قسم قصر قلب ہے۔ آیت میں بھی یہی قصر مراد ہے، قصر قلب یہ ہے کہ متکلم مخاطب کے خلاف خیال رکھتا ہو، اس لئے وہ اپنے گمان کے مطابق حکم کو کسی کے ساتھ خاص کر دے۔

میں اللہ سبحانہ نے مخاطب کے خیال کے خلاف حکم حرمت کو ان چار چیزوں کے ساتھ مختص کر دیا اس لئے آیت میں ”قصرِ قلب“ موجود ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (١٧٤)﴾

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کر لیتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھر رہے، قیامت کے دن اللہ ان سے کلام بھی نہیں کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ان یہود ونصاریٰ کی باتیں بیان ہوئیں جو اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ اشیاء کو لوگوں کے لئے حرام اور حرام کردہ اشیاء کو لوگوں کے لئے حلال کر دیتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور پیشین گوئیاں اسی طرح حلال وحرام کے صحیح مضامین کو لوگوں سے چھپاتے ہیں، پھر اس فعل کے بدلہ میں لوگوں سے رقم وصول کر کے کھاتے پھرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے ان کے اِن افعال کی قباحت وشناعت اس آیت میں بیان کی، آیت میں نکتہ یہ ہے کہ اس میں (الَّا) حرفِ استثناء واقع ہوا ہے جو ”قصر“ کا فائدہ دیتا ہے۔ ❶ یہاں بھی یہود ونصاریٰ لوگوں سے جو رقم وصول کرتے تھے اس کو آگ کیساتھ خاص کر دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رقم جو ان کے پیٹ میں ہے وہ صرف اور صرف آگ ہی ہے اور کچھ نہیں۔ آیت میں یہ ”قصر“ اس لئے واقع ہوا تا کہ ان کے حالات کی زیادہ سے زیادہ قباحت وشناعت بیان ہو سکے اور اس کی تصویر کشی ایسے شخص کی شکل وشباہت سے کی جائے جو جہنم کی آگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

❶ قصر یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی شئی کے ساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

﴿أُولَئِکَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ(۱۷۵)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب کی خریداری کرلی ہے۔ چناچہ (اندازہ کرو کہ) دوزخ کی آگ سہنے کے لیے کتنے تیار ہیں۔

اس آیت کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور "استعارة تبعية" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں یہود ونصاریٰ کے فعلِ استبدال کو "اشْتَراء" (خریداری کرنا) سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں استبدال (ادلہ بدلی کرنا) "مشبه" اور "اشتراء" (مشبه به) ہے، ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح خریدنے والا شخص کچھ رقم دیکر اس کے عوض کوئی سامان لیتا ہے، بالکل اسی طرح یہود ونصاریٰ ہدایت چھوڑ کر اس کے بدلہ میں گمراہی اپناتے ہیں، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں یہود ونصاریٰ کے استبدال کو "اشْتَراء" سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن آیت میں چونکہ مشبہ بہ کی صراحت "اشْتَرَوُا" بول کر لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت "استعارة تصريحية" موجود ہے۔ نیز اس میں "اشتروا" فعل استعارۃً استعمال کیا گیا ہے، اس لیے "استعارہ تبعیہ" پایا جاتا ہے۔

﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ(۱۷۵)﴾

اس آیتِ کریمہ میں میں "ايجاز بالحذف" واقع ہوا ہے۔ ❷ یہاں "عَلَى" کے بعد "عَمَلِ اَهْلِ" کے الفاظ محذوف ہیں، یہ اصل میں "فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى عَمَلِ اَهْلِ النَّارِ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کس چیز نے ان لوگوں کو جہنم والے کام کرنے کی جرأت دلائی۔

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ ایجاز بالحذف یہ ہے کہ کلام سے کوئی کلمہ، جملہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

آیت سے چونکہ "عَمَلِ اَهْلِ" کے الفاظ حذف کردیئے گئے ہے، اس لئے اس میں "ایجاز بالحذف" موجود ہے۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ(١٧٧)﴾

ترجمہ: نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر ایمان لائے۔

اہل بلاغت کا ایک طریقہ ہے کہ وہ کسی بات میں مبالغہ لانے کے لئے نفس شئی پر ذات کا حکم لگادیتے ہیں، مثلاً "اسخاء حاتم، أشعر زهير" ان میں سے پہلے جملہ میں نفس سخاوت کو (حاتم) کہہ دیا گیا اور دوسرے جملہ میں نفس شعر کو (اشعر) کہہ دیا گیا۔ بالکل اسی طرح آیت میں بھی ایمان لانے والوں کو "وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ" بول کر نفس نیکی قرار دیا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ آیت میں مبالغہ حاصل ہو، گویا نیکی وہی معتبر ہے جو ایمان کے ساتھ متصف ہو۔

﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾

ترجمہ: اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہاں "الرِّقَابِ" سے پہلے (فَكِّ) کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں "وَفِي فَكِّ الرِّقَابِ" تھا۔ مطلب یہ ہے کہ نیکیوں میں سے ایک نیکی غلام کو آزاد کرانے میں مال خرچ کرنا ہے، آیت سے چونکہ لفظِ (فَكِّ) حذف کردیا گیا ہے، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں "مجاز مرسل" بھی موجود ہے۔❶ یہاں "الرِّقَابِ" بمعنی (گردن) کے ہے، یہ اس لفظ

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، کلیت، حالیت، ما کان علیہ یا لزوم کے علاقوں میں سے کوئی علاقہ ہو۔

کا حقیقی معنی ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ غلامی سے آزادی کے لئے صرف گردن نہیں چھڑائی جاتی بلکہ پورا وجود چھڑایا جاتا ہے، اس لئے آیت میں یہ حقیقی معنی درست نہیں ہوگا، لہٰذا "الـرِّقَابِ" سے اس کا مجازی معنی مراد لیا جائے گا اور مجازی معنی (نفس) ہے، یعنی پورے جسم کو آزاد کروانا۔ ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ جزئیت، کلیت کا ہے، اس لیے کہ گردن (جزء) اور نفس (کل) ہے، گویا آیت میں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے، چونکہ ان معنوں کے درمیان علاقہ جزئیت، کلیت کا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ﴾

ترجمہ: اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں نیز جنگ کے وقت صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "وَالصَّابِرِیْنَ" منصوب ہے۔ یہ "اَلْمُوفُوْنَ" کی طرح مرفوع نہیں لایا گیا، یعنی "وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرُونَ فِي الْبَأْسَاءِ" نہیں کہا گیا، بلکہ اس کو منصوب رکھا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ صبر کی خصوصی فضیلت اور عظمت کی طرف اشارہ ہو، یہ اصل میں "اَمْدَحَ الصَّابِرِیْن" یا "اَخص الصَّابِرِیْن" تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں صابرین کی مدح کرتا ہوں یا صابرین کو خصوصیت سے نوازتا ہوں۔ آیت سے "اَمْدَحَ یا اَخص" فعل حذف کردیا گیا ہے اور "الصَّابِرِیْنَ" دراصل ان افعالِ محذوف کا مفعول ہے، اس لئے وہ اعراب میں منصوب ہے۔ نیز کسی کلام میں مدح وذم کے اوصاف ذکر کئے جائیں اور اس میں اعراب کا اختلاف ہو تو وہ اہلِ بلاغت کا ایک تفنن ہوتا ہے جسے اصطلاح میں "قطع" کہا جاتا ہے، اور یہ فن اس لئے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ سامع مختلف

بدلتے ہوئے اعراب کو سن کر سماعت پر توجہ کو بڑھا دے اور اہتمام سے کلام کو سنے۔ یہاں بھی مدح کے اوصاف بیان ہو رہے تھے، جس میں ''الصَّابِرِیْنَ'' معنوی طور پر ''اَلْمُوفُوْنَ'' مرفوع کا معطوف ہے، مگر ''الصَّابِرِیْن'' کو اعراب میں اس سے مختلف لائے تاکہ آیت میں ''قطع'' حاصل ہو جائے اور بدلتے ہوئے اعراب کی وجہ سے سامع کی اس اہم وصف کی طرف توجہ مبذول ہو جائے۔ نیز قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ومن شأن العرب تغيير الإعراب إذا طال الكلام ''عرب کے ہاں جب کلام طویل ہو جائے تو وہ اعراب کو بدل دیتے ہیں۔ ❶

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ(۱۷۷)﴾

ترجمہ: ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''أُولَئِك'' مبتداء اور ''الَّذِین'' خبر ہے۔ اسی طرح اگلے جملہ میں ''أُولَئِك'' مبتداء (ھم) ضمیرِ فصل اور ''الْمُتَّقُونَ'' (أُولَئِك) کی خبر ہے۔ پہلے جملے میں مبتداء کی خبر میں ''صَدَقُوا'' فعلِ ماضی کا استعمال کیا گیا ہے، یہ اس لئے تاکہ یہ بتایا جائے کہ مذکورہ اوصاف کے حاملین میں سچائی کی صفت متحقق ہو گئی اور سچائی ان سے واقع ہو کر ان میں راسخ ہو چکی ہے۔ دوسرے جملہ میں ''أُولَئِكَ '' مبتداء کی خبر ''هُمُ الْمُتَّقُون'' بول کر جملہ اسمیہ کی صورت میں لائی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ مذکورہ اوصاف کے حاملین تقویٰ پر ثابت قدم ہیں، ان کے تقویٰ میں تجدد نہیں کہ وقتاً فوقتاً تقویٰ کا صدور ہو رہا ہو، بلکہ تقویٰ ان میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ گویا وہ ان کی پہچان بن چکا ہے۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں جملہ فعلیہ ''هُمُ اتَّقُوا'' کے بجائے ''هُمُ الْمُتَّقُون'' بولنے میں ایک فائدہ اور بھی حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ اس آیت کا حرفِ فاصل یعنی ''اَلْمُتَّقُون''

❶ التفسير المظهری: ج۱ ص۱۷۷

(لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ) کی طرح (نون) پر ختم ہو رہا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۷۸)﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جو لوگ (جان بوجھ کر ناحق) قتل کردیئے جائیں ان کے بارے میں تم پر قصاص (کا حکم) فرض کردیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت (ہی کو قتل کیا جائے) پھر اگر قاتل کو اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو معروف طریقے کے مطابق (خوں بہا کا) مطالبہ کرنا (وارث کا) حق ہے، اور اسے خوش اسلوبی سے ادا کرنا (قاتل کا) فرض ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک آسانی پیدا کی گئی ہے اور ایک رحمت ہے، اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو وہ دردناک عذاب کا مستحق ہے

یہاں لفظِ "اَلْحُرُّ" اور "اَلْعَبْدُ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس میں "اَلْحُرُّ" بمعنی (آزاد) اور "اَلْعَبْدُ" بمعنی (غلام) کے ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان معنوں کے درمیان "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح لفظِ "اتِّبَاعٌ" اور لفظِ "أَدَاءٌ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ان میں "اتِّبَاعٌ" کا معنی (مطالبہ دیت) کے ہے اور "أَدَاءٌ" بمعنی (اداءِ دیت) کے ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، ان کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔

❶ طباق یہ ہے کہ دو مقابل معنوں کو کلام میں جمع کردیا جائے۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۱۷۹)﴾

ترجمہ: اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے) امید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ سبحانہ کا کلام فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ معیار پر فائز ہے، جو انسانی تصورات کی دنیا سے بالا تر ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت کے عجیب وغریب نکات کا خزینہ مدفون، جن کو جان کر انسانی دل ودماغ، قلب وجگر حیرانگی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ امام ابوالسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں قصاص کے حکم کے محاسن وخوبیوں کو واضح کرنے کے لئے ایسا بدیع اور عمدہ طریقہ اپنایا جس کی حقیقت وانتہاء تک پہنچا نہیں جاسکتا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصاص (قتل کے بدل قتل) کو اس کی ضد یعنی حیات سے تعبیر کیا کہ لوگو! تم قصاص میں قاتلوں کو قتل کرو، اسی میں تمہارے لئے حیات پنہاں ہے۔ بظاہر قصاص میں خون بہانے کے سواء کچھ نہیں، لیکن واقعتاً غور کیا جائے تو قصاص میں اس کی ضد یعنی حیات ہی حیات پائی جاتی ہے، وہ اس طرح کہ اگر قاتل قصاص میں سرے عام قتل کیا جائے تو سرکش لوگوں کے نفس پر اس کا نہایت اثر ہوگا اور آئندہ ایسے لوگوں کو عبرت ہوگی جس کی وجہ سے وہ قتل کی جرأت نہ کرینگے اور یوں قتل کا دروازہ بند ہوکر لوگوں کی جانیں محفوظ ہوجائیگی۔ ایک قاتل کے قتل کی وجہ سے لاکھوں انسانوں کی جانیں محفوظ ہوکر گویا انہیں حیات مل گئی، اس سے بڑھ کر حیات کہاں مل سکتی ہے۔ اس میں لفظِ "حَيَـاةٌ" نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کی عظمت وفخامت بیان کی جاتی ہے۔ یہاں بھی "حَيَاةٌ" کو نکرہ لاکر اس کی عظمت وفخامت بیان کی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ "اے لوگوں تمہارے لے قصاص میں ایسی عظیم حیات رکھی ہے جس کی صفت بیان نہیں کی جاسکتی"۔

نیز یہاں ''ولکم'' کے ذریعے خبر کو مقدم کر کے حصر کا معنی پیدا کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ قصاص ہی میں زندگی ہے۔ یہ جملہ عرب کے اس جملے ''القتل أنفی للقتل'' سے زیادہ بلیغ ہے، اس میں چودہ حروف ہیں، جب کہ ''القصاص حیاۃ'' میں دس حروف ہیں۔ قتل کی نفی حیات کو مستلزم نہیں ہے، جب کہ قصاص حیات کو مستلزم ہے۔ ''حیاۃ'' میں تنکیر تعظیم کا فائدہ دے رہی ہے کہ قصاص میں طویل حیات ہے۔ ہر قتل، قتل کو روکنے والا نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات قتل، قتل و غارت گری کا ذریعہ بن جاتا ہے، جیسے ظلماً قتل ہو، بخلاف قصاص کے وہ ہمیشہ حیات کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ''القتل أنفی للقتل'' میں لفظِ قتل کا تکرار ہے، اور اس میں اسم تفضیل کے بعد ''من'' کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اسی طرح پہلے والے قتل کے بعد ''قصاصا'' اور دوسرے قتل کے بعد ''ظلما'' محذوف ہوگا، اب تقدیری عبارت ہوگی ''القتل قصاصا أنفی للقتل ظلما من ترکہ'' اب اس میں کافی کلمات محذوف ماننے پڑتے ہیں، جب کہ آیت میں محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آیت میں ''أحد الضدین'' کا تذکرہ ہے کہ قصاص میں جب اُسے قتل کر کے موت دی جائے گی تو یہ بقیہ لوگوں کی حیات کا ذریعہ بنے گا، اس میں حیات کا ذکر ہے۔ ''القتل أنفی للقتل'' میں قاف میں تکرار ہے، اس جملے کی ادائیگی میں ثقل ہے برخلاف آیت کے۔ لفظِ قصاص میں عدل کی طرف بھی اشارہ ہے، اس میں زخموں کے قصاص کی طرف بھی اشارہ ہے، جب کہ قتل صرف قتل ہی کو شامل ہے۔ قصاص میں زخموں کی بھی تمام قسمیں شامل ہیں کہ ان میں بھی قصاص ہوگا، تاکہ لوگوں کے اطراف و اعضاء بھی محفوظ ہو جائیں، معلوم ہوا کہ قرآن کریم کا یہ جملہ عرب کے اس جملے ''القتل أنفی للقتل'' سے کئی گنا زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ(۱۸۰)﴾

ترجمہ: یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے۔

یہ آیت ”فن الهاب“ اور ”تهييج“ سے تعلق رکھتا ہے۔ ❶ یہاں بھی ”حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِين“ بول کر لوگوں کو اپنے والد اور رشتہ داروں کے لئے بھلائی کرنے پر ابھارا گیا ہے کہ یہ کام تقویٰ داروں پر لازم ہے۔

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ(۱۸۲)﴾

ترجمہ: ہاں اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرف داری یا گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اور وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ”مجاز مرسل“ پایا جاتا ہے، یہاں ”خَافَ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (ڈرنا اور خوف رکھنا) ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس کا مجازی معنی ”علم“ (جاننا) مراد لیا گیا ہے۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ سببیت، مسببیت کا ہے، کیونکہ خوف ”مسبب“ اور جاننا ”سبب“ ہے، ظاہر ہے کہ انسان کسی چیز سے اس وقت ڈرتا ہے جب اس کو وہ چیز اچھی طرح معلوم ہو۔ علم کے بعد ہی انسان کو خوف انگیز چیزوں کا پتہ چلتا ہے، اسی لئے ان دونوں میں سے علم ”سبب“ اور خوف ”مسبب“ ہے۔ آیت میں ”مسبب“ (خوف) بول کر ”سبب“ (علم) مراد لیا گیا ہے، چونکہ آیت میں لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں سببیت، مسببیت کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے آیت میں ”مجاز مرسل“ موجود ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ(۱۸۳)﴾

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا انداز اپنایا جائے جس سے سامعین اور مخاطبین کو کسی کام کے کرنے پر ابھارا جائے۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کردیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقوی پیدا ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "تشبیہ مرسل" اور "تشبیہ مجمل" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں "کَمَا کُتِبَ" میں (کاف) حرفِ تشبیہ موجود ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ مرسل" پائی جاتی ہے۔ اسی طرح آیت میں "تشبیہ مجمل" بھی پائی جاتی ہے۔ ❷ اس آیت میں امتِ محمدیہ روزوں کو گذشتہ امتوں کے روزوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں امت محمدیہ کا روزہ "مشبہ" اور گذشتہ امتوں کا روزہ "مشبہ بہ" ہے۔ اور دونوں میں وجہ شبہ (فرضیت) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امت محمدیہ کا روزہ فرضیت کے اعتبار سے امت سابقہ کے روزوں کی طرح ہے۔ آیت میں چونکہ وجہ شبہ مذکور نہیں اس لئے آیت میں "تشبیہ مجمل" موجود ہے۔ آیت میں تشبیہ دے کر یہ بتلایا کہ یہ حکم صرف تم پر فرض نہیں بلکہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی یہ فرض تھا، جب حکم میں عموم آجاتا ہے تو اس میں تخفیف آجاتی ہے، جب سب کے لیے ایک حکم ہو تو عمل کرنے میں سہولت ہوتی ہے، اور نفس عمل کے لیے تیار ہوجاتا ہے، یہاں روزے کا مقصد بھی بیان کیا گیا یعنی گناہوں سے بچنا، جب انسان اپنے نفس کو خواہشات سے روکتا ہے تو اللہ رب العزت اُس کے نفس کو متقی اور پرہیزگار بنادیتا ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِى أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۱۸۵)﴾

ترجمہ: رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے سراپا ہدایت، اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردیتی ہیں، لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔

---

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، یہاں آیت کی ابتداء میں ہی "شَهْرُ رَمَضَانَ" میں لفظِ "شَهْرُ" کا استعمال ہو چکا ہے، جو بعد میں آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آیت میں "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ" میں "الشَّهْرَ" اسمِ ظاہر کی جگہ "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ إِيَّاهُ" بول کر ضمیر لانا چاہئے تھی، تاکہ یہ ضمیر گذشتہ لفظِ "الشَّهْرَ" کی طرف لوٹ جاتی، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ "الشَّهْرَ" کا لفظ استعمال کر کے اسم ظاہر کا استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الإظهار في مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ رمضان المبارک کی خوب عظمت واضح کی جائے اور لوگوں کے سامنے اس مقدس مہینہ کی عظمت کو خوب اجاگر کیا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" بھی پایا جاتا ہے، یہاں "الشَّهْرَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (بشمول دن ورات مکمل مہینہ) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ روزہ صرف دن کا ہوتا ہے رات کا نہیں، اس لئے یہاں "اَلشَّهْرَ" سے اس کا مجازی معنی مراد لیا جائیگا اور وہ معنی مجازی (مہینہ کے دن کے ایام ہیں)۔ ان دونوں کے درمیان علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، کیونکہ مکمل مہینہ کل اور دن اس کا جزء ہے، گویا آیت میں کل بول کر جزء مراد لیا گیا ہے، چونکہ آیت کے اس لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں کلیت، جزئیت کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (١٨٥)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "طباق سلب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پر "يُرِيدُ" اور "لَا يُرِيدُ" دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ ان میں ایک کا معنی (ارادہ کرنے) اور دوسرے

---

❶ طباق سلب یہ ہے کہ کلام میں متکلم ایسے دو لفظوں کو جمع کر دے کہ جن کے معانی بیک وقت شئی واحد میں جمع نہ ہوسکیں، یا بالفاظ دیگر دو ایسے متضاد معنی کو کلام میں جمع کر دیا جائے جن میں ایک ایجابی ہو اور دوسرا سلبی ہو۔

کا معنی (ارادہ نہ کرنے) کے ہے۔ایک ہی آیت میں ان دونوں متضاد معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے،جن میں سے ایک "یُرِیدُ" ایجابی اور دوسرا "لَا یُرِیدُ" سلبی ہے،اس لئے آیت میں "طباق سلب" پایا جاتا ہے۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ(۱۸۵)﴾

ترجمہ: لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے،اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے،اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اور تمہارے لئے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا،تاکہ (تم روزوں کی) گنتی پوری کرلو،اور اللہ نے تمہیں جو راہ دکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو،اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔

اس آیت کریمہ میں "لف و نشر" کا اصول پایا جاتا ہے۔❶

اس آیتِ کریمہ میں "فَلْيَصُمْهُ" بول کر روزہ کا حکم دیا گیا،پھر "فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَر"

---

❶ یہ محسنات معنویہ کی ایک صورت ہے،اس کا مطلب یہ کہ پہلے کئی چیزوں کو مفصلاً یا مجملاً بیان کیا جائے پھر ان کے مناسبات کو بیان کیا جائے،مگر یہ تعین نہ کی جائے کہ کونسی چیز کس کے مناسب ہے،بلکہ اسے سامع کے فہم پر ہی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اس کی تعیین کرلے،واضح رہے کہ یہاں تفصیل سے مراد علیحدہ علیحدہ الفاظ سے چیزوں کو بیان کرنا ہے۔پھر "لف نشر" مفصل کی دو قسمیں ہیں:

نمبر۱: لف نشر مرتب۔ نمبر۲: لف نشر غیر مرتب۔

آیت میں چونکہ "لف نشر غیر مرتب" واقع ہوئی ہے،اسی لئے اس کی تعریف پڑھ لی جائے۔"لف ونشر غیر مرتب" کا مطلب یہ ہے کہ جس ترتیب سے متعدد اشیاء بیان ہوئیں،مناسب کے ذکر میں اس ترتیب کا خیال نہ رکھا جائے،بلکہ قطع نظر ترتیب کے اُن اشیاء کے مناسبات کو ذکر کر دیا جائے۔

سے عذر کی وجہ سے رہ جانے والے روزوں کو پورا کرنے کا حکم ہوا، پھر اس کے بعد "یُرِیدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" سے رخصت اور آسانی دینے کا بیان ہوا، گویا آیت کریمہ میں تفصیلاً (الگ الگ الفاظ) سے ان تین چیزوں کو بیان کیا گیا:

نمبر۱: روزہ کا حکم۔

نمبر۲: روزوں کی قضا۔

نمبر۳: روزوں میں بیماری کی وجہ سے رخصت۔

ان تینوں امور کو مفصلاً بیان کرنے کے بعد آگے آیت میں ان کی مناسبات ترتیب کے خلاف بیان کئے گئے ہیں۔ "وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ" سے قضا روزوں کی علت و مناسب کو بیان کیا کہ اگر روزہ بیماری وغیرہ کی وجہ سے رہ جائے تو دوسرے دنوں میں انہیں رکھ لو تاکہ تعداد پوری ہو جائے۔ پھر اس کے بعد "وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ" سے حکم روزہ کے مناسب کو بیان کیا کہ تم پر روزہ اس لئے فرض ہوا تاکہ تم اللہ کی کبریائی بیان کرو۔ اس کے بعد "وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ" سے "يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُم" میں بیان ہونے والی رخصت کے مناسب کو بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے عذر کی وجہ سے تمہیں اس لئے رخصت دی تاکہ تم شکر ادا کر سکو۔ اس آیت میں چونکہ پہلے متعدد اشیاء کو مفصلاً بیان کیا گیا پھر بلا ترتیب اور بغیر تعیین کے ان کے مناسبات کو بیان کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "لف نشر غیر مرتب" موجود ہے۔

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (۱۸۶)﴾

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجیے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں، لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہ راست پر آجائیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، اس آیت کریمہ میں "عَنْ" کے بعد "قُرْبِیْ و بُعْدِی" کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ اصل میں "وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَن قُرْبِيْ و بُعْدِي" تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! اگر آپ سے میرے بندے میرے قریب یا دور ہونے کے بارے میں سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت قریب ہوں۔ اس آیت میں چونکہ "قُرْبِيْ و بُعْدِي" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں اور اس پر "إِنِّي قَرِيبٌ" کے الفاظ قرینہ بھی ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ (۱۸۷)﴾

ترجمہ: تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو، وہ تمہارے لئے لباس ہیں، اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "الرَّفَث" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد ہمبستری و جماع ہے۔ لفظِ "رَفَث" کے لئے اصل یہ ہے کہ وہ (باء) حرف جارہ کے وساطت سے متعدی ہو، مگر آیت میں (باء) کی جگہ "إِلَى" لاکر "الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ" بول کر "الرَّفَث" کو متعدی بنایا گیا ہے، ایسا ایک فائدہ کی خاطر کیا گیا ہے، وہ فائدہ یہ ہے کہ "الرَّفَث" جماع کے ساتھ ساتھ (پہنچنے) کے معنی کو بھی متضمن ہو جائے۔ جس کا طلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رات کے وقت رمضان کے مہینہ میں بیوی کے قریب پہنچنا اور پھر جماع کرنا حلال کر دیا ہے، آیت میں "الرَّفَث" کو لفظِ "إِلَى" سے متعدی بنانے سے جو تضمین حاصل ہوئی ہے، اس سے کلام میں حسن آ گیا، اور رمضان کی راتوں میں مباشرت کی اجازت معلوم ہو گئی، ابتدائے اسلام میں اگر کوئی شخص روزہ افطار کرنے کے بعد ذرا سا بھی سو جاتا تو اُس کے لیے رات کے وقت کھانا، پینا اور جماع کرنا جائز نہیں تھا، اس آیت میں اس کی اجازت آ گئی، اور تضمین سے معلوم ہو گیا کہ صرف بوس و کنار ہی نہیں بلکہ جماع بھی جائز ہے۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾

اس آیت کریمہ میں بلاغت کے تین نکات موجود ہیں:

نمبر۱: لفظِ "أُحِلَّ لَكُمْ" میں معنوی طور پر "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیتِ کریمہ میں "أُحِلَّ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اس بات پر دلیل ہے کہ شاید اس سے پہلے "حُرِّمَ" کا لفظ محذوف ہے۔ اس کی اصل عبارت "أُحِلَّ لَكُمْ مَا حُرِّمَ عَلَيْكُمْ" یا "أُحِلَّ لَكُمْ مَا حُرِّمَ عَلَى مِنْ قَبْلِكُمْ" ہے، اس عبارت میں "أُحِلَّ" اور "حُرِّمَ" موجود ہے۔ ان میں "أُحِلَّ" کا معنی (حلال کرنا) اور "حُرِّمَ" کا معنی (حرام کرنا) ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت میں چونکہ ضمنی طور پر ان دونوں مقابل معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "طباق" موجود ہے۔

نمبر۲: آیتِ کریمہ میں "الرَّفَث" بطور کنایہ واقع ہوا ہے۔ ❷ آیت میں "الرفث" سے مراد جماع کرنا ہے، لیکن اللہ رب العزت نے صراحتاً جماع پر دلالت کرنے والا لفظ استعمال نہیں کیا، ایسے مواقع پر شارع عموماً کنایہ لفظ استعمال کرتے ہیں جیسے یہاں کیا، اسی طرح دیگر جگہوں میں بھی کنایہ کا استعمال ہوا ہے، جیسے "أو جاء أحد منكم من الغائط" اسی طرح زوجین کے ملاپ اور تعلق کو "هن لباس لكم وأنتم لباس لهن" سے تعبیر کیا ہے، اسی طرح "فلما تغشّٰها حملت حملا خفيفا فمرت به" میں۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں بھی لفظ بول کر اس کا لازم مراد لیا گیا ہے اور اس کا لازم معنی (جماع کرنے) کے ہے۔ آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں "كناية" پایا جاتا ہے۔

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

❷ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا معنی لازم مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا اصلی معنی (یعنی معنی ملزوم) مراد لینا بھی درست ہو۔

نمبر۳: اس آیت کریمہ میں "استعارۃ تصریحیۃ" بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں (زوجین) کو ایک دوسرے سے ملنے اور بغل گیر ہونے میں (لباس) سے تشبیہ دی گئی ہے جو پہنے والے کے بدن پر مشتمل ہو۔ اس میں زوجین "مشبہ" اور (لباس) "مشبہ بہ" ہے۔ اور ان کے درمیان وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو لباس برہنہ ہونے سے بچاتا ہے، بالکل اسی طرح (زوجین) ایک دوسرے کو فجور وفحاشی کی دلدل سے محفوظ کرتے ہیں۔ اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں زوجین کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مگر چونکہ آیت میں "هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارۃ تصریحیۃ" موجود ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں زوجین کو لباس سے جو تشبیہ دی گئی وہ اس طور پر کہ زوجین میں سے ہر ایک جب دوسرے سے ملاپ کرتا ہے تو دونوں ایک لحاف کے تحت ہوتے ہیں، وہ گویا دونوں کے لیے لباس ہوتا ہے۔ امام ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هن فراش لكم وأنتم لحاف لهن" "عورتیں بمنزلہ بستر کے ہوتی ہیں اور مرد بمنزلہ لحاف کے۔ امام ابوزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إن كل واحد منهما ليستر صحابه عند الجماع عن أبصار الناس" "زوجین میں سے ہر ایک بوقتِ مباشرت لوگوں کی نگاہوں سے بمنزلہ لباس کے مستور ہوتا ہے۔ یا لباس اس لیے کہا گیا کہ "إنما سمى الزوجان لباسا ليستر كل واحد منهما صاحبه عما لا يحل" "زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کو نکاح کی وجہ سے ان افعال سے روک لیتا ہے جو شریعت میں حلال نہیں ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے "إذا تزوج العبد فقد كمل نصف الدين فليتق الله فى النصف الباقى" "انسان جب نکاح کر لیتا ہے تو اُس کا آدھا دین مکمل ہو جاتا ہے، باقی آدھے کے بارے میں وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ ❷

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ شعب الإيمان: ج٧ ص ٣٤٠، رقم الحديث: ٥١٠٠/ التفسير الكبير: ج٥ ص ٢٧٠

جس طرح لباس انسان کو گرمی سردی اور بہت سے مفاسد اور نقصان دہ چیزوں سے بچاتا ہے، اس طرح نکاح سے بھی انسان بہت سے امراض ومفاسد اور منہیات سے بچ جاتا ہے، جس طرح لباس سے انسان حسین نظر آتا ہے، اسی طرح مسلم معاشرے میں نکاح کی وجہ سے انسان محبوب ومعزز نظر آتا ہے۔ جس طرح بغیر لباس کے انسان نامکمل ہوتا ہے، اسی طرح بغیر نکاح کے بھی۔ جس طرح لباس کا انسان انتخاب کرتا ہے، اسی طرح زوجہ کا بھی۔ جس طرح ہر ایک کا لباس اپنے اپنے ناپ اور مزاج کے موافق ہوتا ہے، اسی طرح زوجہ کے انتخاب میں بھی ہی ہر کا زاویہ نگاہ الگ الگ ہوتا ہے۔ جس طرح لباس جسم کے بہت قریب ہوتا ہے، اسی طرح زوجین بھی۔ جس طرح لباس سے جسم کی خوبی یا خامی مخفی نہیں ہوتی، اسی طرح زوجین میں سے بھی ہر ایک سے دوسرے کے محاسن وعیوب پوشیدہ نہیں ہوتے، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کے لباس سے تعبیر کیا ہے۔

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (۱۸۷)﴾

ترجمہ: اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں دو "استعارة تصريحية" واقع ہوئے ہیں:

نمبر۱: "الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ" میں۔

نمبر۲: "الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ" میں۔ پہلے استعارہ کی تفصیل یہ ہے کہ آیت میں فجر کے وقت افق پر پھیلنے والی روشنی کو سفید دھاگہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں فجر کے وقت کی روشنی "مشبہ" اور سفید دھاگہ "مشبہ بہ" ہے، ان دونوں میں وجہ شبہ (واضح ہونا) ہے۔ یعنی جس طرح سفید دھاگہ واضح اور روشن ہوتا ہے، بالکل اسی طرح فجر کے وقت کی روشنی بھی واضح اور روشن ہو جاتی ہے، چونکہ آیت میں "اَلْخَيْطُ الْأَبْيَضُ" بول کر مشبہ بہ کی

صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔
اسی طرح دوسرے استعارہ کی وضاحت یہ ہے کہ آیت میں (رات کے وقت پھیلی ہوئی اندھیری) کو کالے دھاگہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں رات کی اندھیری "مشبہ" اور کالا دھاگہ "مشبہ به" ہے، اور ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح کالا دھاگہ غیر واضح ہوتا ہے اس میں روشنی نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح رات کی اندھیری غیر واضح ہوتی ہے، اس میں کچھ نظر نہیں آتا، اس وجہ شبہ کی وجہ سے ان کے درمیان استعارہ واقع ہوا ہے، چونکہ آیت میں "اَلْخَيْطِ الْأَسْوَدِ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔ دھاگے کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی جس طرح دھاگہ باریک اور خفیف ہوتا ہے اس طرح ابتداء میں افق پر پھیلنے والی روشنی بھی خفیف سی ہوتی ہے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (۱۸۹)﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ انہیں بتادیجئے کہ یہ لوگوں (کے مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "اسلوبِ حکیم" پایا جاتا ہے۔ ❶ حضرات صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے بارے میں دریافت کیا کہ چاند کا معاملہ کیا ہے؟ کہ ابتداء میں تو باریک رہتا ہے پھر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ کامل ہوجاتا ہے، پھر گھٹتا

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف لانے کی ایک صورت ہے۔ اسلوب حکیم یہ ہے کہ مخاطب کے سامنے خبر کو اس طرح پیش کیا جائے جس کی وہ توقع نہ رکھتا ہو، یا سائل کو ایسا جواب دیا جائے جو اس کی خواہش کے خلاف ہو، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اس بات پر تنبیہ ہوجائے کہ مخاطب کے سامنے جو خبر پیش کی گئی ہے، یا سائل کو جو جواب دیا گیا ہے وہی مقصد بننے کے زیادہ لائق ہے۔ آیت میں یہ دوسری صورت پائی جاتی ہے۔ اور دوسری صورت کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ سائل کے سوال کو کسی ایسے دوسرے سوال کے درجہ میں اتارلیا جائے جو سائل کی حالت کے مناسب ہو، پھر اس کو اسی دوسرے سوال کا جواب دیا جائے۔

رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پہلی حالت پر آجاتا ہے۔ حقیقتاً صحابہ کرام کا سوال چاند کے اختلافی حالت اوراس کے گھٹنے، بڑھنے اور روشنی کی کمی زیادتی کی حقیقت کے متعلق تھا، لیکن اللہ سبحانہ نے صحابہ کرام کے سوال کا جواب نہیں دیا، بلکہ ان کے سوال کو دوسرے سوال کے درجہ میں اتار کراس دوسرے سوال کا جواب دیا کہ "قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ" (آپ فرمادیجئے کہ وہ لوگوں کے اوقات کے جاننے کا ذریعہ ہے۔) مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ چاند کے چھوٹے بڑے ہونے اور ماہیت کے بارے میں سوال کرنا کارگرنہیں اوراس سے تمہاری کوئی غرض وابستہ بھی نہیں اور نہ ہی ہر ایک کے بس کی بات ہے کہ وہ ان اسباب وعلل کو اچھی طرح سمجھ سکے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم یہ سوال کرتے کہ چاند کے چھوٹے بڑے ہونے کی حکمت کیا ہے؟ یہی دوسرا سوال ہے، جس کے درجہ میں سائلین کو اتارا گیا اوراسی کا جواب دیا گیا کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس سے حج اور دیگر معاملات کی تاریخوں کا تمہیں علم ہوجائے۔ اس آیتِ کریمہ میں چونکہ سوال کے برخلاف مخاطبین کی ذہنی وسعت، ماحول اوران کے فوائد کو سامنے رکھ کر جواب دیا گیا ہے، اس لئے اس میں "اسلوب حکیم" پایا جاتا ہے۔

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ(۱۹۰)﴾

ترجمہ: اوران لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جوتم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، یقین جانو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية وأصلية" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں "فِي سَبِيلِ اللَّهِ" (دین اسلام) کو راستہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں "فِي سَبِيلِ اللَّه" دینِ اسلام "مشبه" اور راستہ "مشبه به" ہے۔ اوران میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح صحیح راستہ پر چلنے سے انسان منزل مقصود تک رسائی حاصل کرلیتا ہے، اسی طرح دین اسلام کے احکامات

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

کی پابندی کرنے سے بھی انسان جنت کی صورت میں منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں ”فِی سَبِیلِ اللّٰہ“ دینِ اسلام کو (راستہ) سے تشبیہ دی گئی ہے،لیکن چونکہ ”فِی سَبِیلِ اللّٰہِ“ بول کر آیت میں لفظاً مشبہ بہ کی صراحت کردی گئی ہے،اس لئے اس میں ”استعارة تصريحية“ موجود ہے۔اسی طرح آیت میں ”استعارة أصلية“ بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں چونکہ لفظِ ”سَبِیلِ“ غیر مشتق ہے اوراس میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں ”استعارة أصلية“ ہے۔

﴿وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (١٩١)﴾

ترجمہ:اورتم ان سے مسجد حرام کے پاس اس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں، ہاں اگر وہ تم سے اس میں لڑائی شروع کردیں تو تم ان کو قتل کرسکتے ہو،ایسے کافروں کی سزا یہی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ”مجاز مرسل“ پایا جاتا ہے، یہاں ”اَلْمَسْجِدِ الْحَرَام“ کا لفظ استعمال ہوا ہے،جس کا حقیقی معنی مسجدِ حرام کی حدود ہے،مگر آیت میں یہ حقیقی معنی مراد نہیں، کیونکہ حرمتِ قتل کا تعلق صرف اسی مسجد سے نہیں بلکہ مکمل حدودحرم سے ہے،اس لئے آیت میں مسجد حرام سے اس کا معنی مجازی مراد لیا جائے گا۔اور وہ مجازی معنی بشمول مسجد حرام کے مکمل حدودِ حرم ہے،ان دونوں معنوں (حقیقی ومجازی) کے درمیان علاقہ جزئیت،کلیت کا ہے، کیونکہ مسجدِ حرام (جزء) اور حدودِ حرم (کل) ہے، گویا آیت میں جزء بول کر اس کا کل مراد لیا گیا ہے،آیت میں چونکہ ایسا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے حقیقی اور مجازی معنی میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے،اس لئے اس میں ”مجاز مرسل“ موجود ہے۔آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حدودِ حرم میں کہیں بھی کافروں سے قتال نہ کرو، یہاں تک کہ وہ خود آپ سے لڑنے

❶ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جو اسم جامد یعنی غیر مشتقات میں واقع ہو۔

لگیں، پھر آپ کو بھی حدودِ حرم میں لڑنے کی اجازت ہے، یہاں مسجدِ حرام کا ذکر اس کی عظمت کی وجہ سے ہے، گویا حدودِ حرم میں قتل ایسا ہے جیسا کہ مسجدِ حرام میں، اس لیے کہ حدودِ حرم کی اپنی کوئی فضیلت نہیں، جو فضیلت ونسبت ہے وہ مسجدِ حرام کے طفیل ہے۔

﴿الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ﴾

ترجمہ: حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے، اور حرمتوں پر بھی بدلے کے احکام جاری ہوتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہ آیت اصل میں "هَتْكُ حُرْمَةِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ لَهُ وَقَعَ مِنْكُمْ مُقَابِلٌ بِهَتْكِ حُرْمَةِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الْوَاقِعِ مِنْهُمْ" تھی، اس مقدر عبارت کا مقصد یہ ہے کہ رسول اور ایمان والوں آپ کی طرف سے اشہر حرم کی ہتک دری (حرمت کے مہینوں میں قتال کرنا) کا واقع ہونا کافروں کے طرف سے اشہر حرم کے ہتک دری کے مقابلہ میں ہے، ذی القعدہ حرمت کا مہینہ ہے، ہجرت کے چھٹے سال ذولقعدہ میں کفار نے مسلمانوں پر پتھر و تیر برسائے تھے، اس لئے مسلمانوں کو بھی اللہ سبحانہ نے حرمت کے مہینوں میں قتال کی اجازت اس آیت میں دی، چونکہ آیت سے "هَتْكُ حُرْمَةِ وَقَعَ مِنْكُم" وغیرہ کے الفاظ حذف کردیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ(۱۹۴)﴾

ترجمہ: چنانچہ اگر کوئی شخص تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے جو اس کا خوف دل میں رکھتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ”مشاکلة“ پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں کافروں کے طرف سے ہونے والی ظلم وزیادتی کے قرب وجوار میں مسلمانوں کی طرف سے ان کا بدلہ چکانے کا ذکر کیا گیا، ظلم وزیادتی کا بدلہ دینے کے لئے اُصولاً ”فَاجْزُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى“ ہونا چاہیے، مگر چونکہ بدلہ کا ذکر کافروں کے ظلم وستم یعنی ”فَمَنِ اعْتَدَى“ کے قرب وجوار میں آیا ہے، اس لئے بدلہ دیئے جانے کو آیت میں اپنے اصل لفظ سے ذکر کرنے کے بجائے کافروں کے عمل کے لئے موضوع لفظ سے ہی ”فَاعْتَدُوْا بول کر بیان کیا گیا، اور یہ لفظ کافروں کے ظلم وستم کے قرب وجوار میں آنے کی وجہ سے بیان کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ”مشاکلة“ موجود ہے۔

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ(۱۹۵)﴾

ترجمہ: اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی اختیار کرو، بیشک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ ”مجاز مرسل“ پایا جاتا ہے، یہاں ”أَيْدِى“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (ہاتھوں) کے ہے، لیکن آیت میں یہ معنی مراد نہیں کہ صرف ہاتھوں کو ہلاکت میں ڈالنے سے روکا گیا ہے، بلکہ پورے نفس وجان کو ہلاکت میں ڈالنے سے روکا گیا ہے۔ اس لئے آیت میں اس لفظ کا مجازی معنی یعنی ”نفس“ مراد ہوگا حقیقی معنی ”ہاتھ“ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آیت میں ہاتھ سے پورا نفس مراد لیا گیا ہے، ان دونوں معنوں میں علاقہ جزئیت، کلیت کا ہے، کیونکہ آیت میں ہاتھ (جزء) اور نفس (کل) ہے، گویا آیت میں جزء کے اطلاق سے کل مراد لیا گیا ہے۔ آیت میں چونکہ ایسا لفظ استعمال ہوا جس کے حقیقی اور مجازی معنی میں جزئیت، کلیت کا علاقہ ہے، اس لئے اس میں ”مجاز مرسل“ موجود ہے۔ اس

❶ مشاکلہ یہ ہے کہ کسی معنی یا شئی کو اس کے قرب وجوار میں آنے کی وجہ سے اپنے اصل لفظ کی جگہ اسی غیر کے لفظ سے بیان کیا جائے۔

میں "مجاز مرسل" کے لئے انسانی اعضاء میں سے صرف "أَیْدِی" (ہاتھوں) کا استعمال ہوا ہے باقی اعضاء کا ذکر نہیں ہوا، اس لیے کہ انسانی اعضاء میں سے ہاتھوں کے ذریعہ ہی سے زیادہ تر کام کاج سرانجام پاتے ہیں، اور نفع ونقصان کے اکثر کام ہاتھوں سے ہوتے ہیں، اسی لئے دیگر اعضاء کو چھوڑ کر بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا۔

﴿وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ (۱۹۶)﴾

ترجمہ: اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تَحْلِقُوا" فعل اور "رُءُوسَكُمْ" مفعول دونوں میں "مجاز عقلی" موجود ہے۔ ❶ یہاں "لَا تَحْلِقُوا" بول کر حلق نہ کرنے کی نسبت تمام مخاطبین کی طرف کردی گئی ہے کہ تم سب اپنے اپنے سروں کو حلق نہ کرو، لیکن تمام مخاطب اس کے اصل فاعل نہیں، بلکہ اس کے اصل فاعل "بَعْضُكُمْ" ہے، یعنی تم میں سے بعض بعض کے سروں کو حلق نہ کریں، مگر چونکہ حلق کی نسبت فاعل حقیقی "بَعْضُكُمْ" کی جگہ فاعلِ غیر حقیقی "لَا تَحْلِقُوا" کے ضمیر کی طرف کردی گئی ہے، اس لئے آیت کے عامل میں "مجازی عقلی" موجود ہے۔ اسی طرح مفعول میں بھی حلق کی نسبت "رُءُوسَ" (سروں) کی طرف کردی گئی ہے، حالانکہ سروں کو کوئی نہیں منڈواتا بلکہ سر کے بالوں کو منڈوایا جاتا ہے، لیکن چونکہ بالوں اور سروں میں حالیت، محلیت کی نسبت موجود ہے، اس ظاہری نسبت کی وجہ سے آیت میں فعل حلق کی نسبت مفعول حقیقی (بالوں) کی طرف کرنے کے بجائے مفعولِ غیر حقیقی (سروں) کی طرف کی گئی ہے، اس لئے آیت کے مفعول میں بھی "مجاز عقلی" موجود ہے، واضح رہے کہ یہ حکم مردوں کے ساتھ خاص ہے، عورتوں سے اس کا تعلق نہیں، کیونکہ حج میں عورتوں

❶ مجاز عقلی یہ ہے کہ کسی کلام میں فعل یا معنیٔ فعل یعنی فعلِ مجہول اور اسمائے مشتقات وغیرہ کو کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعلِ حقیقی کے بجائے فاعلِ غیر حقیقی کی طرف منسوب کردیا جائے، یعنی نسبت ظاہری اعتبار سے ہو حقیقی اعتبار سے نہ ہو۔

کے لئے حلق ہی نہیں بلکہ ان کے لئے قصر کروانا سنت ہے۔

﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "کنایة" واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں "یَبْلُغَ الْهَدْیُ" کے الفاظ استعمال ہوئے، آیت میں یہ لفظ بول کر اس کا لازم مراد لیا گیا ہے، ویسے اس کا اصلی معنی (معنی ملزوم) ہدی کے جانور کو اپنے محل تک پہنچانا ہے، مگر آیت میں اس کا لازم مراد لیا گیا اور اس کا لازم معنی (ذبح کرنے) کے ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم ہدی کے جانور کو اپنے محل میں ذبح نہ کرو تب تک اپنے سروں کو نہ منڈواؤں۔ آیت میں چونکہ لفظِ "یَبْلُغَ الْهَدْیُ" سے اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اگرچہ اس کا اصلی معنی مراد لینا بھی درست ہے۔ اس لئے اس میں "کنایة" موجود ہے۔ اب محصور کے ہدی کے جانور کا محل کیا ہے؟ اس بارے میں آئمہ کے اقوال مختلف فیہ ہیں، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جانور کا محل حدودِ حرم ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں اس کا محل مکان احصار ہے۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهٖٓ أَذًى مِنْ رَأْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (۱۹۶)

ترجمہ: ہاں اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزوں یا صدقے یا قربانی کا فدیہ دے۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، اس آیت میں "مَرِيضًا" کے بعد اسی طرح "رَأْسِهٖ" کے بعد "فَحَلَقَ" کا لفظ اور "فَفِدْيَةٌ" سے پہلے "فَعَلَيْه" محذوف ہے۔ یہ اصل میں "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا فَحَلَقَ أَوْ بِهٖٓ أَذًى مِنْ رَأْسِهٖ فَحَلَقَ فَعَلَيْه فَفِدْيَةٌ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے اگر احصار کی صورت میں تم میں سے کوئی مریض ہوا اور اس

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر لازم معنی مراد لینے کے ساتھ ساتھ لفظ کا معنی اصلی (یعنی ملزومی معنی) مراد لینا بھی درست ہو۔

نے حلق کروایا ہو، یا کسی کے سر میں تکلیف ہو یعنی جوئیں وغیرہ ہوں، اور تکلیف کی وجہ سے سر کا حلق کروائے ہو تو اس پر فدیہ لازم ہوگا۔ اس آیت کریمہ سے چونکہ "فَحَلَقَ" اور "فَعَلَيهِ" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے اور اس پر "فَفِدْيَةٌ" کی پہلی (فاء) قرینہ ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (١٩٦)﴾

ترجمہ: جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اٹھائے وہ جو قربانی میسر ہو (اللہ کے حضور پیش کرے) ہاں اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات (روزے) اس وقت جب تم (گھروں کو) لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ کل دس روزے ہوں گے، یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں بلاغت کے دو نکات پائے جاتے ہیں:

نمبرا: التفات من الغيبة إلى الخطاب" اس آیت کریمہ میں "فَمَنْ تَمَتَّعَ" اور "فَمَنْ لَمْ يَجِدْ" وغیرہ میں "تَمَتَّعَ، لَمْ يَجِدْ" غائب کے صیغے ہیں، جن کی ضمیریں "مَنْ" کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ غائب کے ان صیغوں کے مطابق آیت میں آگے "إِذَا رَجَعْتُمْ" کی جگہ "إِذَا رَجَعَ" بولنا چاہیے تھا، تاکہ "رَجَعَ" بھی گذشتہ الفاظ کی طرح ماضی کا صیغہ بن کر کلام میں مقتضائے حال کے مطابق ہو جاتا، لیکن آیت کریمہ میں "رَجَعَ" چھوڑ کر "رَجَعْتُمْ" خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من الغيبة إلى

الخطاب" پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے ہوا تا کہ سامعین ایک انداز سے دوسرے انداز کی طرف منتقل ہونے کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں۔

نمبر۲: اس آیتِ کریمہ میں اہلِ بلاغت کے ایک اور انداز کو اپنایا گیا ہے۔❶ یہاں (مَنْ) موصولہ لفظی طور پر مفرد ہے، مگر معنوی طور پر (مَنْ) کا اطلاق لاعلی التعین کثیر افراد پر ہوتا ہے اس لئے یہ معناً جمع ہے، اس کے معنی کی رعایت کرتے ہوئے آیت کریمہ میں "رَجَعَ" مفرد کی جگہ "رَجَعْتُمْ" جمع لایا گیا ہے۔

﴿ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "الإجمال بعد التفصیل" یا "الإبهام بعد الإیضاح" کا اصول پایا جاتا ہے۔❷ یہاں حج تمتع کا بیان ہوا ہے، حج تمتع کرنے والے پر ہدی کی قربانی لازم ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس پر قادر بھی ہو، اگر وہ ہدی کے قربانی پر قادر نہ ہو تو شریعت نے اُسے یہ رخصت دی کہ وہ روزہ رکھ لے۔ اس روزے کو آیت میں پہلے تفصیلاً بیان کیا گیا ہے، یعنی "فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ" سے تین روزوں کے ادائیگی کا حکم حج میں ہو اور "سَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ" سے سات روزوں کا حکم حج سے واپسی کے بعد کا ہے۔ اسی طرح تفصیلاً روزوں کے ذکر کرنے کے بعد آیت کے اگلے حصہ میں اس تفصیل کو اجمالاً "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" سے بیان کیا گیا ہے کہ پہلے جن روزوں کا تفصیلی طور پر ذکر ہوا تھا اب اجمالاً مبہم انداز سے اُن کا

❶ اہل بلاغت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ایسے لفظ کے لئے جو لفظاً مفرد اور معناً جمع ہو تو کبھی مفرد کا صیغہ لاتے ہیں لفظ کی رعایت کرتے ہوئے اور کبھی معنی کی رعایت کرتے ہوئے جمع کا صیغہ لاتے ہیں۔

❷ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے کسی چیز کو تفصیلاً وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے، پھر اس کے بعد اسی شئی کو اجمالی طور پر مبہم انداز سے ذکر کیا جائے اور یہ کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

ذکر کیا گیا کہ کہ روزے کل دس رکھنے ہیں، اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں "الاجمال بعد التفصیل" موجود ہے، آیت میں تفصیل کے بعد اجمال اس لئے واقع ہوا تا کہ مندرجہ ذیل اغراض حاصل ہوں:

نمبر۱: تفصیل کے بعد اجمال لا کر ان روزوں کی پابندی پر اور ان کی ادائیگی میں سستی برتنے سے روکنے پر مبالغہ اور تاکید کی گئی ہے۔

نمبر۲: تفصیل کے بعد اجمال اس لئے واقع ہوا تا کہ یہ بات تاکید سے بتائی جائے کہ ان کی تعداد میں کمی نہیں ہوسکتی، مکمل دس روزے ہی رکھنے ہیں۔

نمبر۳: تفصیل کے بعد اجمال لانے میں اس بات کی بھی وضاحت ہے کہ دس روزوں کے ثواب میں کمی نہیں کی جائیگی۔ یہ دس روزے مکمل ہیں، اور ان کا ثواب بھی مکمل ملے گا، یہ خیال نہ آئے کہ سات روزے تو لوٹ کر رکھے ہیں کہیں ثواب میں محل کی وجہ سے کمی تو نہیں آئے گی۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَاب﴾

اس آیتِ کریمہ میں "الاظهار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے، یہاں آیت میں ایک مرتبہ "وَاتَّقُوااللَّهَ" میں لفظِ "اللَّهَ" کا ذکر ہو چکا ہے، جو بعد میں آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں اللہ سبحانہ کے لئے "وَاعْلَمُوا أَنَّه" بول کر ضمیر کا ذکر ہونا چاہیے تھا، تا کہ یہ ضمیر گذشتہ لفظ کی طرف لوٹ جاتی، لیکن آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ ضمیر کی جگہ "وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ" میں لفظِ "اللَّهَ" کی صورت میں اسمِ ظاہر کا استعمال ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں "الاظهار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے، یہ اس لئے ہوا تا کہ سامع کے دل ودماغ میں بار بار اللہ کا نام سن کر خوفِ خدا، خشیتِ الٰہی اور عذابِ شدید سے بچنے کی فکرمندی پیدا ہو جائے۔

﴿الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (۱۹۷)﴾

ترجمہ: حج کے چند متعین مہینے ہیں۔ چنانچہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ کر) اپنے اوپر حج لازم کرلے تو حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے، نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا۔

اس آیتِ میں بھی گذشتہ آیت کی طرح "الاظهار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے، اس میں ایک مرتبہ "اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ" میں لفظِ حج کا ذکر ہوا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں حج کے لئے ضمیر لانا چاہئے، تاکہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہوجائے، مگر اس آیت میں لفظِ حج کے ذکر ہونے کے بعد بھی آگے "وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" بول کر دوبارہ لفظِ "اَلْحَجِّ" کی صورت میں اسمِ ظاہر کو لایا گیا، "وَلَا جِدَالَ فِيهِ" بول کر ضمیر کا استعمال نہیں کیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الإظهار فی مقام الإضمار" موجود ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ مندرجہ ذیل نکات حاصل ہوں:

نمبر ۱: حج بہت زیادہ اہمیت اور کمال شان کا حامل ہے، اسی لئے آیت میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کا استعمال ہوا۔

نمبر ۲: آیت میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اس لئے استعمال ہوا تاکہ جماع، فسق اور لڑائی جھگڑے کے ممانعت کی علت بیان ہو (یعنی بیت اللہ کی عظمت ومقام) بیت اللہ شریف کی زیارت اور اس کے قربت کے واجبات میں سے یہ ہے کہ جماع، فسق وفجور اور لڑائی وغیرہ کو ترک کیا جائے اور خالصتاً عبادات وارکین حج کی طرف توجہ مرکوز ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ (لا) نافیہ کو تین بار ذکر کیا گیا، ایسا اس لئے کیا تاکہ ان افعال سے نہی کرنے میں مبالغہ ہو اور اس بات پر دلالت ہو کہ یہ کام واقعتاً ایسے ہیں جو کرنے کے بالکل نہیں، بھلا جو کام فی نفسہ قبیح ہو تو دورانِ حج اُس کا قبح اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، اس لیے اس سے پرہیز لازم ہے۔ جیسا کہ ریشم کی لباس پہنا جائز نہیں، اگر یہی ریشم

کے کپڑے پہن کر کوئی نماز پڑھے تو اس فعل کی شناعت وقباحت اور بڑھ جاتی ہے، بالکل اسی طرح حج میں گناہوں کا معاملہ ہے۔

اس آیت میں ''فلا رفث ولا فسوق ولا جدال'' میں نہی کو نفی کے صیغہ کے ساتھ لایا گیا ہے، یہ اس لیے کہ ''إیراد الإنشاء بصیغة الخبر أبلغ من إیراده بصیغة الإنشاء'' یعنی انشاء بصیغہ خبر زیادہ بلیغ ہوتا ہے انشاء بصورتِ انشاء کے مقابلہ میں۔ ❶

آیت میں نفی نہی کے معنی میں ہے اور آیت کا حاصل ہے: ''فلا ترفثوا ولا تفسقوا ولا تجادلوا فی الحج'' نفی کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ مبالغہ کا معنی پیدا ہو، گویا یہ احکامات اتنے مؤکد ہیں کہ مخاطب نے سنتے ہیں ان پر پورا پورا عمل کر دیا۔ اسی طرح قرآن میں ''لا تعبدون إلا الله'' میں نفی بمعنی نہی کے ہے، مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر یہاں نہی کے بجائے نفی کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا کہ یہ حکم اتنا اہم ہے کہ مخاطب نے سنتے ہی اس پر عمل کر دیا۔ آیت کا لفظی معنی ہے تم عبادت نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى وَاتَّقُونِ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ (۱۹۷)﴾

ترجمہ: اور تم جو کوئی نیک کام کرو گے اللہ اسے جان لے گا، اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقوی ہے، اور اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو۔

اس آیت کریمہ میں ''الاکتفاء'' پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں دو مقابل یعنی خیر اور شر میں

❶ أضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن: ج۵ ص ۲۰

❷ اکتفاء یہ ہے کہ دو مقابل امور میں سے ایک کو ذکر کر دیا جائے اور دوسرے مقابل کو جملہ میں مذکور مقابل سے معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا جائے۔

سے ایک (خَیر) کوذکر کیا گیا اور دوسرے مقابل (شر) کو حذف کردیا گیا، کیونکہ خیر کے ذکر سے شر کا پتہ چل جاتا ہے، گویا آیت اصل میں "وَمَا تَفعَلُوا مِنْ خَیرٍ وَشَرٍّ یَعْلَمُهُ اللّٰهُ" تھی، اس میں (خیر و شر) دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان میں سے خیر کا ذکر کردیا گیا ہے اور خیر کے ذکر سے شر کے معلوم ہونے کی وجہ سے شر کو حذف کردیا گیا، اس وجہ سے آیت میں "الاکتفاء" موجود ہے۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ(۲۰۰)﴾

ترجمہ: پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کرچکو تو اللہ کا اس طرح ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو، اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دعا میں بس) یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اس آیتِ کریمہ میں "تشبیہ مرسل" اور "تشبیہ مجمل" پائے جاتے ہیں۔ ❶ اس میں چونکہ "كَذِكْرِكُمْ" (کاف) حرف تشبیہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ مرسل" موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں "تشبیہ مجمل" بھی پائی جاتی ہے۔ ❷ یہاں اللہ تعالیٰ کے حمد وثناء میں مبالغہ کرنے کو مخاطب کا اپنے آباواجداء کی تعریف وثناء کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اے لوگو! جس طرح تم حج سے فارغ ہونے کے بعد ناز وفخر سے اپنے آباء واجداد کا تذکرہ کرتے ہو بالکل اسی طرح اللہ سبحانہ کی حمد وثناء بھی کرتے رہو۔ ان دونوں میں وجہ شبہ کیفیت ہے کہ جس کیفیت سے تم اپنے بزرگوں کو یاد کرتے ہو اسی کیفیت سے اللہ سبحانہ کو یاد رکھو، آیت میں چونکہ وجہ شبہ مذکور نہیں اس لئے اس میں "تشبیہ مجمل" پائی جاتی ہے۔

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو۔

اسی طرح آیت میں "تشبیہ تمثیل" ہے۔❸ یہاں وجہ شبہ یعنی تعریف کی کیفیت، طریقہ، اسلوب وغیرہ متعدد امور سے کشید ہے، اس لئے آیت میں " تشبیہ تمثیل" پائی جاتی ہے۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "التفات من الخطاب إلى الغيبة" پایا جاتا ہے، یہاں آیت کی ابتداء میں "قَضَيْتُم، مَنَاسِكَكُمْ" وغیرہ خطاب کے الفاظ ہیں، اس لحاظ سے آیت میں آگے "فَمِنَ النَّاسِ" کی جگہ "فَمِنكُمْ" کہنا چاہئے تھا، تاکہ یہ بھی "قَضَيْتُم، مَنَاسِكَكُمْ" کی طرح خطاب کے قبیل سے ہو جاتا، مگر آیت میں خطاب کا لفظ استعمال نہیں ہوا، بلکہ "فَمِنَ النَّاس" بول کر "النَّاس" کا ذکر کر دیا گیا جو کہ اسم ظاہر ہے، اور اسم ظاہر بھی غائب کے قبیل سے ہے، اس آیت میں چونکہ "فَمِنكُمْ" بول کر (کم) ضمیرِ خطاب لانے کی جگہ "فَمِنَ النَّاس" بول کر لفظِ غائب کا ذکر کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "التفات من الخطاب إلى الغيبة" پایا جاتا ہے۔ اس آیت میں التفات لا کر ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ جب لوگ حج سے فارغ ہوئے تو وہ ایسے روش پر چلے جس پر عقل مند لوگوں کو نہیں چلنا چاہئے اور وہ روِش دعا میں دنیا پر اکتفاء کرنا ہے۔ جب انہوں نے اپنی دعاؤں میں دنیا کا ہی سوال کیا اللہ سبحانہ نے انہیں مخاطب بنانے کی جگہ عتاب کے طور پر غائب کے حلقہ میں ڈال دیا اور یہ بتا دیا کہ اس لائق نہیں کہ اللہ رب العزت تم سے خطاب کرے، کیونکہ تم نے رب سے صرف دنیا کا سوال کیا ہے آخرت کا نہیں۔

﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵)﴾

ترجمہ: اور جب اٹھ کر جاتا ہے تو زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ

❸ تشبیہ تمثیل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ متعدد امور سے کشید ہو۔

اس میں فساد مچائے، اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ میں "عطف الخاص علی العام" پایا جاتا ہے، اس آیت کریمہ میں پہلے "لِيُفْسِدَ" فعل کا ذکر ہوا ہے۔ یہ لفظ عام ہے، کیونکہ ظلم، قتل، گالی، کفر، ڈاکہ زنی، زنا، غرض یہ ہے کہ تمام گندگی اور گناہوں کو فساد اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ آیت میں اس عام کو ذکر کرنے بعد (واو) حرفِ عطف کے ذریعہ "يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ" بول کر اس عام فساد میں داخل کھیتی باڑی اور نسل کی ہلاکت کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "عطف الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے۔ یہاں عام (فساد) پر خاص (ہلاکتِ حرث ونسل) کا عطف اس لئے ہوا تاکہ کھیتی باڑی اور آفزائش نسل کے مہتم بالشان ہونے کو بیان کیا جائے کہ یہ دونوں بہت اہم ترین امور ہیں، کیونکہ تعمیر دنیا اور زندگی گذارنے کے لئے انسان ان دونوں کی طرف زیادہ محتاج ہوتا ہے، اس لئے ان کی ہلاکت سے بطورِ فساد کے بڑا گناہ ہوگا۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ(۲۰۶)﴾

ترجمہ: اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کرو، تو نخوت اس کو گناہ پر اور آمادہ کر دیتی ہے۔ چناچہ ایسے شخص کو تو جہنم ہی راس آئے گی اور یقین کرو وہ بہت برا بچھونا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية واستعارة تبعية" ہیں۔ (۱) یہاں جاہل شخص کی حمیت وغیرت اور اس غیرت کے سبب گناہ پر ابھر جانے کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا اپنے مقروض پر کوئی حق ہو اور وہ شخص مقروض کا پیچھا کرنا لازم کر لے اور اس کو پکڑھ لے۔ اس استعارہ میں جاہل شخص کی حالتِ حمیت وغیرہ "مشبہ" اور قرض خواہ شخص کی حالت "مشبہ بہ" ہے، اور ان میں وجہ شبہ (لزوم) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرض خواہ مقروض کا پیچھا کرنا لازم کر لیتا ہے، اسی طرح جاہل شخص کی

(۱) استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

غیرت وحمیت بھی گناہوں کو اپنے اوپر لازم کرلیتی ہے، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں تشبیہ واقع ہوئی ہے، مگر چونکہ آیت میں مشبہ بہ کو "أَخَذَتْه" بول کر لفظوں میں صراحت کیساتھ ذکر کردیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "استعارۃ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت میں "استعارۃ تبعیۃ" بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "أَخَذَتْه" فعلِ مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارۃ تبعیۃ" پایا جاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ" کے جملہ میں "التکمیل" پائی جاتی ہے، جس کا دوسرا اصطلاحی نام "الاعتراض" ہے۔ ❷ یہاں "أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ" میں "اَلْعِزَّةُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب (غرور وحمیت) کے ہے۔ چونکہ انسانوں کو فخر ومباہات عمدہ چیزوں پر بھی ہوتا ہے اور قبیح چیزوں پر بھی، جب آیت میں "أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ" کہا تو اس میں وہم ہوا کہ شاید یہاں حمیت وغرور عمدہ چیزوں پر ہو، لیکن آیت میں "بِالْإِثْمِ" کا لفظ بڑا کر خلافِ مقصود کے وہم کو دور کردیا کہ یہاں نخوت وتکبر گناہوں پر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں "التکمیل" موجود ہے۔

﴿ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (٢٠٦) ﴾

اس آیتِ کریمہ میں اخنس بن شریف الثقفی کا تہکم اور استہزاء کیا گیا ہے، وہ اس طور پر کہ یہاں "اَلْمِهَادُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو درحقیقت راحت اور آرام کے لئے استعمال ہونے والے بستر کے لئے وضع کیا گیا ہے، جبکہ جہنم میں راحت وسکون نام کی تو کوئی چیز نہیں، لیکن آیت میں اس کے مصداق کا استہزاء کے لئے جہنم کو راحت کا ٹھکانہ قرار دیا گیا، گویا جہنم اس شخص کے لیے بچھونا بنادی جائیگی اور جہنمی کا اکرام اس سے کیا جائیگا۔

---

❶ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے کلام میں جس میں خلاف مقصود کا وہم ہورہا ہو کوئی لفظ ذکر کردیا جائے جس سے خلافِ مقصود وہم دور ہوجائے۔

﴿فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۰۹)﴾

ترجمہ: اگر تم ان کے بعد بھی (راہ راست سے) پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ اقتدار میں بھی کامل ہے، حکمت میں بھی کامل۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية و تبعية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں دلائل کی معرفت یا دلائل کی معرفت کے تمکن کو دلائل کی مجیئت (دلائل کا آنے) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں دلائل کی معرفت یا دلائل کی معرفت کے تمکن "مشبه" ہے اور دلائل کی کی مجیئت "مشبه به" ہے، آیت میں چونکہ "جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت میں "استعارة تبعية" بھی پایا جاتا ہے۔❷ یہاں "جَاءَتْ" فعل ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" پایا جاتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم روشن احکامات کو جان لینے کے بعد یا روشن احکامات کے علم پر تمکن وقدرت پالینے کے بعد انکار کروگے تو اللہ سبحانہ غالب اور حکمت والے ہیں۔ یعنی اللہ رب العزت تمہیں عذاب دینے پر غالب اور قادر ہے، لیکن وہ حکیم ہے، اس لیے فوراً عذاب نہیں دیتا، بندے کو مہلت دیتا ہے۔

﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۲۱۰)﴾

ترجمہ: یہ (کفار ایمان لانے کے لیے) اس کے سوا کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ خود بادل کے سائبانوں میں ان کے سامنے آموجود ہو، اور فرشتے بھی (اس کے ساتھ ہوں) اور سارا معاملہ ابھی چکا دیا جائے؟ حالانکہ آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف تو لوٹ کر رہیں گے۔

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں (ھل) استفہامیہ واقع ہوا ہے۔ حروف استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حروفِ استفہام اس معنی کے لئے استعمال نہیں ہوتے بلکہ دوسرے معانی حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ''انکار'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ مخاطب کے سامنے کلام کے عنوان کی نفی وتردید کی جائے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی (ھل) اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ ''انکار'' کے لئے ہے۔ انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ روشن احکام کے پہنچنے کے بعد لڑکھڑا جانے والوں کو اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ ان پر اللہ کا عذاب بادل کے سائبانوں میں آنازل ہو اور فرشتے بھی اتر آئیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''التفات من الخطاب إلى الغيبة'' پایا جاتا ہے، اس آیتِ کریمہ سے پہلے ''فَإِنْ زَلَلْتُم مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ'' میں ''زَلَلْتُمْ'' اور ''جَاءَتْكُم'' میں (تم) اور (کم) خطاب کے الفاظ ہیں، ان کی رعایت کرتے ہوئے متعلقہ آیتِ کریمہ میں بھی ''يَنظُرُونَ'' غائب کی جگہ ''تَنظُرُونَ'' خطاب کا لفظ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ ان کا مصداق ایک ہے، لیکن آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ''تَنظُرُونَ'' یعنی خطاب کے لفظ کی جگہ ''يَنظُرُونَ'' بول کر غائب کا لفظ ذکر کر دیا گیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''التفات الخطاب إلى الغيبة'' پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے واقع ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ اسلام میں داخل ہونے سے روکنے والے اور شیطان کی پیروی کرنے والے، اسی طرح حق روشن ہونے کے بعد حق کے انکار کرنے والے اپنے برے اعمال وکردار کی وجہ سے بالکل خطاب کے اہل نہیں۔ نیز اس لیے بھی جنایت واعمال بد کی حکایت اہل انصاف اور مصلحین کے سامنے نقل کی جائے۔

﴿فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلَائِكَةُ وَ قُضِيَ الْأَمْرُ وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۲۱۰)﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "ظُلَل" نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی شئی کی ہیبت اور سختی بتائی جاتی ہے۔ یہاں بھی "ظُلَل" نکرہ لاکر بادل سے حاصل ہونے والے سائبانوں کی ہیبت اور سختی بیان کی گئی ہے، گویا وہ سائبان کثافت اور گنجان ہونے کی وجہ سے اتنی ہیبت ناک ہیں کہ دیکھنے والے پر وہ تمام چیزوں کو پوشیدہ اور مخفی کردیتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں "قُضِیَ الْأَمْرُ" میں "قُضِیَ" فعل ماضی لایا گیا ہے، حالانکہ یہاں مقصود زمانہ مستقبل میں اللہ کے حکم کی تکمیل کے بارے میں بتانا ہے، اس لحاظ سے یہاں "قُضِیَ" کی جگہ "یُقْضِی" فعل مضارع لانا چاہیئے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس میں فعلِ ماضی لایا گیا، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ اللہ سبحانہ کی طرف سے ہونے والے فیصلے اتنا یقینی ہے جیسے وہ زمانہ ماضی میں ہوچکا ہے، قرآن کریم کا اسلوب ہے کہ وہ بسا اوقات مستقبل کی یقینی چیز فعل ماضی سے نقل کرتا ہے، گویا کہ اس کا وقوع ہوچکا ہے، جیسے "وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ" وغیرہ میں۔

﴿سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ (۲۱۱)﴾

ترجمہ: بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی ساری کھلی نشانیاں دی تھیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسرائیل سے ان کو دیئے جانے والے دلائل، معجزات اور حجتوں کے بارے میں سوال کرنے کو کہا۔ ویسے تو سوال کسی شے کے بارے میں معرفت اور معلومات کے لئے ہوتا ہے، لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کو دیئے جانے والے تمام دلائل، معجزات اور حجتوں سے بذریعہ وحی واقف تھے، اس لئے یہاں سوال طلب علم کے لئے نہیں ہوگا، جب سوال طلبِ علم کے لئے نہیں تو اس سوال کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، البتہ سوال اس لئے کرنے کو کہا گیا تاکہ بنی اسرائیل پر اللہ کے ہونے والے احسانات اور انعامات کو بتلایا جائے، اور اُن کی احسان فراموشی اور واضح دلائل کے جھٹلانے کو بیان کیا جائے۔

﴿كَمْ آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَة﴾

اس آیتِ کریمہ میں (کـــم) استفہامیہ واقع ہوا ہے، حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معرفت حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی موقع محل کی مناسبت سے اپنے اصل معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتے ہیں، ان معانی میں سے ایک معنی "تقریر" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ کسی عنوان کو ثابت اور پختہ قرار دیا جائے، تاکہ مخاطب اس بات کا اقرار کرے۔ یہاں بھی (کم) استفہامیہ اپنے اصل معنی کے لئے استعمال نہیں ہوا، بلکہ "تقریر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، تقریر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بہت سے واضح دلائل، معجزات اور حجتیں دی ہیں، اس حرفِ استفہام میں "تـــقـــریـــع" کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ ❶ اس میں بھی بنی اسرائیل کو (کـــم) استفہامیہ کے ذریعہ جھڑکا گیا ہے کہ اتنے واضح دلائل کے بعد بھی تم انکار کرتے ہو، یہ تمہاری لئے بڑی شرمناک بات ہے۔

﴿وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تْهُ فَإِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۲۱۱)﴾

ترجمہ: اور جس شخص کے پاس اللہ کی نعمت آ چکی ہو، پھر وہ اس کو بدل ڈالے، تو (اسے یاد رکھنا چاہئے کہ) اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "الإظهـار فى مقام الإضمار" پایا جاتا ہے، اس آیتِ کریمہ میں ایک مرتبہ "وَمَـنْ يُبَـدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰه" میں لفظِ "الـلّٰه" کا ذکر ہو چکا ہے جو ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں اللہ سبحانہ کے لئے ضمیر لانا چاہئے، مگر اس آیت میں آگے ضمیر لانے کے بجائے "فَإِنَّ اللّٰه" میں دوبارہ لفظِ "اللّٰه" لا کر اسم ظاہر ذکر کر دیا گیا ہے، حالانکہ گذشتہ لفظِ "الـلّٰه" کی بنیاد پر اس میں "فَـإِنَّه" بول کر ضمیر لانا چاہئے تھی، لیکن اس میں

❶ تقریع کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے مخاطب کو ڈانٹا، اور جھڑکا جائے۔

ضمیر نہیں بلکہ لفظِ "اللہ" اسم ظاہر موجود ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الاظهار فی مقام الاضمار" موجود ہے، یہ اس لئے تا کہ بار بار اللہ رب العزت کا نام ذکر کر کے لوگوں کے دلوں میں حق تعالی کی ہیبت، جلال اور عذابِ الٰہی کی شدت بٹھائی جائے۔

﴿زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے لیے دنیوی زندگی بڑی دلکش بنا دی گئی ہے، اور وہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ جنہوں نے تقوی اختیار کیا ہے وہ قیامت کے دن ان سے کہیں بلند ہوں گے، اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

یہ آیتِ کریمہ "عطف الجملة الفعلية على الجملة الفعلية" کے قبیل سے ہے۔❶

اس آیت میں "زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا" جملہ فعلیہ ہے، اس جملہ فعلیہ پر "يَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا" کا عطف کیا گیا جو خود بھی جملہ فعلیہ ہے، کیونکہ اس کی ابتداء میں "زُيِّن" فعل ہے۔ یہاں فعل کا عطف فعل پر نہیں ہوسکتا، کیونکہ ایسا ہوتا تو مفرد کا عطف مفرد پر ہوتا جو کہ بہتر نہیں، اور یہ اس وجہ سے بہتر نہیں کہ "زُيِّنَ" اور "يَسْخَرُونَ" کے زمانوں میں اتحاد نہیں ہے، ایک فعلِ ماضی اور دوسرا فعلِ مضارع ہے، اس لیے یہاں جملہ کا عطف پورے جملہ پر کیا گیا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "زُيِّنَ" کو فعلِ ماضی اور "يَسْخَرُونَ" کو فعلِ مضارع کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں "زُيِّنَ" کو فعل ماضی سے اس لئے لایا گیا ہے تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ کافروں کے لئے دنیاوی زندگی کا مزین ہونا واقع ہو چکا ہے، اور وہ دنیاوی زندگی کی رنگینیوں میں مکمل اتر چکے ہیں۔ اور دنیاوی زندگی کو ہی انہوں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ جملہ فعلیہ کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا جائے۔

ہے، "یَسْخَرُوْنَ" کو فعلِ مضارع لاکر اس بات پر دلالت کی گئی ہے کہ کفار کا مسلمانوں کا مذاق اڑانے میں حدوث اور تجدد پایا جاتا ہے، یعنی وہ وقتاً فوقتاً نئے نئے طریقوں سے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۳)﴾

یہ جملہ اسمیہ کی صورت میں واقع ہوا ہے، جملہ فعلیہ کی صورت میں نہیں، ایسا اس لئے کیا تا کہ آیت کے مضمون اور عنوان میں دوام کا فائدہ حاصل ہو۔ دوام کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تقویٰ دار ہمیشہ کے لئے کفار سے بلند اور اعلیٰ مرتبہ پر ہونگے۔

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ (۲۱۳)﴾

ترجمہ: (شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے، پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے، اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے۔

اس آیت کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "وَاحِدَةً" کے بعد "فَاخْتَلَفُوْا" کا جملہ محذوف ہے اور اس کی تعین آیت میں موجود "فِيمَا اخْتَلَفُوْا فِيهِ" کے جملہ سے ہوجاتی ہے۔ یہ اصل میں "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً اخْتَلَفُوا فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ" تھا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک تمام لوگ ایک ہی دین پر متفق تھے اور سارے حق پر قائم تھے، پھر انھوں نے حسد وکینہ کی وجہ سے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجنا شروع کر دیا، اس آیت سے چونکہ "فَاخْتَلَفُوْا" کا جملہ حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا

❶ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی کلمہ، جملہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں اس محذوف کی تعیین کرنے والا قرینہ بھی موجود ہو۔

اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲۱۳)﴾

ترجمہ: اوران کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں ان کا اختلاف تھا۔ اور (افسوس کی بات یہ ہے کہ) کسی اور نے نہیں بلکہ خود انہوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، روشن دلائل آ جانے کے بعد بھی، صرف باہمی ضد کی وجہ سے اسی (کتاب) میں اختلاف نکال لیا، پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست تک پہنچا دیتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اگر "لِیَحْکُمَ" فعل کی ضمیر لفظِ "الکتاب" کی طرف راجع ہو تو آیت میں "مجاز عقلی" واقع ہوگا۔ ❶ یہاں اگر "لِیَحْکُمَ" فعل کا فاعل "اَلْکِتَابَ" ہو تو یہ "مجاز عقلی" ہوگا، کیونکہ (فیصلہ کرنا) کتاب کا کام نہیں بلکہ یہ کام اللہ کا ہے، اس لحاظ سے اس فعل کا حقیقی فاعل اللہ سبحانہ تعالیٰ ہے کتاب نہیں، لیکن چونکہ اللہ سبحانہ کا فیصلہ لوگوں کو کتاب کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے ظاہری طور پر اس فعل کی نسبت "اَلْکِتَاب" کی طرف کر دی گئی، چونکہ آیت میں فعل کی نسبت فاعلِ حقیقی کی جگہ فاعل غیر حقیقی کی طرف کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں "مجاز عقلی" موجود ہے، البتہ اگر یہاں "لِیَحْکُمَ" فعل کی ضمیر اللہ سبحانہ کی طرف راجع ہو تو پھر آیت میں کوئی "مجاز عقلی" نہیں ہوگا۔

اس جملہ میں "الإظهار فی مقام الإضمار" بھی پایا جاتا ہے، اس آیت کی ابتداء میں "کَانَ النَّاس" آیا ہے، اس میں ایک مرتبہ "النَّاس" بول کر لوگوں کا ذکر کر دیا گیا، اس لحاظ

❶ مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل یا معنیٰ فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات کی نسبت فاعل حقیقی کے بجائے کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعل غیر حقیقی کی طرف کر دی جائے۔

سے آگے آیت میں لوگوں کے لئے ضمیر لانا چاہیئے تھا، مگر اس میں "لِيَحْكُمَ" بول کر ضمیر کی جگہ دوبارہ "لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاس" میں "النّاس" کا ذکر کر دیا جو اسمِ ظاہر ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الاظهار في مقام الاضمار" پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ اس بات کی تعیین زیادہ سے زیادہ ہو کہ اختلاف انسانوں میں ہی ہوا ہے کسی اور میں نہیں۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (۲۱۴)﴾

ترجمہ: (مسلمانو) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں (یونہی) داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تمہیں اس جیسے حالات پیش نہیں آئے جیسے ان لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں، اور انہیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ایمان والے ساتھ بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

اس آیت کریمہ میں (أَمْ) منقطعہ اس لفظ "بل" کے معنی میں ہے جو ایک خبر سے دوسری خبر کی طرف منتقل ہونے کا فائدہ دیتا ہے، اسی طرح یہ "أَمْ" اس ہمزہ استفہامیہ کے معنی میں جو انکار اور توبیخ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں "أَمْ" لاکر کلام کو ایک خبر سے دوسرے خبر کی طرف منتقل کیا گیا ہے، وہ اس طرح کہ بعض لوگ بغیر تکلیف وصبر کے جنت جانے کا خیال رکھتے ہیں، اللہ سبحانہ نے "أَمْ حَسِبْتُمْ" بول کر کلام کو اس سے منتقل کر کے فرمایا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے، کیونکہ جنت میں داخل ہونے کے لئے صبر کرنا اور تکلیف برداشت کرنا ضروری ہے۔ لفظ "أَمْ" اس ہمزہ استفہامیہ کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے جو انکار اور توبیخ کے لئے ہے۔ انکار کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کے سامنے کسی بات یا عنوان کی نفی کی جائے اور

توبیخ کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کو ڈانٹا جائے، یہاں "أَمْ" کو ہمزہ استفہام انکار کے معنی میں لیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے لئے یہ گمان کرنا کہ تم بغیر تکلیف ومحنت کے جنت چلے جاؤ ہرگز درست نہیں، تمہیں ایسا خیال نہیں کرنا چاہیے، توبیخ کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ تم ایسا خیال رکھتے کیسے ہو؟ جس کی کوئی حقیقت نہیں، تمہیں اس خیال پر نادم ہونا چاہیے، یہ توبیخ اس لئے کی گئی تا کہ لوگ آزمائش وتکالیف میں صبر سے کام لیں اور استقامت کے دامن کو تھامے رکھیں۔

﴿ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں لفظِ "مَثَلُ" کے بعد "مِحْنَةِ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ" محذوف ہے، یہ اصل میں "وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ مِحْنَةِ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک تم پر گذشتہ مومنین کے مانند تکالیف نہیں آئیں، آیت سے چونکہ "مِحْنَةِ الْمُؤْمِنِينَ" کے الفاظ حذف کردیئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں "ایجاز بالحذف" موجود ہے۔

اس میں ایک نکتہ اور موجود ہے وہ یہ ہے کہ "خَلَوْا" کا معنی (پہلے گزرنے) کے ہے۔ اس میں "قبلیت" کا معنی خود لفظِ "خَلَوْا" ادا کررہا ہے، اس لحاظ سے بظاہر آیت میں "قَبْلِكُمْ" بولنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے باوجود اس لفظ کا اضافہ اس لئے ہوا تا کہ "خَلَوْا" کے مفہوم میں مزید تاکید ہوجائے۔

﴿ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴾

یہ جملہ اللہ سبحانہ نے گذشتہ انبیاء علیہم السلام اور انکے مسلمان متبعین کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا، گذشتہ لوگوں پر اتنی آزمائش اور سختیاں آئیں کہ وہ رب سے پوچھنے لگے کہ اے اللہ! کب آپ کی مدد اور نصرت آئے گی۔ اس سوال کے جواب میں اللہ سبحانہ نے مندرجہ

بالا جملہ فرمایا،لیکن اس جملہ میں اللہ سبحانہ نے کئی تاکیدات ذکر کی ہیں،وہ تاکیدات یہ ہیں:

نمبر۱:"أَلَا" حرفِ تنبیہ سے جملہ کی ابتداء ہوئی جو جملہ کو مؤکد کرتا ہے۔

نمبر۲:حرفِ "إِنَّ" کا ذکر ہوا،یہ بھی تاکید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

نمبر۳:یہ جملہ جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

نمبر۴:لفظِ " نَصرَ" کی اضافت اللہ سبحانہ کی طرف کی گئی،اس سے بھی تاکید واضح ہوتی ہے،ان چاروں تاکیدات سے یہ جملہ مؤکد کیا گیا ہے،ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ گذشتہ مؤمنین کی حالت کو تاکید کیساتھ بیان کر کے موجودہ مومنین کی ہمت افزائی کی جائے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۱۶)﴾

ترجمہ:تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے،اور وہ تم پر گراں ہے،اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو،اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو،حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو،اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے،اور تم نہیں جانتے۔

اس آیتِ کریمہ میں "مقابلة" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "عَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" میں دو موافق معنوں کو بیان کیا گیا ہے:

نمبر۱: "تَكْرَهُوا شَيْئًا" سے کسی چیز کی ناپسندیدگی کا بیان ہو۔

نمبر۲:"وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" سے کسی چیز کا خیر ہونا بیان ہو۔

یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق اس لئے ہیں کیونکہ ان میں باہمی کوئی ضد نہیں۔

❶ مقابلہ یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو یا زیادہ موافق معنوں کو جمع کر دیا جائے،پھر ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کی ضد بالترتیب لائی جائے،واضح رہے کہ یہاں موافق معنوں سے مراد وہ ہے جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہو۔

آیت میں ان دونوں موافق امور کو بیان کرنے کے بعد ان میں سے ہر ایک کی ضد لائی گئی۔ ”أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا“ میں بیان ہونے والی ناپسندیدہ شئی کی ضد (پسندیدہ شئی) کا ذکر ”أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا“ سے بیان کیا گیا اور خیر کی ضد (شر) کا ذکر ”وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ“ سے کیا گیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”مقابلة“ موجود ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (٢١٦)﴾

اس آیت کریمہ میں ”طباق سلب“ پایا جاتا ہے۔❶ یہاں لفظِ ”يَعْلَمُ“ اور ”لَا تَعْلَمُونَ“ دونوں کے معنوں میں ”طباق سلب“ موجود ہے، چونکہ ان میں سے ”يَعْلَمُ“ (جاننے) کے معنی میں ہے اور ”لَا تَعْلَمُونَ“ (نہ جاننے) کے معنی میں ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا اور ان میں سے ایک ایجابی، دوسرا سلبی ہے، اس لئے آیت میں ”طباق سلب“ موجود ہے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (٢١٩)﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لیے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو، اللہ اسی طرح اپنے احکام تمہارے لیے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر سے کام لو۔

اس آیتِ کریمہ میں ”ایجاز بالحذف“ پایا جاتا ہے، یہاں لفظِ ”اَلْخَمْر“ سے پہلے

❶ طباق سلب یہ ہے کہ ایک ہی کلام میں دو متضاد معنی کو جمع کر دیا جائے، ان میں سے ایک ایجابی اور دوسرا سلبی یعنی منفی ہو۔

"شُرب" کا لفظ، اور لفظِ "الْمَيْسِرِ" سے پہلے "تَعَاطِي" کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں "يَسْأَلُونَكَ عَنْ شُرْبِ الْخَمْرِ وَتَعَاطِي الْمَيْسِر" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! لوگ آپ سے شراب، جوا کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ چیزیں حلال ہیں یا حرام؟ آیت میں چونکہ ان دونوں لفظوں کو حذف کردیا گیا ہے، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا" میں "التفصيل بعد الإجمال" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" میں اجمالاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ جوا اور شراب میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ منافع ہیں، مگر یہ تفصیل نہیں بتائی گئی کہ ان دونوں میں گناہ بڑا ہے یا لوگوں کا نفع؟ بلکہ اس بیان کو آیت میں مبہم رکھا گیا، پھر اس کے فوراً بعد "وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا" سے اس مبہم ومجمل کی تفصیل بیان کردی کہ ان دونوں کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا اور زیادہ نقصان دہ ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفصيل بعد الاجمال" پایا جاتا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ سامع کے ذہن میں جوا اور شراب کی قباحت اچھی طرح راسخ ہوجائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ" میں "تشبيه مرسل" اور "تشبيه مجمل" پائے جاتے ہیں۔ ❷ اس آیت میں میں چونکہ "كَذَٰلِكَ" میں (کاف) حرفِ تشبیہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبيه مرسل" موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں "تشبيه مجمل" بھی موجود ہے۔ ❸ اس آیتِ کریمہ میں دیگر احکامات کے بیان کرنے کو شراب جوا اور انفاق وغیرہ کے حکم بیان کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے، یعنی جس طرح اللہ نے شراب

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کسی چیز کو مبہم اور مجمل انداز سے بیان کیا جائے، پھر اس مبہم ومجمل کی تفصیل اور وضاحت بیان کی جائے۔

❷ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❸ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ تشبیہ محذوف ہو مذکور نہ ہو۔

اور جوے کا زیادہ نقصان دہ ہونا اور اہل وعیال کی ضرورت سے زائد مال کو خرچ کرنے کا حکم بیان فرمایا، اسی طرح اللہ تعالی دوسرے احکامات کو بھی بیان فرماتے ہیں، ان میں دیگر احکامات کو بیان کرنا "مشبہ" اور شراب وغیرہ کے احکام کو بیان کرنا "مشبہ به" ہے، مگر ان دونوں میں وجہ شبہ کیا ہے؟ وہ مذکور نہیں اسی لئے آیت میں "تشبیه مجمل" موجود ہے۔

﴿فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَیَسْأَلُونَکَ عَنِ الْیَتَامَی قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَیْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُکُمْ وَاللَّهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَکُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِیزٌ حَکِیمٌ(۲۲۰)﴾

ترجمہ: دنیا کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی، اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا، اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔

اس آیتِ کریمہ میں "التفات من الغیبة إلی الخطاب" پایا جاتا ہے، اس آیتِ کریمہ میں "یَسْأَلُونَکَ" غائب کا صیغہ ہے، اس لحاظ سے آیت میں "وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ" میں "تُخَالِطُوا" خطاب کی جگہ "یُخَالِطُوا" غائب کا صیغہ ہونا چاہیے، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ غائب کی جگہ "تُخَالِطُوا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ خطاب کا صیغہ ہے، اس سے واضح ہوا کہ کہ آیت میں "التفات من الغیبة إلی الخطاب" پایا جاتا ہے، یہ التفات اس لئے ہے کہ خطاب کے ذریعہ مخاطب کو آنے والے حکم کے سننے کے لئے اُسے قبول کرنے اور اس حکم میں دلچسپی لینے کے لئے بھرپور انداز سے تیار کیا جائے۔

﴿وَاللَّهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ نے اپنے علم کو "یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ" بول کر مفسدین اور

فساد پسند شخص کیساتھ معلق کردیا، ایسا اس لئے کیا تا کہ کلام کو سننے والے لوگ فوراً فساد کو چھوڑ بیٹھیں اور ان کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو جائے کہ اللہ فسادی کو مصلح (اصلاح کرنے والے سے جدا اور علیحدہ رکھتا ہے، اس لئے فسادی کو فساد نہیں کرنا چاہیے وگرنہ فسادی کو اللہ رسوا کردیگا، اس آیتِ کریمہ میں حرفِ جارہ میں سے حرف "مِنْ" آیا ہے، یہ حرفِ "مِنْ" "یَعْلَمُ" فعل سے متعلق ہوکر اس تمییز کے معنی کو متضمن ہوگا جو تمییز عموماً کلمہ "مِنْ" کے ساتھ متعدی ہونے کی صورت میں ہوتی ہے، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اپنے علم کے ذریعہ مفسدین کو مصلح سے جدا کرتا ہے۔ اس جملہ میں "اَلْمُفْسِدَ" اور "الْمُصْلِح" کی "تقسیم" واقع ہوئی ہے، یہ اس لئے ہوا کیونکہ اختلاط (یتیموں کے خرچ کو اپنے خرچ کے ساتھ ملاکر اکھٹا کرنا) دو طرح کا ہوتا ہے:

نمبر۱: اختلاط یتیم کے فائدہ اور بھلائی کے لئے ہو۔

نمبر۲: اختلاطِ یتیم کے نقصان اور فساد کے لئے ہو۔ ان دونوں اختلاط کی وجہ سے آیت میں "اَلْمُفْسِدَ" اور "الْمُصْلِح" کی تقسیم واقع ہوئی ہے۔ دوسری بات جب آیت میں "إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ" کہا گیا تو اس جملہ سے اس کا مقابل خود بخود معلوم ہوا کہ جب یتیموں کی اصلاح کی کوشش کرنا خیر ہے تو پھر ان کے ساتھ فساد کا معاملہ کرنا یقیناً شر ہوگا۔ اس لحاظ سے بھی آیت میں "اَلْمُفْسِدَ" اور "اَلْمُصْلِح" کی "تقسیم" واقع ہوئی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "اَلْمُفْسِدَ" اور "اَلْمُصْلِح" کے معنوں میں "طباق" موجود ہے۔ ❶ یہاں "اَلْمُفْسِدَ" کا معنی ہے (فساد کرنے والا) اور مصلح کا معنی ہے (اصلاح کرنے والا) یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" موجود ہے۔

---

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کیا جائے۔

﴿وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ (۲۲۱)﴾

ترجمہ: اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً ایک مؤمن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آرہی ہو، اور اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور یقیناً ایک مؤمن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے خواہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند آرہا ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ نے "وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ" کے ذریعہ سے "لَا تَنكِحُوا" فعل نہی کی علت بیان کی ہے اور مسلمان مردوں کو مسلمان عورتوں سے نکاح کی ترغیب دی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو اس لیے کہ مسلمان باندی مشرک عورت سے بہتر ہے، مشرک عورتوں میں عدمِ ایمان کی وجہ سے بھلائی نام کی کوئی چیز ہی نہیں، اسی لئے تمہیں مشرک عورتوں کو ترک کر کے مسلمان عورتوں سے نکاح کرنا چاہیے بلے وہ باندی کیوں نہ ہو۔

اس جملہ کی ابتداء میں "لام" لایا گیا ہے، یہ (لام) "لامِ قسمیہ" کی طرح ہے، جس طرح لامِ قسم سے کلام میں تاکید لاکر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر ابھارنے کے لئے مبالغہ کیا جاتا ہے، اسی طرح "وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ" میں موجود (لام) سے مشرک عورت کو چھوڑ کر مؤمن عورت سے نکاح کرنے پر مبالغہ کیا گیا ہے۔

﴿أُولَئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۲۲۱)﴾

ترجمہ: یہ سب دوزخ کی طرف بلاتے ہیں جبکہ اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی

طرف بلاتا ہے، اور اپنے احکام لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

یہ تمام مسلمانوں کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ دخول جنت سے پہلے مغفرت کا مرحلہ بروزِ قیامت پیش آئیگا، پھر اس کے بعد دخول جنت کا مرحلہ ہوگا، اس لحاظ سے مغفرت مقدم اور دخولِ جنت مؤخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "سَابِقُوا اِلَی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ" اور "وَسَارِعُوا اِلَى مَغْفِرَةٍ وَجَنَّةٍ" میں مغفرت مقدم اور جنت کا ذکر مؤخر ہے، مگر آیت میں جنت کا ذکر مقدم اور مغفرت کا مؤخر ہوا ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ اوّل وہلہ میں ہی "فن مقابلة" حاصل ہوجائے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہاں "إِلَى النَّار" میں جہنم کی آگ کا ذکر ہوا ہے، اس کے مقابلہ کے لئے جنت کا ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا، اسی لئے فوراً مغفرت سے پہلے ہی جنت کا ذکر کردیا گیا، جس سے "مقابلة" کی تکمیل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں لفظِ "اَلنَّار" اور "اَلْجَنَّة" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں "النَّار" بمعنی (آگ) کے ہے اور "اَلْجَنَّة" بمعنی (جنت) کے ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں معنوں کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ(۲۲۲)﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ وہ گندگی ہے لہٰذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ان سے قربت (یعنی جماع) نہ کرو، ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس اسی طریقے

(1) طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

سے جاؤ جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے، بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں اور ان سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "لا تَقْرَبُوهُنَّ" "قرب" مصدر سے فعل نہی جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے، اس کا حقیقی معنی (قریب جانا) ہے، مگر آیت میں قریب جانے سے اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے۔ اس کا لازم معنی (جماع کرنے) کے ہے، ظاہر ہے کہ بیوی کے قریب جانے سے جماع کا صدور عین ممکن ہے، اس لئے جماع قریب جانے کا لازم ہے، آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔ کنایہ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی بیویوں سے ان کے پاک ہونے تک (یعنی ماہواری میں) جماع نہ کرو، البتہ جیسے ہی وہ پاک ہوجائیں تو تم اس جگہ سے ملاپ کرو جہاں سے تمہیں اس فعل کی اجازت دی گئی ہے۔ یہاں جماع سے نہیں روکا گیا بلکہ قریب جانے سے منع کیا، جب قریب نہیں جائے گا تو مباشرت بھی نہیں ہوگی، جس طرح "لَا تَقْرَبُوا الزِّنىٰ" (الإسراء: ٣٢) جب قریب جانا منع ہے تو زنا بطریق اولیٰ منع ہوگا، اسی طرح "لا تقربوا مال اليتيم إلا بالتي هي أحسن" (الأنعام: ١٥٢) میں ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ" کے بعد "فَإِذَا تَطَهَّرْنَ" ذکر کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جماع کی ممانعت حصول پاکی تک ہے جب عورت پاکی حاصل کرلے تو شوہر اس کے ساتھ جماع کرسکتا ہے، پھر اس کے بعد جماع کی ممانعت نہیں رہتی۔ یہ مفہوم "حَتّٰى يَطْهُرْنَ" سے معلوم ہوتا ہے، مگر آیت میں اس کے باوجود دوبارہ "فَإِذَا تَطَهَّرْنَ" سے اس مفہوم کی تاکید کی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ پاکی کی اہمیت کو مبالغہ اور تاکید کے ساتھ بیان کیا جائے۔

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا معنی اصلی یعنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" بطور "اعتراض" واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں ترکیبی لحاظ سے "فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ" پورا جملہ (مُبَيَّن) ہے اور "نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ" اس کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے جملے میں مطلق جماع کی اجازت دی گئی ہے، اور محل ومقام کی تعیین نہیں کی گئی ہے، اب کس محل کا حکم اللہ رب العزت نے دیا ہے اس کی وضاحت نہیں ہے، اور آگے "نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ" سے کنایۃً اس محل کو بیان کیا کہ تمہاری بیویاں تمہارے لئے مثل کھیت کے ہیں، سو اپنی کھیت میں جہاں سے چاہو جاؤ، یعنی نسوانی جسم کا جو اگلا حصہ اس غرض کے لیے بنایا گیا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے راستہ کوئی بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، تو بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں اگلے حصہ میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے، مگر آنا ہر حال میں کھیت کے اندر ہو، اور وہ خاص آگے کا محل ہے، یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ میاں بیوی کا ملاپ صرف لذت حاصل کرنے کے لیے نہ ہو، بلکہ اس سے انسانی نسل کی بڑھوتری مقصود ہو، جس طرح کاشتکار اپنی کھیتی میں بیج ڈالتا ہے پیداوار کے مقصود کے لیے، اسی طرح نطفہ بمنزلہ بیج کے ہے، اس سے مقصود بھی اولادِ صالحہ ہو۔ یہ دونوں جملے (مُبَيَّن اور بیان) ہونے کی وجہ سے باہم ایک دوسرے سے معناً مربوط ہیں، ان کے درمیان چونکہ "إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" کا جملہ لایا گیا ہے، اس لئے ان آیات میں "اعتراض" پایا جاتا ہے، یعنی جملہ معترضہ۔ یہ اس لئے لایا گیا تاکہ مؤمنین کو احکام جماع کے عنوان میں جس محل کو اپنانے کا حکم ہے اس کی خوب ترغیب ہو اور جس سے روکا گیا ہے اس سے خوب اجتناب ہو۔

---

❶ اعتراض اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے اجزاء یا معناً دو مربوط جملوں کے درمیان کوئی دوسرا لفظ یا جملہ کسی مقصد کے تحت لایا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "اَلتَّوَّابِیْنَ" کومقدم کیا گیا اور "اَلْمُتَطَهِّرِین" کومؤخر۔اس سے ضمنی طور پر گناہ گاروں کا ذکر پہلے اور گناہ نہ کرنے والوں کا ذکر بعد میں معلوم ہوتا ہے، "التَّوَّابِین" التزامی طور پر گناہ کے وجود کی خبر دیتا ہے، ظاہر ہے کہ توبہ گناہوں کی معافی کے لئے ہی ہوتی ہے، اس لئے "اَلتَّوَّابِیْنَ" سے گناہ گاروں کا ضمناً پتہ چل جاتا ہے اور "الْمُتَطَهِّرِین" گناہ نہ کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے، واضح ہے کہ پاکی کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہ کیا جائے۔اس میں "اَلتَّوَّابِیْنَ" کومقدم کر کے گناہ گاروں کو "اَلْمُتَطَهِّرِیْنَ" (گناہ نہ کرنے والوں) پر اس لئے مقدم کیا کہ گناہ گار اللہ کی رحمت ومغفرت سے مایوس نہ ہوں، چونکہ بنوآدم معصوم نہیں ہیں، عموماً حیض ونفاس میں بے صبری کی وجہ سے انسان سے یہ گناہ سرزد ہوجاتا ہے، اس لیے فرمایا: تم توبہ کرو، اللہ رب العزت توابین سے محبت کرتا ہے، یہاں "التوابین" مبالغہ کا صیغہ ہے کہ جتنی مرتبہ توبہ ٹوٹ جائے پھر صدقِ دل سے توبہ کرو، اللہ رب العزت توبہ قبول کرنے والا ہے۔توابین کومقدم کر کے اشارہ کیا کہ "متطهرين" کہیں خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اللہ صرف ہم سے ہی محبت کرتا ہے۔

﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲۳)﴾

ترجمہ: تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھتیاں ہیں، لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو ہوجاؤ، اور اپنے لئے (اچھے عمل) آگے بھیجو، اللہ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ تم اس سے جا کر ملنے والے ہو، اور مؤمنوں کو خوشخبری سنادو۔

اس آیتِ کریمہ میں "تشبیہ بلیغ" پائی جاتی ہے۔❶ یہاں بیوی کو ایسی زمین سے تشبیہ دی گئی ہے جسمیں کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور نطفہ کو اس دانے سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے۔اسی طرح اولاد کو اس فصل سے تشبیہ دی گئی جو زمین سے اگتی ہے۔

❶ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ اور وجہ شبہ مذکور نہ ہو۔

اس آیت میں بیوی، نطفہ اوراولاد "مشبہ" زمین، دانہ اسی طرح زمین سے اگنے والے فصل "مشبہ بہ" ہیں۔ اس تشبیہ میں چونکہ نہ حرفِ تشبیہ مذکور ہے اور نہ ہی ان کے درمیان وجہ شبہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ بلیغ" پائی جاتی ہے۔

﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ﴾

اس آیتِ کریمہ میں بلاغت کے کئی نکات پائے جاتے ہیں:

نمبر۱: "کنایۃ" ❶ یہاں "فَأْتُوا حَرْثَكُمْ" کا جملہ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی ہے (اپنی کھیتی کے پاس آؤ) مگر آیت میں یہ جملہ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے اور اس کا لازم معنی (جماع کرنا) کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں جس کیفیت سے چاہو تم اپنی بیویوں سے جماع کرو مگر جماع کا محل صرف نسوانی جسم کا اگلا حصہ ہے۔ آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں "کنایۃ" پایا جاتا ہے۔

نمبر۲: اس آیتِ کریمہ میں دو جگہ لفظِ "حَرْثٌ" استعمال ہوا ہے، ایک مرتبہ "نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ" میں، دوسری مرتبہ "فَأْتُوا حَرْثَكُمْ" میں، لیکن اس میں پہلا لفظِ "حَرْثٌ" نکرہ لایا گیا ہے، کیونکہ یہ خبر ہے اور خبر میں اصل نکرہ ہونا ہے۔ دوسرے جملہ میں لفظِ "حَرْثَكُمْ" کی اضافت (كُمْ) ضمیر کی طرف کر کے اِسے معرفہ لایا گیا، ایسا اس لئے کیا گیا کیونکہ اضافت میں گذشتہ شے کا حوالہ ہوتا ہے اور جس کی طرف لفظ مضاف ہو اس سے لفظ میں تخصیص آجاتی ہے۔ اس میں "حَرْثَكُمْ" سے پہلے جو لفظِ "حَرْثٌ" گزرا اس پر "حَرْثَكُمْ" کا حوالہ پایا جاتا ہے، پھر "حَرْثٌ" کی اضافت (کم) کی طرف کرنے سے مخاطب اور "حَرْثٌ" کے درمیان تخصیص بھی آجاتی ہے۔ اس جملہ کے نظیر کلام عرب میں یوں ہے "زَيْدٌ مَمْلُوكٌ لَكَ فَأَحْسِنْ اِلٰى مَمْلُوكِكَ" اس میں پہلا مملوک نکرہ اور دوسرا مملوک اضافت کی وجہ سے

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا معنی لازم مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ معنی حقیقی (یعنی معنی ملزوم) بھی مراد لینا درست ہو۔

معرفہ ہے، ایسا اس لئے ہوا کیونکہ اہل بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب نکرہ گزر جائے اور وہ نکرہ بعینہ اسی لفظ سے لوٹانا ہو تو پھر اس کو معرفہ بنا کر لوٹایا جاتا ہے، چاہے معرفہ (الف لام) کی وجہ سے ہو، جیسے "فعصی فرعون الرسول" یا چاہے اضافت کی وجہ سے ہو، جیسے اس مقام پر۔ اس قاعدہ کی رعایت کرتے ہوئے بھی آیت میں پہلا "حَـــرْثٌ" نکرہ اور دوسرا معرفہ لایا گیا ہے۔ نیز جب نکرہ کا اعادہ معرفہ کے ساتھ ہو تو عین اولی ہوتا ہے، یعنی دونوں جگہ حرث سے ایک ہی محل ہے۔

﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲۳)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تلوین الخطاب" موجود ہے۔ (۱) یہاں پہلے "قَدِّمُوا، فَاتُوا، وَاتَّقُوا" میں خطاب عام مؤمنین سے تھا۔ آگے "بَشِّرِ الْمُؤْمِنِين" سے خطاب کے اسلوب کو بدل دیا گیا، وہ اس طرح کہ اس میں خطاب عام مؤمنین کو نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اس میں چونکہ خطاب کے اسلوب کو عام مؤمنین سے رسول کی طرف منتقل کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "تلوین الخطاب" موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں "بَشِّرِ الْمُؤْمِنِين" بول کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مؤمنین کے لئے مبشر (خوشخبری اور بشارت دینے والا) قرار دیا تا کہ مسلمانوں کے اعزاز واکرام میں خوب مبالغہ ہو کہ مسلمان کتنے مشرف ومکرم ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم الشان ہستی انہیں خوش خبری دینے والے ہیں۔

اس آیت میں "بَشِّرِ الْمُؤْمِنِين" میں ایسے وصف پر تنبیہ پائی جاتی ہے جس وصف کی بناء پر لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، خیر کے کاموں میں جلدی کرتے اور پھر وہ صف لوگوں کو بشارت کا مستحق بناتا ہے۔ وہ وصف مؤمنین میں موجود وصفِ ایمان ہے، یقیناً ایمان ایسا وصف ہے جس کی وجہ سے انسان میں خوفِ خدا، کارِ خیر کے کرنے کا جذبہ اور بشارت کا

(۱) تلوین الخطاب کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کیا جائے۔

استحقاق پایا جاتا ہے۔اسی طرح آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت کے حکم دینے میں بھی حضور اور مسلمانوں کے درمیان ایک بڑے اُنسیت اور تعلق کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے اعمال کا ثواب ملنے کا بھی وعدہ پایا جاتا ہے۔اس میں ”بَشِّرِ الْمُؤْمِنِين“ کہا گیا ہے،”بَشِّرهُمْ“ بول کر ضمیر نہیں لائی گئی۔ایسا اس لئے کیا تا کہ لفظِ مؤمنین کی صراحت سے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا جائے کہ لوگ ایمان کی وجہ سے ہی بشارت کے حقدار ہیں،اگر ایمان نہ ہو تو ان کے لئے کوئی بشارت نہیں۔اسی طرح یہاں (ھم) ضمیر کی جگہ ”الْمُؤْمِنِين“ اس لئے لایا گیا تا کہ اس آیت کا اختتام گذشتہ آیت ”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِين“ کی طرح (نون) پر ختم ہو اور دونوں آیتوں کا کلمہ فاصل یعنی آخری کلمہ ایک جیسے ہو،اگر یہاں (ھم) ضمیر لاتے تو یہ نکتے حاصل نہ ہوتے۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ (۲۲۵)﴾

ترجمہ:اور اللہ تمہارے لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا،البتہ جو قسمیں تم نے اپنے دلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی ان پر گرفت کرے گا۔اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ”ایجاز بالحذف“ پایا جاتا ہے،یہاں آیت میں ”بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“ سے پہلے ”فِي أَيْمَانِكُمْ“ کے الفاظ محذوف ہیں۔اصل عبارت ” وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُم فِي أَيْمَانِكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“ تھی۔(اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری ان قسموں کی وجہ سے گرفت کرے گا جو تم نے اپنے دلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی۔) آیتِ کریمہ سے چونکہ ”فِيْ أَيْمَانِكُم“ کے الفاظ حذف کر دیئے گئے اور اس محذوف کی تعیین آیت میں موجود ”بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ“ کے جملہ سے ہو جاتی ہے،اس لئے آیت میں ”ایجاز بالحذف“ موجود ہے۔اللہ رب العزت ”غفور“ ہے،یمینِ لغو

پر مواخذہ نہیں کرتا، اور ’’حلیم‘‘ ہے کہ یمین منعقدہ پر فوراً سزا نہیں دیتا، بلکہ مہلت دیتا ہے۔

﴿لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۲۲۶)﴾

ترجمہ: جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں (یعنی ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں) ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، چنانچہ اگر وہ (قسم توڑ کر) رجوع کر لیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اس آیت کریمہ میں ’’تَرَبُّصُ‘‘ مصدر اور ’’أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ‘‘ ظرف ہے، آیت میں ’’تَرَبُّصُ‘‘ مصدر کی اضافت ظرف کی طرف کر دی گئی ہے، یہ اصل میں ’’لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ فِي أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ‘‘ تھا، اس میں حرفِ (فی) کو حذف کر کے اضافت ظرف کی طرف کر دی گئی ہے۔

﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (227)﴾

ترجمہ: اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو (بھی) اللہ سننے جاننے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے ’’فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ‘‘ والے جملہ میں وعید اور تہدید پائی جاتی ہے۔ (1) اس میں ’’فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ‘‘ بول کر ایلاء کرنے والوں کو قسم نہ توڑنے پر دھمکایا گیا ہے کہ لوگو سنو اگر تم نے ایلاء کیا ہو تو چار مہینے کے اندر اندر ہی اپنی قسم توڑ دو اور بیوی کے قریب چلے جاؤ! لیکن اگر تم نے طلاق کا عزم کیا تو اللہ سننے اور جاننے والا ہے، اس لئے وہ تمہیں قسم نہ توڑنے پر اور طلاق دینے پر سزا دے سکتا ہے، لہٰذا تم خبردار رہو۔ اللہ رب العزت تمہاری گفتگو سنتا ہے اور تمہارے دلوں کے ارادے کو بھی جانتا ہے، اور سزا دینے پر قادر بھی ہے، لہٰذا خلافِ شرع امور سے باز رہو۔

(1) وعید و تہدید کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر ڈرانے دھمکانے کا نام ہے۔

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ(٢٢٨)﴾

ترجمہ: اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین مرتبہ حیض آنے تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "اَلْمُطَلَّقَات" **مبتداء** اور "يَتَرَبَّصْنَ" **فعل** خبر ہے۔ یہ **فعلِ** مضارع اگرچہ خبر ہے، مگر یہاں یہ **فعل** مضارع امر کے معنی میں ہوگا، یہ **اصل میں** "لِيَتَرَبَّصْنَ الْمُطَلَّقَاتُ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلقہ عورتیں دوسری شادی سے خود کو تین حیض تک روکے رکھیں۔ آیت میں "الْمُطَلَّقَاتُ" کو مبتداء اور "لِيَتَرَبَّصْنَ" **فعل امر** کو "يَتَرَبَّصْنَ" مضارع بنا کر مبتداء کی خبر بنا دی گئی، مگر پھر بھی جملہ امر کے معنی میں ہی ہوگا۔ اس میں صریح فعل امر کی جگہ خبر اس لئے لائی گئی کیونکہ خبر فعل امر سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ خبر میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ مامور بہ یعنی تین حیض تک مطلقات کا خود کو شادی سے روکنا ان واجبات میں سے جن کی بجا آوری مسارعت و تیزی سے ہوئی ہے، گویا مامور بہ اتنا اہم تھا کہ "مُطَلَّقَاتُ" نے فوراً ہی اس پر عمل کر لیا اور اب اس کی خبر دی جارہی ہے۔ اس آیت میں **فعلِ مضارع** ہے جو امر کے معنی میں ہے، یہ اس لیے کہ "إيراد الإنشاء بصيغة الخبر أبلغ من إيراده بصيغة الإنشاء" یعنی انشاء بصیغہ خبر زیادہ بلیغ ہوتا ہے، انشاء بصورتِ انشاء کے مقابلہ میں۔ ❶

"وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ" اور "وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ" میں **فعل** مضارع امر کے معنی میں ہے، لیکن اِسے مضارع سے اس لیے تعبیر کیا کہ یہ احکام اتنے مؤکد ہیں کہ گویا مکلّف نے سنتے ہی اس پر عمل کر دیا۔

فعل مضارع بصورت خبر لا کر اشارہ کیا اس حکم کی ادائیگی اور تحقق کی طرف کہ گویا سنتے ہی اس پر عمل کر دیا۔ جس طرح دعا میں "رحمہ اللہ" کہا جاتا ہے، یہ ماضی بصورتِ خبر ہے کہ

❶ أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن: ج٥ ص٢٠

گویا اللہ رب العزت نے اس پر رحم کر دیا، حالانکہ یہ بھی اصولاً صیغہ امر ہے کہ اے اللہ! تو اس پر رحم فرما۔

﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا (۲۲۸)﴾

ترجمہ: اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہوں تو ان کے لیے حلال نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ (حمل یا حیض) پیدا کیا ہے اُسے چھپائیں۔

اس آیتِ کریمہ میں مطلقہ عورت کو رحم مادر میں موجود اشیاء چاہے حیض ہو یا حمل چھپانے سے منع کیا گیا ہے۔ مطلقہ عورت کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ وہ عدت میں جلدی یا تاخیر کے لئے جھوٹ بولے، بلکہ ان پر لازم ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک عدت گزاریں، اگر رحم مادر میں حمل ہے تو وضع حمل تک انتظار کریں اور اگر حمل نہ ہو تو تین حیض گزارے۔ اس آیت میں "إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ" کی قید بڑھائی گئی کی اگر وہ عورت مؤمن ہے تو وہ عدت کے معاملہ میں ٹال مٹول نہ کرے، اور صحیح بات کو چھپائے نہیں۔ آیت میں عدت گزارنے کے لئے یہ قید مقصود نہیں بلکہ یہ قید مطلقہ عورتوں کو جو حکم دیا جا رہا ہے، ان میں سختی اور پابندی ڈالنے کے لئے بڑھائی گئی ہے۔ اس قید کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی عورت مسلمان نہ ہو تو اس پر عدت نہیں اور کافر عورت عدت کے معاملہ میں تاخیر وجلدی کر سکتی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں، بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ قید، قیدِ احترازی نہیں جس سے کافر مطلقہ کو حکم سے نکال دیا جائے، یہ قید اتفاقی ہے، بکہ جو حکم میں سختی کے لئے لائی گئی ہے۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۲۸)﴾

ترجمہ: اور ان عورتوں کو معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں

جیسے (مردوں کو) ان پر حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اس جملہ میں "احتباك" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیتِ کریمہ میں دونوں اطراف سے مقابل کو حذف کیا گیا ہے۔ یہ جملہ اصل میں "وَلَهُنَّ عَلَى اَزْوَاجِهِنَّ مِنَ الْحُقُوقِ مِثْلُ الَّذِیْ لِاَزْوَاجِهَنَّ عَلَيْهِنَّ مِنُ الْحُقُوقِ" تھا۔ آیت کی ابتداء میں "عَلَى اَزْوَاجِهِنَّ مِنَ الْحُقُوقِ" (مردوں پر لازم حقوق) کو حذف کر دیا گیا، مگر دوسری طرف سے "عَلَيْهِنَّ" (عورتوں پر لازم حقوق) بول کر اس کے مقابل کو ذکر کر دیا گیا، جو محذوف کی دلیل ہے۔ اسی طرح آیت کی دوسری طرف سے میں "لِاَزْوَاجِهَنَّ مِنُ الْحُقُوقِ" (مردوں کے حقوق) کو حذف کر دیا گیا ہے، مگر اس کے مقابل (عورتوں کے حقوق کو "لَهُنَّ" بول کر ابتداء میں ذکر کر دیا گیا، آیت میں چونکہ دونوں اطراف میں سے ایک ایک مقابل کو حذف کر کے دوسرے مقابل کو محذوف کی دلیل بنا دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "احتباك" پایا جاتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے مردوں پر ایسے ہی حقوق لازم ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق لازم ہیں۔

﴿وَلَهُنَّ ...... عَلَيْهِنَّ﴾

یہاں (لام) جارہ اور (علی) جارہ کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❷ "لَهُنَّ" میں (لام) جارہ کے ذریعہ مردوں پر عورتوں کے حق کا ذکر کیا گیا ہے اور "عَلَيْهِنَّ" سے عورتوں پر لازم حق کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل مفہوم ومعانی کو آیت میں جمع کر دیا گیا اس لئے ان میں "طباق" پایا جاتا ہے۔

---

❶ احتباک کا مطلب یہ کسی کلام کے دونوں اطراف میں سے ہر ایک میں ایک مقابل کو حذف کر دیا جائے اور دوسری طرف اس محذوف کا مقابل ذکر کر دیا جائے جو محذوف کی دلیل بنے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کلام میں دونوں مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمۡسَاکٌ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِیحٌ بِإِحۡسَانٍ(۲۲۹)﴾

ترجمہ: طلاق (زیادہ سے زیادہ) دو بار ہونی چاہئے، اس کے بعد (شوہر کے لیے دو راستے ہیں) یا تو قاعدے کے مطابق (بیوی کو) روکے رکھے (یعنی طلاق سے رجوع کرلے) یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے (یعنی رجوع کے بغیر عدت گزر جانے دے)۔

اس آیتِ کریمہ میں "مَرَّتَان" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو دو مرتبہ طلاق دینے کے معنی میں ہے۔ یہی معنی "ثِنْتَانِ" سے بھی ادا کیا جاسکتا ہے، مگر آیت میں "ثِنْتَانِ" کی جگہ "مَرَّتَان" کو ایک خاص نکتہ کے تحت ترجیح دی گئی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ دو طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسری طلاق دی جائے، بیک وقت ایک ہی دفعہ میں دو طلاق نہ دے، اگر چہ دو دفعہ طلاق میں بھی رجوع کا حق ہوتا ہے، مگر ایک ساتھ دو طلاق دینا بہتر نہیں ہے، بلکہ بوقتِ ضرورت ایک کے بعد دوسری طلاق دی جائے، دونوں اکٹھی نہ جائیں، یہ نکتہ لفظِ "مَرَّتَان" سے حاصل ہوا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "إِمْسَاك" اور لفظِ "تَسْرِیح" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "إِمْسَاك" بمعنی (روکنے اور گھر میں ٹھہرانے) کے ہے۔ اور "تَسْرِیح" بمعنی (گھر سے رخصت کرنے) کے ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ آیت میں ان مقابل معنوں کو جمع کیا گیا ہے، اس لئے ان کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿ وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ أَنۡ تَأۡخُذُوا مِمَّا آتَیۡتُمُوهُنَّ شَیۡئًا إِلَّا أَنۡ یَخَافَا أَلَّا یُقِیمَا حُدُودَ اللّٰهِ(۲۲۹)﴾

ترجمہ: اور (اے شوہرو) تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم نے ان (بیویوں) کو جو کچھ دیا ہو وہ (طلاق کے بدلے) ان سے واپس لو، اِلّا یہ کہ دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "التفات من الخطاب إلی الغیبة" پایا جاتا ہے۔اس آیت کریمہ میں شوہرکو پہلے "لَکُمۡ أَنۡ تَأۡخُذُوا" اور "آتَیۡتُمُو" وغیرہ سے مخاطب بنایا گیا ہے۔یہ سارے الفاظ خطاب کے ہیں،اس اعتبار سے آگے میاں بیوی کو خطاب کرنے کے لئے "أَلَّا تُقِیمَا" بول کر مخاطب کا صیغہ لانا چاہیے تھا،مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ "تُقِیمَا" کی جگہ "یُقِیمَا" غائب کا لفظ لایا گیا ہے،اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من الخطاب إلی الغیبة" پایا جاتا ہے، یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ سامع کی توجہ سماعت برقرار رہے۔یہاں حذفِ فاعل ہوا،اصل عبارت یوں ہے"إلا أن یخاف ولاة الأمور أنّ الرجل والمرأة أن لا یقیما حدود اللّٰه "یہاں"ولاة الأمور"فاعل کو حذف کیا گیا ہے،اور"أن الرجل والمرأة "مفعول بہ ہیں،تو گویا کہ مفہوم یہ ہے کہ قاضی یا حکم وغیرہ اس بات کا اندیشہ رکھتے ہوں کہ یہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان کے درمیان تفریق کر دیں۔

آیت میں"شیئا"تنکیر برائے تحقیر ہے کہ معمولی عوض بھی لینا درست نہیں،مہر،لباس اور دیگر اشیاء میں سے،اس لیے کہ تم نے اس کے بدلے اس سے استمتاع کیا ہے، اِلّا یہ کہ تم حدود قائم نہ رکھ سکو۔

﴿إِلَّا أَنۡ یَخَافَا أَلَّا یُقِیمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلَّا یُقِیمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا فِیمَا افۡتَدَتۡ بِهِ تِلۡکَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعۡتَدُوهَا وَمَنۡ یَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِکَ هُمُ الظَّالِمُونَ (229)﴾

ترجمہ: الا یہ کہ دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔چنانچہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے لیے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں،لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو،اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''الإظھار فی مقام الإضمار'' پایا جاتا۔ ❶ یہاں ایک مرتبہ ''اَلَّا یُقِیمَا حُدُودَ اللّٰه'' بول کر اللہ کے حدود کا ذکر کر دیا گیا ہے، یہ لفظ آئندہ اللہ کے حدود کے لئے آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آیت میں ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیمَا حُدُودَ اللّٰه'' کی جگہ ''فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا یُقِیمَا اِیَّاهَا''۔ اور اسی طرح ''تِلْكَ حُدُودُ اللّٰه'' کی جگہ ''تِلْكَ حُدُودُهٗ'' ہونا چاہیے تھا، تاکہ ضمیر گذشتہ مرجع کی طرف لوٹ جاتی، مگر آیت میں ضمیر کے بجائے ''حُدُودُ اللّٰه'' بول کر دوبارہ اسمِ ظاہر کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''الاظھار فی مقام الاضمار'' موجود ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ بار بار اللہ کے نام کے ذکر سے سامع کے دل میں اللہ کی خشیت وڈر پیدا ہو اور وہ حدود اللہ کو قائم رکھنے کا اہتمام کرے۔

﴿فَأُولَئِکَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾

اس جملہ میں ''فَأُولَئِكَ'' اسم اشارہ مبتدء اور ''الظَّالِمُونَ'' اس کی خبر ہے۔ درمیان میں موجود (هُمْ) ضمیر ضمیرِ فصل ہے، یہ ضمیرِ فصل اس لئے لائی گئی تاکہ آیت میں ''قصر الصفة علی الموصوف'' کا مفہوم حاصل ہو۔ ❷

یہاں ظلم کی صفت ''حُدُودَ اللّٰهِ'' کو پامال کرنے والوں کے ساتھ مختص کر دی گئی ہے، گویا یہ صفت صرف انہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جو ''حُدُودَ اللّٰهِ'' سے تجاوز کرنے والے ہیں، یہی لوگ ظالم لوگ ہیں۔

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے ظاہر اور کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کا ذکر کر دیا جائے۔

❷ قصر الصفہ علی الموصوف دو قسموں پر ہیں:

نمبر۱: حقیقی۔ نمبر۲: اضافی۔

یہاں قصر الصفہ علی الموصوف حقیقی پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفت موصوف کے علاوہ کسی اور میں حقیقی طور پر نہ پائی جائے۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (۲۳۱)﴾

ترجمہ: اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، تو یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ (اپنی زوجیت میں) روکے رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو۔

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔ (1) یہاں لفظِ "أَجَل" استعمال ہوا ہے جس کا حقیقی معنی (مکمل مدتِ عدت) ہے، لیکن آیت میں یہ معنی مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کی عدت مکمل ہونے پر رجوع کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، اس لئے آیت میں اس لفظ کا مجازی معنی مراد لیا جائیگا۔ وہ مجازی معنی (اکثر مدتِ عدت) ہے، یعنی عدت کی گزرنے کے قریب ہو جائے تو رجوع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، آیت میں اس معنی سے "فَأَمْسِكُوهُنَّ" میں رجوع کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی درست ہوگا۔ لفظِ "أَجَلُ" کے ان دونوں معنوں میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، کیونکہ مکمل مدتِ عدت (کل) اور اکثر مدتِ عدت (جزء) ہے، آیت میں گویا کل بول کر جزء مراد لیا گیا ہے، چونکہ ان دونوں معنوں میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (۲۲۹) وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُن بِمَعْرُوفٍ (۲۳۱)﴾

یہاں دوسری آیت میں "فَأَمْسِكُوهُنَّ" بول کر طلاق دینے والے مردوں کو عدت کے اختتام سے پہلے پہلے رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔ بالکل یہی حکم ایک مرتبہ آیت نمبر (۲۲۹) میں "فَإِمْسَاكٌ" میں ضمناً گذر چکا ہے، اس اعتبار سے یہاں ایک ہی حکم کا تکرار پایا جاتا

(1) مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، کلیت، حالیت، ما کان علیہ یا لزوم وغیرہ کا علاقہ ہو۔

ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ حکم رجوع کی بھرپور اہمیت واضح ہو اور مردوں کو رجوع کرنے اور رشتہ زوجیت کو باقی رکھنے پر ابھارا گیا ہے۔

﴿فَأَمۡسِكُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ وَلَا تُمۡسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعۡتَدُوا وَمَنۡ يَفۡعَلۡ ذَٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا (۲۳۱)﴾

ترجمہ: یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ (اپنی زوجیت میں) روکے رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو، اور انہیں ستانے کی خاطر اس لیے روک کر نہ رکھو کہ ان پر ظلم کرسکو، اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا، اور اللہ کی آیتوں کو مذاق مت بناؤ۔

اس آیتِ کریمہ میں "لَا تُمۡسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوا" میں یہ بتایا گیا ہے کہ دو طلاق سے فارغ ہونے کے بعد عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع اس نیت سے نہ کرو کہ تم اپنی بیوی کو تکلیف واذیت پہنچاتے پھرو، اگر تمہاری یہ نیت ہو تو پھر رجوع مت کرو۔ آیت میں نہی اس لئے وارد ہوئی تا کہ دستور اور حسنِ سلوک کے ساتھ رجوع کا جو حکم ہوا اس کی مزید تاکید ہو کہ رجوع کرنا صرف اور صرف حسنِ سلوک کی نیت سے ہو، ضرر واذیت کے ارادے سے نہ ہو۔ اس نہی سے ان لوگوں کو بھی ڈانٹنا مقصود ہے جنہوں نے اپنی بیویوں کو طلاق کے بعد ضرر واذیت رسانی کی غرض سے گھروں میں رجوع کے ذریعہ روکے رکھا ہے۔ یعنی عدت گزرنے لگتی ہے تو رجوع کر لیتے ہیں، تا کہ عدت طویل ہو جائے۔ جو اس طرح کرے گا تو اللہ رب العزت کے حکم کی مخالفت کی وجہ سے کسی اور پر نہیں بلکہ اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے، اس لیے کہ ظلم کی سزا اسی کو ملے گی۔ اللہ رب العزت کے احکامات کو ترک کر کے اور اعراض کر کے اُن کا مزاق نہ اڑاؤ۔

﴿وَاذۡكُرُوا نِعۡمَتَ اللَّهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَا أَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِنَ الۡكِتَابِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعۡلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ (231)﴾

ترجمہ: اور اللہ نے تم پر جو انعام فرمایا ہے اسے اور تم پر جو کتاب اور حکمت کی باتیں

تمہیں نصیحت کرنے کے لیے نازل کی ہیں انہیں یاد رکھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "عطف الخاص علی العام" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "نِعْمَتَ اللّٰه" کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ عام ہے کیونکہ اللہ کی نعمتیں کتاب وسنت سمیت تمام اشیاءِ نعمت کو شامل ہیں، اس عام کو ذکر کرنے کے بعد آیت میں آگے "واو" عاطفہ کے ذریعہ خاص شئی یعنی "الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ" کا ذکر ہوا، جو گذشتہ عام "نِعْمَتَ اللّٰهِ" میں داخل تھا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "عطف الخاص علی العام" پایا جاتا ہے، آیت میں ایسا اس لئے ہوا تا کہ کتاب وسنت کی نعمت کو تمام نعمتوں سے اہم اور افضل قرار دیا جائے۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (۲۳۱)﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظ "طَلَّقْتُمُ" اور "فَأَمْسِكُوهُنَّ" کے درمیان "طباق" موجود ہے۔❷ یہاں "طَلَّقْتُمُ" کا معنی (طلاق دینے) کے ہے اور "فَأَمْسِكُوهُنَّ" کا معنی (روکے رکھنے کے) یعنی طلاق نہ دینے کے ہے، طلاق دینا اور نہ دینا دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظِ "أَمْسِكُوا" اور لفظِ "سَرِّحُوا" کے معنوں میں بھی "طباق" پایا جاتا ہے، تفصیل یہ ہے کہ "أَمْسِكُوا" "إِمْسَاك" مصدر سے مشتق ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ طلاق کے ارادے سے رجوع کر کے بیوی کو گھر میں ٹھہرا لیا جائے اور "سَرِّحُوا" "تَسْرِيح" مصدر سے مشتق ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ بیوی کو طلاق پر برقرار

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے عام شئی کو ذکر کیا جائے، پھر اس کے بعد اس عام میں موجود خاص شئی کا عطف اسی عام پر کر دیا جائے تا کہ خاص کی عظمت وخصوصیت ظاہر کی جاسکے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

رکھتے ہوئے اپنے گھر سے اچھے انداز میں رخصت کیا جائے۔ اب یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے، یہاں ایک مرتبہ "وَاتَّقُوا اللَّهَ" میں لفظِ "اللّٰہ" کا ذکر ہوا، پھر دوبارہ اسی آیت کے اگلے جملہ میں "أَنَّ اللَّهَ" بول کر لفظِ "اللَّهَ" کو مکرر ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں لفظِ "اللّٰہ" کا "تکرار" ہوا ہے، یہ "تکرار" اس لئے ہوا تاکہ بار بار لفظِ "اللّٰہ" کے ذکر سے سامع کے دل و دماغ میں اللہ سبحانہ کی عظمت وہیبت پختہ ہو جائے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "وَاعْلَمُوا" اور "عَلِيمٌ" کے معنوں میں "جناس اشتقاق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں لفظِ "وَاعْلَمُوا اور عَلِيمٌ" کا اصل مادہ "عِلْماً" ہے۔ اسی طرح اس کا اصل معنی (جاننے) کے ہے، ان دونوں امور میں مذکورہ دونوں الفاظ چونکہ ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان میں "جناس اشتقاق" موجود ہے۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكُمْ أَزْكَى لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (232)﴾

ترجمہ: اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو (اے میکے والو) انہیں اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کریں، بشرطیکہ وہ بھلائی کے ساتھ ایک دوسرے سے راضی ہو گئے ہوں۔ ان باتوں کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جارہی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔

❶ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمات اصل مادہ اور اصل معنی میں ایک دوسرے کے موافق و متحد ہوں۔

یہی تمہارے لیے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ طریقہ ہے، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے، یہاں "أَنْ يَّنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ" میں جو لفظ "أَزْوَاج" استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (شوہر) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ طلاق دینے کے بعد مرد عورت کا شوہر نہیں رہتا، بلکہ وہ اجنبی ہو جاتا ہے، اس لئے حقیقی معنوں میں اس پر زوج کا اطلاق کرنا درست نہیں ہوگا۔ لہٰذا آیت میں "أَزْوَاج" سے مجازی معنی مراد لیا جائے گا، وہ مجازی معنی آیت میں (سابقہ شوہر) کے ہے، ان دونوں معنوں (شوہر اور سابقہ شوہر) میں علاقہ ما کان علیہ کا ہے۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی معنی پر لفظ کا اطلاق زمانہ ماضی کے اعتبار سے کیا جائے۔) چونکہ اپنی بیوی کو طلاق دینے والا شخص کبھی زمانہ ماضی میں مطلقہ کا شوہر ہوا کرتا تھا، اس اعتبار سے آیت میں طلاق دینے والے پر "أَزْوَاج" کا اطلاق کر دیا گیا، آیت کے اس لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں چونکہ علاقہ "ما کان علیہ" کا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔

﴿اللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "يَعْلَمُ اور لَا تَعْلَمُونَ" کے معنوں میں "طباق سلب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "يَعْلَمُ" کے معنی (جاننے) کے ہے اور "لَا تَعْلَمُونَ" کے معنی (نہ جاننے) کے ہے۔ یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان میں سے ایک مثبت اور دوسرا منفی ہے، ان کو چونکہ آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق سلب" پایا جاتا ہے۔

﴿فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ...... وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا﴾

❶ طباق سلب یہ ہے کہ کلام میں دو متضاد اور مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے، اور ان میں سے اگر ایک ایجابی ہو تو دوسرا سلبی ہو۔

ان دونوں جملوں کے درمیان "مقابلة" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے جملے میں دو معانی بیان کئے گئے ہیں:

نمبر۱: "فَأَمْسِكُوهُنَّ" میں طلاق سے رجوع کرنے کا بیان ہوا۔

نمبر۲: "بِمَعْرُوفٍ" میں حسن سلوک کا بیان ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق معنی ہیں، وہ اس طور پر ہے کہ ان دونوں میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔ آیت میں ان دونوں موافق معنوں کو بیان کرنے کے بعد بالترتیب ان کے مقابل کو بیان کیا گیا یعنی "لَا تُمْسِكُوهُنَّ" "فَأَمْسِكُوهُنَّ" کا مقابل ہے، اور "ضِرَارًا" "بِمَعْرُوفٍ" کا مقابل ہے۔ "فَأَمْسِكُوهُنَّ" کا معنی ہے روک کر رکھو، اور اس کی ضد "لَا تُمْسِكُوهُنَّ" کا معنی مت روک کر رکھو۔ اسی طرح "بِمَعْرُوفٍ" میں حسنِ سلوک کا بیان ہے، جب کہ "ضِرَارًا" میں نقصان پہنچانے کا۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُن بِمَعْرُوفٍ (۲۳۱) وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ(۲۳۲)﴾

مذکورہ دونوں آیتوں میں "أَجَل" کا "تکرار" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں پہلی آیت میں ایک مرتبہ "أَجَل" کا لفظ ذکر ہوا، اس کے بعد پھر دوبارہ دوسری آیت میں لفظِ "أَجَل" کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں لفظِ "أَجَل" کا تکرار ہوا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہاں دونوں آیتوں میں موجود "بلوغِ أَجَل" کے علیحدہ علیحدہ

❶ مقابلہ یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو موافق معنوں کو بیان کیا جائے، پھر بالترتیب ان مقابل معنوں میں سے ہر ایک کی ضد لائی جائے، البتہ یہاں موافق معنوں سے مراد یہ ہے کہ دونوں معانی ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

❷ یہ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کلمہ یا جملہ کو مکرر ذکر کیا جائے اور یہ کسی نہ کسی غرض ومقصد کے تحت ہوتا ہے۔

معانی ہیں، پہلے "بلوغِ أَجَل" سے مراد عدت کے ختم ہونے کے قریب قریب کا زمانہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عدت کا اکثر حصہ گذر جائے اور عدت اپنی انتہاء کو پہنچنے لگے تو شوہر رجوع کرلے۔ اور دوسرے "بلوغِ أَجَل" سے مراد مطلقہ کی عدت کی تکمیل ہے، جس کا معنی ہے کہ طلاق کے بعد اگر عورت عدت پوری کرچکی ہو تو اس مطلقہ عورت کو پہلے شوہر سے دو طلاق دینے کی صورت میں نکاح کرنے سے نہ روکا جائے۔ آیت میں آگے "فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ" کا جملہ آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں نکاح کرنے سے نہ روکو، معلوم ہوا کہ عدت گزر چکی ہے، اگر عدت باقی ہوتی تو طلاقِ رجعی میں دوبارہ نکاح کا کیا مطلب؟ معلوم ہوا کہ ان دونوں مختلف "بلوغِ أَجَل" کی طرف اشارہ کے لئے لفظِ "أَجَل" کا تکرار لایا گیا ہے۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ (۲۳۲)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "طَلَّقْتُمُ" کا خطاب شوہروں سے کیا گیا ہے، پھر اس کے فوراً بعد آیت کے اگلے حصہ میں "فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ" میں مطلقہ عورتوں کے اولیاء کو متوجہ کرکے خطاب کیا گیا، گویا ایک ہی آیت میں ایک مخاطب سے دوسرے مخاطب کی طرف التفات ہوا ہے، یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ آیت کی سماعت پر سامع بھرپور توجہ دے اور کلام سننے میں لطف آئے۔

﴿ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲۳۲)﴾

اس جملہ میں بھی گذشتہ جملہ کی طرح ایک مخاطب سے دوسرے مخاطب کی طرف التفات ہوا ہے، "ذَٰلِكَ" میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا، پھر اس کے فوراً بعد "مِنْكُمْ" میں جمع کی ضمیر "كُمْ" لاکر تمام لوگوں کو مخاطب کیا گیا، ایک مخاطب سے دوسرے مخاطب کی طرف آیت میں التفات اس لئے ہوا تاکہ سامع آیت کی طرف مکمل متوجہ رہے

اور کلام اللہ کا مخاطب ہونے کی وجہ سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ پر مستحکم رہے۔

﴿ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ (۲۳۲) ﴾

اس آیت کریمہ میں "تقدیم و تاخیر" واقع ہوئی ہے۔ ❶ اس میں "بِالْمَعْرُوف" کا تعلق "أَنْ يَّنْكِحْنَ" سے ہے، اس لئے اس کو "تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ" پر مقدم کرنا چاہیے، تا کہ "بِالْمَعْرُوف" مقدم اور "إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ" مؤخر ہو جاتے اور ہر ایک اپنی جگہ پر ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا، بلکہ مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیا گیا ہے، یہ اصل میں "أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ" تھا، اس میں "تقدیم و تاخیر" اس لئے واقع ہوا تا کہ کلام میں حسن آئے، اور زوجین کی رضامندی کی رعایت کرتے ہو نکاح کرنے سے روکا نہ جائے۔

﴿فَلَا تَعْضُلُوهُن﴾

اس جملہ میں موجود نکتہ بلاغت کو بیان کرنے سے پہلے اس کا مختصر شان نزول پیش کیا جاتا ہے۔ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کیا، وہ اپنے شوہر کے پاس رہنے لگی، پھر ایک مرتبہ اس شخص نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کو ایک طلاق دے دی اور اس کے بعد رجوع بھی نہ کیا، یہاں تک کہ اس کی عدت گذر گئی، عدت گذرنے کے بعد حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن اور انکے شوہر کا ارادہ بنا کہ دوبارہ تجدیدِ نکاح کے ذریعہ ازدواجی زندگی قائم کریں۔ اس شخص نے اِن کی ہمشیرہ کو پیغام نکاح بھیجا، تو جواب میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے تمہاری شادی اپنی بہن سے کروائی اور تم نے صلہ میں طلاق دے دی، اللہ کی قسم! وہ تمہارے پاس پھر کبھی

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا حق مقدم ہو اس کو مؤخر کر دیا جائے اور جس کا حق مؤخر ہو اس کو مقدم کر دیا جائے۔

نہیں لوٹے گی۔ یہ تو ان کا جواب تھا مگر اللہ رب العزت کو اِن کی بہن اور اس کے شوہر کی حالت کا قطعی علم تھا، اور اس مرد میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، اور عورت بھی رجوع کرنا چاہتی تھی، تو اللہ سبحانہ نے آیت اتار دی کی طلاق رجعی کی عدت ختم ہونے کے بعد اگر عورت اپنے سابق شوہر سے بیاہ کرنی چاہیے تو ولی انہیں نہ روکیں بلکہ تجدید نکاح کرنے دیں، جب ان کی آپس کی رضامندی موجود ہے۔ ❶

اب آیت میں بلاغت کا نکتہ ملاحظہ ہو۔ اس شان نزول کے پیش نظر آیت کا مخاطب واحد ہے، کیونکہ واقعہ میں مخاطب حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ہیں، اس لحاظ سے آیت میں "فَلَا تَعْضُلُوْا" جمع کی جگہ "فَلَا تَعْضُل" واحد ہونا چاہیے تھا، مگر آیت میں واحد کی جگہ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ نزولِ آیت کا واقعہ تو ایک فرد سے متعلق ہے، مگر یہ خطاب عام ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسا معاملہ ہو تو اولیاء کو یہی حکم ہے کہ وہ سابق شوہر سے نکاح کرنے سے عورتوں کو نہ روکیں، بشرطیکہ مرد اور عورت دونوں دوبارہ نکاح پر راضی ہوں۔

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (233)﴾

ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں، یہ مدت ان کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں، اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اس پر واجب

❶ صحيح البخاري: كتاب النكاح، باب من قال: لا نكاح إلا بولي، رقم الحديث: ٥١٣٠

ہے کہ وہ معروف طریقے پران ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اٹھائے۔(ہاں) کسی شخص کواس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی، نہ تو ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے ستایا جائے، اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر وہ دونوں (یعنی والدین) آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے (دوسال گزرنے سے پہلے ہی) دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں بھی ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی انّا سے دودھ پلواؤ تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ تم نے جو اجرت ٹھہرائی تھی وہ (دودھ پلانے والی کو) بھلے طریقے سے دے دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تلوین الخطاب" سے کام لیا گیا ہے۔ (۱) یہاں "يُرْضِعْنَ" فعلِ مضارع سے جمع مونث غائب کا صیغہ ہے، یہ لفظ اگرچہ مضارع ہے، مگر یہ فعل امر کے معنی میں ہے۔ آیت اصل میں "وَالْوَالِدَاتُ لِيُرْضِعْنَ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ جننے والی ماؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کو دوسال تک دودھ پلائیں۔ اس آیت میں فعلِ امر کے اسلوب کو چھوڑ کر معنی امر کو فعل مضارع کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تلوین الخطاب" موجود ہے۔ آیت میں معنی امر کو خبر یعنی فعلِ مضارع سے اس لئے بیان کیا تا کہ ماؤں کو دودھ پلانے کے حکم پر ابھارنے میں مبالغہ ہو سکے، گویا جیسے حکم دیا انہوں نے پورا بھی کر دیا، اب اس کی خبر دی جارہی ہے۔ یہاں "اَلْوَالِدَاتُ" کو "يُرْضِعْنَ" پر مقدم کیا، اس لیے کہ یہ مبتدا ہے، اور یہ جملہ اسمیہ ہے اس میں استمرار و دوام

(۱) تلوین الخطاب یہ ہے کہ کلام کے ایک اسلوب کو دوسرے اسلوب و انداز کی طرف منتقل کیا جائے۔

کا معنی ہے، جب کہ ''یُرضِعنَ'' کو مقدم کرتے تو یہ جملہ فعلیہ ہوتا، اور اس میں تجدد اور حدوث کا معنی ہوتا۔ اسی طرح آیت میں ''تاکید'' بھی پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں ''حَولَینِ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے معنی (دو سال) کے ہیں۔ اس لفظ سے دونوں سالوں کا مکمل ہونا خود بخود معلوم ہو رہا ہے، اس کے باوجود آیت میں ''کَامِلَین'' کا لفظ لایا گیا تاکہ ''حَولَین'' کے معنی میں تاکید پیدا ہو، اس آیت میں چونکہ ''حَولَین'' کے معنی کو پرزور بنانے کے لئے ''کَامِلَین'' کا لفظ لایا گیا ہے، اس لئے اس میں ''تاکید'' موجود ہے۔

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا گیا کہ دودھ پلانے والی ماں کا نان، نفقہ اور کپڑے والد کے ذمہ ہے، اس لئے مناسب تھا کہ والد کو تسلی اور ان اخراجات کا صلہ دیا جائے۔ آیت میں ''اَلمَولُودِ لَہُ'' میں موجود (لَہُ) سے والد کو تسلی دے دی کہ بچہ والد کی طرف منسوب ہوگا، والدہ کی طرف نہیں۔ مدد ونصرت، اہل وعیال، کنبہ کے اضافہ اور کسب میں عموماً والد ہی اولاد سے زیادہ فائدہ لیتا ہے اور جس طرح بچے کے لئے باپ پر دودھ پلانے والی کا خرچہ، نان، نفقہ اور کپڑے لازم ہیں۔ اسی طرح بچے پر والد کی اطاعت واجب ہے۔ اس نکتہ کی طرف اشارہ ''الْمَولُودِ لَهُ'' میں موجود (لَهُ) سے ہوا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بچہ نسب میں والد کی طرف منسوب ہوگا، جب نسبت کا فائدہ اسے دیا گیا تو نان نفقہ کا بوجھ بھی اس پر ڈالا گیا، گویا ''اَلْغُرْمُ بِالْغُنْمِ'' کے اصول کے تحت کام ہوا ہے۔

﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا﴾

اس آیتِ کریمہ میں دو جملے استعمال ہوئے ہیں:

نمبر ۱: ''لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا''۔

❶ تاکید یہ ہے کہ کسی بات وعنوان کو زور دے کر بیان کیا جائے۔

نمبر۲:"لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا"۔

یہ دونوں جملے جملہ فعلیہ ہیں اوران دونوں میں "لا" نافیہ داخل ہے جوعموماً مستقبل کی نفی کے لیے آتا ہے، ان دونوں میں یہ "لا" نافیہ اس لئے لایا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ وسعت سے بڑھ کر نفس کوکسی کام کا مکلّف نہ بنایا جائے۔اسی طرح میاں بیوی میں سے کسی ایک کو بچہ کے ذریعہ تکلیف نہ پہنچائی جائے،مضرت پہنچانا ایسی اشیاء میں سے ہے جن میں ہر وقت تجدد وحدوث پایا جاتا ہے۔ وسعت سے بڑھ کر اللہ سبحانہ کسی کو مکلّف نہیں بناتے اور نہ ہی میاں بیوی میں سے کسی کو یہ حق کہ وہ ایک دوسرے کوتکلیف دے۔ چونکہ زوجین کے درمیان طویل وقت ایک ساتھ گزرتا ہے،عموماً مختلف باتوں، جملوں اور افعال کے ذریعے ایک دوسرے کوتکلیف دی جاتی ہے، اور ہر دن نت نئے طریقوں سے بلا قصد بھی ایک دوسرے کواذیت پہنچ جاتی ہے،اس سے روکا گیا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ میں بچوں کے متعلق احکامات بیان فرمانے کے بعد "وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا" سے خشیت الٰہی اوراللہ سبحانہ کے علیم وبصیر ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ اس لئے کہ بچے اوران کو دودھ پلانے والی مائیں اور اناؤں کے بارے میں اللہ نے جو احکامات مشروع فرمائے ہیں ان پرتاکیدی طور پرعمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اگر شوہر نان نفقہ اور کسوہ میں کمی زیادتی کررہا ہے، اور بلا وجہ دودھ پلانے والی عورت (ماں) کواذیت دے رہا ہے تو اللہ رب العزت اس کے تمام اقوال وافعال کو دیکھ رہا ہے، اسی طرح مرد کواذیت دی جارہی ہے تو جان لے کہ اللہ رب العزت ہرایک کے فعل سے واقف ہے۔

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ(۲۳۳)﴾

اس آیتِ کریمہ میں پہلے "وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ" سے اللہ سبحانہ نے بچوں کا رزق بیان فرمایا، اس عنوان کو بیان کرنے کے بعد، پھر آیت میں "وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ" بول کر بچوں کی ماؤوں کے رزق کا عنوان بیان کیا گیا، چونکہ ماؤوں کا رزق بچوں کی پرورش اور رزق کا ذریعہ ہے، اگر مائیں رزق نہ کھائیں تو وہ کمزوری کے سبب بچوں کو خوراک نہیں کھلاسکتی، ماں کا نان نفقہ ضروری ہے۔ اسی لئے آیت میں بچوں کے رزق کے بعد ماؤوں کے رزق کا بیان ہوا۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز" پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیتِ کریمہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر والد کا انتقال ہوجائے تو یہ بچہ جو اپنے والد کا وارث ہے، اس پر بھی بواسطہ کفیل یہ لازم ہے کہ اس کے مال میں سے دودھ پلانے والی کو نان نفقہ اور کسوہ دیا جائے، اسی طرح آیت کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر بچہ کا انتقال ہوجائے تو بچہ کے وارث کے لئے بھی وہی حکم ہے جو بچے کے مُتوَفّٰی والد کے لئے تھا۔ یہ بہت لمبی چھوڑی بات تھی۔ اگر اس کو بیان کیا جاتا تو یوں کہا جاتا "وَعَلَى الصَّبِيِّ الَّذِي هُوَ وَارِثُ اَبِيْهِ الْمُتَوَفّٰى مِثْلَ مَاعَلَى الْاَبِ مِنَ النَّفَقَةِ وَالْكِسْوَةِ" یا یوں کہا جاتا "عَلٰى وَارِثِ الصَّبِيِّ مِثْلَ مَا كَانَ عَلَى اَبِ الصَّبِيِّ فِيْ حَالِ حَيَاتِهِ مِنَ النَّفَقَةِ وَالْكِسْوَةِ" آیت میں چونکہ اس لمبی چوڑی بات کو "عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ" جیسی مختصر عبارت سے بیان کیا گیا ہے، جس سے مقصود مکمل طور پر واضح ہوجاتا ہے، اس لئے اس آیت میں "ایجاز" پایا جاتا ہے۔

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲۳۳)﴾

❶ ایجاز یہ ہے کہ الفاظ معنیٔ مقصود سے کم ہوں، لیکن مقصود مکمل طریقے سے واضح ہوجائے، یعنی وہی مختصر عبارت معنیٔ مقصود کو ادا کرنے کے لئے کافی ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں "تلوین الخطاب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے "فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا" میں ماں باپ دونوں کے بارے میں کلام ہوا کہ اگر دو سال سے پہلے پہلے ماں باہمی مشاورت اور رضامندی سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہے تو چھڑا سکتے ہیں، اس میں ماں باپ کو خطاب کرنے کے بعد "وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا" میں کلام کے اسلوب کو ماں باپ دونوں سے پھیر کر صرف باپ کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس جملہ میں والد کو بالخصوص یہ حکم ہوا کہ بچے کی ماں دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا اسے کوئی تکلیف ہو جس کی وجہ سے وہ دودھ نہ پلائے تو اگر تم انّا کو دودھ پلانے کے لئے طلب کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ جو عوض طے ہوا ہے وہ انّاں کے حوالہ کر دیا جائے، اس آیت میں چونکہ کلام کو ماں باپ دونوں سے پھیر کر صرف باپ کی طرف منتقل کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "تلوین الخطاب" پایا جاتا ہے۔

﴿وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ (۲۳۳)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پاجاتا ہے، یہاں لفظِ "أَنْ تَسْتَرْضِعُوا" کے بعد "اَلْمَرَاضِعَ" اور "إِذَا سَلَّمْتُمْ" کے بعد "إِلَى الْمَرَاضِع" محذوف ہے۔ یہ اصل میں "وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا الْمَرَاضِعَ أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ إِلَى الْمَرَاضِعَ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوف" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے بچوں کے والدو! اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلانے والی انّا سے دودھ پلانا چاہو تو اس میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں، مگر یہ اجازت اس شرط کیساتھ ہے کہ تم دودھ پلانے والی انّا کو ان کی مقرر کردہ اجرت دے دو، اس آیت سے چونکہ "اَلْمَرَاضِعَ اور إِلَى الْمَرَاضِعَ" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

❶ تلوین الخطاب یہ ہے کہ کلام کو ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کیا جائے۔

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۳۴)﴾

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں، اور بیویاں چھوڑ کر جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں گی، پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچ جائیں تو وہ اپنے بارے میں جو کاروائی (مثلا دوسرا نکاح) قاعدے کے مطابق کریں تو تم پر کچھ گناہ نہیں، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت کریمہ میں "معدول الخطاب" یا "تلوین الخطاب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُم" میں سب کے سب جمع کے صیغے ہیں، اس لئے اس میں خطاب تمام لوگوں کو عام ہے، مگر اس کا معنی خاص ہے، وہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی ایک انتقال کر جائے اور بیوی اس کی زندہ ہو تو وہ چار مہینے دس دن عدت گذارے۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم ایک شخص کیساتھ مختص ہے، کیونکہ مرنے والا ایک ہوتا ہے، سب کے سب ایک ساتھ عموماً نہیں مرتے، اس لئے آیت کا معنی خاص ہے اگرچہ الفاظ عام ہیں، معنی کے لحاظ سے آیت میں "وَمَنْ يُتَوَفَّى مِنكُم وَيَذَرُ" بول کر واحد کے الفاظ لانے چاہیئے تھے، تاکہ اس میں معنی کے لحاظ سے واحد کا اسلوب اپنایا جاتا، مگر آیت میں واحد کے اسلوب سے منتقل ہو کر جمع کے الفاظ ذکر کر دیئے گئے، اس لئے آیت میں "تلوین الخطاب" یا بالفاظِ دیگر "معدول الخطاب" پایا جاتا ہے۔

﴿وَ الَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُم وَ يَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾

❶ ان دونوں اصطلاحات کا معنی اور مفہوم ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ کلام کو ایک اسلوب وطرز کی دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کیا جائے۔

اکثر مفسرین کے نزدیک اس آیت میں ''النسخ'' پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کے اترنے سے پہلے بیوہ غیرِ حاملہ عورت کی عدت ایک سال تک تھی، چونکہ مذکورہ آیت میں اس عدت کو منسوخ کر کے دوسرا حکم دیا گیا جو چار ماہ دس دن پر مشتمل ہے۔اس لئے آیت میں ''النسخ'' موجود ہے۔

﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا (۲۳۴)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''الاختصاص'' واقع ہوا ہے۔ ❷ اس آیت کریمہ میں بیوہ خاتون کی عدت کا حکم بتانے کے لئے چار ماہ دس دن کی تعداد کو خاص کر دیا تاکہ ایک سال کی عدت کو منسوخ کر دیا جائے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''الاختصاص'' واقع ہوا ہے۔

﴿وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا (۲۳۵)﴾

اس آیت کریمہ میں ''کنایۃ'' پایا جاتا ہے۔ ❸ اس میں لفظِ ''سِرًّا'' استعمال ہوا ہے، اس کے معنی اصلی (سرگوشی اور پوشیدہ طور پر باتیں کرنا) ہے، مگر آیت میں اس لفظ سے اس کا لازم معنی یعنی نکاح مراد لیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ مُتَوَفّٰی عَنْھَا سے سرگوشی کرنا پیغام نکاح کو لازم کرتا ہے، آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''کنایۃ'' موجود ہے۔آیت کا مطلب یہ ہے کہ عدت میں عورتوں سے نکاح کا وعدہ نہ کرو۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ (۲۳۵)﴾

ترجمہ: اور نکاح کا عقد پکا کرنے کا اس وقت تک ارادہ بھی مت کرنا جب تک عدت

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آیت سے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا جائے۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکم میں کسی عدد کو خاص کیا جائے اور یہ کسی خاص معنی کی غرض سے ہوتا ہے۔

❸ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا معنی لازم مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا اصلی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

کی مقررہ مدت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے، اور یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرتے رہو، اور یاد رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا بڑا بردبار ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں مسلمان مردوں اور بیوہ عورتوں کو حکم ہوا کہ بیوہ خاتون کی عدت ختم ہونے تک بیوہ کی طرف رغبت رکھنے والا آدمی نکاح کا پختہ ارادہ وعزم نہ باندھے۔ اس میں دورانِ عدت نکاح سے روکنے کے لئے "وَلَا تَعْزِمُوا" بول کر عزمِ نکاح سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ عزمِ نکاح میں بظاہر کوئی حرج نہیں، بلکہ فعلِ نکاح سے روکنا مقصود ہے، اس لحاظ سے "لَا تَنْكِحُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ" بولنا چاہیئے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ "وَلَا تَعْزِمُوا" سے نفی کی گئی ہے، تعبیر کا یہ اسلوب اس لئے اپنایا گیا تاکہ عقدِ نکاح کی ممانعت میں مبالغہ ہو کہ دورانِ عدت تمہیں ارادہ نکاح سے بھی روکا جاتا ہے، جب ارادہ نکاح کی صراحت سے روکا گیا ہے تو فعلِ نکاح کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تعریض" پائی جاتی ہے۔❶ یہاں عزمِ نکاح رکھنے والے مرد کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم ممنوعہ حکم یعنی نکاح کا ارادہ اپنے دل میں رکھتے ہو، حالانکہ اللہ رب العزت جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے سب کو جانتا ہے، یہ نہیں کہا کہ تمہارے دل میں عزمِ نکاح کو جانتا ہے، بلکہ فرمایا: جو کچھ ہے وہ جانتا ہے، جب سب کچھ جانتا ہے تو عزمِ نکاح کو بھی جانتا ہے، مگر اس کی وضاحت نہیں کی، بلکہ بندے کی حالت دیکھ کر کلام کا رخ دوسری جانب کر کے مقصد کو واضح کر دیا، اس لئے آیت میں "تعریض" موجود ہے۔

﴿أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "فَاحْذَرُوهُ" فعل امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، فعل امر اصل میں

❶ تعریض وہ کنایہ ہے جس میں کلام کو کسی ایک جانب مائل کر دیا جائے، یعنی اس میں اشارہ ایک جانب ہو اور مراد دوسری جانب ہو، تعریض کے لئے سیاق کلام کا سہارا لیا جاتا ہے۔

اس لئے وضع کیا گیا تا کہ متکلم خود کو بڑا سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرے، مگر کبھی کبھی فعلِ امر کا صیغہ اس معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ان میں سے ایک معنی "تھدید" ہے۔ (1) یہاں بھی "فَاحْذَرُوهُ" فعل اپنے اصل معنی کے لئے مستعمل نہیں بلکہ یہ بھی مخاطب کو دھمکانے کے لئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ تم دورانِ عدت عزمِ نکاح سے اجتناب کرو، ورنہ تمہیں اس کی سزاء بھگتنا پڑے گی۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "غَفُورٌ" (فَعُولٌ) کے وزن پر اور "حَلِيمٌ" (فَعِيلٌ) کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں، یہ دونوں مبالغہ کے وزن پر اس لئے لائے گئے تا کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ مغفرت اور صفت بردباری میں مبالغہ کو بیان کیا جائے۔آیت کا مطلب یہ ہے دورانِ عدت عزم نکاح سے جو تم سے گناہ ہوئے ہیں، استغفار کریں، اللہ رب العزت بہت بخشنے والے ہیں، اور بردبار ہیں فوراً سزا نہیں دیتے بلکہ مہلت دیتے ہیں، مغفرت کرنے والے اور بہت زیادہ بردباری کرنے والے ہیں۔

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (۲۳۸)﴾

ترجمہ: تمام نمازوں کا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا اور اللہ کے سامنے باادب فرمانبردار بن کر کھڑے ہوا کرو۔

اس آیت کریمہ میں "حَافِظُوا" (فَاعِلُوا) کے وزن پر باب مفاعلہ سے جمع مذکر حاضر فعلِ امر کا صیغہ ہے، اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مؤمنین کو نماز کی پابندی اور نماز کے التزام کا حکم دیا ہے۔اس حکم کو بیان کرنے کے لئے آیت میں "حَافِظُوا" مزید کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ اس حکم کو بیان کرنے کے لئے مجرد کے باب سے "اِفْعَلُوا" کے وزن پر "اِحْفَظُوا" بھی لایا جا سکتا تھا، مگر آیت میں "اِحْفَظُوا" چھوڑ کر "حَافِظُوا" کا

---

(1) تہدید کا مطلب یہ ہے کہ فعلِ امر کے ذریعہ کسی کو دھمکی دی جائے۔

استعمال گیا نماز کی پابندی اور محافظت کے حکم میں مبالغہ اور زیادتی کے لیے ہے، اس لیے کہ ''**كثرة الألفاظ تدل على كثرة المعانی**''۔

اس آیتِ کریمہ میں "ذکر الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے، یہاں آیت میں پہلے "الصَّلَوَاتِ" کہہ کر تمام نمازوں کا ذکر کیا گیا جو کہ عام ہے۔ یہ عام اس لئے ہے کیونکہ اس میں صلاۃِ وسطیٰ سمیت تمام نمازیں شامل ہیں، آیت میں اس عام کو ذکر کرنے کے بعد "الصَّلَاةِ الْوُسْطَى" بول کر اس عام میں داخل ایک خاص نماز کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے عصر کی نماز یا مغرب کی نماز مراد ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "ذکر الخاص بعد العام" پایا جاتا ہے۔ یہاں عام (تمام نمازوں) میں "الصَّلَاةِ الْوُسْطَى" کے داخل ہونے کے بعد اس کو دوبارہ مستقل اس لئے بیان کیا تا کہ صلوٰۃ وسطیٰ کی فضلیت و مرتبہ اور اس کی اہمیت کو بیان کیا جائے۔

﴿**فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲۳۹)**﴾

ترجمہ: اور اگر تمہیں (دشمن کا) خوف لاحق ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار ہونے کی حالت ہی میں (نماز پڑھ لو) پھر جب تم امن کی حالت میں آ جاؤ تو اللہ کا ذکر اس طریقے سے کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں دو شرطیہ جملے بیان ہوئے ہیں:

نمبر ۱: "فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا"۔

نمبر ۲: "فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ"۔ ان دونوں جملوں میں بلاغت کے عمدہ نکات موجود ہیں، آیت میں پہلے شرطیہ جملہ میں "إِنْ" اور دوسرے شرطیہ جملے میں "إِذَا" استعمال ہوئے ہیں۔ حروفِ شرطیہ کا یہ اختلاف کس لئے ہوا ملاحظہ ہو، پہلے جملہ میں "إِنْ" شرطیہ اس لئے استعمال ہوا تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ قتل اور خوف کا وقوع

عمومی طور پر نہیں ہوتا۔ دوسرے جملہ میں "إِذَا" شرطیہ اس لئے استعمال ہوا تا کہ یہ بتائے جائے کہ امن کا وقوع اور امن کی کثرت زیادہ تر متحقق ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ پہلی شرط کا جوابِ شرط اپنے اندر "ایجاز بالحذف" رکھتا ہے۔ اس جملہ میں "فَرِجَالًا" سے پہلے "فَصَلُّوا" کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں "فَإِنْ خِفْتُمْ فَصَلُّوا رِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو وقتِ نماز میں دشمن کا خوف ہو تو پیادہ یا سواری کی حالت میں ہی نماز پڑھ لیا کرو، اس جملہ سے چونکہ "فَصَلُّوا" کا لفظ حذف کر دیا گیا اور اس محذوف لفظ کی تعیین "فَرِجَالًا" کی "فا" شرطیہ سے ہو جاتی ہے، اس لئے اس جملہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرے جملہ شرطیہ کے جوابِ شرط میں "اطناب" پایا جاتا ہے جو ایجاز حذف کی ضد ہے۔ ❶ یہاں جوابِ شرط میں معنیٰ مقصود صرف یہ بتاتا ہے کہ اگر تم حالتِ امن میں ہو تو نماز ایسے پڑھو جیسے تمہیں نماز پڑھنے حکم دیا گیا ہے۔ اس معنیٰ مقصود کو ادا کرنے کے لئے "فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ" تک کا جملہ کافی ہے، لیکن آیت میں اس معنیٰ مقصود کو ادا کرنے کے لئے "مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ" کی زائد عبارت لائی گئی تا کہ اس زائد عبارت سے معنیٰ مقصود کی خوب تاکید ہو، اس سے واضح ہوا کہ دوسرے جوابِ شرط میں "اطناب" پایا جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک ہی آیت میں دو مختلف شرطیہ الفاظ کا انتخاب کیا، پھر اس سے حاصل ہونے والے نکات اور اسی طرح ان الفاظ میں سے ہر ایک کے جواب میں دو متضاد اصطلاحات کو جمع کرنا سب وہ اعجاز ہیں جس نے عالم انسانیت کے بڑے بڑے ادیبوں، بلغاء اور فصحاء کو قرآن کے کے سامنے عاجز ہونے پر مجبور کر دیا۔

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (۲۳۸)

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنیٰ مقصود کو اس سے زائد عبارت لا کر بیان کیا جائے اور وہ زائد عبارت کسی غرض ومقصد کے تحت ہو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲۳۹)﴾

یہاں لفظِ "حَافِظُوا" اور "خِفْتُمْ" کے معنوں میں تقدیری طور پر "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "حَافِظُوا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم حالت امن میں ہو تو نماز کی حفاظت کرو اور اسے اپنے وقت پر پڑھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "حَافِظُوا" کے لفظ میں تقدیری طور پر امن کا معنی پایا جاتا ہے۔ اور "خِفْتُمْ" کا معنی ہے حالت خوف میں ہونا۔ یہ دونوں معانی (امن میں ہونا اور حالت خوف میں ہونا) ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "طباق" موجود ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہاں "خِفْتُمْ" کے بعد "مِنَ الْعَدُوِّ وَسَبُعٍ" کے جملہ محذوف ہیں، یہ اصل میں "فَإِنْ خِفْتُمْ مِنَ الْعَدُوِّ وَالسَبُعِ فَصَلُّوا رِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں درندے یا دشمنوں کا خوف ہو تو تم پیدل یا سواری کی حالت میں نماز پڑھ لیا کرو، آیت میں چونکہ "مِنَ العَدُوِّ وَالسَبُعِ" کا جملہ حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔

﴿فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ﴾

اس آیت کریمہ میں "تشبیہ مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں نماز پڑھنے کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعلیم کے مشابہ پڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں نماز پڑھنا "مشبہ" اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم "مشبہ بہ" ہے۔ اس تشبیہ میں چونکہ "كَمَا عَلَّمَكُمْ" میں (کاف) حرفِ تشبیہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ مرسل" موجود ہے۔

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

❷ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرفِ تشبیہ مذکور ہو۔

﴿كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "عَلَّمَ اور تَعْلَمُونَ" کے درمیان "جناس مماثل" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "عَلَّمَ" اور "تَعْلَمُونَ" دونوں فعل ہونے کی وجہ سے ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "جناس مماثل" موجود ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۴۰)﴾

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جایا کریں کہ ایک سال تک وہ (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نکالا نہیں جائے گا، ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں قاعدے کے مطابق وہ جو کچھ بھی کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، اور اللہ صاحب اقتدار بھی ہے، صاحب حکمت بھی۔

اس آیتِ کریمہ کے متعدد مقامات میں "ایجاز بالحذف" موجود ہے، یہاں "غَيْرَ إِخْرَاجٍ" کے بعد "لَهُنَّ مِنْ مَكَانِهِنَّ الَّذِي يَعْتَدُدْنَ فِيهِ" کا جملہ۔ "فَإِنْ خَرَجْنَ" کے بعد "مِنْ بُيُوتِهِنَّ مِنْ رَضَاءِ مِنْهُنَّ" کا جملہ۔ "فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ" کے بعد "مِنْ مَبْلَغِهِنَّ اِلَى التَّزْوِيجِ اَوْ الزِّيْنَةِ بَعْدَ اِنْقِضَاءِ الْمُدَّةِ" کا جملہ۔ "عَزِيزٌ" کے بعد "فِي اِنْتِقَامِهِ" کا جملہ، اسی طرح "حَكِيمٌ" کے بعد "فِي اَحْكَامِهِ" کا جملہ محذوف ہے۔ یہ اصل میں "وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ لَهُنَّ مِنْ مَكَانِهِنَّ الَّذِي يَعْتَدُدْنَ فِيهِ فَإِنْ خَرَجْنَ مِنْ بُيُوتِهِنَّ مِنْ رَضَاءِ

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے دو کلموں میں مشابہت پائی جائے، یعنی دو اسموں، دو حرفوں یا دو فعلوں کے درمیان "جناس" پایا جائے۔

مِنهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيُكُمُ فِى مَا فَعَلْنَ فِى أَنُفُسِهِنَّ مِنُ مَبْلِغِهِنَّ اِلَى التَّزُوِيجِ اَوُ الزِّينَةِ بَعدَ انُقِضَاءِ الُمُدَّةِ مِنُ مَعُرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ فِى اِنتِقَامِه حَكِيمٌ فِى اَحُكَامِه" تھا۔ (اس پوری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جولوگ تم میں سے مرجائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کرجائیں کہ ان کوایک سال تک کا خرچہ دے دیا جائے اور ان کواس گھر سے نہ نکالا جائے جس میں یہ عدت گزار رہی ہیں، ہاں اگر وہ اپنی رضامندی سے اپنے گھروں سے نکل جائیں اور اپنے حق میں عدت گذارنے کے بعد بیاہ وزینت اختیار کرنا چاہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اللہ انتقام لینے میں غالب اور احکام بیان کرنے میں حکمت والے ہیں۔) اس آیت سے چونکہ متعدد الفاظ اور جملے حذف کردیئے گئے ہیں اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿غَيُرَ إِخُرَاجٍ فَإِنُ خَرَجُن﴾

یہاں لفظِ "إِخُرَاجٍ" اور لفظِ "خَرَجُنَ" کے درمیان "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "إِخُرَاجٍ " اسم اور "خَرَجُنَ" فعل ہے، اس لئے یہ دونوں علیحدہ علیحدہ نوع کے کلمات ہیں، چونکہ ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے اس میں "جناس مغائر" موجود ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوُنَ مِنكُم﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "يُتَوَفَّوْنَ" بطور "مجاز" استعمال ہوا ہے۔ ❷ یہاں "يُتَوَفَّوْنَ" کا معنی موضوع لہ (حقیقی معنی) مرنے کے ہے۔ یہ معنی آیت میں مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہاں وصیت کی بات چل رہی ہے اور مرنے کے بعد وصیت کا تصور ہی ممکن نہیں،

❶ جناس مغائر وہ جناس ہے جو دو علیحدہ علیحدہ نوع کے کلموں میں پایا جائے، یعنی حرف واسم، حرف وفعل، یا فعل واسم کے درمیان۔

❷ مجاز یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا معنی موضوع لہ یعنی حقیقی معنی مراد نہ لیا جائے، بلکہ غیر موضوع لہ مراد ہو۔

اس لئے یہ لفظ اپنے حقیقی معنی کے لئے مستعمل نہیں، بلکہ یہ لفظ معنی غیر موضوع لہ کے لئے استعمال ہوا ہے اور وہ معنی (قریب الموت ہونا) ہے۔ چونکہ آیت میں لفظ بول کر اس کا معنی غیر موضوع لہ مراد لیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز" موجود ہے۔ آیت میں مجازی معنی مراد لینے کی صورت میں مفہوم بالکل واضح ہوگا۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ "اے لوگوں تم مرنے کے قریب ہو جاؤ اور تمہاری بیویاں رہ جائیں تو ان کے لئے وصیت کرلو"۔

﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲۴۱)﴾

ترجمہ: اور مطلقہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا متقیوں پر ان کا حق ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی "ایجاز بالحذف" موجود ہے۔ یہاں "بِالْمَعْرُوف" کے بعد "عَادَةً" یا "شَرْعاً" کے الفاظ۔ "حَقًّا" کے بعد "حَقَّ ذَلِكَ" کا جملہ۔ اسی طرح "الْمُتَّقِينَ" کے بعد "مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ" کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ اصل میں "وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوف عَادَةً اَوْ شَرْعاً حَقًّا حَقَّ ذَلِكَ عَلَى الْمُتَّقِين مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ" تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو دستور کے مطابق عادۃً یا شرعاً نان نفقہ دینا چاہئے۔ اور اللہ کے عذاب سے ڈرنے والوں پر یہ حق ثابت ہو چکا ہے۔ اس آیت کریمہ سے چونکہ "عَادَةً، حَقَّ ذَلِكَ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ" کے الفاظ حذف کردئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے، ایک مرتبہ "مَتَاعًا" کا ذکر آیت نمبر ۲۴۰ میں ہوا، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں دوبارہ "مَتَاعٌ" کا لفظ لایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تکرار" پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تاکہ حکم متعہ یعنی نان، نفقہ، کسوہ کے بارے میں شوہروں کو خوب تاکید کی جائے۔ اس تکرار سے تاکید اس صورت میں ہوگی جب دونوں مقام میں مطلقہ عورتوں سے ایسی عورتیں مراد ہوں جو مدخول بہا ہوں۔ اگر

پہلی آیت میں عورت سے مدخول بہا اور دوسری آیت میں غیر مدخول بہا مراد ہوتو یہ تکرار تاکید کے لئے نہیں بلکہ دونوں معنوں میں اختلاف کی وجہ سے واقع ہوگا۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ (۲۴۳)﴾

ترجمہ: کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا جو موت سے بچنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے؟

اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں ہمزہ استفہامیہ واقع ہوا ہے، حروفِ استفہام اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی حروفِ استفہامیہ اپنے اصل معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی "تعجب" کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ تعجب کا معنی لیا جائے۔ یہاں بھی ہمزہ استفہام اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ تعجب کے لئے ہے، تعجب کی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ "اے نبی وہ بنی اسرائیل جو اپنے گھروں سے جہاد کے ڈر سے بھاگ گئے پھر انہیں موت آئی، پھر انہیں زندگی ملی تو اس وقت ان کی حالت بہت عجیب تھی"۔

﴿فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ (۲۴۳)﴾

ترجمہ: چناچہ اللہ نے ان سے کہا: مرجاؤ، پھر انہیں زندہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بہت فضل فرمانے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

اس آیتِ کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں لفظِ "اللّٰہ" سے پہلے "مَلَكٌ" مضاف اور لفظِ "اللّٰہ" کے بعد "بِاذْنِهِ" کا لفظ محذوف ہے۔ اسی طرح "مُوتُوا" کے بعد "فَمَاتُوا" کا جملہ اور "لَا يَشْكُرُونَ" کے بعد ضمیر محذوف ہے۔ اصل میں "فَقَالَ

لَهُمُ مَلَكُ اللّٰهِ بِإذْنِه مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمُ إِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَه" تھا۔اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے جہاد سے بھاگنے والوں کو اللہ کے فرشتہ نے اللہ کے حکم سے کہا کہ مرجاؤ، اس پر بنی اسرائیل مرگئے، پھر اللہ نے انہیں زندہ کیا، بے شک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والے ہیں، مگر اکثر لوگ اس کی شکر گزاری نہیں کرتے، اس آیت سے چونکہ چند الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں۔اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ﴾

اس آیت کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے، یہاں ایک مرتبہ "عَلَى النَّاسِ" کے ساتھ لفظِ "النَّاس" کو ذکر کیا گیا، پھر اسی آیت میں "أَكْثَرَ النَّاس" بول کر لفظِ "النَّاس" کا اعادہ کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تکرار" موجود ہے، یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تاکہ آیت کے مضمون میں خوب مبالغہ وتاکید پیدا ہو۔

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۴۴) وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۴۵)﴾

ترجمہ: اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو، اور یقین رکھو کہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اور اللہ ہی تنگی پیدا کرتا ہے، اور وہی وسعت دیتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹایا جائے گا۔

ان دونوں جملوں میں "ایجاز بالحذف" پایا جاہے، یہاں لفظِ "سَمِيعٌ" کے بعد "لَاقْوَالِكُمْ" اور "عَلِيمٌ" کے بعد "بِاعْمَالِكُمْ" کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ اصل میں "وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ لَاقْوَالِكُمْ عَلِيمٌ بِاعْمَالِكُمْ" تھا۔مطلب یہ ہے کہ لوگوں جان لو کہ اللہ تمہاری باتوں کو سننے والا اور تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے۔ چونکہ اس جملہ

سے ''لَاَقْوَالِکُمْ'' اور ''بِاَعْمَالِکُمْ'' کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔ اسی طرح اگلے جملہ میں ''تُرْجَعُونَ'' کے بعد ''فَیُجَازِیٰ کُلًّا بِمَا عَمِلَ'' کا جملہ محذوف ہے۔ یہ اصل میں '' وَإِلَیْہِ تُرْجَعُونَ فَیُجَازِیٰ کُلًّا بِمَا عَمِلَ'' تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، بس اس کے بعد ہر ایک کو اپنے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، اس جملہ سے بھی چونکہ ''فَیُجَازِیٰ کُلًّا بِمَا عَمِلَ'' کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں بھی ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔

﴿مُوتُوا ثُمَّ أَحْیَاھُمْ...... یَقْبِضُ وَیَبْسُط (۲۴۵)﴾

یہاں لفظ ''مُوتُوا'' اور ''أَحْیَا'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''مُوتُوا'' مرنے کے معنی میں ہے۔ اور ''أَحْیَا'' زندہ کرنے کے معنی میں ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔ اسی طرح ''یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ''یَقْبِضُ'' کا معنی تنگ رزق کے ہے اور ''یَبْسُطُ'' کا معنی کشادگی رزق کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے معنوں میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿وَلَکِنَّ أَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُونَ......وَقَاتِلُوا فِی سَبِیلِ اللَّہِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّہَ سَمِیعٌ عَلِیمٌ (۲۴۴)﴾

یہاں دوسری آیت میں ''التفات من الغیبۃ إلی الخطاب'' پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلی آیت میں لوگوں کے لئے ''یَشْکُرُون'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے، یہ غائب کا لفظ ہے۔

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

اس کے مطابق اگلی آیت میں بھی غائب کے الفاظ ہونے کے چاہیے تھے،مگر اس میں غائب کی جگہ "قَاتِلُوا" اور "وَاعْلَمُوا" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو خطاب کے الفاظ ہیں،اس سے واضح ہوا کہ دوسری آیت میں "التفات من الغيبة إلى الخطاب" موجود ہے، یہ التفات اس لئے واقع ہوا تا کہ سامع کو انداز واسلوب کی تبدیلی سے لطف آئے اور سامع کی توجہ سماعت پر برقرار رہے، اور آنے والے احکامات کا اپنے آپ کو مخاطب سمجھ کر توجہ سے سن کر عمل کرے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۴۵)﴾

ترجمہ: کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تا کہ وہ اسے اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدر جہا زیادہ ہو جائے؟ اور اللہ ہی تنگی پیدا کرتا ہے، اور وہی وسعت دیتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹایا جائے گا۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية و تبعية" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور اس کا بدلہ پانے کو حقیقی طور پر قرض دینے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور اس کا بدلہ پانا "مشبه" اور حقیقی قرض دینا "مشبه به" ہے، ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح قرض دے کر قرض دوبارہ وصول کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے بعد اجر وثواب کی شکل میں اس مال کا بدلہ وصول کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ شبہ کی بنیاد پر مذکورہ "استعارة" واقع ہوا ہے، چونکہ آیت میں "يُقْرِضُ" بول کر "مشبه به" کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجودہ ہے۔ اسی طرح آیت میں "استعارة تبعية" بھی موجود ہے۔ ❷

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں "مشبه به" کی صراحت لفظوں میں موجود ہو۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

یہاں ''یُقْرِضُ'' فعل مشتق ہے، چونکہ اس میں ''استعارة'' واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تبعية'' موجود ہے۔

﴿قَرْضًا حَسَنًا﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''قَرْضًا'' مصدر کی صفت ''حَسَنًا'' بول کر لائی گئی ہے، جب کسی شئی کو صفت کے ساتھ مختص کیا جاتا ہے تو اس شئی میں تاکید آجاتی ہے۔ یہاں بھی ''حَسَنًا'' صفت کے ذریعہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مال کے بارے میں تاکید کی گئی ہے، یعنی جس قدر اخلاص کے ساتھ خرچ کرے گا، اُسی قدر اس کا بدلہ پائے گا۔

﴿فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''يُضَاعِفَ'' اور ''أَضْعَاف'' کے درمیان ''جناس مغائر'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''يُضَاعِفَ'' فعل اور ''أَضْعَاف'' اسم ہے۔ اس لئے یہ دونوں علیحدہ علیحدہ نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ''جناس مغائر'' موجود ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ''يَبْسُطُ'' فعل کو ''يَقْبِضُ'' فعل کے بعد لاکر کشادگی رزق کا ذکر مؤخر کیا ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ فقیر کو تسلی ملے کہ اللہ سبحانہ فقر وفاقہ اور ناگفتہ حالی کے بعد فروانی عطا فرماتے ہیں، لہٰذا تنگدست آدمی پریشان نہ ہو، تکلیف کے بعد راحت آتی ہے، اور عسر کے بعد اللہ رب العزت یُسر لاتا ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ

❶ جناس مغائر وہ ہے جو دو علیحدہ علیحدہ نوع کے کلموں میں پایا جائے، یعنی حرف واسم یا حرف وفعل یا فعل واسم کے درمیان۔

أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ(۲۴۶)﴾

ترجمہ: کیا تمہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے گروہ کے اس واقعے کا علم نہیں ہوا جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرر کردیجیے تاکہ (اس کے جھنڈے تلے) ہم اللہ کے راستے میں جنگ کرسکیں۔ نبی نے کہا: کیا تم لوگوں سے یہ بات کچھ بعید ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم نہ لڑو؟ انہوں نے کہا: بھلا ہمیں کیا ہوجائے گا جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ نہ کریں گے، حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پاس سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ پھر (ہوا یہی کہ) جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پیٹھ پھیر گئے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے، یہاں "إِلَى" کے بعد "قِصَّة" کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں "أَلَمْ تَرَ إِلَى قِصَّةِ الْمَلَإِ" تھا۔ اس جملہ سے چونکہ "قِصَّة" کا لفظ حذف کردیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ﴾

اس میں بھی "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے، یہاں اس جملہ سے پہلے "فَسَأَلَ اللّٰهُ ذَلِكَ النَّبِيُّ فَكَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ وَبَعَثَ مَلِكاً فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا" تھا۔ جس کا مطلب یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے نبی نے اللہ سے سوال کیا، اللہ نے ان بنی اسرائیل پر جہاد کو فرض کردیا اور ان کے لئے ایک بادشاہ کو بھیجا، جیسے ہی ان پر قتال فرض ہوا تو وہ لوگ جہاد سے منہ موڑنے لگے۔ اس آیت سے چونکہ "فَسَأَلَ اللّٰهُ ذَلِكَ النَّبِيُّ فَكَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ وَبَعَثَ مَلِكاً" کا جملہ حذف کردیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿قَالَ إِنَّ اللَّـهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۲۴۷)﴾

ترجمہ: نبی نے کہا: اللہ نے ان کو تم پر فضیلت دے کر چنا ہے اور انہیں علم اور جسم میں (تم سے) زیادہ وسعت عطا کی ہے، اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "وَاللَّـهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" والا جملہ کس کا قول ہے؟ اس بارے میں دو احتمال ہیں:

نمبر۱: یہ جملہ "إِنَّ اللَّـهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" کی طرح بنی اسرائیل کے نبی یوشع بن نون یا حضرت شمویل علیہ السلام کا کلام ہے، جنہوں نے بنی اسرائیل کو جہاد کی ترغیب دی، ظاہری طور پر یہ ان ہی کا قول معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر نے چونکہ بنی اسرائیل میں تعنت، حجت بازی، طالوت کے بادشاہت کا انکار، اسی طرح جہاد سے فرار ہونے کی قوی دلیل دیکھی تھی، اس لئے انہوں نے یہ جملہ کہا، مطلب یہ ہے کہ اے لوگوں! تم کس طرح طالوت کی بادشاہت سے انکار کرتے ہوئے اور جہاد سے فرار ہوتے ہو، حالانکہ رب نے خود ہی بادشاہت کے لئے طالوت کو چنا، بادشاہی کے لئے علم وجسم کی ضرورت ہوتی ہے، ان اوصاف سے بھی اللہ نے طالوت کو وافر حصہ نصیب کیا۔ سنو! اللہ جسے چاہے بادشاہت عطا کرے، وہ بڑی وسعتوں والا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون اس کا حقدار ہے۔ یہ پہلے احتمال کی تفصیل ہے۔

نمبر۲: یہاں دوسرا احتمال یہ ہے کہ "وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" کا جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ کا کلام ہے، اس احتمال کے مطابق یہ کلام بنی اسرائیل کے قصہ کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے ہے۔ یہاں چونکہ بنی اسرائیل اور ان کے نبی کا

کلام چل رہا تھا، اس کلام کے درمیان "وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" بول کر اللہ سبحانہ کا قول ذکر کر دیا گیا ہے، اس لئے یہ جملہ معترضہ کے قبیل سے ہے۔ یہ جملہ معترضہ اس لیے لایا گیا تا کہ اس بات میں سختی اور قوت حاصل ہو کہ بادشاہت اللہ جسے چاہے عطا فرماتا ہے، جب اللہ سبحانہ اپنی تمام مملوکہ شئی کے اکیلئے متصرف ہیں، تو بادشاہت کا تصرف بھی اُسی کو ہے، اس لئے اللہ جس کو چاہے بادشاہ بنا دے، اُسے مشورہ دینے کی ضرورت نہیں، وہ "علیم" ہے، خوب جانتا ہے کہ کون حقدار ہے۔

﴿مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۲۴۸)﴾

ترجمہ: اور موسیٰ اور ہارون نے جو اشیاء چھوڑی تھیں ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں، اسے فرشتے اٹھائے ہوئے لائیں گے، اگر تم مؤمن ہو تو تمہارے لیے اس میں بڑی نشانی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون سے ان بزرگ ہستیوں کی ذات مراد ہے، ان کے خاندان، اہل وعیال مراد نہیں۔ اس اعتبار سے یہاں لفظِ "آل" زائد ہے، کیونکہ لفظِ "آل" کے بغیر بھی ان کے ذات کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ زائد کلمہ ان انبیاء علیہم السلام کی بھرپور عظمت اور تحسین کلام کے لیے ہے۔

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾

اس آیتِ کریمہ کے مخاطبین متعدد ہیں، اس لحاظ سے آیت میں "ذَلِكَ" اسم اشارہ مفرد کے بجائے "ذَلِكُمْ" جمع کا لفظ ہونا چاہیے تھا، مگر آیت میں مخاطبین کے تعدد کے باوجود "ذَلِكَ الفَرِيقُ" کی تاویل میں کر کے "ذَلِكَ" مفرد لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "الفریق" چونکہ لفظی طور پر مفرد ہے، تو لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے "ذَلِكَ" مفرد لایا گیا ہے، یا یہ ہے کہ

یہاں مخاطب جدا جدا ہے۔ ”ذٰلِكَ“ کا مخاطب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے یہ مفرد لایا گیا ہے، اور ”لَكُمْ“ کا خطاب عام ہے، اس لئے اس کو جمع لایا گیا۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۲۵۰)﴾

ترجمہ: اور جب یہ لوگ جالوت اوراس کے لشکروں کے آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار صبر واستقلال کی صفت ہم پر انڈیل دے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے اور ہمیں اس کافر قوم کے مقابلے میں فتح ونصرت عطا فرمادے۔

اس آیتِ کریمہ میں ”استعارة تمثيلة“ پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں بنی اسرائیل کو صبر دیئے جانے کی حالت کو اس حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں کسی شخص کے جسم پر پانی ڈالا جائے، جس طرح پانی ڈالنے سے انسان کا ظاہر وباطن ایک فرحت محسوس کرتا ہے، بالکل اسی طرح صبر سے اِن کے ظاہر وباطن کو راحت، سلامتی اور ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے، صبر کا تعلق دل سے ہوتا ہے، لیکن یہاں تعبیر اختیار کی گئی کہ گویا پورے جسم پر صبر کو انڈیل دے، یعنی قلب وجوارح تمام میں ثابت قدمی ہو۔ جس طرح جسم پر پانی انڈیلا جائے تو پورا جسم تر ہوجاتا ہے، اسی طرح گویا صبر بھی ایک محسوس شے ہے، جسے جسم پر انڈیلا جائے تو ہر ہر عضو میں ثابت قدمی آجائے، چونکہ یہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ ہے، اس لئے آیت میں ”استعارة تمثيلة“ پایا جاتا ہے۔

﴿وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”كناية“ پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ”ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا“ کا اصلی معنی

❶ استعارہ تمثیلہ یہ ہے کہ مرکب حالت کو دوسری مرکب حالت سے تشبیہ دی جائے۔

❷ کنایۃ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا معنی اصلی یعنی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

(ثابت قدمی) ہے، مگر آیت میں اس لفظ سے ثابت قدم ہونے کا لازم معنی مراد ہے اور وہ ہے شجاعت و بہادری۔ ثابت قدمی کو بہادری لازم ہے، جب کوئی ثابت قدم ہوگا تو وہ لازمی طور پر شجاع و بہادر ہوگا۔ تب ہی اس کے قدم میدانِ جنگ میں جمیں گے، اگر بزدل ہوگا تو دائیں بائیں بھاگے گا تو قدم اکھڑ جائیں گے، آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا ہے، اس لئے اس میں "کنایة" پایا جاتا ہے۔

﴿تِلْکَ آیَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ وَإِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِینَ (۲۵۲)﴾

ترجمہ: یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں، اور آپ بیشک ان پیغمبروں میں سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

اہلِ بلاغت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی بات یا عنوان کو کبھی زور اور قوت دے کر بیان کرتے ہیں، اسے بلاغت کی اصطلاح میں "تاکید" کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تاکید اور قوت کیساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کے لئے آیت میں تین تاکیدات لائی گئی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

نمبر۱: "إِنَّ" حرف تاکید۔

نمبر۲: "لَمِنَ" میں لام تاکید۔

نمبر۳: جملہ اسمیہ جو استمرار و تاکید کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

ان تینوں تاکیدات سے آیت میں عزت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو پختہ کر کے بیان کیا گیا ہے، "المرسلین" جمع لا کر اشارہ کیا ہے کہ رسولوں کی بعثت کوئی نئی بات نہیں، آپ سے پہلے بھی رسول ہیں، اور آپ بھی اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے ہیں۔ اس آیت میں "علیك" اور "إنك" میں ضمیر مفرد اور "المرسلین" صیغہ جمع کے ساتھ آپ کی عظمت کا اظہار ہے۔

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (۲۵۳)﴾

ترجمہ: یہ پیغمبر جو ہم نے (مخلوق کی اصلاح کے لیے) بھیجے ہیں، ان کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا، اور ان میں سے بعض کو اس نے بدرجہا بلندی عطا کی اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی مدد فرمائی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ اپنے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے خود اختلاف کیا، چناچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جو ایمان لائے اور کچھ وہ جنہوں نے کفر اپنایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تِلْكَ" اسم اشارہ استعمال کیا گیا ہے، یہاں انبیاء ومرسلین کی طرف اشارہ کرنے کے لئے "تِلْكَ" اسم اشارہ بعید کا اس لئے لایا گیا تا کہ یہ بتلایا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام ومرتبہ بہت بلند وبالا ہے، اور اس تک انسان اپنی محنت وکسب سے نہیں پہنچ سکتا ہے، یہ محض رب العالمین کا انتخاب ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اس آیت میں مشارالیہ "الرُّسُل" جمع ہے، مگر اس کے لئے اسم اشارہ "تِلْكَ" واحد مؤنث لایا گیا ہے، ایسا اس لئے ہوا کیونکہ "الرُّسُل" جمع مکسر ہے اور جمع مکسر کا حکم یہ ہے کہ جب کبھی اس کی صفت، ضمیر یا اسم اشارہ وغیرہ لانا ہو تو اس کے لئے واحد مؤنث کی صفت، ضمیر یا اسم اشارہ لایا جاتا ہے، یہاں بھی "الرُّسُل" جمع مکسر کے لئے اس کے حکم کے مطابق اسم اشارہ واحد مؤنث کا لایا گیا ہے۔ "الرُّسُل" کو جمع مکسر لانے میں بھی دو اغراض مقصود ہیں:

نمبر۱:"الرُّسُل"،جمع مکسر اس لئے لایا گیا تا کہ عبارت میں اختصار ہو۔

نمبر۲:"الـرُّسُـل"،جمع مکسر اس لئے لایا گیا تا کہ عبارت میں تکرار نہ آئے،اگر یہاں "تِلْكَ الرُّسُل" کہہ کر جمع مکسر سے جملہ بیان نہ کرتے،بلکہ اس کی جگہ جمع سالم لاکر "اُولٰئِكَ الْـمُرْسَلُوْنَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ" بولتے تو جملہ طویل ہو جاتا،اور اس صورت میں یہ الفاظ "تِـلْكَ الـرُّسُل" کے الفاظ سے زیادہ ہوتے۔اسی طرح اس میں ضمائر کا بھی تکرار آتا،ان سے بچنے کی غرض سے آیت میں جمع مکسر کا انتخاب ہوا ہے۔

﴿وَ لَـكِـنَّ الـلَّـهَ ذُو فَـضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲۵۱) فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (۲۵۳)﴾

یہاں دوسری آیت میں "التفات من الغيبة الى التكلم" پایا جاتا ہے۔یہاں آیت نمبر ۲۵۱ میں لفظِ "الـلّٰه"،یعنی اسمِ ظاہر کا استعمال ہوا ہے،اسم ظاہر الفاظ غائب کے قبیل سے ہے،اس لحاظ سے اگلی آیت میں "فَـضَّـلْـنَـا"،کی جگہ "فَـضَّل" بول کر غائب کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے تھا،مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کے الفاظ کو چھوڑ کر "فَضَّلْنَا"، جمع متکلم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التـفـات من الغيبة إلى التكلم" موجود ہے، یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ سامع قرآن کریم کے بدلتے انداز سے لطف اندوز ہو اور تفصیلِ رسل پر ایمان لائے،جس کی وضاحت رب العالمین نے کی ہے،اور اپنے عقلی گھوڑے نہ دوڑائے۔

﴿تِـلْـكَ الـرُّسُـلُ فَـضَّـلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَـعْـضَـهُـمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَـاءَ الـلَّـهُ مَـا اقْتَتَـلَ الَّـذِيـنَ مِـنْ بَـعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنِ اخْتَـلَـفُـوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (۲۵۳)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''التقسیم'' پائی جاتی ہے۔❶ یہاں پہلے ''فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ'' بول کر اللہ سبحانہ نے انبیاء ورسل کی بعض کو بعض پر ملنے والی فضلیت کو بیان کیا، پھر اس کے بعد ''مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ'' بول کر فضلیت کی تمام اقسام یعنی اللہ سے کلام کا شرف حاصل کرنا، درجات کی بلندی، معجزات کے ذریعہ تائید وغیرہ حاصل کرنے کو بیان کیا گیا ہے، چونکہ اس آیت میں فضلیت کے تمام اقسام کو بیان کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ''تقسیم'' پائی جاتی ہے۔اسی طرح آیت کے اگلے جملے ''وَلَكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ'' میں بھی ''تقسیم'' پائی جاتی ہے، وہ اس طرح کہ اس جملہ میں ''اخْتَلَفُوا'' بول کر لوگوں کے اختلاف کرنے کو بیان کیا گیا، پھر اس کے بعد ''فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ'' بول کر اختلاف کی تمام اقسام کو بیان کر دیا گیا ہے، بعض لوگوں نے تو ہدایت آنے کے بعد مسلمان ہو کر اختلاف ظاہر کیا اور بعضوں نے کافر ہو کر، چونکہ اس جملہ میں اختلاف کی تمام اقسام بیان کی گئی ہیں، اس لئے آیت میں ''تقسیم'' پائی جاتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے جملہ ''مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ'' میں ''التفات من التكلم إلى الغيبة'' پایا جاتا ہے، یہاں پہلے ''فَضَّلْنَا'' کا لفظ لایا گیا ہے جو تکلم کا لفظ ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں ''كَلَّمَ اللَّهُ'' کی جگہ ''كَلَّمْنَا'' بول کر متکلم کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر اس میں ایسا نہیں ہوا، بلکہ ''كَلَّمْنَا'' کی جگہ ''كَلَّمَ'' بول کر غائب کا لفظ لایا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''التفات من التكلم إلى الغيبة'' واقع ہوا ہے، یہ التفات اس لئے واقع ہوا تاکہ ''كَلَّمَ اللَّهُ'' میں موجود لفظِ ''اللّٰہ'' کے ذکر کے ذریعہ اللہ سبحانہ کی عظمت وفخامت شان کو

❶ تقسیم محسنات معنویہ کی ایک قسم ہے، اہل بلاغت تقسیم کی تین ذیلی صورت بیان کرتے ہیں۔ہم یہاں ان تینوں میں سے وہ صورت بیان کرینگے جو آیت میں منطبق ہوتی ہے۔وہ صورت یہ ہے کہ کسی چیز کی تمام اقسام کو مکمل طور پر بیان کیا جائے۔

واضح کیا جائے، اور ضمیرِ متکلم کا تکرار نہ ہو سکے، اگر یہاں "کَلَّمَ اللَّهُ" کی جگہ "کَلَّمْنا" لاتے تو اس سے ایک تو اللہ رب العزت کے نام کا صراحتاً ذکر نہ ہوتا، دوسرا "فَضَّلْنَا" میں موجود "نا" ضمیر بھی مکرر آتی، ان دونوں وجوہات کی بناء پر آیت میں مذکورہ التفات واقع ہوا ہے۔

﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ﴾

آیتِ کریمہ میں "بَعْضَهُمْ" مضاف مضاف الیہ مل کر "رَفَعَ" فعل کا مفعول ہے، آیت میں بلند درجات پانے والے انبیاءِ مرسلین کون سے ہیں؟ ان کا نام مبہم رکھا گیا، ان کی وضاحت نہیں کی گئی، ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ اس ابہام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور مقام و مرتبہ کو ظاہر کیا جائے۔

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ" کے تکرار کی وجہ سے "اطناب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ہدایت اور براہین قاطعہ کے واضح ہونے کے بعد لوگوں کو اُن کی طلب کے بغیر محض اپنی قدرت سے متفق کر دے کہ ان میں باہمی کوئی اختلاف نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں، اسی لئے ان میں اختلاف برپا ہوا، اس مقصد کو واضح کرنے کے لئے ایک ہی مرتبہ "وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ" بولنا کافی تھا، مگر اس آیت میں اس معنیٰ مقصود کو بیان کرنے کے لئے دوبارہ "وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ" کے تکرار سے زائد عبارت لائی گئی ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں تکرار کی وجہ سے "اطناب" واقع ہوا ہے، یہ اطناب اس لئے واقع ہوا تا کہ آیت کے مفہوم میں تاکید حاصل ہو۔

---

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنیٰ مقصود کو اس سے زائد عبارت لا کر بیان کیا جائے اور یہ کسی فائدے کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲۵۴)﴾

ترجمہ:اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرلو جس دن نہ کوئی سودا ہوگا نہ کوئی دوستی (کام آئے گی) اور نہ کوئی سفارش ہوسکے گی۔اور ظالم وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں بات پرزور دینے کے لئے تاکید کے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں:

نمبر۱: جملے کو جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے جو جملہ فعلیہ کے بنسبت تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

نمبر۲: مبتداء "اَلْكَافِرُونَ" اور "اَلظَّالِمُونَ" خبر کے درمیان "هم" ضمیرِ فصل لائی گئی ہے، یہ بھی جملہ میں تاکید کا فائدہ دیتی ہے، یہ دونوں تاکیدات جملے میں اس لئے لائی گئی ہیں تاکہ اس آیت کے مفہوم میں "قصر الصفة على الموصوف إضافي" پایا جائے۔❶ اس آیتِ کریمہ میں بھی فعلِ ظلم کو مسلمانوں کے بنسبت کافروں کے ساتھ خاص کردیا گیا ہے کہ کافر ہی ظالم ہیں، البتہ کافروں کے علاوہ دیگر کسی میں یہ صفت ہے یا نہیں، آیت کی اس سے کوئی غرض نہیں۔ "قصر الصفة على الموصوف إضافي" کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''کفار ہی ظالم ہیں مسلمان نہیں''۔

﴿اَللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۲۵۵)﴾

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک صفت کو کسی موصوف کے ساتھ دوسرے موصوف کے اعتبار سے خاص کردیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ صفت اس موصوف کے علاوہ باقی میں پائی جائے یا نہ پائی جائے۔

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے، جس کو نہ کبھی اونگھ لگتی ہے، نہ نیند۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے (وہ بھی) اور زمین میں جو کچھ ہے (وہ بھی) سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ سارے بندوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات کو خوب جانتا ہے، اور وہ لوگ اس کے علم کی کوئی بات اپنے علم کے دائرے میں نہیں لا سکتے، سوائے اس بات کے جسے وہ خود چاہے، اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے، اور ان دونوں کی نگہبانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا، اور وہ بڑا عالی مقام، صاحب عظمت ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ نے نیند کی نفی سے پہلے "سِنَةٌ" بول کر اونگھ کی نفی کی ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کو اونگھ نہیں آتی۔ یہاں "سِنَةٌ" (اونگھ) کو مقدم اس لئے کیا تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے نیند کی نفی کرنے میں مبالغہ ہو، مبالغہ اس طور پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نیند آنا تو دور کی بات، اللہ اس نقص سے اتنا زیادہ پاک ہے کہ نیند تو درکنار اللہ کو اونگھ بھی نہیں آتی۔ اس میں "سِنَةٌ" (اونگھ) سے نیند کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے، مگر اس کے باوجود آگے "وَلَا نَوْمٌ" بول کر صراحتاً نیند کی بھی نفی کی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ لفظِ "سِـــنَةٌ" کی تقدیم سے آیت کے مفہوم میں جو مبالغہ آیا تھا اس میں مزید اضافہ ہو۔ نیز اس میں یہ نکتہ ہے کہ نفی کا معنی جملہ کی ابتداء میں موجود "لا نافیہ" سے ہو جاتا ہے، مگر اس میں "نَوْم" کے ساتھ "لا نافیہ" کا تکرار لایا گیا ہے، یہ اس لئے کہ یہ فائدہ حاصل ہو کہ یہاں اونگھ اور نیند کی نفی صرف اجتماعی طور پر ہی نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ طور پر بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں "لا نافیہ" کا تکرار نہ ہوتا تو آیت میں یہ شبہ ہوتا کہ اللہ سبحانہ کو نیند اور اونگھ ایک ساتھ نہیں آتی ہے، البتہ علیحدہ علیحدہ نیند اور اونگھ آ سکتی ہے، حالانکہ آیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ آیت میں چونکہ اس احتمال کا شبہ

ہوسکتا تھا، اس لئے ''لا'' نافیہ ''کو مکرر لا کر بتلایا کہ نہ تو اللہ کو اجتماعی طور پر اونگھ اور نیند آتی ہے اور نہ ہی علیحدہ علیحدہ۔

اس آیت کو ''آیت الکرسی'' کہا جاتا ہے، اس میں ''حســن الافتتـــاح'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں آیت کی ابتداء ہی اللہ سبحانہ کے اسم مبارک سے ہوئی ہے۔ اور اللہ کے نام سے کسی کلام کی ابتداء کرنا یہ اس کلام کے ''حســن الافتتـاح'' کی دلیل ہے۔ لہٰذا اس آیت میں بھی لفظ ''اللّٰہ'' کی وجہ سے ''حسن الافتتاح'' پایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اس آیت میں اور اس کے بعد آنے والی آیتوں میں متعدد مقامات میں لفظ ''اللّٰہ'' کا تکرار پایا جاتا ہے، اس آیت میں اللہ سبحانہ کے متعدد اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ وہ اوصاف الوہیت، واحدانیت، حیات، علم، قیومیت، مالکیت، قدرتِ ارادہ وغیرہ ہیں، اس لحاظ سے بھی آیت میں ''حسن'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک نکتہ اور بھی موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس آیت میں متعدد مقام میں ''فـصـل'' پایا جاتا ہے۔ ❷ فصل کے کئی دواعی و اسباب ہوتے ہیں، ان میں سے ایک سبب ''کـمـال اتصال'' ہے، یہاں بھی ''اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ'' اور ''لَاتَأْخُذُهُ'' وغیرہ کے درمیان ''کـمـال اتـصـال'' موجود ہے، اس لئے ان دونوں کے درمیان عطف کو چھوڑ دیا گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''فصل'' واقع ہوا ہے۔

﴿ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''اَلْحَيُّ الْقَيُّوم'' اور ''سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❸ یہاں ''اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ'' اللہ سبحانہ کے حیات اور قیومیت کے معنی میں ہے،

❶ حسن الافتتاح یہ ہے کہ کلام کو خوبصورت اور بہتر انداز و اسلوب میں شروع کیا جائے۔

❷ فصل کا مطلب یہ ہے کہ ایک جملہ کا عطف دوسرے جملہ پر کیا جائے۔

❸ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

جس پر کبھی موت اور غفلت نہیں آتی۔اور ''سِنَۃٌ وَلَا نَوْمٌ'' موت وغفلت کے معنی میں ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ﴾

اس آیت کریمہ کے لفظِ ''يَعْلَمُ'' اور ''لَا يُحِيطُونَ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔(1) یہاں ''يَعْلَمُ'' کا معنی (جاننے) کے ہے، اور ''لَا يُحِيطُونَ'' (عدم علم) پر دلالت کرتا ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾

بعض قراء نے اس آیت کو ''وَسِعُ'' ضمہ کے ساتھ اور ''السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ'' کو بھی ضمہ کیساتھ پڑھا ہے، یہ قرأت شاذ ہے۔آیت میں اگر اس قرأت کو مان لیا جائے تو اس میں تشبیہ پائی جائیگی، وہ اس طرح کہ اگر اللہ سبحانہ کی کرسی مجسم ہو تو پھر (آسمان وزمین کی وسعت) کی تشبیہ اللہ سبحانہ کی کرسی کی وسعت سے ہوگی، پھر یہ محسوس کی تشبیہ محسوس سے ہوگی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان وزمین کی وسعت اللہ سبحانہ کی کرسی کی وسعت کی طرح ہے اور مشہور قرأت ہو تو اس صورت میں اگر کرسی سے مراد علم ہو تو اُس کی تشبیہ آسمان وزمین سے دی گئی ہے، تو یہ معقول کی تشبیہ محسوس کے ساتھ ہوگی، یا کرسی کنایہ سلطنت سے ہے تو مراد اللہ رب العزت کا اقتدار آسمان وزمین کو محیط ہے۔

فائدہ: ''النفي المقصود به المدح لا بد أن يكون متضمنا لإثبات كمال ضده'' مقام مدح میں کی گئی نفی اپنی ضد کے کمال کو ثابت کرتی ہے۔

اس آیت میں ''لا تأخذه سنة ولا نوم'' میں نفی ہے، اور نفی جب مقامِ مدح میں

---

(1) طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

ہوتو اُس کی ضد (صفتِ مثبت) کا فردِ کامل مراد ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالی سے نوم کی نفی کی گئی ہے تو وہاں مقصود اس کی ضد یعنی کمالِ یقظہ کو ثابت کرنا ہے، یعنی اللہ تعالی کے لیے بیداری کامل درجہ کی ثابت ہے۔

''آیت الکرسی'' جنات وشیاطین پر سب سے زیادہ بھاری ہے، اس وجہ سے کہ اس آیت میں اللہ رب العزت کا ذکر سولہ (۱۶) مرتبہ آیا ہے، کہیں صراحت کے ساتھ، کہیں ضمیر کے ساتھ اور کہیں صفات کی صورت میں۔ پورے قرآن میں کسی اور سورت میں ایک آیت میں اس طرح الوہیت، وحدانیت، حیات، علم، قیومیت، بادشاہت، قدرت، ارادہ وغیرہ صفات کا تذکرہ نہیں ہے، اس لیے یہ آیت جنات وشیاطین پر سب سے زیادہ بھاری ہے، اسی لیے اپنے اور اہل وعیال کی حفاظت کے لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے، اور اولاد کو بھی حفظ کروانی چاہیے، اس آیت میں اللہ رب العزت کا سولہ مرتبہ یوں تذکرہ ہوا ہے:

۱۔ اَللّٰهُ	۲۔ ''هُوَ'' ضمیر	۳۔ اَلْحَيُّ
۴۔ اَلْقَيُّوْمُ	۵۔ ''لَا تَأْخُذُهٗ'' کی ضمیر	۶۔ ''لَهٗ'' کی ضمیر
۷۔ ''عِنْدَهٗ'' کی ضمیر	۸۔ ''إِلَّا بِإِذْنِهٖ'' کی ضمیر	۹۔ ''يَعْلَمُ'' میں موجود ضمیر
۱۰۔ ''عِلْمِهٖ'' کی ضمیر	۱۱۔ ''شَآءَ'' کی ضمیر	۱۲۔ ''كُرْسِيُّهٗ'' میں موجود ضمیر
۱۳۔ ''وَلَا يَؤُدُهٗ'' میں ضمیر	۱۴۔ ''هُوَ'' ضمیر	۱۵۔ اَلْعَلِيُّ
۱۶۔ اَلْعَظِيْمُ		

﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْتَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۵۶)﴾

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا، اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس

نے ایک مضبوط کنڈا اتھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں، اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارۃ تمثیلیۃ'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں اعتقادِ حق کا التزام کرنے والے شخص کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو مضبوط رسی کو پکڑتا رہے، اس میں پہلا ''مشبہ'' اور دوسرا ''مشبہ بہ'' ہے، چونکہ یہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تمثیلیۃ'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' کا بھی احتمال ہے۔ ❷ یہاں اعتقادِ حقہ کو مضبوط رسی سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں اعتقادِ حق ''مشبہ'' اور مضبوط رسی ''مشبہ بہ'' ہے، ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح مضبوط رسی کسی مضبوط آدمی کے ہاتھ ہو اور اُسے پکڑنے سے انسان گرنے سے محفوظ ہو جاتا ہے، اسی طرح اعتقادِ حق رکھنے والا اور اس پر ثابت قدم رہنے والا پھسلنے سے محفوظ رہتا ہے۔ جس طرح رسی کو پکڑنے سے گرنے سے محفوظ ہوتا ہے، اسی طرح قرآن وسنت کو تھامنے والا باطل وخواہشات میں گرنے سے محفوظ ہوتا ہے، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر اعتقادِ حق کو مضبوط رسی سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر آیت میں چونکہ ''بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''معدول الخطاب'' یا بالفاظ دیگر ''تلوین الخطاب'' پایا جاتا

❶ استعارہ تمثیلیہ وہ استعارہ ہے جس میں ایک مرکب حالت وکیفیت کو دوسری مرکب حالت وکیفیت سے تشبیہ دی جائے۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

ہے۔ ❶ یہاں ”لَا إِکْـرَاهَ فِـی الدِّین“ جملہ خبریہ ہے، مگر مراد اس سے معنی نہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں دین پر کسی سے زبردستی نہ کرو۔ اس معنی کے اعتبار سے آیت کو ”لَا تـکْـرَهُـوْا فِی الدِّینِ اَحَدًا“ کی صورت میں ذکر کرنا چاہیے تھا، مگر آیت میں اس جملہ کو فعلِ نہی کے اسلوب کی جگہ نفی کے اسلوب میں خبر کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ”معدول الخطاب“ پایا جاتا ہے۔

نہی کی جگہ نفی کے استعمال میں خوب مبالغہ ہے کہ دین میں ذرہ برابر اکراہ نہیں، اور اِسے نفی کے طور پر لایا جس میں خبر کا اظہار ہے کہ گویا انہوں نے سن کر عمل کرلیا، اب اس کی خبر دی جارہی ہے، جیسے ”فلا رفث ولا فسوق ولا جدال“ میں۔

یاد رہے کہ دین میں ابتداءً جبر نہیں ہے، لیکن دین اسلام کو قبول کرنے کے بعد اگر کوئی مرتد ہو تو اس پر جبر ہوگا، جیسے کوئی جب تک مدرسہ میں داخلہ نہ لے تو اس پر مدرسہ کے قوانین واحکامات لازم نہیں ہوتے، لیکن اگر کوئی داخلہ لے لے اور فارم پُر کرلے تو اب اس پر تمام قوانین واحکامات لاگو ہوں گے، اسی طرح معاملہ دینِ اسلام کا ہے۔

﴿قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَکْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (۲۵۶) اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِینَ آمَنُوا یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَی النُّورِ وَالَّذِینَ کَفَرُوْا (۲۵۷)﴾

یہاں لفظِ ”الـرُّشْد“ اور ”الْـغَـیِّ“ کے معنوں میں ”طبـاق“ پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ”الـرُّشْد“ بمعنی (ہدایت) کے ہے اور ”الْـغَـیِّ“ بمعنی (گمراہی) کے ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت مین جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ”طبـاق“ موجود ہے۔ اسی طرح یہاں لفظِ ”یَـکْـفُـر“ اور ”وَیُـؤْمِـنْ“ کے معنوں میں ”طبـاق“ موجود ہے، کیونکہ کفر کرنا اور ایمان لانا دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں،

❶ اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کردیا جائے۔
❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

اس لئے ان کے درمیان بھی "طباق" موجود ہے۔

دوسری آیت کریمہ کے لفظِ "الظُّلُمَاتِ" اور "النُّورِ" کے معنوں میں بھی "طباق" موجود ہے، وہ اس طرح کہ "الظُّلُمَاتِ" بمعنی (اندھیروں) کے ہے، اور "النُّور" بمعنی (روشنی) کے ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، اس لئے ان میں بھی "طباق" موجود ہے۔

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۵۷)﴾

ترجمہ: اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے، وہ انہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں، وہ سب آگ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

اس آیت کریمہ میں بھی گذشتہ آیت مبارکہ کی مانند "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں کفر کو (اندھیرے) سے اور ایمان کو (روشنی) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں کفر "مشبه" اور اندھیرا "مشبه به" ہے۔ سی طرح ایمان "مشبه" اور روشنی "مشبه به" ہے۔ کفر اور اندھیرے کے درمیان وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح اندھیرے میں چلنے والا ٹھوکر کھاتا رہتا ہے، منزل مقصود تک نہیں پہنچتا بالکل اسی طرح کافر بھی ٹھوکر کھاتا رہے گا اور اسے منزل مقصود تک رسائی حاصل نہ ہوگی۔ اسی طرح ایمان اور روشنی کے درمیان وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح روشنی کے سبب انسان منزل پاتا ہے، اسی طرح ایمان کے سبب مسلمان منزل مقصود پائینگے، آیت میں چونکہ "الظُّلُمَاتِ" اور "النُّورِ" بول کر "مشبه به" اندھیرے اور روشنی کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔

---

❶ استعارۂ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے، یہاں ایک مرتبہ "الَّذِينَ آمَنُوا" کے ساتھ "يُخْرِجُ" فعل کا ذکر ہوا ہے، پھر دوبارہ "الطَّاغُوتُ" کے ساتھ "يُخْرِجُونَ" بول کر اسی فعل کو دوبارہ ذکر کیا گیا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں فعل "اِخْرَاج" کا "تکرار" پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے ہے کہ دونوں فعلوں کے متعلقات علیحدہ علیحدہ ہیں، پہلے فعلِ 'اخْرَاج" کا تعلق "رحمن" سے ہے۔ اور دوسرے فعلِ "اخْرَاج" کا تعلق شیطان وطاغوت سے ہے، اس فرق کی طرف اشارہ کرنے کے لئے آیت میں فعلِ "اخْــرَاج" کا تکرار آیا ہے۔

﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "فِيهَا" سے پہلے "هم" ضمیر اس لئے لائی گئی تا کہ اس بات میں تاکید ہو کہ شیطان اور اس کے پیروکار کفار پکے جہنمی ہیں، اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۲۵۸)﴾

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر غور کیا جس کو اللہ نے سلطنت کیا دے دی تھی کہ وہ اپنے پروردگار (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیم علیہ السلام سے بحث کرنے لگا؟ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ: میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی، تو وہ کہنے لگا کہ میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔

اس آیتِ کریمہ میں ہمزہ استفہام واقع ہوا ہے۔❶ آیت کریمہ میں استعمال ہونے والا ہمزہ استفہام "تعجب" اور "تقریر" کا معنی میں ہے۔تعجب کا معنی یہ ہے کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نمرود کا ابراہیم (علیہ السلام) سے رب کے بارے میں محاجہ کرنا بہت ہی عجیب بات ہے"۔تقریر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اس عجیب محاجہ کے بارے میں معلوم ہے"۔اس ہمزہ استفہام نے تقریر کا معنی اس طور پر دیا کہ یہ ہمزہ اصل میں انکار کے لئے ہے اور "لَمْ تَرَ" فعل نفی پر داخل ہوا ہے۔ جب نفی پر نفی داخل ہو تو وہ اثبات وتقریر کا فائدہ دیتی ہے، بالکل اسی طرح یہاں بھی ہمزہ استفہام انکاری نے "لَمْ تَرَ" فعل نفی پر داخل ہو کر اثبات وتقریر کا معنی دیا ہے کہ یقینی بات ہے کہ نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بحث ومباحثہ کیا۔

﴿إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کی حکایت ہے جو انہوں نے نمرود سے کہا تھا۔اس قول میں "يُحْيِي وَيُمِيتُ" فعل مضارع استعمال ہوا ہے، یہاں فعلِ مضارع کو فعل ماضی پر اس لئے ترجیح دی گئی تا کہ احیاء (زندہ کرنا) اور اماتت (مارنے) کے معنی میں تجدد و استمرار حاصل ہو، چونکہ فعل ماضی میں استمرار اور تجدد پر دلالت نہیں ہوتی اس لئے اُسے استعمال نہیں کیا۔فعل مضارع کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ سبحانہ زندگی اور موت دیتے رہتے ہیں اور اس کی نئی نئی صورتیں ہوتی ہیں"۔

اس آیتِ کریمہ میں "رَبِّيَ" مبتداء اور "الَّذِي" اس موصول اپنے صلہ سے ملکر اس کی

---

❶ حروف اس استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات جاننے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی حروفِ استفہام اپنے اصل معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوتے جاتے ہیں، ان میں سے ایک معنی "تعجب" اور دوسرا معنی "تقریر" ہے۔

خبر ہے۔ ویسے تو عموماً مبتداء معرفہ اور خبر نکرہ ہوا کرتے ہیں، مگر کبھی کسی غرض کی خاطر یہ اصول ترک کر دیا جاتا ہے اور دونوں بصورت معرفہ لائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی "رَبِّیَ" مبتداء اضافت کی وجہ سے معرفہ اور "الَّذِی" خبر اسم موصول ہونے کی وجہ سے معرفہ ہیں۔ یہ دونوں معرفہ اس لئے لائے گئے تاکہ آیت میں "اختصاص وقصر" کا فائدہ حاصل ہو۔ ❶ یہاں فعلِ احیاء اور فعلِ اماتت کو مبتداء اور خبر معرفہ لاکر اللہ سبحانہ کی ذات اقدس کیساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔ قصر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ ہی وہ یکتا ذات ہے جو لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "یُحیِی وَیُمِیتُ" کے معنوں کے درمیان، اسی طرح لفظِ "الْمَشْرِقِ" اور "الْمَغْرِب" کے معنوں کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "یُحیِی" (زندگی دینے) کے معنی میں ہے اور "یُمِیتُ" (موت دینے) کے معنی میں ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معنی ہیں، اسی طرح "الْمَشْرِقِ" اور "الْمَغْرِب" ایک دوسرے کی مقابل سمتیں ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اسی لئے ان کے درمیان بھی "طباق" موجود ہے۔

﴿فَبُهِتَ الَّذِی كَفَرَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "فَبُهِتَ"، فعل کے فاعل کو موصول، صلہ کیساتھ بیان کیا گیا ہے حالانکہ اس کی تعبیر بغیر موصول کے "فَبُهِتَ الْكَافِرُ" سے بھی ہو سکتی تھی، لیکن آیت میں اس تعبیر کو ترک کر کے "الَّذِی كَفَرَ" کو ترجیح دی گئی ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ نمرود کے لاجواب ہونے اور حیرانگی کی علت کو بیان کیا جائے، نمرود ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو سن کر حیران اور لاجواب اس لئے ہوا کہ وہ کفر کرتا تھا، اس کے کفر نے ہی اسے مبہوت و پریشان کر دیا۔ اگر

❶ اختصاص وقصر کا مطلب یہ ہے کہ ایک شئی کو کسی شئی کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

اسمِ موصول سے تعبیر نہ ہوتی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَـٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۵۹)﴾

ترجمہ: یا (تم نے) اس جیسے شخص (کے واقعے) پر (غور کیا) جس کا ایک بستی پر ایسے وقت گزر ہوا جب وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی؟ اس نے کہا کہ: اللہ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال تک کے لیے موت دی، اوراس کے بعد زندگی کر دیا۔ (اور پھر) پوچھا کہ تم کتنے عرصے تک (اس حالت میں) رہے ہو؟ اس نے کہا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے کہا: نہیں بلکہ تم سو سال اسی طرح رہے ہو۔ اب اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ ذرا نہیں سڑیں۔ اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (کہ گل سڑ کر اس کا کیا حال ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا تا کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنا دیں، اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اٹھاتے ہیں، پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں۔ چنانچہ جب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ گئی تو وہ بول اٹھا کہ: مجھے یقین ہے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں بستی کی تعمیرات کو زندہ کرنے سے اور بستی کی تخریبِ عمارت کو موت دینے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں بستی کی تعمیرات اور بستی کی تخریبِ عمارت "مشبه" اور زندہ کرنا، موت دینا "مشبه به" ہیں،

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

آیت میں چونکہ "يُحيِي" اور "مَوتِهَا" بول کرمشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔

اس آیت میں "مجاز مرسل" پائے جانے کا بھی احتمال ہے، یہاں "قَريَةٍ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (بستی) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ بستی نہ تو زندہ کی جاتی ہے نہ ہی بستی ماری جاتی ہے کہ اس کی طرف حیات اور موت کی نسبت کی جائے، اس لئے آیت میں اس لفظ کا حقیقی معنی مراد لینا درست نہیں، لہٰذا لامحالہ لفظ کو اس کے مجازی معنی پر ہی محمول کیا جائیگا۔ یہاں اس لفظ کا مجازی معنی (اہل بستی) ہے۔ آیت میں بستی بول کر اہل بستی مراد لیا گیا ہے اور اہل بستی کا موت واقع ہونا یا زندہ کیا جانا بعید از عقل نہیں، اسی لئے آیت میں لفظ سے یہ مجازی معنی مراد لیا جائے۔ ان دونوں معنوں (بستی اور اہل بستی) کے درمیان علاقہ حالیت اور محلیت کا ہے، کیونکہ بستی محل اور اہل بستی حال ہے، گویا آیت میں محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے، چونکہ آیت میں ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ حالیت اور محلیت کا ہے، اس لئے اس میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۵۹)﴾

اس آیت کریمہ میں بھی "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے، یہاں ہڈی پر گوشت چڑھانے کو جسم پر لباس پہنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں ہڈی پر گوشت چڑھانا "مشبہ" اور جسم پر لباس پہنا "مشبہ بہ" ہے۔ وجہ شبہ ان میں یہ ہے کہ جس طرح لباس سے انسان کا جسم چھپ جاتا ہے بالکل اسی طرح گوشت چڑھانے سے ہڈیاں چھپ جاتی ہیں۔ اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں یہ استعارہ واقع ہوا، لیکن چونکہ آیت میں "نَكْسُوهَا" بول کر مشبہ بہ (کپڑے پہنے) کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (261)﴾

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے (اور) ہر بال میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (ثواب میں) کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے، اللہ بہت وسعت والا (اور) بڑے علم والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ "ایجاز بالحذف" پایا جاہے۔ یہاں دو جگہ "ایجاز حذف" کا امکان ہے:

نمبر ا: "مَثَلُ الَّذِينَ" کے درمیان "نَفَقَات" کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں "مَثَلُ نَفَقَاتِ الَّذِينَ يُنفِقُونَ" تھا، اس میں لفظِ "نفقات" حذف کر دیا گیا ہے۔

نمبر ۲: "كَمَثَلِ حَبَّةٍ" کے درمیان بھی "بَاذِرِ" کا لفظ محذوف ہے، یہ اصل میں "كَمَثَلِ بَاذِرِ حَبَّةٍ" تھا، اس میں بھی لفظ "بَاذِرِ" حذف کر دیا گیا ہے، گویا آیت کی پوری تقدیری عبارت "كَمَثَلِ نَفَقَاتِ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَل بَاذِرِ حَبَّةٍ" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والے کے خرچ کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو زمین پر ایک دانہ بوئے، پھر اس دانیں کے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں، اس آیت کریمہ میں چونکہ "نَفَقَات" اور "بَاذِر" کے الفاظ حذف کردئے گئے ہیں، اس لئے آیت میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

﴿فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَل حَبَّة﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تشبیہ مرسل" ❶ اور "تشبیہ مجمل" ❷ دونوں پائے جاتے ہیں یہاں "كَمَثَل" میں (کاف) حرفِ تشبیہ مذکور ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ تشبیہ مجمل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو۔

مرسل“ پائی جاتی ہے۔اسی طرح آیت میں ”تشبیہ مجمل“بھی پائی جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ کی راہ میں خرچ ہونے والے مال کو اس دانے سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین میں اگ کر سات بالیاں نکالے اور ہر بالی میں سو سو دانیں نکل کر سات سو دانے حاصل ہو جائیں۔اس تشبیہ میں اللہ کی راہ میں خرچ شدہ مال ”مشبہ“اور دانہ ”مشبہ بہ“ ہے،ان دونوں کے درمیان وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح ایک دانہ بڑھ کر تیزی سے کثیر ہو جاتا ہے،اسی طرح اللہ کے راستہ میں خرچ ہونے والے مال بھی بڑھ کر تیزی سے کثرت کی طرف بڑھ جاتا ہے،اس وجہ شبہ کی وجہ سے آیت میں تشبیہ واقع ہوا ہے،مگر چونکہ آیت میں یہ وجہ شبہ مذکور نہیں،اس لئے آیت میں ”تشبیہ مجمل“ پائی جاتی ہے۔یہ تشبیہ اس لئے دی گئی تا کہ اللہ کی راہ میں خرچ ہونے والے مال کے بڑھنے کی کیفیت کی منظر کشی کی جائے، گویا یہ عمل دیکھنے والے کی سامنے ہو رہا ہے۔حضراتِ اہل علم فرماتے ہیں کہ یہاں ”ممثل بہ“ یعنی ایک بالی میں سو سو دانوں کا ہونا کوئی بعید بات نہیں، بلکہ یہ دن رات ہمارے مشاہدوں میں آتے رہتے ہیں، جیسے باجرے کی بالیاں اور مکئی وغیرہ۔اس آیت کریمہ میں تعداد میں سے بالخصوص سات کا ذکر ہوا ہے، یہ اس لئے ہوا کیونکہ سات کا عدد دس کا اکثر عدد ہے،اسی طرح ستر (۷۰) سو(۱۰۰) کا اکثر حصہ ہے،اسی طرح سات سو (۷۰۰) ایک ہزار (۱۰۰۰) کا اکثر حصہ ہے۔عرب بھی بالخصوص اعداد میں اسی کا ذکر زیادہ کرتے تھے،اس لئے آیت میں یہی عدد مختص ہوا۔اہلِ عرب اکائیوں میں سات، دہائیوں میں ستر اور سینکڑوں میں سات سو اور ہزاروں میں سات ہزار کا ذکر کرتے ہیں، یہ مبالغہ اور کثرت پر دلالت کرتا ہے،تحدید مقصود نہیں ہوتی۔

﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”مجاز عقلی“ موجود ہے،اہل بلاغت کی اصطلاح میں ”مجاز

عقلی“ کو”اسناد مجازی“ بھی کہا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں ”أَنبَتَتْ“ فعل استعمال ہوا ہے، اس کا معنی (اگانے) کے ہے۔آیت میں اس فعل کی نسبت ”حَبَّة“(دانہ) کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ زمین سے کوئی چیز اگانا اصل میں اللہ کا فعل ہے دانے کا نہیں، اس لئے اس فعل کا فاعلِ حقیقی بھی اللہ ہے دانہ نہیں، مگر چونکہ بالیاں، بیج وغیرہ دانہ کے ظاہری سبب ہیں، جس کے سبب سے اللہ سبحانہ اگاتے ہیں، اس لئے ان میں ظاہری مناسبت پائی جاتی ہے، آیت میں اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے فعلِ ”أَنبَتَتْ“ کی نسبت فاعل حقیقی ”اللّٰه“ کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی ”حَبَّة“ کی طرف کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ”مجاز عقلی“ پایا جاتا ہے۔

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (262)﴾

ترجمہ: جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، نہ ان کو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم پہنچے گا۔

اس آیتِ کریمہ میں ”ذکر العام بعد الخاص“ موجود ہے، یہاں پہلے ”مَنًّا“ بول کر (احسان جتلانے) کا ذکر ہوا یہ خاص شئی ہے، آیت میں اس کو ذکر کرنے کے بعد ”لَا أَذًى“ بول کر عام شئی یعنی ہر طرح کی اذیت وتکلیف کا ذکر کر دیا گیا جس میں احسان جتلانے کی تکلیف بھی داخل ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”ذکر العام بعد الخاص“ موجود ہے۔ آیت میں خاص کے بعد عام کا ذکر اس لئے ہوا تا کہ آیت میں شمول کا فائدہ حاصل ہو، یعنی آیت ایسی جامع ہو جائے جس میں صدقہ کے بعد احسان جتلانے کے ساتھ ساتھ

❶ مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل یا معنی فعل یعنی فعل مجہول، اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت فاعل حقیقی کی جگہ فاعل غیر حقیقی کی طرف کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے کر دی جائے۔

تمام اقسامِ تکلیف واذیت اس میں شامل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں "مَنًّا" اور "لَا أَذًى" کے درمیان (لا) نافیہ کا تکرار لایا گیا۔

﴿لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں بلاغت کے لحاظ سے دو عمدہ نکات پائے جاتے ہیں، وہ نکات یہ ہیں:

نمبر۱: "لَهُمْ أَجْرُهُمْ" میں (هم) ضمیر کا تکرار، اسی طرح اس جملہ میں "أَجْرٌ" کو "عِندَ رَبِّهِمْ" کی قید سے مقید کر دیا گیا کہ خرچ کرنے والوں کا اجر خالصتاً اللہ کی طرف سے ہے۔ اس میں (هم) ضمیر کا تکرار اور "عِندَ رَبِّهِمْ" کی قید اس لئے بڑائی گئی تا کہ آیت کے عنوان میں تاکید ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی عظمت وشرافت واضح ہو۔ اس عمل کا ثواب انہیں مخلوق کا ہی نہیں، بلکہ خالق کے ہاں ملے گا، نیز خبر کی تقدیم کی وجہ سے اس میں حصر کا معنی ہے۔

نمبر۲: ترکیبی لحاظ سے "لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ" والا جملہ "الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ" کی خبر ہے، اس خبر میں اصولی طور پر "فا" سببیہ کا دخول ہونا چاہیے تھا، تا کہ یہ پتہ چلے کہ یہاں اجر کی علت و وجہ اخلاص و ایمان کیساتھ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے، لیکن یہاں خبر کو "فـا" سببیہ سے خالی رکھا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا، پھر اس کے بعد احسان جتلانا اور اذیت نہ دینے پر اللہ کی طرف سے اجر وثواب کا ترتب واستحقاق اتنی واضح اور بدیہی بات ہے کہ اس کے لئے "فـا" سببیہ کی تصریح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ (۲۶۳)﴾

ترجمہ: بھلی بات کہہ دینا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور اللہ بڑا بے نیاز، بہت بردبار ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ”وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ“ کا جملہ ”تذییل“ کے طور پر واقع ہوا ہے۔❶ یہاں بھی ”وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ“ کا جملہ گزشتہ عنوان کی تاکید کی غرض سے لایا گیا ہے کہ ایسے صدقہ سے جس کے بعد سائل کو اذیت دی جائے ہزار ہاں درجہ بہتر ہے کہ تم معذرت کرلو یا نرمی سے بات کہہ دو۔ اللہ تمہارے اس قسم کی صدقہ سے کہ جس میں لوگوں کو تکلیف بھی ہو بالکل مستغنی ہے، اس لئے ایسا صدقہ نہ کرو۔ چونکہ آیت میں ”وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ“ سے گذشتہ عنوان میں تاکید حاصل ہوئی ہے، اس لئے آیت میں یہ جملہ بطور ”تذییل“ کے ہے۔

یہ جملہ وعدہ اور وعید پر بھی مشتمل ہے۔ جس کا مطلب یہ کہ اخلاص کیساتھ سائل کو اذیت دیئے بغیر صدقہ کرنے والے کے لئے اجر کا وعدہ اور اذیت کے ساتھ صدقہ کرنے والے کے لئے دھمکی ہے کہ اللہ تو تمہارے اس صدقہ سے غنی ہے، وہ زمین وآسمان کا بادشاہ ہے اور سارے خزانوں کی چابیاں اُسی کے پاس ہیں، وہ تمہارے صدقہ کا محتاج نہیں ہے۔ البتہ وہ اپنی حلم وبردباری کی وجہ سے تمہاری فوراً پکڑ نہیں کرتا اور تمہیں مہلت دیتا ہے ورنہ تم سزا کے مستحق ہو۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر سائل کو نہیں دے سکتے ہو تو اُس سے بھلی بات کرو یعنی تمہارا حق مجھ پر تھا لیکن میں نہیں دے سکا، معاف کرنا۔ اسی طرح اگر سائل بداخلاقی کرے یا اصرار کرے تو اس سے درگزر کرو، یہ بہتر ہے اس سے کہ تم صدقہ دے کر احسان جتلاء یا تلخ کلامی سے پیش آؤ۔

﴿يَـا أَيُّهَـا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَـالَـهُ رِئَـاءَ الـنَّـاسِ وَلَا يُـؤْمِـنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُـرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (۲۶۴)﴾

ترجمہ: اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی

❶ تذییل یہ ہے کہ ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ تاکید کی غرض سے لایا جائے جو پہلے جملہ کے مفہوم میں ہو۔

طرح ضائع مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ چناچہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنی چٹان پر مٹی جمی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس (مٹی کو بہا کر چٹان) کو (دوبارہ) چکنی بنا چھوڑے، ایسے لوگوں نے جو کمائی کی ہوتی ہے وہ ذرا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتی، اور اللہ (ایسے) کافروں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔

اس آیتِ کریمہ میں "تشبیہ تمثیلی" پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں ریاء کاری کیساتھ مال کرچ کرنے والے مال کو اس مٹی سے تشبیہ دی گئی ہے جو چٹان پر پڑی ہو اور اس پر غیر معمولی مینہ پڑ کر اسے بہا لے جائے۔ اس میں ریا کاری کیساتھ خرچ کرنے والا مال "مشبہ" اور چٹان پر پری مٹی "مشبہ بہ" ہے۔ ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح چٹان پر پڑی مٹی کو قرار ودوام نہیں بلکہ وہ کمزور ہوتی ہے، تیز بارش کے گرنے سے نام ونشان تک مٹ جاتا ہے، پتھر جیسے پہلے تھا اسی طرح ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح ریاء کاری کیساتھ خرچ کرنے والا مال بھی بے کار اور بے سود ہے۔ ریاء کاری کی وجہ سے اس مال کا اجر وثواب بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ شبہ چونکہ متعدد اشیاء سے کشید ہوتی ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ تمثیلی" پائی جاتی ہے۔

یہاں آیت میں تشبیہ بھی عام پتھر سے نہیں بلکہ چکنے جیسے ماربل کے پتھر سے ہے، اور تو پتھر اپنی سختی اور ٹھوس ہونے کی وجہ سے اس میں کاشت نہیں ہوتی، بالفرض اگر کسی عام پتھر میں امکان بھی ہو، لیکن ماربل کے اس انتہائی سخت پتھر پر کوئی امکان نہیں، پھر اس پر معمولی مٹی جمع ہو جائے جس پر بیج ڈال کر امید رکھے، لیکن تیز بارش آکر اس پتھر کو بالکل صاف کر دے، تو کاشت کے حوالے سے کچھ بھی نفع نہیں ہوتا، اسی طرح ریا کار شخص کو ذرہ برابر بھی نفع ہوتا۔

❶ تشبیہ تمثیلی وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ متعدد امور سے کشید ہو۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾

یہ جملہ بطور "تذییل" واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں مذکورہ جملہ لا کر گذشتہ آیت میں بیان والے مضمون یعنی ریاء کاری کیساتھ مال خرچ کرنے اور سائل کو صدقہ دینے کے بعد اذیت دینے پر مذمت میں تاکید کی گئی ہے کہ یہ امور اتنے قابلِ مذمت ہیں کہ ان کو اللہ نے کفریہ اعمال قرار دیا، اور اللہ کفریہ اعمال کو کسی طرح پسند نہیں فرماتا۔ یہ جملہ چونکہ گذشتہ مضمون کی تاکید کررہا ہے، اس لئے یہ بطور " تذییل" واقع ہوا ہے۔

اس آیت میں "تعریض" بھی پائی جاتی ہے۔ ❷ یہاں مذکور کلام کا ظاہری مفہوم و مطلب تو یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتے۔ اس مفہوم کی طرف آیت کو مائل کیا گیا ہے، مگر چونکہ یہ جملہ ریاء کاری احسان اور اذیت سمیت مال خرچ کرنے کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس لئے آیت میں اس جملہ سے دوسری جانب مراد ہے، وہ مراد یہ ہے کہ ہرطرح کی ریا کاری، صدقہ کیساتھ اذیت اور احسان جتلانا، یہ کفار کے کام ہیں، لہٰذا مؤمنین کو اس سے بچنا چاہیے۔ یہاں مراد ناشکری ہے کہ اللہ تعالی ناشکرے لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ رب العالمین کے دیئے ہوئے مال پر اُس کے نام پر خرچ کرنے کے بجائے دکھلاوے کے لیے کرتا، تو ایسے شخص کی درست راہ کی طرف رہنمائی نہیں کی جاتی ہے۔ آیت میں چونکہ اس جملہ کو ایک مفہوم کی جانب مائل کرکے دوسری جانب مراد لی گئی ہے، اس لئے اس میں "تعریض" موجود ہے۔

﴿أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ

---

❶ تذییل یہ ہے کہ ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ پہلے جملہ کے مضمون اور عنوان کی تاکید کے لئے لایا جائے۔

❷ تعریض کنایہ کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ کہ کلام کو ایک جانب مائل کیا جائے، مگر مراد اس سے دوسری جانب ہو اور تعریض کے لئے کلام کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔

فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (۲۶۶)﴾

ترجمہ: کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں (اور) اس کو اس باغ میں اور بھی ہر طرح کے پھل حاصل ہوں، اور بڑھاپے نے اسے آ پکڑا ہو، اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں، اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آ کر اس کو اپنی زد میں لے لے اور پورا باغ جل کر رہ جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم غور کرو۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ریاکاری، اذیت اور احسان جتلانے کیساتھ مال خرچ کرنے والے آدمی کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے، جس کا ایک باغ ہو اس باغ میں انگور اور کھجوروں کے درخت ہوں، اس میں نہریں بہہ رہی ہو، اس میں ہر طرح کے میوہ جات موجود ہو، پھر وہ شخص بوڑھا ہو جائے، اور اس کے ننھے ننھے بچے بھی ہوں تو اچانک اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ باغ جل کر راکھ ہو جائے۔ بالکل یہی مثال ریاکاری، تکلیف اور احسان جتلاتے ہوئے صدقہ دینے والے شخص کی ہے کہ اس کو اپنے عمل کا کوئی فائدہ نہ ملے گا، یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسرے مرکب حالت کے ساتھ تشبیہ ہے اس لئے آیت میں "استعارة تمثيلية" موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں ہمزہ استفہامیہ استعمال ہوا ہے، جو "انکار" کے معنی میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کے ذریعہ کلام کے عنوان کی نفی کی جائے۔ یہاں بھی ہمزہ استفہام اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ "انکار" کے لئے ہے، انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "تم میں سے کوئی شخص ایسا ہرگز اپنے لیے نہیں

❶ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت کو دوسرے مرکب حالت سے تشبیہ دی جائے، اس میں نہ مشبہ مذکور ہو نہ ہی حرف تشبیہ۔

چاہے گا جیسا آیت میں بیان ہوا ہے'' ، لہٰذا انفاق محض اللہ رب العزت کی رضا کے لیے ہو۔

﴿یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَیِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِیهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِیهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِیٌّ حَمِیدٌ (۲۶۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہو اور جو پیداوار ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہو اس کی اچھی چیزوں کا ایک حصہ (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا کرو، اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں (اللہ کے نام پر) دیا کرو گے جو (اگر کوئی دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے) تم اسے آنکھیں میچے بغیر نہ لے سکو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَیِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِنَ الْأَرْضِ'' تک ایمان والوں کو یہ حکم ہوا ہے کہ ایمان والے اپنی کمائی میں سے اور اللہ سبحانہ نے زمین سے جو کچھ نکالا اس میں سے عمدہ واعلیٰ حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ اس جملہ سے مفہوم مخالف کے طور پر یہ بات سمجھ آجاتی ہے کہ عمدہ مال اور حصہ خرچ کرنے کا حکم ہوا ہے، ناپاک اور گھٹیا چیزیں نہیں۔ اس جملہ سے ناپاک اور گھٹیا چیزوں کے انفاق کی ممانعت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے، مگر اس کے باوجود اسی آیت میں ''وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیثَ مِنْهُ'' بول کر بری اور خبیث اشیاء کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے صراحتاً منع کر دیا گیا ہے۔ مفہوم مخالف سے ممانعت معلوم ہونے کے باوجود آیت میں نہی کی صراحت اس لئے کی گئی تا کہ عمدہ اور اعلیٰ مال خرچ کرنے کے عنوان کو زیادہ تاکید ومبالغہ سے بیان کیا جائے کہ ایمان والوں غور سے سنو! اللہ کی راہ میں اعلیٰ اور عمدہ اشیاء ہی خرچ کرو، ناپاک، گھٹیا اور بے حیثیت اشیاء سے اجتناب کرو۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "طَیِّبَات" اور "اَلْخَبِیْث" کے معنوں میں "طباق" موجود ہے۔ ❶ یہاں "طَیِّبَات" عمدہ اور پاکیزہ کے معنی میں ہے، اور "اَلْخَبِیْثَ" ناپاک اور گھٹیا کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان مقابل معنوں کو چونکہ آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿اِلَّا اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے، یہاں "تُغْمِضُوْا" فعل استعمال ہوا ہے، یہ "اغماص" مصدر سے مشتق ہے۔ اس کا حقیقی معنی (آنکھوں کو بند کرنا) ہے۔ لیکن آیت میں یہ معنی مراد نہیں، اس لیے کہ خراب اشیاء اور مال وغیرہ وصول کرتے وقت کسی کی آنکھ بند نہیں ہوتی بلکہ سب کی آنکھیں ایسے موقعوں پر کھلی رہتی ہیں۔ اس لئے یہاں "اغماص" کو حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جائیگا بلکہ اس لفظ سے اس کا مجازی معنی مراد لیا جائیگا، یعنی سستی اور نظر انداز کرنا، یہ معنی مراد لینے سے آیت کا مفہوم بالکل درست ہوتا ہے کہ جب تمہیں کوئی گھٹیا چیز دے تو تم نہیں لیتے، اِلّا یہ کہ تم آنکھیں نیچے کیے بغیر نظر انداز کرتے ہوئے بادلِ نخواستہ لے لیتے ہو، یعنی دل خوش نہیں ہوتا، آنکھیں چار ہونے کے بجائے معمولی آنکھیں کھول کر پیشانی پر ناگواری کے آثار لا کر لے لیتے ہو، اسی طرح اللہ رب العزت بھی گھٹیا چیز کی خیرات قبول نہیں کرتا، جب تم یہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو تو رب العالمین کے نام پر کیسے دیتے ہو۔

یہاں ان دونوں معنوں میں علاقہ لزوم کا ہے، کیونکہ جب کوئی شخص ناپسندیدہ چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ عموماً اپنی آنکھوں کو بند کر لیتا ہے تاکہ وہ اس چیز کو نہ دیکھ سکے اور اس کو نظر انداز کرتے ہوئے سستی سے کام لے سکے۔ اس سے واضح ہوا کہ آنکھ بند کرنا ملزوم اور سستی کرنا لازم ہے، گویا آیت میں ملزوم بول کر لازم معنی مراد لیا گیا ہے، کیونکہ ان معنوں

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل کو جمع کر دیا جائے۔

کے درمیان علاقہ لزوم کا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔

بقولِ بعض اس آیت میں لفظ "تُغْمِضُوا" بطور "استعارة تصريحية" کے بھی ہوسکتا ہے۔ ❶ یہاں سستی کرنے اور نظر انداز کرنے کو آنکھ بند کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں سستی کرنا اور نظر انداز کرنا "مشبہ" اور آنکھ بند کرنا "مشبہ بہ" ہے، اور ان دونوں میں وجہ شبہ عدم توجہ ہے جس طرح آنکھ بند کرلینے کی صورت میں انسان کی توجہ اشیاء پر نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح سستی اور نظر انداز کرنے والے آدمی کی توجہ بھی ان اشیاء پر نہیں ہوتی جن سے وہ ناگواری کا اظہار کررہا ہو، اس آیت میں چونکہ "تُغْمِضُوا" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۲۶۹)﴾

ترجمہ: وہ جس کو چاہتا ہے دانائی عطا کردیتا ہے، اور جسے دانائی عطا ہوگئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو سمجھ کے مالک ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "الاظهار في مقام اضمار" پایا جاتا ہے، یہاں ایک مرتبہ ابتداء میں "يُؤْتِي الْحِكْمَةَ" بول کر حکمت کا ذکر کردیا گیا ہے، جو بعد میں اپنے لئے آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ" کی جگہ "وَمَنْ يُؤْتَها" بول کر "ها" ضمیر لانا چاہیے تھی، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ "ها" ضمیر کی جگہ دوبارہ "الْحِكْمَةَ" کا لفظ لاکر اسمِ ظاہر کا استعمال کیا گیا، جس سے لفظِ "الْحِكْمَةَ" کا تکرار بھی ہوا، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الاظهار في مقام الاضمار" پایا جاتا ہے، یہ اس لئے ہوا تاکہ حکمت کی فضیلت، شرفیت اور عمدگی کا اظہار ہو، اور اس کی اہمیت زیادہ سے زیادہ اجاگر ہو۔

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۲۷۰)﴾

ترجمہ: اور تم جو کوئی خرچ کرو یا کوئی منت مانو اللہ اسے جانتا ہے۔ اور ظالموں کو کسی طرح کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "أَنْفَقْتُمْ" اور "نَفَقَةٍ" کے درمیان، اسی طرح لفظِ "نَذَرْتُمْ اور نَذْر" کے درمیان "جناس اشتقاق" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "أَنْفَقْتُمْ" اور "نَفَقَةٍ" کا اصل مادہ اشتقاق (نَفَقَةً) ہے، اوران کا اصل معنی (خرچ کرنے) کے ہے، ان دونوں چیزوں میں یہ دونوں کلمے ایک دوسرے کے موافق ومتحد ہیں، اس لئے انکے درمیان "جناس اشتقاق" موجود ہے۔ اسی طرح لفظِ "نَذَرْتُم" اور "نَذْرٍ" کا اصل مادہ اشتقاق "نذر" ہے اوراس کا اصل معنی (منت ماننے) کے ہے، یہ دونوں کلمات بھی چونکہ اصل مادہ اشتقاق اور معنی میں ایک دوسرے کے موافق ہیں، اس لئے ان کے درمیان بھی "جناس اشتقاق" موجود ہے۔

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۲۷۰)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "کنایة" پاجاتا ہے۔❷ یہاں "يَعْلَمُ" فعل استعمال ہوا ہے، اس کا معنی اصلی (جاننے) کے ہے، مگر آیت میں اس لفظ سے جاننے کا لازم یعنی بدلہ دینا مراد لیا گیا ہے، سب کو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کو سب چیزیں پہلے سے ہی معلوم ہیں، اس لئے مذکورہ جملہ سے اگر صرف اللہ کے علم کی خبر دی جائے تو خاطر ہوا فائدہ نہ ہوگا، اس لئے لامحالہ جہاں کہیں بھی اللہ کے لیے "يَعْلَمُ" کسی عمل کے بعد آجائے تو اس سے اس کا لازم معنی

❶ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمے اصل مادہ اشتقاق اور اصل معنی میں ایک دوسرے موافق اور متحد ہوں۔

❷ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر لازم مراد لینے کے ساتھ ساتھ لفظ کا معنی اصلی یعنی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

ہی مراد لیا جائے گا، یعنی بدلہ دینا چونکہ آیت میں علم سے اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "کنایة" موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے لیے خرچ کرتا ہے اور نذر کو پورا کرتا ہے، تو اللہ رب العزت اس کے اس عمل سے واقف ہے اور اسے پورا بدلہ عطا کرے گا۔ جو کوئی ریا کاری کے لیے خرچ کرتے ہیں یا نذروں کو پورا نہیں کرتے، ایسے لوگ ظالم ہیں اور ان ظالموں کا روز قیامت کوئی مددگار نہیں ہوگا، جو انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۷۱)﴾

ترجمہ: اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے، اور اگر ان کو چھپا کر فقرا کو دو تو یہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے، اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا، اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۲۷۰) إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۷۱)﴾

یہاں دوسری آیت میں "التفصیل بعد الاجمال" پایا جاتا ہے۔ (۱) یہاں پہلی آیت میں "وَمَا أَنْفَقْتُم" میں اجمالی طور پر خرچ کرنے کا ذکر ہوا، مگر وہ کیا ہے؟ زکوۃ، صدقہ، عطیات ہیں یا کچھ اور اس بارے میں کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ پہلی آیت میں اجمالی طور پر خرچ کا ذکر کرنے کے بعد دوسری آیت میں "إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَات" سے اس اجمال کی وضاحت کر دی گئی کہ انفاق سے مراد صدقہ وغیرہ کرنا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفصیل بعد الاجمال" پایا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ آیت کا عنوان سامع کے

(۱) یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کسی مبہم اور مجمل شئی کو بیان کیا جائے پھر اس کی وضاحت اور تفصیل بیان کی جائے تاکہ سامع کے ذہن میں بات اچھی طرح نقش ہو جائے۔

ذہن میں خوب اچھی طرح نقش ہوجائے، چونکہ ان دونوں کے درمیان حرف عطف نہیں لایا گیا، بلکہ دونوں میں حرفِ عطف ترک کر کے فصل سے کام لیا گیا ہے۔

اس آیت کے لفظِ "تُبْدُوا" اور "تُخْفُوهَا" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "تُبْدُوا" (ابداء) مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (ظاہر کرنے) کے ہے، اور "تُخْفُوهَا" (اخفاء) مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (چھپانے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "اَلْفُقَرَاء" اور "اَغْنِیاء" کے درمیان "طباق معنوی" موجود ہے۔ ❷ اس آیت میں "اَلْفُقَرَاء" کا لفظ استعمال ہوا ہے، "اَلْفُقَرَاء" سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صدقہ اغنیاء دیتے ہیں اور فقراء اس کا محل ہیں۔ اس لحاظ سے آیت اصل میں "وَیُوتِ الاَغْنِیَاءُ الصَّدقَاتِ الْفُقَرَاءَ" ہے۔ اس میں "اَغْنِیاء" اور "اَلْفُقَرَاء" کے معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو معنوی طور پر آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق معنوی" موجود ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (۲۷۲)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) ان (کافروں) کو راہ راست پر لے آنا آپ کی ذمہ داری نہیں

---

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

❷ طباق معنوی یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے، مگر کلام میں دونوں معانی صراحتاً مذکور نہ ہوں بلکہ صرف ایک ہی معنی ذکر کر دیا جائے، مگر دوسرا معنی مذکور معنی سے سمجھ آجائے۔

ہے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ راست پر لے آتا ہے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو وہ خود تمہارے فائدے کے لیے ہوتا ہے جبکہ تم اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں "اطناب" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں معنیٰ مقصود یہ بتانا ہے کہ انسان اللہ کی رضا کے لئے کچھ بھی خرچ کرے اللہ اسے خرچ کرنے کا پورا پورا اجر عطا فرماتے ہیں، اس کے اجر میں کمی نہیں کی جاتی۔ اس معنیٰ مقصود کو "وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ" کے جملہ سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، مگر اس آیت میں مذکورہ معنیٰ مقصود کے لئے "وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ" (تم اجر میں کم نہیں کئے جاؤ گے) کی زائد عبارت لائی گئی، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "اطناب" پایا جاتا ہے، یہ اطناب اس لئے ہوا تاکہ آیت کے عنوان میں تاکید ہو۔ یعنی تمہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ذرہ برابر اس میں کمی نہیں کی جائے گی۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ﴾

اس آیتِ کریمہ میں بھی گزشتہ آیت کی طرح لفظِ "هُدَاهُم" اور "اَلظّٰلِمِيْنَ" کے درمیان "طباق معنوی" موجود ہے۔ ❷ یہاں "هُدَاهُم" میں (هم) ضمیر سے مراد "اَلظّٰلِمِيْنَ" ہے۔ ان دونوں لفظ کے معنوں میں "طباق" موجود ہے، وہ اس طرح کہ "هُدیٰ" (ہدایت) سے ہے اور "اَلظّٰلِمِيْنَ" (ظلم) سے ہے۔ ہدایت اور ظلم دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ ان کو آیت میں معنوی طور پر جمع کیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں کے درمیان "طباق معنوی" موجود ہے۔

---

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنیٰ مقصود کو بیان کرنے کے لئے اس سے زائد عبارت لائی جائے۔

❷ طباق معنوی یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے، مگر کلام میں دونوں معانی صراحتاً مذکور نہ ہوں، صرف ایک ہی معنیٰ ذکر کر دیا جائے اور دوسرا معنیٰ مذکور معنیٰ سے خود سمجھ آ جائے۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۲۷۳)﴾

ترجمہ: (مالی امداد کے بطور خاص) مستحق وہ فقرا ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح مقید کر رکھا ہے کہ وہ (معاش کی تلاش کے لیے) زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ چونکہ وہ اتنے پاک دامن ہیں کہ کسی سے سوال نہیں کرتے، اس لیے ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے، تم ان کے چہرے کی علامتوں سے ان (کی اندرونی حالت) کو پہچان سکتے ہو (مگر) وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "لِلْفُقَرَاءِ اور أَغْنِيَاء" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "اَلْفُقَرَاء" بمعنی (غریب) کے ہے اور "أَغْنِيَاء" بمعنی (مالدار) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح لفظِ "أُحْصِرُوا" اور "ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ" کے معنوں میں بھی "طباق" موجود ہے، کیونکہ "أُحْصِرُوا" کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی سفر سے روک دیا جائے اور "ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ" کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی زمین پر سفر کرے۔ یہ دونوں مفہوم بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔

فائدہ: "لا یسئلون الناس الحافا" میں "سوال کرنے" اور "الحاف" دونوں کی نفی ہے، یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے، البتہ مطلق سوال کرتے ہیں، بلکہ یہاں سوال اور الحاف دونوں کی نفی ہے۔ اصول ہے "نفی الذات الموصوفة قد

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

یکون نفیا للصفة دون الذات وقد یکون للذات کذلک''❶

ترجمہ: جب کسی ذاتِ موصوفہ سے نفی کی جاتی ہے تو کبھی صرف صفت کی نفی مقصود ہوتی ہے اور کبھی ذات وصف دونوں کی۔

آیت میں ذات اور وصف دونوں کی نفی ہے، یعنی نہ یہ لوگ سوال کرتے ہیں اور نہ سوال کرنے میں اصرار کرتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۷۴)﴾

ترجمہ: جولوگ اپنے مال دن رات خاموشی سے بھی اور علانیہ بھی خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ کوئی غم پہنچے گا۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظ "بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" کے معنوں میں، اسی طرح "سِرًّا وَ عَلَانِيَةً" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں "بِاللَّيْل" بمعنی (رات) اور "النَّهَار" بمعنی (دن) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان کو چونکہ آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح "سِرًّا" بمعنی (پوشیدہ) اور "عَلَانِيَةً" بمعنی (واضح) کے ہے۔ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، ان کو کلام میں جمع کیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان بھی "طباق" موجود ہے۔

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۷۵)﴾

❶ البرھان فی علوم القرآن: ج۳ ص ۳۹۳/ الإتقان فی علوم القرآن: ج۳ ص ۲۶۴

❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

ترجمہ: جولوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھوکر پاگل بنا دیا ہو، یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ گئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آ گیا تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے۔ اور اس (کی باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

﴿قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا﴾

مذکورہ جملہ عہد نبوی کے عرب کے قول کی حکایت ہے، اس میں عرب نے (خرید و فروخت) کو سود سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ میں خرید وفروخت "مشبہ" اور سود "مشبہ بہ" ہے۔ ان میں وجہ شبہ نفع وزیادتی ہے، یعنی جس طرح سود میں زیادتی اور نفع ہے اسی طرح خرید وفروخت میں بھی نفع ہے۔ اسی لئے عرب نے خرید وفروخت کو سود سے تشبیہ دی ہے۔ یہ دراصل "تشبیہ مقلوب" ہے۔ (1) یہاں اصل میں "مشبہ" سود ہے، کیونکہ اہل عرب خرید وفروخت کی طرح سود کو بھی حلال اور نفع بخش سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے خرید وفروحت "مشبہ بہ" ہے اور سود "مشبہ" ہے، مگر اہل عرب نے اپنے کلام میں سود "مشبہ" کو "مشبہ بہ" بنا دیا اور خرید وفروخت "مشبہ بہ" کو "مشبہ" بنا دیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تشبیہ مقلوب" پائی جاتی ہے۔ آیت اصل کے مطابق "إِنَّمَا الرِّبَا مِثْلُ الْبَيْعِ" ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ اہلِ عرب کا اعتقاد سود کی حلت کے متعلق انتہاء کو پہنچ چکا تھا، اس لئے انہوں نے مبالغۃً بیع (خرید وفروخت) کو تشبیہ میں اصل یعنی "مشبہ بہ" بنانے کے بجائے فرع (سود) کو ہی اصل "مشبہ بہ" بنا ڈالا۔

---

(1) تشبیہ مقلوب وہ تشبیہ ہے جس میں مشبہ کو مشبہ بہ اور مشبہ بہ کو مشبہ بنا دیا جائے۔

﴿وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا...... يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ (۲۷٦)﴾

یہاں پہلی آیت کے لفظِ "أَحَلَّ" اور "حَرَّمَ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "أَحَلَّ" کا معنی (حلال کرنے) کے ہے اور "حَرَّمَ" کا معنی (حرام کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح اگلی آیت میں "يَمْحَقُ" بمعنی (مٹانے اور ختم کرنے) کے ہے اور "يُرْبِي" بمعنی (بڑھانے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کے معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان بھی "طباق" موجود ہے۔

یہاں لفظِ "الرِّبَا وَيُرْبِي" کے درمیان "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں چونکہ "الرِّبَا" اسم اور "يُرْبِي" فعل ہے۔ یہ دونوں مختلف النوع کلمات ہیں، اس لئے ان کے درمیان "جناس مغائر" واقع ہوا ہے۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "كَفَّار" (فَعَّالٍ) کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ لایا گیا ہے، جو ناشکری کے معنی میں زیادتی کا مفہوم دیتا ہے، ناشکری کے معنی سے گناہ کا مفہوم خود بخود سمجھ آ جاتا ہے، اس کے باوجود آیت میں (فَعِيلٍ) کے وزن پر "أَثِيم" کا لفظ لایا گیا جو کہ خود بھی تاکید و مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی (بہت زیادہ گناہ کرنے والے) کے ہے۔ یہ لفظ اس لئے لایا گیا تاکہ دونوں الفاظ یعنی "كَفَّار" اور "أَثِيم" کے مفہوم میں موافقت کے باوجود تلفظ اور

---

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

❷ جناس مغائر وہ ہے جو دو مختلف النوع کلموں میں پایا جائے ایک دوسرے کے مشابہ ہوں۔ مختلف النوع کلمات سے مراد اسم و حرف یا اسم و فعل یا حرف و فعل ہے۔

بناوٹ میں مختلف ہو جائے۔ نیز ناشکری کرنے کی خوب مذمت کی جائے، ناشکرا انسان بڑا گناہ گار ہے اور اللہ رب العزت ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲۷۹)﴾

ترجمہ: پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ اور اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہارا اصل سرمایہ تمہارا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "حَرْبٍ" نکرہ لایا گیا ہے۔ نکرہ سے کبھی شئی کی عظمت وہیبت بیان کی جاتی ہے۔ یہاں بھی "حَرْبٍ" کو نکرہ لا کر سود خوری سے باز نہ آنے والے کے خلاف ہیبت ناک اور عظیم جنگ بندی کو بیان کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سود خور سود کھانے سے باز نہ آیا تو اللہ کی طرف سے اس کے خلاف ایک بڑی جنگ کا اعلان ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اللہ رب العزت سے زیادہ کوئی طاقتور نہیں، اور انسان سے زیادہ کوئی کمزور نہیں، جب وہ طاقتور ذات کسی سے جنگ کرے تو اس کی شکست یقینی ہے۔

﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾

یہاں لفظِ "تَظْلِمُونَ" اور "تُظْلَمُونَ" کے درمیان "جناس محرف" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں دونوں الفاظ تعدادِ حروف، نوعیتِ حروف (حروفِ ہجاء) اور ترتیبِ حروف (تقدیم وتاخیر) میں ایک دوسرے کے موافق ہیں، لیکن چونکہ "تَظْلِمُونَ" میں "تاء" پر فتحہ اور لام پر کسرہ ہے اور "تُظْلَمُونَ" میں "تاء" پر ضمہ اور لام پر فتحہ ہے۔ اس لئے ان میں ہیئت کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس اختلافِ ہیئت کی وجہ سے "تَظْلِمُونَ" اور "تُظْلَمُونَ"

❶ جناس محرف جناس غیر نام کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ کہ دو الفاظ حروفِ تہجی میں عددِ حروف میں، اسی ترتیبِ حرف یعنی تقدیم وتاخیر میں تو متفق ہوں مگر ہیئتِ حروف یعنی حرکات وسکنات وغیرہ میں مختلف ہوں۔

کے درمیان" جناس محرف" موجود ہے۔

﴿اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۸۱)﴾

ترجمہ: اور ڈرو اس دن سے جب تم سب اللہ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، پھر ہر ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا دیا جائے گا، اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ "يَوْمًا" نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کی فخامت اور ہولناکی بیان کی جاتی ہے، یہاں بھی "يَـوْمًـا" کو نکرہ لا کر روزِ قیامت کی عظمت، فخامت اور ہولناکی کو بیان کیا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "عظیم الشان اور خطرناک دن یعنی قیامت سے ڈرو"۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّـذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَـدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَـا دُعُـوا وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ وَأَقْـوَمُ لِـلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيـدٌ وَإِنْ تَـفْـعَـلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللهُ وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۸۲)﴾

ترجمہ: اے ایمان والو جب تم کسی معین میعاد کے لیے ادھار کا کوئی معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور تم میں سے جو شخص لکھنا جانتا ہو انصاف کے ساتھ تحریر لکھے، اور جو شخص لکھنا جانتا ہو لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ نے اسے یہ علم دیا ہے تو اسے لکھنا چاہیے۔ اور تحریر وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہو، اور اسے چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور اس (حق) میں کوئی کمی نہ کرے۔ ہاں اگر وہ شخص جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہے ناسمجھ یا کمزور ہو یا (کسی اور وجہ سے) تحریر نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا سرپرست انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو، ہاں اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہو جائیں جنہیں تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ اور جب گواہوں کو (گواہی دینے کے لیے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں، اور جو معاملہ اپنی میعاد سے وابستہ ہو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے لکھنے سے اکتاؤ نہیں۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف اور گواہی کو درست رکھنے کا بہتر ذریعہ ہے، اور اس بات کی قریبی ضمانت ہے کہ تم آئندہ شک میں نہیں پڑو گے۔ ہاں اگر تمہارے درمیان کوئی نقد لین دین کا سودا ہو تو اس کو نہ لکھنے میں تمہارے لیے کچھ حرج نہیں ہے۔ اور جب خرید وفروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور نہ لکھنے والے کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے نہ گواہ کو۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی، اور اللہ کا خوف دل میں رکھو، اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُم بِدَيْنٍ...... وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ...... وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ...... وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ......وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (٢٨٢)...... فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ (٢٨٣)﴾

یہاں پہلے جملے کے لفظ "تَدَايَنتُم اور بِدَيْن" کے درمیان "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "تَدَايَنتُمْ" فعل اور "دَيْنٍ" اسم ہے، یہ دونوں دو نوع کے کلمہ ہیں، یعنی ایک فعل ہے اور دوسرا اسم ہے۔ ان کے درمیان "جناس" واقع ہوا ہے، تو یہ "جناس مغائر" ہے۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں "لِيَكْتُبْ" فعل اور "كَاتِب" اسم ہیں، یہ دونوں مختلف النوع کلمے ہیں، چونکہ ان کے درمیان بھی جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں بھی "جناس مغائر" موجود ہے۔ تیسرے جملہ میں "كَاتِبٌ" اسم اور "يَكْتُب" فعل ہیں، یہ دونوں بھی دو مختلف النوع کلمے ہیں، چونکہ ان کے درمیان بھی جناس پایا جاتا ہے، اس لئے ان میں "جناس مغائر" موجود ہے۔ چھوتے جملہ میں "وَاسْتَشْهِدُوا" فعل اور "شَهِيدَيْن" اسم ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، ان کے درمیان بھی جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں "جناس مغائر" موجود ہے۔ اسی طرح پانچویں جملہ میں "يُعَلِّمُ" فعل اور "عَلِيمٌ" اسم ہونے کی وجہ سے دو مختلف النوع کے کلمے ہیں۔ ان کے درمیان بھی جناس مغائر پایا جاتا ہے، آخری جملہ میں "اؤْتُمِنَ" فعل اور "أَمَانَتَهُ" اسم ہیں۔ یہ دونوں بھی الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، ان کے درمیان بھی "جناس مغائر" موجود ہے۔

﴿إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ ...... وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ﴾

یہاں پہلے جملہ میں "تَدَايَنتُمْ" کا معنی (قرض کا معاملہ کرنے) کے ہے، اس لفظ سے قرض کا معنی ادا ہوجاتا ہے، مگر آیت میں اس کے باوجود دوبارہ صراحت کے ساتھ "بِدَيْنٍ" بول کر قرض کا ذکر کردیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا تاکہ آیت کے مفہوم میں تاکید ہوسکے۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں "وَلْيَكْتُبْ" کا معنی یہ ہے کہ (کوئی لکھنے والا شخص قرض کے معاملہ کو قلمبند کرے) اس لفظ سے بھی "كَاتِبٌ" (لکھنے والا) کا مفہوم خود بخود ادا

❶ جناس مغائر وہ ہے جس میں دو کلمے مختلف النوع کلمات ہوں، یعنی اسم و حرف، یا حرف و فعل یا فعل واسم کے درمیان۔

ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود جملہ میں صراحت کیساتھ ''کَاتِبٌ'' کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی آیت کے عنوان میں تاکید کے لئے ہے۔

﴿وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ﴾

اس آیت کریمہ میں ''تشبیہ مرسل'' واقع ہوئی ہے۔ ❶ یہاں معاملہ قرض کی کتابت کے طریقہ کو اللہ سبحانہ کے بیان کردہ طریقہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں معاملہ قرض کی کتابت کا طریقہ ''مشبہ'' اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کا بیان کردہ طریقہ ''مشبہ بہ'' ہے۔ اس تشبیہ میں چونکہ ''کَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ'' کے جملہ میں (کاف) حرفِ تشبیہ کو ذکر کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''تشبیہ مرسل'' موجود ہے۔

﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّر ...... وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ﴾

یہاں پہلے جملہ کے لفظِ ''تَضِلَّ'' اور ''تُذَكِّر'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''تَضِلَّ'' بمعنی (نسیان اور بھولنے) کے ہے اور ''تُذَكِّر'' بمعنی (یاد دہانی کرانے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں ''صَغِيرًا'' (چھوٹے) اور ''كَبِيرًا'' (بڑے) کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان کو بھی آیت میں جمع کیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔

﴿وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ...... فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ...... ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ ...... إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ﴾

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

یہاں پہلے جملہ میں معاملہ قرض کی کتابت کو"بِالْعَدْل" بول کرعدل وانصاف کیساتھ مختص کردیا گیا ہے،اسی طرح دوسرے جملہ میں بھی ولی کی طرف معاملہ قرض کے املاء کرنے والے کوبھی"بِالْعَدْل"بول کرعدل وانصاف کیساتھ مختص کردیا گیا ہے۔تیسرے جملہ میں معاملہ قرض کی کتابت کو"أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ" بول کراللہ کے ہاں قرین انصاف قرار دیا گیا،اس کے باوجوداس جملہ میں کتابت کو"أَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ"بول کرگواہی کے لئے درست طریقے قرار دیکرایک قیداور تخصیص بڑھادی گئی ہے۔اسی طرح چھوتے اورآخری جملہ میں جب معاملہ نقدی کا ہوتو عدم کتابت کی اجازت دی گئی ہے،نقدی معاملہ وہ ہے جس میں لین دین دونوں جانب سے دست بدست ہو۔اس جملہ میں معاملہ کا نقدی ہونا "تِجَارَةً حَاضِرَةً" کے الفاظ سے مفہوم ہوجاتا ہے،اس کے باوجود جملہ میں"تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ" کی قید بڑھائی گئی ہے،جس کا مطلب آپس میں لینے دینے کے ہے۔حالانکہ مفہوم پہلے جملہ سے معلوم ہوجاتا ہے،لیکن اس کے باوجود یہاں"تُدِيرُونَهَا"کی قیدلگائی گئی ہے۔ان تمام جگہوں میں یہ تخصیصات اورقیودات اس لئے بڑھائی گئی ہیں تاکہ ان جملوں میں بیان ہونے والے احکامات کوتاکید کے ساتھ بیان کیا جائے۔

﴿وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں"اطناب" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں معنی مقصود معاملہ قرض کے بارے میں لکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کوبغیرکسی انکار کے معاملہ قرض کوانصاف سے لکھنے کاحکم دینا ہے۔یہ مفہوم ومقصود"كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ" تک کے جملہ سے پورا ہوجاتا ہے،کیونکہ ظاہرسی بات ہے کہ جب لکھنے کاحکم ہواتوانکارکاکوئی مطلب نہیں بنتا،مگراس جملہ میں اس معنی مقصود کوبیان کرنے کے لئے"وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ" کی زائدعبارت لائی گئی ہے۔یہ زائد

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنی مقصودکواس سے زائدعبارت لاکر بیان کیا جائے اوروہ زائدعبارت کسی غرض ومقصد کے لیے ہو۔

عبارت اس لئے تا کہ کتابت کے حکم میں تاکید ہو سکے۔ یہاں چونکہ معنی مقصود کو بیان کرنے کے لئے "وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ" کی زائد عبارت لائی گئی ہے، اس لئے اس میں "اطناب" موجود ہے۔

﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا﴾

اس آیت کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ایک مرتبہ "وَلْيُمْلِلِ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ" سے (حق) کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد "فَإِنْ كَانَ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ" کا لفظ بول کر دوبارہ "اَلْحَقُّ" کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں لفظ "اَلْحَقُّ" کا تکرار ہوا ہے۔ یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ لوگوں کو ادائیگی حقوق کی خوب تاکید کیساتھ ترغیب دی جائے۔ اس آیت میں مدیون (مقروض) کے بارے میں "عَلٰى" حرفِ جارہ کا استعمال کیا گیا ہے، جو استعلاء کے لیے ہے، تا کہ یہ بتایا جائے کہ صاحبِ حق (قرض خواہ) کو مقروض کے سامنے بولنے کا حق حاصل ہے۔ وہ مقروض کو قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں ڈانٹنے کا حق رکھتا ہے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾

اس جملہ میں "الاظهار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے۔ یہاں "وَلْيُمْلِلِ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ" میں مدیون کا ذکر ہوا ہے، یہ بعد میں اپنے لئے آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا تھا، اس لحاظ سے آیت میں آگے "فَإِنْ كَانَ الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ" کی جگہ "فَإِنْ هُوَ سَفِيهًا" بول کر ضمیر لانا چاہیئے تھی، مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ "الَّذِى عَلَيْهِ الْحَقُّ" بول کر اسم ظاہر کا اظہار کر دیا گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ مذکورہ جملہ میں "الاظهار فی مقام الاضمار"

❶ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ، کلمہ، یا حکم مکرر ذکر کیا جائے اور یہ کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

موجود ہے۔ یہ اس لئے تا کہ جس کے ذمے حق واجب ہورہا ہے اس کی خوب وضاحت ہو۔

﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى......وَاتَّقُوا اللهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللهُ وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

یہاں پہلے جملہ میں " تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ "إِحْدَاهُمَا" کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد آگے "فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا" میں دوبارہ لفظِ "إِحْدَاهُمَا" کا ذکر کیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ اس جملہ میں لفظِ "إِحْدَاهُمَا" کا تکرار ہوا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ اس میں تاکید ہو کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے۔ اور یہ تاکید اس لیے ہے کہ عورتوں میں عموماً بھولنے کا مرض زیادہ ہے۔

اسی طرح دوسرے جملہ میں بھی لفظِ "اللَّه" کا تکرار ہے۔ اس میں ایک مرتبہ "وَاتَّقُوا اللَّه" کے جملہ میں لفظِ "اللَّه" کا ذکر ہوا، پھر "وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ" میں دوبارہ لفظِ "اللّٰہ" کا ذکر ہوا، اس کے بعد سہ بارہ "وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ" میں لفظِ "اللّٰہ" کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ میں لفظِ "اللَّه" کا تکرار واعادہ ہوا ہے، ان تینوں جملوں میں لفظِ "اللَّه" کا تکرار اس لئے ہوا تا کہ سامع کے دل و دماغ میں خشیت اور خوفِ خدا پیدا ہو، اور تقوی کی خوب ترغیب ہو، گویا اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ تینوں جملوں میں لفظِ "اللّٰہ" کے تکرار سے درج ذیل تین عنوانات کا مستقل ہونا بتایا گیا ہے:

نمبر۱: تقوی پر ابھارنا۔ نمبر۲: علم۔ نمبر۳: اللہ کے علم کا عظیم الشان ہونا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جس قدر تقوی ہوگا اُسی قدر اللہ رب العزت اُسے علم عطا کرے گا، اور تقوی پر علم وہبی اور علم لدنی عطا ہوتا ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ......وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ(۲۸۲)﴾

یہاں متعدد مقامات میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ یہاں "آمَنُوْا" کے بعد "بِمَا جَاءَ مُحَمَّدٌ" کا جملہ، "مُسَمًّى" کے بعد "بَيْنَكُمْ" کا لفظ، "عَلَّمَهُ اللّٰهُ" کے بعد "اَلْكِتَابَةَ وَالْخَطَّ" کے الفاظ، "عَلَيْهِ الْحَقُّ" کے بعد "مَا عَلَيْهِ مِنَ الدَّيْنِ" کا جملہ۔ اسی طرح "رَبَّه" کے بعد "فِيْ اِمْلَائِهِ" کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ اصل میں "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا بِمَا جَاءَ مُحَمَّدٌ إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى بَيْنَكُمْ فَاكْتُبُوهُ ......وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ الْكِتَابَةَ وِالْخَطَّ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ مَا عَلَيْهِ مِنَ الدَّيْنِ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّه فِيْ اِمْلَائِهِ" تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان لانے والوں جب تم اپنے مابین کوئی معاملہ قرض کا انجام دو تو تم اس کو لکھ لو، اور کاتب کو اللہ نے خط وکتابت جس طرح سکھایا ہے اُس طرح لکھنے سے انکار نہ کرے، بس وہ لکھے اور جس پر کسی قرض میں سے حق ہو تو وہ بھی معاملہ قرض کا املاء کروائے اور وہ املاء کروانے میں اپنے رب سے ڈرے۔) یہاں چونکہ "بِمَا جَاءَ مُحَمَّدٌ، بَيْنَكُمْ، اَلْكِتَابَةَ وَالْخَطَّ، مَاعَلَيْهِ مِنَ الدَّيْنَ، فِيْ اِمْلَائِهِ" کے الفاظ اور جملے حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے ان میں "ایجاز حذف" پایا جاتا ہے۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (۲۸۳)﴾

ترجمہ: اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لیے جائیں۔ ہاں اگر تم ایک دوسرے پر بھروسہ کرو تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور گواہی کو چھپاؤ، اور جو گواہی کو چھپائے وہ گنہگار دل کا حامل ہے، اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

﴿وَلا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا﴾

اس جملہ کے لفظِ "تَكْتُمُوا" اور "يَكْتُمْ" کے درمیان "جناس مماثل" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں "تَكْتُمُوا" اور "يَكْتُمْ" دونوں فعل ہیں، چونکہ یہ دونوں ایک ہی نوع کے دو کلمے ہیں، اس لئے ان کے درمیان "جناس مماثل" موجود ہے۔

﴿وَإِنْ كُنتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور "استعارة تبعية" پائے جاتے ہیں۔❷ یہاں "سَفَر" پر قدرت اور تمکن پانے کو سوار کا سواری پر قدرت وتمکن پانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں سفر پر قدرت پانا "مشبه" اور سواری پر سوار کا تمکن پانا "مشبه به" ہے۔ آیت میں چونکہ "عَلَى" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں "استعارة تبعية" بھی موجود ہے۔❸ یہاں "عَلَى" حرف ہے، اس میں چونکہ استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے اس میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

﴿وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّه﴾

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ کے اسمِ مبارک لفظِ "اللّٰه" کے ساتھ ساتھ لفظِ "رَبَّه" بڑھا کر اللہ تعالیٰ کے ایک وصف کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ گویا آیت میں اللہ کا نام اور وصف دونوں جمع کر دیئے گئے ہیں، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ تقویٰ اور تحذیر کے حکم میں مبالغہ ہو۔

﴿لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے دو کلمات میں مجانست پائی جائے۔ یعنی دو اسموں، فعلوں، یا دو حرفوں کے درمیان جناس ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❸ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۸۴)﴾

ترجمہ: جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا پھر جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "تُبْدُوا" اور "تُخْفُوهُ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "تُبْدُوا" (ابداء) مصدر سے مشتق ہے۔ اس کا معنی (ظاہر کرنے) کے ہے اور "تُخْفُوهُ" (اخفاء) مصدر سے مشتق ہے۔ اس کا معنی (پوشیدہ کرنے اور چھپانے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں لفظِ "فَيَغْفِرُ" اور "يُعَذِّبُ" کے معنوں میں "طباق" موجود ہے۔ وہ اس طرح کہ "فَيَغْفِرُ" کا معنی (مغفرت کرنے) کے ہے اور "يُعَذِّبُ" کا معنی (عذاب دینے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، اس لئے ان کے درمیان بھی "طباق" پایا جاتا ہے۔

﴿لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ "مَا فِي السَّمَاوَات" میں لفظِ (ما) کا ذکر ہوا ہے، پھر بعد میں آگے "وَمَافِي الْأَرض" میں دوبارہ لفظِ (ما) کا ذکر کیا گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تاکہ کلام میں خوب تاکید ہو اور اللہ رب العزت کی بادشاہت اور سلطنت کی وسعت کو بیان کیا جائے۔

---

❶ طباق کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کرنے کا نام ہے۔

﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (۲۸۵)﴾

ترجمہ: یہ رسول (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم آپ کی مغفرت کے طلبگار ہیں، اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ (۲۸۵)﴾

اس آیت کریمہ کے لفظِ "آمَنَ" اور "اَلْمُؤْمِنُوْن" کے درمیان "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "آمَنَ" فعل اور "اَلْمُؤْمِنُوْن" اسم ہے، یہ دونوں دو مختلف النوع کلمات ہیں، چونکہ ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں "جناس مغائر" موجود ہے۔ اسی طرح ان دونوں میں "جناس اشتقاق" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "آمَنَ" اور "اَلْمُؤْمِنُوْن" کا اصل مادہ اشتقاق "امن" ہے اور اس کا اصل معنی (محفوظ ہونے اور ایمان لانے) کے ہے۔ ان دونوں چیزوں میں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے موافق ہیں، اس لئے ان میں "جناس اشتقاق" بھی پایا جاتا ہے۔

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو مختلف النوع کے دو کلمات کے درمیان جناس واقع ہو، مثلاً ایک حرف ایک اسم یا ایک حرف ایک فعل یا ایک فعل اور ایک اسم کے درمیان ہو۔

❷ جناسِ اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمے اصل مادہ اشتقاق اور اصل معنی میں ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہوں۔

اس آیتِ کریمہ میں ”ایجاز بالحذف“ بھی پایا جاتا۔ یہاں ”الْمُؤْمِنُون“ کے بعد ”بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ“ محذوف ہے۔ یہ اصل میں ”آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُون بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ“ تھا۔ آیت سے چونکہ ”بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ“ کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں ”ایجاز حذف“ موجود ہے۔

﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ(۲۸۵)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ“ بطور ”اطناب“ کے واقع ہوا ہے۔ ❶ اس آیت کا مقصودی عنوان یہ ہے کہ رسول اور ایمان والے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور رسولوں پر بلاتفریق ایمان رکھتے ہیں۔ وہ ایمان لانے میں یہود اور نصاری کی طرح تفریق نہیں کرتے کہ بعض رسولوں پر تو ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں، بلکہ وہ یکساں طور پر تمام انبیاء ومرسلین کو رسول مانتے ہیں، یہ مقصودی عنوان ”وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ“ سے سمجھ آ جاتا ہے، مگر آیت میں اس مقصودی عنوان کو بیان کرنے کے لئے آگے صراحتاً ”لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ“ کی زائد عبارت لائی گئی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”اطناب“ موجود ہے۔ یہ زائد عبارت اس لئے لائی گئی تاکہ آیت کے مفہوم میں تاکید ہو، اور اس بات کی وضاحت ہو کہ بعض رسولوں پر ایمان لانا کافی نہیں ہے، بلکہ تمام رسولوں پر بلاکسی تفریق کے ایمان ضروری ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنیٰ مقصود کو بیان کرنے کے لئے اس سے زائد عبارت لائی جائے اور وہ زائد عبارت کسی مقصد کے لیے ہو۔

وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۲۸۶)﴾

ترجمہ: اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا، اس کو فائدہ بھی اسی کام سے ہوگا جو وہ اپنے ارادے سے کرے، اور نقصان بھی اسی کام سے ہوگا جو اپنے ارادے سے کرے۔ (مسلمانو اللہ سے یہ دعا کیا کرو کہ) اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرمایئے۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو، اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمایئے، ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمایئے۔ آپ ہی ہمارے حامی و ناصر ہیں، اس لیے کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمایئے۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

اس آیت کریمہ میں ''لَهَا'' اور ''عَلَيْهَا'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❶ ''لَهَا'' میں (لام) ''انتفاع'' کے لئے ہے۔ اور انتفاع میں نفع پانے کا مفہوم داخل ہے۔ ''عَلَيْهَا'' میں ''عَلَى'' ''ضرر'' کے لیے ہے اس میں نقصان کا معنی پایا جاتا ہے۔ (نفع پانا اور ضرر پانا) دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں۔ ان مقابل معنوں کو چونکہ آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان معنوں کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

یہاں ''لَهَا''، فعل ''كَسَبَتْ'' پر اور ''عَلَيْهَا'' فعل ''اكْتَسَبَتْ'' پر مقدم ہے۔ یہ دونوں ''لَهَا'' اور ''عَلَيْهَا'' معمول ہیں اور افعال عامل ہیں۔ اصول کے مطابق عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں، مگر جب کبھی کوئی نکتہ مقصود ہو تو معمول کو عامل پر مقدم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی معمولوں کو عاملوں پر حصر کے لیے مقدم کیا گیا ہے۔ ❷ اس

❶ طباق دو مقابل معنوں کو جمع کرنے کا نام ہے۔

❷ حصر کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی دوسری شئی کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

آیت میں بھی معمولوں کو عاملوں پر مقدم کر کے نفع وضرر کو انسان کے اپنے کسب کیساتھ مختص کر دیا گیا ہے۔حصر کی صورت میں دونوں کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی نیکی کا کام کیا تو اس کا ثمرہ بھی اسی کو ملے گا،اور اگر کسی نے کوئی گناہ کیا تو اس کا وبال بھی اُسی پر ہوگا۔

﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَإِلَیْکَ الْمَصِیرُ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِینَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا إِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِینَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ (٢٨٦)﴾

ان آیتوں میں بار بار ''نِدَاء'' کا تکرار ہوا ہے۔پہلی آیت میں ''رَبَّنَا'' کہا گیا، پھر اگلی آیت میں اسی ''نداء'' کا متعدد مقام پر ذکر ہوا۔''رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا،رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا'' میں ''رَبَّنَا''تکرار کے ساتھ مذکور ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''تکرار'' واقع ہوا ہے۔یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ بندہ کی طرف سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف خوب عاجزی،درماندگی اور التجاء کا اظہار ہو سکے۔

﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا إِصْرًا کَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِینَ مِنْ قَبْلِنَا﴾

اس آیت کریمہ میں ''تشبیه مرسل'' پائی جاتی ہے۔❶ یہاں مشقت والی تکلیف کا اور سختی کا مکلّف بنانے کو اس سختی اور مشقت والی تکلیف کے مکلّف بنانے سے تشبیہ دی دگئی ہے جس کا محل بنی اسرائیل تھے۔اس تشبیہ کے لئے آیت میں چونکہ ''کَمَا'' بول کر حرفِ تشبیہ ذکر کر دیا گیا ہے،اس لئے آیت میں ''تشبیه مرسل'' موجود ہے۔

﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا إِصْرًا﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارة تصریحية'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں مشقت والی تکلیف کو

---

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کر دی جائے۔

اس بھاری بوجھ سے تشبیہ دی گی ہے جو اُٹھانے والے کو اپنی جگہ محبوس کر دے۔اس میں مشقت والی تکلیف ''مشبه'' اور بھاری بھرکم بوجھ ''مشبه به'' ہے۔ان میں وجہ شبہ نا گواری ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھاری بھرکم بوجھ اٹھانے میں اٹھانے والے کو نا گواری گزرتی ہے، بالکل اسی طرح مشقت والی تکلیف سے بھی انسان پر نا گواری گزرتی ہے۔اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں استعارہ واقع ہوا ہے۔مگر چونکہ آیت میں ''إِصۡرًا'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے،اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَۃُ آلِ عِمْرَان

﴿الٓمٓ (1)﴾

اس میں ابتداء ابہام سے ہوئی ہے، کیونکہ ''الٓـمٓ'' حروفِ مقطعات میں سے ہے اور حروف مقطعات بوجہ اخفاء معانی مبہمات میں سے ہیں، اس لئے سورت کی ابتداء ''الٓـمٓ'' سے کرنے میں ابہام پایا جاتا ہے۔ ابتداء میں ہی یہ ابہام اس لئے لایا گیا ہے تاکہ سامع کلام کے اگلے حصہ کی طرف اپنی نظر وفکر کو متوجہ رکھے۔ اور ابتداء میں اپنی کم علمی کا اقرار اور خالقِ کائنات کے علیم وخبیر ہونے کا اقرار کرے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ (۳)﴾

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے۔ اس نے تم پر وہ کتاب نازل کی ہے جو حق پر مشتمل ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل اتاریں۔

اس آیت کریمہ میں ''استعارة تصريحية و تبعية'' پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں لوح محفوظ سے دلوں میں قرآن کریم کے القاء کرنے کو بلندی سے نیچے کی طرف مجسم شئی کے اتارنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں لوح محفوظ سے دلوں کی طرف قرآن کریم کا القاء کرنا ''مشبہ'' اور بلندی سے نیچے کی طرف کوئی چیز اتارنا ''مشبه به'' ہے۔ لیکن چونکہ آیت میں ''نَزَّلَ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ اور یہ استعارہ اس لئے ماننا پڑا کیونکہ ''نَزَّلَ'' اپنے حقیقی معنی میں

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

نہیں ہوسکتا، کیونکہ "تــنـزِیـل" کا حقیقی معنی یہ ہے کہ بلندی سے نیچے کی طرف کوئی مجسم چیز اتاری جائے، قرآن تو لوح محفوظ میں مثبت تھا۔اس کے لئے "تنزِیل" کا حقیقی معنی مراد لینا درست نہیں ہوگا،اس لئے آیت میں "تنزِیل" کو بطور استعارہ القاء کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔اس آیت میں "استعــارة تبعية" بھی پایا جاتا ہے۔❷ یہاں "نَـزَّلَ" فعل مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک عمدہ نکتہ اور بھی موجود ہے۔وہ یہ ہے کہ یہاں قرآن مجید کی تعبیر "الـقرآن" سے کرنے کے بجائے "الْـکِتَـابَ" سے کی گئی ہے جو اسم جنس کے قبیل سے ہے۔ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن کریم کو تمام آسمانی کتابوں پر کمالِ فوقیت حاصل ہے، گویا قرآن ہی اس لائق ہے کہ اسے کتاب کا نام دیا جائے۔

﴿مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں قرآن کریم کا گذشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے کی حالت کو اس انسان کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے سامنے کوئی چیز پڑی ہو اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس چیز کو وصول کرے، اور اس کی تصدیق واقرار کرے، قرآن کریم بھی تدریجاً نازل ہوا اور یہ سابقہ کتابوں کے مضامین واحکامات کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ اور مثال ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تمثيلية" پایا جاتا ہے۔

﴿مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴)﴾

---

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا مشتقات میں واقع ہو۔

❷ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت وکیفیت کی دوسری مرکب حالت وکیفیت کے مثال وتشبیہ دی جائے۔

ترجمہ: جو اس سے پہلے لوگوں کے لیے مجسم ہدایت بن کر آئی تھیں، اور اسی نے حق و باطل کو پرکھنے کا معیار نازل کیا۔ بیشک جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا ہے ان کے لیے سخت عذاب ہے، اور اللہ زبردست اقتدار کا مالک اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔ یہاں قرآن کریم کو اس جسمانی شئی سے تشبیہ دی گئی ہے جو باقاعدہ جسموں کے درمیان تفریق ڈال دے، اس تشبیہ میں قرآن کریم ''مشبہ'' اور دو اجسام کے درمیان تفریق ڈالنے والا ''مشبہ بہ'' ہے۔ ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح کوئی مجسم شئی دو چیزوں کو تفریق کے ذریعہ ایک دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز کر دیتی ہے، بالکل اسی طرح قرآن حق اور باطل کے درمیان حد فاصل اور تمیز ڈال کر دونوں کو جدا جدا کر دیتا ہے، اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں استعارہ واقع ہوا ہے۔ لیکن چونکہ آیت میں ''الْفُرْقَان'' بول کر ''مشبہ بہ'' کی صراحت لفظوں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' مذکور ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (٦)﴾

ترجمہ: وہی ہے جو ماؤں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست اقتدار کا بھی مالک ہے، اعلی درجے کی حکمت کا بھی۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی ''استعارۃ تبعیۃ'' پایا جاتا ہے۔ یہاں لفظِ ''يُصَوِّرُ'' کہہ کر اللہ سبحانہ کے حکم دینے کو یا کسی کام کی صنعت اور کاریگری سے اللہ کے ارادہ کے تعلق ہونے کو اس مصور سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی چیز کا خاکہ بنائے، پھر اس کے اجزاء کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ان سے کوئی صورت بنالے۔ اس میں ''يُصَوِّر'' کہہ کر اللہ کا حکم دینا یا کسی کام کی صنعت اور کاریگری سے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا متعلق ہونا ''مشبہ'' ہے اور مصور ''مشبہ

بـہ،، ہے۔آیت میں چونکہ "یُـصَوِّرُ،، بول کرمشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارۃ تصریحیۃ،، پایا جاتا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۷)﴾

ترجمہ: (اے رسول) وہی اللہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس کی کچھ آیتیں تو محکم ہیں جن پر کتاب کی اصل بنیاد ہے اور کچھ دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔اب جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ ان متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان آیتوں کی تاویلات تلاش کریں، حالانکہ ان آیتوں کا ٹھیک ٹھیک مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جن لوگوں کا علم پختہ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہم اس (مطلب) پر ایمان لاتے ہیں (جو اللہ کو معلوم ہے) سب کچھ ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے ہے، اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ(۷)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "استعارۃ مکنیۃ،، پایا جاتا ہے۔❶ یہاں خواہش پرست دل کو اس شئی سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی جگہ سے ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے ہٹا ہوا ہو۔اس میں خواہش پرست دل "مشبہ،، ہے اور اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی شئی "مشبـہ بہ،، ہے۔ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے شئی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے

❶ استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ حذف کردیا جائے، البتہ مشبہ بہ کے لوازم میں سے کوئی ایک لازم ذکر کرکے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کردیا جائے۔

اسی طرح خواہش پرست دل خیر اور بھلائیوں سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں استعارہ واقع ہوا ہے۔آیت میں چونکہ مشبہ (خواہش پرست دل) کا ذکر ''فِی قُلُوبِهِمْ'' سے کردیا گیا ہے،اورمشبہ بہ (اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی چیز) کوحذف کردیا گیا،لیکن ''زَیْغٌ'' بول کرمشبہ بہ کے لازم (ٹیڑھاپن) کوذکرکر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے،اس لئے آیت میں ''استعارة مكنية'' موجود ہے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ (٣) مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ (٤) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (٥) وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (٧) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (٨)﴾

ان آیتوں میں متعدد مقامات پر چند چیزیں ذکر کرنے کے لئے مختص کی گئی ہیں۔وہ چیزیں یہ ہیں:

نمبر۱: پہلے اور دوسرے جملہ میں قرآن،توراۃ،انجیل اور الفرقان کے لفظ سے زبور کا ذکر کیا گیا ہے،حالانکہ آسمانی کتابیں اور صحائف ان کے علاوہ بھی ہیں مگرآیت میں ان کا ذکر نہیں ہوا۔چونکہ اہل کتاب،مسلمان،یہود اور نصاریٰ ہیں،اس لئے آیت میں دیگر کتابوں کا ذکر چھوڑ کر بالخصوص ان ہی چاروں کا ذکر ہوا ہے۔واضح رہے کہ یہ یہاں ''الْفُرْقَانَ'' سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک زبور ہے،ان کے قول کے مطابق اختصاص میں چار معروف کتابوں کا ذکر ہوتا ہے،لیکن دیگر بعض مفسرین نے ''الْفُرْقَان'' سے قرآن کریم مراد لیا ہے،اس صورت میں اختصاص تین کتابوں سے متعلق ہوگا۔

نمبر۲: تیسرے جملہ میں ''فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ'' میں یہ بتانے کے لئے کہ

اللہ سبحانہ کے علم سے کوئی شئی مخفی نہیں، صرف آسمان وزمیں کی تخصیص ہوئی ہے، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں اللہ کی مخلوقات ہیں جن کا ذکر یہاں نہیں ہوا، مگر چونکہ ظاہراً اللہ کی تمام مخلوقات میں یہی دونوں چیزیں جسامت میں بہت بڑی ہیں، اس لئے آیت میں ان ہی کا بالخصوص ذکر ہوا ہے۔

نمبر۳: چوتھے جملہ میں اس علم کا ذکر ہوا ہے جو صفتِ رسوخ اور پختگی سے آراستہ ہو۔ علم تو بہت ساروں کے پاس ہوتا ہے، مگر آیت میں ان ہی علماء کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا ہے جن کے علم میں رسوخ ہو۔ ایسا اس لئے کیا تا کہ اس عالم کی عظمت شان اور فوقیت واضح کی جائے جو راسخ فی العلم ہو۔

نمبر۴: چوتھے جملہ میں نصیحت کے عنوان کے ساتھ ''أُولُو الْأَلْبَابِ'' بول کر تحصیل نصیحت کے لیے عقلمندوں کی تخصیص کر دی گئی ہے، حالانکہ نصیحت حاصل کرنا صرف ان کا خاصہ نہیں، ان کے علاوہ بے عقل افراد بھی نصیحت حاصل کر سکتے ہیں، مگر چونکہ حقیقی معنوں میں حق وباطل کی تمیز، تدبر وتفکر کی صلاحیت عقلمندوں میں زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے آیت میں بالخصوص ارباب عقل کا ذکر ہوا۔

نمبر۵: چھٹے اور آخری جملہ میں کجروی سے محفوظ رہنے کی دعا مانگی گئی ہے۔ اس دعا میں بالخصوص قلوب (دلوں) کا ذکر ہوا ہے، حالانکہ انسانی جسم کے بہت سے اعضاء اور بھی ہیں، مگر چونکہ جسم کی اصلاح، فساد اور دخول ایمان کا اصل محل دل ہے، دل پورے جسم میں بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور باقی سارے اعضاء بمنزلہ رعایا کے ہیں، رعایا وہی کرتی ہے جو بادشاہ حکم دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جسم کا کوئی اور عضوء ایسا نہیں، اس لئے آیت میں بالخصوص دل کا ذکر ہوا ہے۔

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۹)﴾

ترجمہ: ہمارے پروردگار تو تمام انسانوں کو ایک ایسے دن جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ بیشک اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ میں ''التفات من الخطاب الی الغیبة'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں آیت میں ''إِنَّکَ''، میں ''کاف''، ضمیر استعمال ہوئی ہے جو خطاب کا لفظ ہے۔اس لحاظ سے آگے آیت میں اللہ سبحانہ کے لئے ''إِنَّ اللَّـهَ لَا يُخْلِفُ'' کی جگہ ''إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ'' بول کر خطاب کے الفاظ لانے چاہیے تھے،مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ''إِنَّ اللَّهَ'' بول کر اسمِ ظاہر لایا گیا ہے جو الفاظ غائب کی قبیل سے ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''التفات من الخطاب إلى الغيبة'' پایا جاتا ہے۔یہ التفات اس لئے ہوا کہ تا کہ سامع قرآن کریم کے بدلتے انداز کوسن کر لطف اندوز ہواور کلام سننے میں سامع کو تسکین قلب حاصل ہو۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ (١٠)﴾

ترجمہ:حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے اللہ کے مقابلے میں نہ ان کی دولت ان کے کچھ کام آئے گی ،نہ ان کی اولاد اور وہی ہیں جو آگ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔

اس آیت کریمہ میں کئی نکات پائے جاتے ہیں جو ترتیب وار پیش خدمت ہیں:

نمبرا:اس میں ''ایجاز بالحذف'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ''مِنَ اللّٰہ'' میں لفظ ''مِن'' کے بعد ''عذاب'' کا لفظ محذوف ہے۔یہ اصل میں ''مِن عذَابِ اللّٰہ'' تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کوان کی سرمایہ داری اوراولاد اللہ کے عذاب سے چھٹکارا نہیں دلا

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف پیش کرنے کی ایک صورت ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے ظاہراور کلام کا سیاق وسباق تو خطاب کے الفاظ کا تقاضہ کرے مگر کلام میں خطاب کی جگہ غائب کے الفاظ ذکر کردیئے جائیں۔

❷ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی جملہ،کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

سکتے۔اس آیت میں چونکہ لفظِ ''عذاب'' حذف کردیا گیا ہے،اس لئے اس میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔

نمبر۲:اس میں لفظِ ''شَيْـئًا''،نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی شئی کی قلت اور کمی کو بیان کیا جاتا ہے، یہاں بھی ''شَيْئًا''کونکرہ لاکراس کے معنی میں قلت کو بیان کیا گیا ہے۔اس صورت میں ''شَيْـئًا'' کا مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کی سرمایہ داری اوراولادان کوعذاب سے بچانے کے لئے تھوڑا سا بھی نفع بخش نہ ہوگی۔

نمبر۳:اس آیت کریمہ میں ''وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّار'' جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے۔یہ جملہ اسمیہ کی صورت میں اس لئے لایا گیا تاکہ آیت میں بیان ہونے والے عنوان کو دائمی طور پر متحقق اور ثابت کیا جائے۔یہی لوگ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن ہوں گے،یعنی ان کا عذاب وقتی اور عارضی نہیں ہوگا، بلکہ دائمی ہوگا۔

نمبر۴:اس آیت کریمہ میں''وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّار''میں''استعارة تصريحية'' بھی پایا جاتا ہے۔❶ یہاں کفار کو اس لکڑی اور ایندھن سے تشبیہ دی گئی ہے جو فقط جلانے کے لئے استعمال کی جائے۔اس میں کفار ''مشبه'' ہےاورلکڑی وایندھن''مشبه به'' ہے۔آیت میں چونکہ ''وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّار'' بول کرمشبہ بہ کی صراحت لفظوں کردی گئی ہے،اس لئے آیت ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔

نمبر۵:اس آیت میں ''وَأُولَئِكَ'' مبتداءاور''وَقُودُ النَّار''اس کی خبر ہے،ان دونوں کے درمیان آیت میں ''هُمْ'' ضمیر فصل لائی گئی ہے۔یہ اس لئے تاکہ اس میں خوب تاکید کا معنی حاصل ہو۔

﴿كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۱۱)﴾

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کے صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

ترجمہ: ان کا حال فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں کے معاملے جیسا ہے۔ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، چنانچہ اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ میں لے لیا، اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

اس جملہ میں ''**التفات من التكلم إلى الخطاب**'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''**كَذَّبُوا بِـآيَاتِنَا**'' میں ''نا'' ضمیر استعمال ہوئی ہے، جو تکلم کی ضمیر ہے۔ اس لحاظ سے آیت میں آگے ''**فَـأَخَذَهُمُ**'' کی جگہ ''**فَـاَخَذْنَا**'' بول کر تکلم کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ آیت میں ''**اَخَذْنَا**'' کی جگہ ''**فَأَخَذَهُمْ**'' استعمال ہوا ہے جو غائب کا صیغہ ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''**التفـات من التكلم إلى الخطاب**'' پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ اس میں موجود لفظِ ''**اللّٰه**'' کے ذریعہ لوگوں میں اللہ کی عظمت و ہیبت اور عذاب پر گرفت دلوں میں راسخ ہو جائے، ''**والله شـديد العقاب**'' میں لفظِ ''اللہ'' کا دوبارہ ذکر تاکید اور خوفِ الٰہی کے لیے ہے، اللہ رب العزت نے الوہیت کا دعوی کرنے والے کا کیا حشر کیا ہے، آج تک وہ لوگوں کے لیے عبرت کا مقام ہے، لفظِ ''شدید'' صفتِ مشبہ کا صیغہ مبالغہ کے لیے ہے، اللہ رب العزت کی گرفت وقتی اور عارضی نہیں بلکہ دائمی اور استمراری ہے۔

﴿**قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (١٢)**﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان سے کہہ دو کہ تم مغلوب ہو گئے اور تمہیں جمع کر کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، اور وہ بہت برا بچھونا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''**ذكر العام وإرادة الخاص**'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''**لِلَّذِينَ كَفَرُوا**'' عام لفظ ہے، کیونکہ اس کا اطلاق تمام طبقاتِ کفر پر ہو سکتا ہے، اس لئے یہ عام ہے، مگر آیت میں بقول بعض مفسرین کے اس سے خاص یہود مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں عام لفظ کا ذکر کیا جائے، مگر مراد اس سے خاص ہو۔

یہود ونصاری دونوں مراد ہیں،اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں ’’**اطلاق العام و إرادة الخاص**‘‘ موجود ہے۔

﴿**قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ (۱۳)**﴾

ترجمہ:تمہارے لیےان دوگروہوں (کے واقعے) میں بڑی نشانی ہے جوایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ان میں سے ایک گروہ اللہ کے راستے میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا جو اپنے آپ کو کھلی آنکھوں ان سے کئی گنا زیادہ دیکھ رہا تھا۔اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے۔ بیشک اس واقعے میں آنکھوں والوں کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ’’كَانَ‘‘ فعلِ ناقص ’’آيَةٌ‘‘ اس کا اسم مؤخراور ’’لَكُمْ‘‘ جار مجرور متعلق سے ملکراس کی خبر مقدم ہے۔اصول تو یہ ہے کہ افعالِ ناقصہ کے اسم کو ان کے خبر پر مقدم کیا جاتا ہے،مگر جب کوئی خاص غرض مطلوب ہوتو اصول کے خلاف افعالِ ناقصہ کے خبر کو ان کے اسم پر مقدم کر دیا جاتا ہے۔اس آیت مبارکہ میں بھی ایک عمدہ نکتہ کے پیش نظر ’’كَانَ‘‘ کی خبر ’’لَكُمْ‘‘کواس کے اسم ’’آيَةٌ‘‘ پر مقدم کر دیا گیا ہے۔وہ نکتہ یہ ہے کہ آیت کے مخاطبین کواس تقدیم سے اہمیت دی جائے اور مخاطب کو بعد میں آنے والی چیزوں کی سماعت کی طرف شوق دلایا جائے۔

اس میں لفظِ ’’آيَة‘‘ نکرہ استعمال ہوا ہے،نکرہ سے کبھی شئی کی عظمت وفخامت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔یہاں بھی ’’آيَة‘‘ نکرہ لاکر اس کی عظمت وفخامت بیان کی گئی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ان دو جماعتوں میں تمہارے لئے بہت عظیم نشانی موجود ہے۔ بدر

میں بے سروسامانی کی حالت میں تین گنا بڑے لشکر کو شکست دینا جو ہر قسم کے ہتھیار سے لیس تھے، اور مدد کے لیے فرشتوں کا اترنا، اس میں تمہارے لیے اللہ رب العزت کی حکمت وقدرت کی بڑی نشانیاں ہیں۔

﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَة(۱۳)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "محسنات بدیعة" کی ایک قسم "احتباک" پائی جاتی ہے۔❶ یہ آیت اصل میں "فِئَةٌ مُؤمِنةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَة تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ الشَّيطَانِ" تھا۔اس مقدر عبارت میں "مؤمنةٌ" موجود ہے، جو آیت کریمہ میں حذف کردیا گیا، مگر آیت کی دوسری جانب میں اس کا مقابل "کَافِرَة" ذکر کردیا گیا ہے جو "مُؤمِنَةٌ" کے حذف پر دلیل ہے۔اسی طرح مذکورہ مقدر عبارت کے دوسری جانب "فِي سَبِيلِ الشيطان" مقدر نکالا گیا ہے جو آیت میں موجود نہیں، مگر آیت میں پہلی طرف میں اس کا مقابل یعنی "فِي سَبِيلِ اللَّه" مذکور ہے، جو "فِي سَبِيلِ الشيطان" کے حذف پر دلیل ہے۔اس تفصیل سے واضح ہوا کہ مذکورہ آیت میں "احتباک" موجود ہے۔

﴿يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظ "يَرَوْن" اور "رَأْي" کے درمیان "جناس مغائر" موجود ہے۔❷ یہاں "يَرَوْن" فعل ہے اور "رَأْي" اسم ہے۔اسم اور فعل دو الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان مختلف النوع کلموں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں "جناس مغائر" موجود ہے۔

---

❶ احتباک یہ ہے کہ کسی کلام کے دو اطراف میں سے ہر ایک طرف سے ایک مقابل کو حذف کردیا جائے اور دوسرے طرف اس محذوف کا مقابل موجود ہو جو محذوف کے حذف پر دلیل بھی ہو۔

❷ جناس مغائر یہ ہے کہ دو الگ الگ نوع کے کلموں میں جناس واقع ہو، یعنی ایک اسم ایک فعل یا ایک اسم ایک حرف یا ایک فعل ایک حرف کے درمیان جناس ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں ''احتراس'' واقع ہوا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں ''یَرَوْنَھُمْ مِثْلَیْہِمْ'' میں ''یَرَوْنَ'' فعل استعمال ہوا ہے، یہ فعل ''رؤیت'' مصدر سے مشتق ہے، جو کبھی ''دل کی رؤیت'' کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی غلبہ ظن اور غالب گمان کے لئے۔ جب آیت میں یہ جملہ کہا گیا تو اس میں یہ وہم ہوا کہ شاید مشرکین نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے دگنا رؤیت قلبی کے ذریعے جانا ہو، یا ظنِ غالب کے طور پر، حالانکہ یہ خلافِ مقصود وہم ہے۔ آیت میں آگے ''رَأْیَ الْعَیْنِ'' بول کر اس وہم کو دور کر دیا گیا کہ مشرکین کا اپنے آپ کو مسلمانوں سے دگنا جاننا رؤیت عین سے تھا۔ یعنی وہ کھلی آنکھوں اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ کفار کی تعداد ایک ہزار تھی جب کہ مسلمان تین سو تیرہ تھے۔ اور یہ رؤیت قلبی یا ظن غالب کے طور پر نہ تھا۔ چونکہ آیت میں ''رَأْیَ الْعَیْنِ'' کے لفظ سے گذشتہ جملہ میں پیدا ہونے والے خلافِ مقصود وہم کو دور کیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ''احتراس'' موجود ہے۔

﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِینَ وَالْقَنَاطِیرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ عِنْدَہُ حُسْنُ الْمَآبِ (۱۴)﴾

ترجمہ: لوگوں کے لیے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے جو ان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہے۔ یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے۔

❶ احتراس کا دوسرا نام تکمیل ہے۔ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے کلام میں جو خلافِ مقصود کا پہلو رکھتا ہوا ایسا کوئی لفظ یا جملہ لایا جائے جو خلافِ مقصود وہم کو دور کر دے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''**الایضاح بعد الابہام**'' موجود ہے۔ ❶ اس آیت کی ابتداء میں ''**زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ**'' بول کر ابہام کیساتھ لوگوں کے لئے خواہشات کا مزین ہونا بتایا گیا ہے، مگر خواہشات کا مزین ہونا کن چیزوں میں ہے، اور وہ کون کون سی چیزیں ہیں، اور اس کی کیا کیفیت ہے؟ اس بارے میں تفصیل نہیں ہوئی، اس لئے خواہشات کا مزین ہونا ایک مبہم شئی ہے۔ آیت میں اس مبہم شئی کو بیان کرنے کے بعد ''**مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ**'' بول کر اس کی تفصیل بیان کردی گئی کہ عورتوں، بچوں، سونا اور چاندی کے ذریعہ لوگوں کے خواہشوں کی تزیین ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''**الایضاح بعد الابہام**'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں تزیین کا محل ''**حُبُّ**'' (چاہت اور محبت) کو قرار دیا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تاکہ آیت میں مبالغہ ہو۔ دوسری بات حقیقت میں مزین خواہشات نہیں ہوتیں بلکہ وہ چیزیں مزین ہوتی ہیں جن کی انسان خواہش رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے آیت میں ''**زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ**'' کی جگہ ''**زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الْمُشْتَهَيَاتِ**'' سے تعبیر ہونی چاہئے تھی، مگر آیت میں ''**الْمُشْتَهَيَاتِ**'' کی جگہ ''**الشَّهَوَاتِ**'' سے تعبیر بیان کی گئی، گویا ''**الْمُشْتَهَيَاتِ**'' (وہ چیزیں جن کی انسان خواہش رکھے) کو سراسر شہوات قرار دیا گیا۔ ایسا اس لئے کیا تاکہ آیت میں مزید تاکید پیدا ہو۔ اس آیت کریمہ کے لفظِ ''**الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ**'' کے درمیان ''**جناس مماثل**'' بھی موجود ہے۔ ❷ یہاں ''**الْقَنَاطِير**'' اور ''**الْمُقَنْطَرَةِ**'' دونوں اسم ہیں، اس لئے یہ دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک نوع کے ان دونوں

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی مبہم شئی بیان کی جائے پھر اس کے بعد اس مبہم کی وضاحت کی جائے۔

❷ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دوکلموں میں جناس واقع ہو یعنی دو اسموں، دوقول یا دوفعلوں میں جناس ہو۔

کلموں میں جناس واقع ہوا ہے۔اس لئے ان کے درمیان "جناس مماثل" موجود ہے۔

﴿قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَ رِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ وَ اللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۱۵)﴾

ترجمہ: کہہ دو کیا میں تمہیں وہ چیزیں بتاؤں جو ان سب سے کہیں بہتر ہیں؟ جو لوگ تقوی اختیار کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور پاکیزہ بیویاں ہیں، اور اللہ کی طرف سے خوشنودی ہے۔اور تمام بندوں کو اللہ اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظ "بِخَيْرٍ" استعمال ہوا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی آپ لوگوں سے پوچھیں کہ آپ ان کو عورتیں، بچوں اور سونے، چاندی جواہرات سے بہتر چیزیں نہ بتادیں؟ اس میں لفظِ "بِخَيْرٍ" (بہترین شئی) کے معنی میں ہے، مگر وہ بہترین چیز کیا ہے؟ یہ بات آیت میں مبہم رکھی گئی ہے، تاکہ اس خبر کی فخامت شان واضح ہو اور سامع کو اس کی معرفت و پہچان کی طرف شوق دلایا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "لِلَّذِينَ اتَّقَوْا" میں تقویٰ کے عنوان کے ساتھ لفظِ "رَبِّ" کی اضافت متقین کی طرف کر کے اللہ سبحانہ کی صفتِ ربوبیت کا عنوان ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں صفت ربوبیت کا عنوان "هُمْ" ضمیر کی طرف اضافت کیساتھ اس لئے بیان ہوا تاکہ اہل تقویٰ اور پارساں لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم اور انعامات واحسانات کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہو۔

﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ (۱۷)﴾

ترجمہ: یہ لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں، سچائی کے خوگر ہیں، عبادت گزار ہیں (اللہ

کی خوشنودی کے لیے) خرچ کرنے والے ہیں، اور سحری کے اوقات میں استغفار کرتے رہتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت کے محبوب بندوں کے پانچ اعمال واوصاف بیان کیے گئے ہیں:

(۱) صبر کرنے والے۔ (۲) سچ بولنے والے۔ (۳) اطاعت گزاری کرنے والے۔ (۴) خرچ کرنے والے۔ (۵) سحری کے اوقات میں استغفار کرنے والے۔

جب انسان میں صبر آتا ہے تو سچائی آجاتی ہے، پھر اطاعت وفرماں برداری آسان ہوجاتی ہے، خواہشات ختم ہوجاتی ہیں پھر انسان راہِ حق میں خرچ کرتا ہے اور رات کے آخری پہر میں اٹھ کر اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔

یہاں ''المستغفرین'' کے ساتھ ''بالأسحار'' کی قید ہے، معلوم ہوا کہ رب العالمین کو سحری کے وقت میں گناہوں پر ندامت خوب پسند ہے، اس وقت کی عبادت میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے اور اس وقت میں اٹھنا نفس پر بہت گراں ہے، اور یہ خاص نزولِ رحمت کا وقت ہوتا ہے۔

﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۱۵) الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ (۱۶)﴾

یہاں پہلی آیت میں لفظ ''وَرِضْوَانٌ'' نکرہ استعمال ہوا ہے، نکرہ سے کبھی شئی کی عظمت وفخامت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی ''وَرِضْوَانٌ'' نکرہ لاکر جنت میں حاصل ہونے والی اللہ رب العزت کی خوشنودی کی عظمت وفخامت واضح کی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں تقویٰ داروں کو اللہ کی بڑی عظیم الشان خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوگی۔ یہاں دوسری آیتِ کریمہ میں مختلف اوصاف کے درمیان ''واو'' حرفِ عاطفہ داخل کیا گیا ہے۔

یہ حرفِ عاطفہ ان اوصاف کے درمیان مندرجہ ذیل نکات کے حصول کے لئے داخل ہوا ہے:

نمبر۱: ان اوصاف میں سے ہر ایک کی عظمت وفخامت واضح کی جائے کہ صبر، سچائی، عبادت گزاری، خرچ کرنا اور وقت سحر میں استغفار پڑھنا بہت ہی عظیم صفات ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایسی مستقل صفت ہے جو اپنے موصوف کو قابل مدح بنا دیتی ہے۔

نمبر۲: یہ حروف عطف اس لئے داخل ہوئے تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ ان میں سے ہر ایک وصف کمال کے درجہ میں موصوف کے اندر پایا جائے پھر جا کر وہ صحیح معنوں میں متقی کہلائے گا۔

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۸)﴾

ترجمہ: اللہ نے خود اس بات کی گواہی دی ہے، اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے انصاف کے ساتھ (کائنات) کا انتظام سنبھالا ہوا ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں جس کا اقتدار بھی کامل ہے حکمت بھی کامل۔

اس آیتِ کریمہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایک مرتبہ "لَا إِلَهَ إِلَّا هُو" کا ذکر ہوا ہے، پھر آیت میں آگے "قَائِمًا بِالْقِسْطِ" کے بعد دوبارہ "لَا إِلَهَ إِلَّا هُو" کا جملہ لایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں "لَا إِلَهَ إِلَّا هُو" کا تکرار پایا جاتا ہے، یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ اللہ سبحانہ کی الوہیت کے عنوان کو تاکید سے بیان کیا جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ پہلا "لَا إِلَـهَ إِلَّا هُـو" شہادت کے قائم مقام ہے اور دوسرے "لَا إِلَـهَ إِلَّا هُو" میں اللہ رب العزت، فرشتوں اور اہلِ علم کی طرف سے توحید کی گواہی کا تذکرہ ہے۔

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُو﴾

اس آیت کریمہ میں بقول بعض مفسرین کے "استعارة تصريحية وتبعية" پائے

جاتے ہیں۔ ❶ یہاں اللہ سبحانہ کی توحید کی خبر دینے والی آیات وبراہین کو انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے گواہوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں اللہ کی وحدانیت پر آیات وبراہین کا دلالت کرنا "مشبه" اور گواہوں کا گواہی دینا "مشبه به" ہے۔آیت میں چونکہ "شَهِدَ" ذکر کر کے مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔اسی طرح اس آیت میں "استعارة تبعيه" بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "شَهِدَ" فعل ہے، اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (١٩)﴾

ترجمہ: بیشک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے الگ راستہ لاعلمی میں نہیں بلکہ علم آ جانے کے بعد محض آپس کی ضد کی وجہ سے اختیار کیا اور جو شخص بھی اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے تو (اسے یاد رکھنا چاہئے کہ) اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں "الدِّين" إِنَّ کا اسم اور "الْإِسْلَامُ" إِنَّ کی خبر ہے۔ یہ دونوں معرفہ لائے گئے ہیں، حالانکہ اصول یہ ہے کہ "إِنَّ" کا اسم معرفہ اور خبر عموماً نکرہ ہوا کرتے ہیں، مگر جب کوئی خاص نکتہ یا غرض مطلوب ہو تو دونوں کو معرفہ لاتے ہیں۔ یہاں بھی "حصر" کی غرض سے دونوں معرفہ لائے گئے ہیں۔ ❸ اس آیت میں بھی "إِنّ" کے اسم

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❸ حصر کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو کسی شئی کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کر دیا جائے۔

اور خبر دونوں کو معرفہ لاکر دین کو اسلام کیساتھ مختص کر دیا گیا ہے۔ حصر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے دوسرے مذاہب دین نہیں۔ اور اللہ کے ہاں اب اسلام کے علاوہ کوئی دین معتمد نہیں۔

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾

اس آیتِ کریمہ کا اصل مصداق یہود ونصاریٰ ہیں، لیکن آیت میں ان کے اختلاف کو بیان کرنے کے لئے ''وَاخْتَلَفَ الْيَهُودُ وَالنَّصَارىٰ'' کی تعبیر استعمال نہیں ہوئی بلکہ ''وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَاب'' سے یہود ونصاریٰ کی تعبیر کی گئی ہے۔ یہ تعبیر اس لئے بیان ہوئی تاکہ یہود ونصاریٰ کی قباحت زیادہ بیان ہو کہ یہ کتنے برے لوگ ہیں جو کتاب پانے کے بعد بھی حق سے اختلاف کر بیٹھے۔ اس میں ''إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ'' کا جملہ بھی لایا گیا ہے، یہ جملہ اس لئے لایا گیا تاکہ گذشتہ جملہ میں یہود ونصاریٰ کی قباحت میں جو زیادتی پائی جاتی تھی، اس زیادتی پر ایک زیادتی اور ہو جائے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ کتاب ملنے کے بعد حق سے اختلاف کرنا بہت بری اور قبیح بات ہے، مگر اس قباحت پر مزید قباحت یہ ہے کہ اختلاف علم آنے کے بعد ہوا ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ کی قباحت کی ان دو زیادتیوں کے بعد ''بَغْيًا بَيْنَهُمْ'' بول کر تیسری زیادتی بھی لائی گئی ہے جو پہلے سے بھی زیادہ قباحت کی تاکید کرتی ہے، کیونکہ یہ جملہ ''حصر'' کے درجہ میں ہے، گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان یہود ونصاریٰ کا قبیح ترین فعل اختلاف صرف ضد اور حسد کی وجہ سے تھا، انہوں نے کسی دلیل کی وجہ سے اختلاف نہیں کیا، بلکہ محض ضد کی وجہ سے ''بَغْيًا'' مفعول لہٗ ہے، ایسے ناعاقبت اندیشوں سے اللہ جلد حساب لینے والے ہے کہ خوامخواہ بلا دلیل وشبہ حق سے کوئی اختلاف کر بیٹھے۔

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں "الاظهار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے۔ یہاں "وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ" میں لفظِ "اللّٰه" کا ذکر ہوا ہے۔ یہ لفظ آیت میں اللہ تعالیٰ کے لئے آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آیت میں آگے "فَإِنَّ اللَّهَ" کی جگہ "فَإِنَّه" بول کر ضمیر گذشتہ لفظ اللہ کی طرف لوٹانا چاہیے تھی، لیکن اس میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کو چھوڑ کر "فَإِنَّ اللَّهَ" میں لفظِ "اللّٰه" کا استعمال کیا گیا ہے جو اسم ظاہر ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الاظهار فی مقام الاضمار" موجود ہے۔ یہ اس لئے ہوا تاکہ بار بار لفظ اللہ کا ذکر سن کو لوگوں کے دلوں میں خوفِ الٰہی داخل ہو اور معلوم ہو کہ یہ عذاب وسزا کسی مخلوق کی طرف سے نہیں، اللہ رب العزت کی طرف سے ہے، اور یہ عذاب دور نہیں بلکہ جلد آنے والا ہے۔

﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۲۰)﴾

ترجمہ: پھر بھی اگر یہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ میں نے تو اپنا رخ اللہ کی طرف کرلیا ہے اور جنہوں نے میری اتباع کی ہے انہوں نے بھی، اور اہل کتاب سے اور (عرب کے) ان پڑھ (مشرکین) سے کہہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت پا جائیں گے، اور اگر انہوں نے منہ موڑا تو تمہاری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانے کی حد تک ہے اور اللہ تمام بندوں کو خود دیکھ رہا ہے۔

آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں لفظِ "وَجه" استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی (چہرے) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ تابعداری

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ کلیت، سببیت، حالیت، ما کان علیہ، یا لزوم وغیرہ کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

صرف چہرے سے نہیں ہوتی بلکہ انسان کے پورے وجود سے ہوتی ہے۔اس لئے آیت میں لفظِ ''وَجه'' کا حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی مراد لیا جائے گا۔وہ مجازی معنی (مکمل وجود) کے ہے۔ان دونوں معنوں میں علاقہ جزئیت، کلیت کا ہے۔کیونکہ چہرہ جزء اور مکمل وجود (کل) ہے۔آیت میں گویا (جزء) بول کر (کل) مراد لیا گیا ہے۔ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ چونکہ کلیت، جزئیت کا ہے،اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''الاظهار فی مقام الاضمار'' پایا جاتا ہے۔اس آیتِ کریمہ سے پہلے ''وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْم'' میں اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کا ذکر ہو چکا ہے،اس لحاظ سے ان کے لئے مذکورہ متعلقہ آیت میں ''وَقُلْ لَهُمْ'' بول کر ضمیر لانا چاہیے تھی تا کہ ضمیر گزشتہ ''الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَاب'' کی طرف لوٹ جاتی ،مگر اس آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ''لَهُمْ'' بول کر ضمیر لانے کے بجائے دوبارہ ''وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ'' بول کر اسم موصول کی صورت میں اسم ظاہر کا استعمال کیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''الاظهار فی مقام الاضمار'' موجود ہے۔یہاں ایسا اس لئے ہوا تا کہ معطوف علیہ ''لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ'' اور معطوف ''الْأُمِّيِّين'' کے اوصاف کے درمیان تقابل کی رعایت ہو جائے۔ظاہر ہے کہ جب یہاں اہل کتاب کا تقابل ''الْأُمِّيِّين'' (ناخواندہ) سے ہو رہا ہے،اس لئے لفظ بھی ایسا ہونا چاہیے جو ''الْأُمِّيِّين'' کی ضد ہو یعنی وہ لفظ ایسا ہو جو علم پر دلالت کرے اور وہ اسم موصول کی صورت میں ''لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَاب'' کا جملہ ہے۔اسی لئے آیت میں ضمیر کی جگہ مذکورہ اسم ظاہر استعمال کیا گیا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظ ''أَسْلَمْتُم'' کے ساتھ ہمزہ استفہامیہ استعمال ہوا ہے۔حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے

ہیں، مگر کبھی حروفِ استفہام اپنے اصل معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنی کے لئے بھی استعمال کیے جاتے ہیں، ان میں ایک معنی "تقریر" کا ہے۔ ❶ ایک معنی "توبیح وتقریع" کے ہے۔ ❷ یہاں بھی ہمزہ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یا تو تقریر یا تو توبیخ کے لئے ہے۔ پہلی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم اب بھی اسلام قبول نہیں کرتے۔ توبیخ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم تابعداری کرو ورنہ تم بڑے خسارے میں پڑ جاوگے۔

﴿فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں دو "طباق" پائے جاتے ہیں۔ ❸ بالترتیب دونوں طباق کی تفصیل ملاحظہ ہو:

نمبر۱: یہاں "أَسْلَمُوْا" اور "تَوَلَّوْا" میں "طباق" ہے۔ "أَسْلَمُوْا" کا معنی ہے (اسلام کی طرف متوجہ ہونا) اور "تَوَلَّوْا" کا معنی ہے (اسلام سے روگردانی) کرنا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" پایا جاتا ہے۔

نمبر۲: یہاں "اِهْتَدَوْا" اور "ضَلُّوْا" کے معنوں میں تقدیری طور پر "طباق" پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اسلام کی تابع داری اور اسلام کی طرف متوجہ ہونا ہدایت ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام سے روگردانی کرنا بھی ضلالت اور گمراہی ہے اور یہ دونوں معانی یعنی ہدایت اور گمراہی دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ان معنوں کو چونکہ معنوی طور پر آیت میں جمع کردیا گیا ہے۔ اس لئے ان کے درمیان "طباق" موجود ہے۔

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرفِ استفہام کے ذریعہ کلام کے عنوان کو ثابت اور پختہ قرار دیا جائے۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرفِ استفہام کے ذریعہ مخاطب کو ڈانٹا جائے۔

❸ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۱)﴾

ترجمہ: جولوگ اللہ کی آیتوں کوجھٹلاتے ہیں اورنبیوں کوناحق قتل کرتے ہیں اورانصاف کی تلقین کرنے والےلوگوں کوبھی قتل کرتے ہیں،ان کودردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

اس آیتِ کریمہ میں ''اطناب'' پایاجاتاہے۔ ❶ یہاں مقصد یہ بتاناہے کہ بعض کفار نےمعصوم انبیاءکوقتل کیاہے،اوران کایہ قتل کرناناحق تھا۔یہ معنیٰ مقصود ''وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ'' سے اداہوجاتاہے،کیونکہ ظاہرسی بات ہے کہ انبیاء کاقتل برحق نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ ناحق ہی ہوتاہے۔اسی لئے یہ مفہوم ''يَقْتُلُونَ'' سےخودبخودسمجھ آجاتاہے،مگرآیت میں اس معنیٰ مقصود کوبیان کرنے کے لئے ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کی زائدعبارت لائی گئی ہے۔اس سے واضح ہواکہ آیت میں ''اطناب'' پایاجاتاہے۔یہ زائدعبارت اس لئے لائی گئی تاکہ قتل انبیاء کی قباحت میں خوب تاکیدہو،اورانبیاءکےقتل کاعزم کرنے والے کے دل میں اس کام کابڑاگناہ ہونا واضح کیاجائے۔اوریہ بتلایاجائے کہ تم نے دوہراجرم کیاایک انبیاءعلیہم السلام کاقتل کرنااور وہ بھی ناحق۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''تکرار'' پایاجاتاہے۔یہاں ایک مرتبہ ''يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ'' میں لفظِ ''يَقْتُلُونَ'' کاذکرہواہے،پھرآگےآیت میں دوبارہ ''يَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ'' میں اسی لفظ کاذکرہواہے۔اس سے واضح ہوتاہے کہ اس آیت میں ''يَقْتُلُونَ'' کاتکرار موجودہے۔یہ تکراراس لئے ہواتاکہ فعل قتل کی خوب قباحت ظاہرہو۔

❶ اطناب یہ ہے کہ کسی معنیٰ مقصودکواس سے زائدعبارت لاکربیان کیاجائےاوریہ کسی غرض اورفائدے کے لیے ہوتاہے۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''اسلوب تھکم'' پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں عذاب کی خبر دینے کے لئے بشارت کا استعمال ہوا ہے، حالانکہ بشارت کا تعلق ہمیشہ سے خیر کے کاموں سے ہے، مگر اس میں کفار کا مذاق اڑانے کے لئے شر (عذاب) کے لئے بشارت کا استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''اسلوب تہکم'' موجود ہے۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ﴾

اس میں حرفِ ''ف'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ حرفِ ''ف'' اس لئے لایا گیا تا کہ یہ بتایا جائے کہ ''إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ'' میں موصول صلہ مل کر شرط کے معنی کو متضمن ہے اور ''بَشِّرْهُمْ'' اس کی جزاء ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے کفر، قتل انبیاء جیسے کام کئے ہیں اس لئے ان کو عذاب کی خوشخبری دی گئی ہے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۵)﴾

ترجمہ: بھلا اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب ہم انہیں ایک ایسے دن (کا سامنا کرنے) کے لیے جمع کرلائیں گے جس کے آنے میں ذرا بھی شک نہیں ہے اور ہر ہر شخص نے جو کچھ کمائی کی ہوگی وہ اس کو پوری پوری دے دی جائے گی، اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں ''كَيْفَ'' حرفِ استفہام استعمال ہوا ہے۔ حروفِ استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حرفِ استفہامیہ اپنے اصل معنی سے ہٹ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک معنی ''تعجب'' کا ہے۔ یہاں بھی ''كَيْفَ'' اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہ بھی ''تعجب'' کے لئے استعمال ہوا ہے، تعجب کی صورت میں آیت کا

(1) اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا طرز و انداز اپنایا جائے جس سے کسی کا مذاق اور استہزاء مفہوم ہو۔

مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب کی حالت پر تعجب ہے کہ وہ کس طرح یوم جزاء کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اس کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے۔

فائدہ: ''کلما أخبر الله بلفظ کیف عن نفسه فهو استخبار علی طریق التنبیه للمخاطب أو التوبیخ''

ترجمہ: جب بھی اللہ تعالی اپنے متعلق لفظِ ''کیف'' سے بصورت استفہام کوئی خبر دے تو وہاں مخاطب کی تنبیہ یا توبیخ مقصود ہوا کرتی ہے۔

اس آیت میں بھی اللہ رب العزت نے لفظِ ''کیف'' سے استفہام کی صورت میں خبر دی ہے، یہ اسلوب مخاطبین کی توبیخ اور تنبیہ کے لیے اختیار کیا ہے۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ إِنَّکَ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیرٌ (۲۶)﴾

ترجمہ: کہو کہ اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رسوا کر دیتا ہے، تمام تر بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''مَالِکَ الْمُلْکَ'' میں ایک مرتبہ ''الْمُلْکَ'' کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آگے دوبارہ ''تُؤْتِی الْمُلْکَ'' میں لفظِ ''الْمُلْکَ'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ'' میں ایک مرتبہ ''تَشَاءُ'' کا ذکر ہوا ہے پھر اس کے بعد دوبارہ ''وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ'' میں ''تَشَاءُ'' کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''تکرار'' موجود ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ اللہ سبحانہ کی عظمت و بڑائی واضح ہوا۔

﴿مَالِکَ الْمُلْک﴾

ان دونوں لفظوں میں "جناس مماثل" موجود ہے۔ ❶ یہاں "مَالِکَ" اور "الْمُلْک"، دونوں اسم ہیں، اور دونوں اسم ایک نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک نوع کے ان دونوں کلموں میں جناس واقع ہوا ہے۔ اس لئے ان میں "جناس مماثل" موجود ہے۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾

اس آیت کریمہ میں "ایجاز بالحذف" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ" کے بعد "اِیْتَائه" کا لفظ، "وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ" کے بعد "اِنْتِزَاعَهُ" کا لفظ "وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ" کے بعد "عِزَّتُه" کا لفظ، اسی طرح "وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" کے بعد "ذِلَّتُه" کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ آیت اصل میں "قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ اِیْتَائَهُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ اِنْتِزَاعَهُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ عِزَّتُهُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ذِلَّتُه" تھی۔ اس آیت سے چونکہ کچھ الفاظ حذف کردیئے گئے ہیں، اس لئے اس میں "ایجاز حذف" موجود ہے۔

یہاں لفظِ "تُؤْتِی" اور "تَنْزِعَ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❸ یہاں "تُؤْتِی" کا معنی (عطاء کرنے) کے ہے اور "تَنْزِعَ" کا معنی (چھیننے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان کے معنوں میں "طباق" موجود ہے۔ اسی آیت کے دوسرے الفاظ یعنی "تُعِز"

---

❶ جناس مماثل وہ جناس ہے جو ایک نوع کے کلموں میں واقع ہو یعنی دو اسم، دو فعل یا دو حروف میں جناس ہو۔

❷ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی جملہ، کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں اس محذوف کی تعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

❸ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

اور ''تُذِلُّ'' میں بھی ''طباق'' موجود ہے۔ ''تُعِز'' کا معنی (عزت دینے) کے ہےاور ''تُذِلُّ'' کا معنی (ذلیل ورسوا کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

﴿تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۷)﴾

ترجمہ: تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہےاور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو ہی بے جان چیز میں سے جاندار کو برآمد کر لیتا ہےاور جاندار میں سے بے جان چیز نکال لاتا ہے،اور جس کو چاہتا ہے بےحساب رزق عطا فرماتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں دن ورات کے چھوٹا بڑا کرنے کو ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں دن رات کو چھوٹا بڑا کرنا ''مشبه'' ہےاور ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''تُولِج'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ''استعارة تبعية'' بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''تُولِجُ'' فعل ہے۔ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تبعية'' موجود ہے۔

یہاں لفظِ ''اللَّيْلَ'' اور ''النَّهَار'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ''اللَّيْل'' بمعنی (رات) کے ہےاور ''النَّهَار''، بمعنی (دن) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اسی آیت کے دوسرے الفاظ ''اَلْحَيَّ'' اور ''الْمَيِّت'' کے

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں موجود ہو۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

معنوں میں بھی ''طباق'' موجود ہے۔ ''الحی'' بمعنی (زندہ) کے ہے اور ''المیّت'' بمعنی (مردہ) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿لا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۲۸)﴾

ترجمہ: مؤمن لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا یار و مددگار نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، اِلّا یہ کہ تم ان (کے ظلم) سے بچنے کے لیے بچاؤ کا کوئی طریقہ اختیار کرو، اور اللہ تمہیں اپنے (عذاب) سے بچاتا ہے، اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ'' میں ایک عمدہ نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے کافروں سے دوستیاں کی تو وہ اللہ کی ولایت اور دوستی سے دور کر دیئے جائینگے۔

اس آیتِ کریمہ میں خطاب عام ہے لیکن اس کا سببِ نزول خاص ہے۔ یہ آیت اصل میں حاطب ابن ابی بلتعہ وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، جن کو کفار مکہ سے ایک گنا تعلق تھا اس وجہ سے کہ ان کے اہل وعیال مکہ میں تھے، تاکہ اس احسان کی وجہ سے وہ ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں، یا یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے منافقین ساتھی جو مشرکین و یہود کو اپنا دوست بنائے ہوئے تھے اور ان کو مسلمانوں کی راز کی خبریں بتا دیتے تو ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں، ان کا یہ عمل تو خاص تھا۔ اللہ سبحانہ نے اس خاص عمل کے سبب آیت اتاری مگر اس آیت میں خطاب عام مؤمنین کو ہوا، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت کا خطاب تو عام ہے مگر سببِ نزول خاص ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''التفات من الغيبة إلى الخطاب'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے ''لا يَتَّخِذ، وَمَنْ يَفْعَل'' وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کے اعتبار سے آگے ''أَنْ تَتَّقُوْا'' کی جگہ ''أَنْ يَتَّقُوْا'' بولکر غائب کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی جگہ ''أَنْ تَتَّقُوْا'' بول کر خطاب کا لفظ لایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''التفات من الغيبة إلى الخطاب'' موجود ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ سامع انداز کو بدلتا دیکر لطف اندوز ہو۔

اس آیت میں ''تکرار'' واقع ہوا ہے۔ یہاں ''اَلْمُؤْمِنُوْنَ'' دو مرتبہ استعمال ہوا، پھر اسی آیت میں لفظِ ''اللّٰه'' تین مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں ''تکرار'' موجود ہے۔

﴿قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹)﴾

ترجمہ: (اے رسول) لوگوں کو بتا دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اسے جان لے گا۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ سب جانتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں دو جگہ ''اختصاص'' ہوا ہے۔ ❷ وہ دو جگہیں یہ ہیں:

نمبر۱: ''مَا فِي صُدُورِكُمْ'' اس میں تمام اعضاء کو چھوڑ کر صرف سینوں کا ذکر ہوا ہے،

---

❶ یہ کلام کو مقتضائے حال کے خلاف پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ، مگر کلام میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ ذکر کر دیئے جائے۔

❷ اختصاص یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی شئی بالخصوص ذکر کی جائے، جبکہ اس شئی کے علاوہ دوسری شئی کا ذکر بھی کلام میں ہوسکتا ہو۔

باقی اعضاء کا ذکر ترک کر دیا گیا ہے۔

نمبر۲:"مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْض" اس جملہ میں اللہ سبحانہ کے بنائی ہوئی تمام مخلوقات میں "السَّمَاوَاتِ" اور "الْأَرْض" بول کر صرف زمین اور آسمان کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ ان دونوں کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات ہیں، مگر آیت میں بالخصوص ان مخلوقات کو چھوڑ کر صرف آسمان اور زمین کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں اختصاص خاص غرض کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ پہلے جملہ میں سینہ کی تخصیص اس لئے ہوئی تا کہ یہ بتایا جائے کہ سینہ انسان کے تمام اعضاء کا مرکز ہے، کیونکہ اس میں انسان کا اشرف ترین عضو یعنی (دل) پایا جاتا ہے۔ دوسرے جملہ میں آسمان وزمین کی تخصیص اس لئے ہوئی تا کہ یہ بتایا جائے کہ آسمان وزمین تمام مخلوقات میں بظاہر سب سے بڑے ہیں، اسی لئے یہ دونوں ذکر کے لئے مخصوص ہوئے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں لفظِ "صُدُوْر" استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنیٰ (سینوں) کے ہے مگر آیت میں یہ معنیٰ مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ راز اور باتیں سینوں میں نہیں بلکہ دلوں میں چھپائی جاتی ہیں، اس لئے یہاں "صُدُوْر" کے لفظ سے اس کا مجازی معنیٰ مراد لیا جائے گا اور مجازی معنیٰ (دل) ہے۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم دل میں موجود باتوں کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ ان کو ہر حال میں جانتے ہیں۔ اس مقام میں لفظ کے حقیقی معنیٰ (سینہ) اور مجازی معنیٰ (دل) کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہیں بلکہ حالیت، محلیت کا علاقہ ہے، کیونکہ اس میں "صُدُوْر" (سینہ) محل اور دل حال ہے، گویا آیت میں محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ چونکہ حالیت، محلیت کا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنیٰ حقیقی اور معنیٰ مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ کلیت، جزئیت، حالیت، محلیت، سببیت، مسببیت، ما کان علیہ، ما یکون علیہ یا لزوم کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں ”ذکر العام بعد الخاص“ پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت میں پہلے ”مَافِي صُدُورِكُمْ“ بول کر سینوں میں موجود خاص رازوں اور باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد ”مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ“ بول کر زمین وآسمان میں موجود تمام اشیاء کا ذکر کر دیا گیا ہے جو سینوں کی باتوں کے مقابلہ میں عام ہے، کیونکہ زمین وآسمان کی چیزوں میں خود انسان کے سینے بھی داخل ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”ذکر العام بعد الخاص“ واقع ہوا ہے۔ یہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ رب العزت کی وسعتِ علم کا تذکرہ ہو۔

یہاں لفظِ ”تُخْفُوْا“ اور ”تُبْدُو“ کے معنوں میں ”طباق“ موجود ہے۔ ”تُخْفُوْا“ بمعنی (چھپانے) کے ہے اور ”تُبْدُوْ“ بمعنی (ظاہر کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت میں چونکہ ان مقابل معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ”طباق“ موجود ہے۔

یہاں بھی ”تکرار“ واقع ہوا ہے۔ اس آیت میں لفظِ ”يَعْلَمُ“ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں دو مرتبہ لفظِ ”اللّٰه“ کا ذکر ہوا ہے۔ اس واضح ہوا کہ آیت میں ”تکرار“ موجود ہے۔

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَاعَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًاوَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ(٣٠)﴾

ترجمہ: وہ دن یاد رکھو جس دن کسی بھی شخص نے نیکی کا جو کام کیا ہوگا، اسے اپنے سامنے موجود پائے گا، اور برائی کا جو کام کیا ہوگا اس کو بھی (اپنے سامنے دیکھ کر) یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کی بدی کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا۔ اور اللہ تمہیں اپنے (عذاب) سے بچاتا ہے، اور اللہ بندوں پر بہت شفقت رکھتا ہے۔

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے کوئی خاص شئی ذکر کی جائے پھر اس کے بعد کوئی عام شئی ذکر کی جائے تا کہ حکم عام ہو جائے اور کلام کے مفہوم میں وسعت آسکے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''تانیس بعد الایحاش'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے ''یُحَذِّرُ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس میں انسان کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ ڈرنا ایک ایسی صفت ہے جو وحشت اور نامانوسیت کی دلیل ہے، آیت میں اس کو بیان کرنے کے فوراً بعد ''وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ'' بول کر اس وحشت کو دور کر دیا کہ اللہ کے عذاب سے تم ضرور ڈرو، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر بے حد مہربان اور شفیق ہے۔ اس آخری جملہ سے چونکہ وحشت کو دور کر کے انسیت، محبت وعقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس لئے آیت میں ''تانیس بعد الایحاش'' موجود ہے۔

یہاں لفظِ ''خَیْرٍ'' اور ''سُوْءٍ'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' موجود ہے۔ ''خَیْرٍ'' بمعنی (بھلائی اور اچھائی) کے ہے اور ''سُوْءٍ'' بمعنی (برائی) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اسی طرح اس آیت کے لفظِ ''مُحْضَرًا'' اور ''بَعِیْدًا'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ''مُحْضَرًا'' بمعنی (قریب) کے ہے اور ''بَعِیْدًا'' بمعنی (دور) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

اس آیت میں بھی ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''مَا عَمِلَتْ'' فعل دوبار استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح اسی آیت میں لفظِ ''اللّٰه'' دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں ''تکرار'' موجود ہے۔ یہ تکرار اللہ رب العزت کے خیر اور شر کے متعلق وسعت علم اور اپنے بندوں کو ترہیب اور ترغیب کے لیے ہے لفظِ ''نفس'' ''خیر'' اور ''سوء'' میں نکارت عموم کے لیے ہے۔

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کوئی ایسا انداز جملہ یا کلمہ ذکر کیا جائے جس سے ظاہراً عدم موانست اور وحشت کا اظہار ہو رہا ہو، پھر اس کے بعد ایسے الفاظ ذکر کر دیئے جائیں جو وحشت کو دور کر دیں اور وہ الفاظ موانست، عقیدت ومحبت کا اظہار کر رہے ہو۔

﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۳۱)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "تُحِبُّونَ" اور "يُحْبِبْ" کے درمیان "جناس مماثل" موجود ہے۔ ❶ یہاں "تُحِبُّونَ" اور "يُحْبِبْ" دونوں فعل ہیں، اور دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک ہی نوع کے ان دونوں کلموں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان کے درمیان "جناس مماثل" موجود ہے۔

اس آیت میں "تکرار" بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں فعل "تُحِبُّونَ" دو مرتبہ اور لفظِ "اللَّه" تین مرتبہ استعمال ہوا۔ اس لئے آیت میں تکرار موجود ہے۔ لفظِ محبت کے تکرار سے اشارہ ہے کہ محبت ایسی صرف "اتباعِ رسول" سے حاصل ہوگی، گویا "اتباع" کو دو محبتوں کے درمیان میں لایا ہے۔ اسی طرح لفظ "اللہ" کے تکرار میں اشارہ ہے کہ محبت کا مبدأ اور منتہا حضور کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں ہے۔ اتباعِ رسول کے دو ثمرات بیان کیے ہیں، اللہ رب العزت محبت بھی کرے گا اور گناہوں کو بھی معاف کرے گا، اس لیے کہ وہی گناہوں کا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳۲)﴾

ترجمہ: کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر بھی اگر منہ موڑو گے تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے دو کلموں میں جناس پایا جائے، یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حروفوں میں۔

اس آیت میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہاں دو مرتبہ لفظِ ''اللّٰہ'' کا ذکر ہوا ہے، اس لئے اس میں تکرار موجود ہے۔ اسی طرح آیت نمبر ۲۸ سے آیت نمبر ۳۲ تک ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ سارے تکرار اس لئے ہوئے تاکہ ان آیات کے عنوانات ومضامین میں خوب تاکید ہو۔

﴿إِنَّ اللهَ اصْطَفَى آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ (۳۳)﴾

ترجمہ: اللہ نے آدم، نوح، ابراہیم کے خاندان، اور عمران کے خاندان کو چن کر تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی۔

اس آیتِ کریمہ میں ''إطلاق العام وإرادۃ الخاص'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''اَلْعَالَمِينَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عام ہے، کیونکہ ''الْعَالَمِينَ'' کا اطلاق ہر زمانہ کے تمام جہاں پر ہوتا ہے، مگر اس آیت میں ''الْعَالَمِينَ'' سے تمام جہاں وعالم مراد نہیں، بلکہ آیت میں موجود انبیاء علیہم السلام کے زمانہ کے عالم مراد ہیں جو کہ خاص ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''إطلاق العام وإرادۃ الخاص'' واقع ہوا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں بالخصوص آدم، نوح، آل ابراہیم، اور آل عمران علیہم السلام کا ذکر ہوا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر انبیاء بھی ہیں، مگر اس آیت میں انتخاب اور پسندیدگی کے عنوان کے ساتھ بالخصوص ان ہی کا ذکر ہوا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ ان کی خصوصی عظمت ومقام واضح کیا جائے۔

﴿إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۳۵)﴾

ترجمہ: (چنانچہ اللہ کے دعا سننے کا وہ واقعہ یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا کہ یا رب!

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں کوئی عام لفظ ذکر کیا جائے مگر اس سے مراد خاص معنی ہو۔

میں نے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اسے ہر کام سے آزاد کر کے تیرے لئے وقف رکھوں گی، میری اس نذر کو قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہ آیتِ کریمہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے قول کی حکایت ہے۔اس قول میں ''مَا فِي بَطْنِي'' میں ''مَا'' کا لفظ مبہم لایا گیا ہے، چونکہ مریم علیہا السلام کی والدہ کے لئے شکم میں موجود حمل پر مطلع ہونا مشکل تھا،اس لئے انہوں نے لاعلی التعین مذکر یا مؤنث بولنے کے بجائے مبہم یعنی لفظِ ''مـــا'' کا ذکر کر دیا جس کا اطلاق مذکر اور مونث دونوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے۔

اس آیت میں ''إِنَّکَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيم'' والا جملہ متعدد تاکیدات سے مؤکد کیا گیا ہے:

نمبر۱: ''إِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل سے جو تاکید کا معنی دیتا ہے۔

نمبر۲: ''کـــاف'' ضمیر کے بعد ''أَنْـــتَ'' بول کر ضمیر منفصل لائی گئی، یہ بھی تاکید کے لئے ہے۔

نمبر۳: یہ جملہ اسمیہ کی صورت میں ہے اور جملہ اسمیہ تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ان تین تاکیدات کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے مذکورہ جملہ اپنی زبان مبارک سے نکالا ہے۔

﴿فَلَـمَّـا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (٣٦)﴾

ترجمہ: پھر جب ان سے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ (حسرت سے) کہنے لگیں: یارب یہ تو مجھ سے لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ اللہ کو خوب علم تھا کہ ان کے یہاں کیا پیدا ہوا ہے۔ اور لڑکا

لڑکی جیسا نہیں ہوتا، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے حفاظت کے لیے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔

یہاں ''إِنِّی وَضَعْتُهَا أُنْثَی'' بھی حضرت مریم کی والدہ کے قول کی حکایت ہے۔ اس میں حضرت مریم کی والدہ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ میں نے لڑکی جنی ہے۔ اس جملہ میں اگر چہ بظاہر مؤنث کی ولادت کی خبر دی گئی ہے، مگر مراد اس خبر سے معذرت کرنا ہے۔ حضرت مریم کی والدہ نے منت مانی تھی کہ اگر ان کی اولاد پیدا ہوئی تو وہ اس بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی، مگر حسنِ اتفاق اللہ تعالیٰ نے ان کو لڑکے کی جگہ لڑکی عطا فرمادی۔ جب ان کے پاس لڑکی کی پیدائش ہوئی تو وہ معذرت کرنے لگی کہ میں معذرت چاہتی ہو یہ تو لڑکی پیدا ہوئی ہے، اور لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہوتی۔

﴿ قَالَتْ رَبِّ إِنِّی وَضَعْتُهَا أُنْثَی وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى وَإِنِّی سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى'' بطور ''اعتراض'' واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں ''رَبِّ إِنِّی وَضَعْتُهَا أُنْثَی'' اور ''وَإِنِّی سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ'' دونوں حضرت مریم کی والدہ کے قول کا مقولہ ہے، اس لحاظ سے یہ دونوں جملے معناً مربوط ہیں۔ ان دونوں مربوط جملوں کے درمیان اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ''وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى'' کا جملہ ذکر کر دیا۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ جملہ بطورِ جملہ معترضہ کے واقع ہوا ہے۔ آیت میں یہ جملہ معترضہ اس لئے لایا گیا تا کہ حضرت مریم کی والدہ کو خوب تسلی ہو اور حضرت مریم کی فضلیت اور مقام ومرتبہ کو واضح کیا جائے۔

---

❶ اعتراض اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام کے اجزاء کے درمیان یا معناً دو مربوط جملہ کے درمیان کوئی جملہ یا لفظ لایا جائے، اور یہ کسی نہ کسی مقصد وغرض کے لیے ہوتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”التفات من الخطاب إلی الغیبة“ پایا جاتا ہے۔ ❶ مذکورہ جملہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی والدہ کو خطاب کیا تھا۔ اس لحاظ سے آیت میں ”بِمَا وَضَعْتِ“ بول کر خطاب کا لفظ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ”بِمَا وَضَعْتِ“ کے بجائے ”بِمَا وَضَعَتْ“ بول کر غائب کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”التفات من الخطاب إلی الغیبة“ واقع ہوا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ سامع قرآن کے بدلتے اسلوب و انداز سے لطف اندوز ہو۔

﴿قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا...... وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”تکرار“ پایا جاتا ہے۔ اس آیت میں ایک مرتبہ ”إِنِّي وَضَعْتُهَا“ میں لفظِ ”إِنِّي“ کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد آگے آیت میں دوبارہ ”وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا“ میں ”إِنِّي“ کا ذکر کیا گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”إِنِّي“ کا تکرار پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ عنوان میں خوب مبالغہ ہو۔ اور وضعِ حمل اور تسمیہ میں اہتمام کا تذکرہ ہو۔

﴿وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ﴾

اس جملہ میں حضرت مریم کی والدہ نے ”أُعِيذُ“ فعل مضارع استعمال کیا ہے، فعل ماضی استعمال نہیں کیا، یہاں فعل ماضی چھوڑ کر فعل مضارع اس لئے استعمال کیا گیا تا کہ اس کے معنی میں تجدد اور استمرار کا معنی حاصل ہو، اور اس کے معنی میں انقطاع نہ آئے۔ استمرار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مریم اور اس کی اولاد کو شیطان کی شر سے تیری پناہ میں

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے ظاہر تو خطاب کے الفاظ کا تقاضہ کرے مگر کلام میں خطاب کی جگہ حاضر کے الفاظ ذکر کردیئے جائیں۔

مستقل دیتی ہوں تاکہ ہر لمحہ اور ہر آن شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں ہوں، یہ بھی اوراس کی اولاد بھی، حضرت مریم کی اولاد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، یہ اُن کا بھی اعزاز ہے کہ دنیا میں ابھی آئے نہیں اوران کے لیے اُن کی عابدہ نانی دعا کررہی ہے۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى......وَإِنِّي سَمَّيْتُهَامَرِيَم وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ حضرت مریم کی والدہ کے قول کی حکایت ہے۔انہوں نے اس قول میں "وَضَعْتُ"اور"سَمَّيْتُ" ماضی کے صیغے استعمال کئے ہیں۔جبکہ "أُعِيذُ" مضارع استعمال کیا۔"أُعِيذُ" مضارع لانے کی حکمت ومصلحت تو گذشتہ نکتہ میں بیان ہوچکی ہے۔ یہاں مقصود "وَضَعَت"اور"سَمَّيت" کے ماضی لانے کی حکمت ومصلحت کو بیان کرنا ہے۔ یہ دونوں فعل اس لئے ماضی لائے گئے تاکہ ان فعلوں کے معانی میں انقطاع کا مفہوم حاصل ہو،مطلب یہ ہے کہ وضع حمل اورنام رکھنا جاری نہیں رہا، بلکہ جیسے ہی حضرت مریم کی ولادت ہوئی تو وضع حمل منقطع ہوگیا اور جیسے ہی ان کا نام مریم رکھا تو کام بھی مکمل ہوگیا۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَامَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۷)﴾

ترجمہ: چنانچہ اس کے رب نے اس (مریم) کو بطریق احسن قبول کیا اوراسے بہترین طریقے سے پروان چڑھایا۔ اورزکریا اس کے سرپرست بنے۔ جب بھی زکریا ان کے پاس ان کی عبادت گاہ میں جاتے،ان کے پاس کوئی رزق پاتے،انہوں نے پوچھا: مریم! تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ وہ بولیں:اللہ کے پاس سے۔اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''أَنبَتَ'' فعل استعمال ہوا ہے جو ''اِنبَات'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا حقیقی معنی (اگانے) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ کبھی کوئی انسان اگایا نہیں جاتا، اس لئے آیت میں یہ معنی مراد لینا درست نہیں ہوگا، بلکہ اس لفظ سے اس کا مجازی معنی مراد لیا جائے گا۔ وہ مجازی معنی تمام احوال میں حضرت مریم کی صلاح کے لئے مفید چیزوں سے ان کی تربیت کرنا ہے۔ ان دونوں معنی کے درمیان لزوم کا علاقہ پایا جاتا ہے۔ (اگانا) ملزومی معنی، اور (تربیت کرنا) لازم معنی ہے۔ کیونکہ اگانے کو اصلاح والی چیزوں کیساتھ تربیت لازم ہے۔ جب کسی چیز کو اگایا جاتا ہے تو لازمی طور پر اس کی تربیت قابل اصلاح چیزوں سے ہوتی ہے، تب جا کر اگنے والی اشیاء محفوظ ہوتی ہیں، اس لئے اگانے کو تربیت لازم ہے۔ گویا اس آیتِ کریمہ میں ملزوم بول کر لازم مراد لیا گیا ہے۔ آیت کے اس لفظ میں چونکہ لزوم کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

بعض اہل بلاغت فرماتے ہیں کہ آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔ ❷ یہاں تربیت کرنے کو اگانے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں تربیت کرنا ''مشبہ'' اور نباتات اگانا ''مشبہ بہ'' ہے۔ ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح کسان پانی وغیرہ دے کر اور آفات سے بچا کر نباتات وغیرہ کو بڑھاتا ہے، اسی طرح اللہ سبحانہ نے حضرت مریم کو تمام آفات وبلیات سے بچا کر ان کے صلاح کے قابل چیزوں کے ذریعہ ان کی تربیت کی ہے۔ اس آیت میں چونکہ ''أَنبَتَ'' بول کر ''مشبہ بہ'' کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔ یہاں حضرت مریم

---

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، مسببیت، کلیت، جزئیت، حالیت، محلیت، ما کان علیہ، ما یکون علیہ، یا لزوم کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

کے جسم کی نشو ونما اور بڑھنے کو نبات سے تشبیہ سرعت کے ساتھ بڑھنے، خصوصی تربیت وحفاظت میں دی گئی ہے۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "تَقَبَّلَ" اور "قَبُولٍ" کے درمیان "جناس مغائر" موجود ہے۔ ❶ یہاں "تَقَبَّلَ" فعل اور "قَبُولٍ" اسم ہے۔ یہ دونوں الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، اور ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اسے "جناس مغائر" کہتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں لفظِ "أَنْبَتَ" فعل اور "نَبَاتًا" اسم ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، ان میں بھی "جناس مغائر" واقع ہوا ہے۔ اسی طرح اس آیت کے لفظِ "رِزْقاً" اور "يَرْزُقُ" کے درمیان بھی "جناس مغائر" موجود ہے، کیونکہ "رِزْقاً" اسم اور "يَرْزُقُ" فعل ہے۔ یہ دونوں الگ الگ نوع کے کلمے ہیں۔ ان میں بھی "جناس مغائر" پایا جاتا ہے۔

﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾

اس جملہ میں لفظِ "رِزْقًا" نکرہ استعمال ہوا ہے۔ نکرہ سے کبھی شئی کی عظمت وکثرت بیان کی جاتی ہے۔ یہاں بھی "رِزْقًا" کو نکرہ لاکر حضرت مریم کو ملنے والے رزق کی کثرت وعظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم کے پاس مختلف اور زیادہ اجناس کے عظیم الشان رزق آیا کرتے تھے۔

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (۴۱)﴾

ترجمہ: انہوں نے کہا: پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر کردیجیے، اللہ نے کہا:

---

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو الگ الگ نوع کے کلموں میں جناس واقع ہو۔ مثلاً اسم وفعل یا اسم وحرف یا حرف وفعل کے درمیان۔

تمہاری نشانی یہ ہوگی کہ تم تین دن تک اشاروں کے سوا کوئی بات نہیں کرسکو گے۔اور اپنے رب کا کثرت سے ذکر کرتے رہو، اور ڈھلے دن کے وقت بھی اور صبح سویرے بھی اللہ کی تسبیح کیا کرو۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''الْعَشِي'' بمعنی (شام) کے ہے اور ''الْإِبْكَار''، بمعنی (صبح) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ(۴۲)﴾

ترجمہ: اور (اب اس وقت کا تذکرہ سنو) جب فرشتوں نے کہا تھا کہ: اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پاکیزگی عطا کی ہے اور دنیا جہان کی ساری عورتوں میں تمہیں منتخب کر کے فضیلت بخشی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔اس آیتِ کریمہ میں لفظِ ''الْمَلَائِكَةُ''، استعمال ہوا ہے۔اس کا حقیقی معنی تمام فرشتے ہیں، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں لیا گیا، بلکہ اس لفظ سے اس کا معنی مجازی مراد لیا گیا ہے۔وہ مجازی معنی ''جبرئیل امین'' ہے۔ ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے۔کیونکہ تمام فرشتہ عام اور جبرئیل امین خاص ہے۔آیت میں گویا عام بول کر خاص مراد لیا گیا ہے۔اس لفظ کے (حقیقی ومجازی) معنوں میں چونکہ عموم وخصوص کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔یہاں حضرت جبرئیل امین پر جمع کا اطلاق عظمتِ شان کے لیے ہے۔

آیت میں لفظِ ''اصطفاک''، میں تکرار ہے، یہ تکرار مقام ومرتبہ کی فضیلت کے

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

لیے ہے کہ حضرت مریم کا چناؤ خود رب العالمین نے کیا ہے۔

﴿يَامَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (۴۳)﴾

ترجمہ: اے مریم! تم اپنے رب کی عبادت میں لگی رہو، اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع بھی کیا کرو۔

اس آیتِ مبارکہ میں ''اسْجُدِي''کو''ارْكَعِي''، پر مقدم کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان موجود ''واو''، ترتیب کے لئے نہیں، بلکہ یہ ''واو''، جمع کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ''واو'' کے ذریعہ دونوں فعلوں کو نماز میں جمع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اے مریم! آپ رکوع، سجدہ کو نماز میں جمع کرو۔ اس جملہ میں سجدہ کا حکم رکوع کے حکم پر مقدم ہوا ہے، حالانکہ نمازوں میں رکوع پہلے اور سجدہ بعد میں ہے۔ ممکن ہے کہ اس شریعت میں سجدہ پہلے اور رکوع بعد میں ہو، یا یہاں سجدہ کی تقدیم اس لیے ہے کہ انسان نماز میں اللہ رب العزت کے سب سے زیادہ قریب سجدہ میں ہوتا ہے۔ جیسے کہا گیا ہے''أقرب ما يكون العبد من ربه وهو ساجد'' کہ رب کے سب سے زیادہ قریب سجدہ کرنے والا شخص ہوتا ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ (۴۲)......يَامَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (۴۳)﴾

امام ابوالسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں دوسری آیت میں ''يَامَرْيَمُ اقْنُتِي''، بول کر نداء کا جو تکرار ہوا، وہ اس لئے تا کہ یہ بتایا جائے کہ اس خطاب سے اصل مقصود بعد میں آنے والے احکامات یعنی فرمانبرداری، سجدہ، رکوع وغیرہ کی بجا آوری ہے۔ اس نداء سے پہلے موجود نداء یعنی ''يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ'' اس لئے واقع ہوا تا کہ یہ نداء حضرت مریم پر ہونے والی نعمتوں کے تذکرہ کیساتھ حضرت مریم کو مکلّف بنانے اور ''وَاسْجُدِي وَارْكَعِي'' کے حکم وغیرہ کی تعمیل کی ترغیب کے لئے تمہید بنے۔

﴿ذٰلِکَ مِنۡ أَنۡبَاءِ الۡغَیۡبِ نُوحِیهِ إِلَیۡکَ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ إِذۡ یُلۡقُونَ أَقۡلَامَهُمۡ أَیُّهُمۡ یَکۡفُلُ مَرۡیَمَ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ إِذۡ یَخۡتَصِمُونَ (۴۴)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) یہ سب غیب کی خبریں ہیں جو ہم وحی کے ذریعے تمہیں دے رہے ہیں، تم اس وقت ان کے پاس نہیں تھے جب وہ یہ طے کرنے کے لیے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا، اور نہ اس وقت تم ان کے پاس تھے جب وہ (اس مسئلے میں) ایک دوسرے سے اختلاف کرر ہے تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں منکرین وحی کا تہکم واستہزاء پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب حضرت مریم کے کفالت کے بارے میں لوگ اپنے قلموں کو سمندر میں ڈال رہے تھے، اور جب وہ لوگ باہم مخاصمت کرر ہے تھے، اس وقت آپ ان میں موجود نہ تھے اور نہ ہی آپ نے یہ خبریں کہیں پڑی ہیں، جبکہ غیب کی خبروں کے یہی دو ذریعہ ہیں کہ انسان یا تو خود مشاہدہ کرے یا کہیں سے سن لے۔ منکرین وحی ان دونوں چیزوں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی کرتے تھے۔ تو یہ ان کا تہکم ہے کہ آپ اس وقت نہیں تھے، اب اگر آپ پر وحی بھی نہ آئے تو یہ خبریں کیسے معلوم ہوئیں، بغیر وحی کے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کی معرفت نہیں ہوسکتی۔ معلوم ہوا کہ تمہارا انکار کرنا تہکم واستہزاء ہے، اگر وحی بھی نہیں ہے تو آپ کو کیسے معلوم ہوا، کیوں بے وقوفی اور نادانی والی باتیں کرتے ہو۔

اس آیت میں "تکرار" واقع ہوا ہے۔ اس آیت میں ایک مرتبہ "إِذۡ یُلۡقُونَ" کے ساتھ "وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ" بول کر یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود نہ تھے جب حضرت مریم کی پرورش کی ذمہ داری کے لئے اپنے قلموں کو نہر میں ڈال رہے تھے۔ آیتِ کریمہ کا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور وحی کو ثابت کرنا ہے کہ آپ نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، پھر بھی آپ اس واقعہ کی خبر دے رہے ہیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور وحی کی بیّن دلیل ہے۔ یہاں یہ مقصدی معنی "وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ

إِذْ یُلْقُونَ" سے حاصل ہو جاتا ہے، مگر اس آیت میں آگے "وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ" بول کر دوبارہ اسی جملہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قلموں کو نہر میں ڈالتے وقت اور مخاصمت کے وقت موجود نہ تھے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک مستقل طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل اور شہادت ہے۔

﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ (۴۲) يَامَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (۴۳) ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (۴۴)﴾

ان آیاتِ کریمہ کے متعدد مقامات میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلی آیت میں "اصْطَفَاكِ" ایک مرتبہ ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آگے آیت میں "وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ" میں دوبارہ اسی لفظ کو ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں ایک مرتبہ "يَا مَرْيَمُ" بول کر نداء کا ذکر کیا گیا، پھر اس کے بعد دوسری آیت کی ابتداء میں بھی "يَامَرْيَمُ" بول کر دوبارہ نداء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیسری آیت میں ایک مرتبہ "وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ" کا جملہ استعمال ہوا۔ پھر اس کے بعد آگے آیت میں "وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ" بول کر اسی گذشتہ جملہ کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں تکرار ہوا ہے۔ ان تینوں مقامات میں تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ آیت کے مضمون میں خوب تاکید ہو۔

﴿وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ (۴۲)﴾

اس آیتِ کریمہ میں بھی "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ یہاں "نِسَاءِ الْعَالَمِينَ"

کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا حقیقی معنی ہے ہر زمانہ کے تمام جہاں کی عورتوں پر آپ کی فضیلت ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس لفظ سے صرف حضرت مریم کے زمانہ میں موجود تمام عورتوں پر فضیلت ہے، یہی اس لفظ کا مجازی معنی ہے۔ان دونوں معانی کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے، کیونکہ ہر زمانہ کے تمام جہاں کی عورتیں عام اور صرف حضرت مریم کے زمانے میں موجود عورتیں خاص ہیں، آیت میں گویا عام بول کر خاص مراد لیا گیا ہے۔آیت میں چونکہ اس لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں عموم وخصوص کا علاقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں ''**مجاز مرسل**'' موجود ہے۔

﴿**یَامَرْیَمُ اقْنُتِی لِرَبِّکِ وَاسْجُدِی وَارْکَعِی مَعَ الرَّاکِعِینَ (۴۳)**﴾

بعض مفسرین نے یہاں قنوت، سجود اور رکوع میں ''**استعارۃ تصریحیۃ**'' مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک مذکورہ الفاظ سے نماز کی ہیئت اور ارکین مراد نہیں، بلکہ وہ بطور ''**استعارۃ تصریحیۃ**'' ان الفاظ کے استعمال ہونے کے قائل ہیں۔ ❶ یہاں ان مفسرین کے بقول مطلق عبادت (رکوع، سجدہ) کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں مطلق عبادت کرنا ''**مشبه**'' اور رکوع، سجدہ کرنا ''**مشبه به**'' ہے۔آیت میں چونکہ ''**وَاسْجُدِی وَارْکَعِی**'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''**استعارۃ تصریحیۃ**'' موجود ہے۔

﴿**ذَلِکَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَیْبِ نُوحِیهِ إِلَیْکَ (۴۴)**﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''**ذَلِکَ**'' اسم اشارہ استعمال ہوا ہے۔ اسمائے اشارات کئی اغراض ومعانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ان میں سے ایک غرض ''**تعظیم**'' ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم اشارہ کو کسی شئی کی عظمت شان بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہاں بھی ''**ذَلِکَ**''، اسم اشارہ لا کر حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہم السلام

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

کے قصوں کی عظمت شان بیان کی گئی ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! ہم آپ کو ان انبیاء کے عظیم الشان قصے وحی کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

﴿وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ (۴۴)﴾

اس آیت میں "تشبیــه بلیغ" پائی جاتی ہے۔❶ یہاں قلموں کو پانی کے بہاؤ میں تیزی کے ساتھ بہنے والی چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی جس طرح تنکے اور لکڑیاں پانی کے بہاؤ میں بہہ جاتی ہیں، اسی طرح لکڑی کا یہ قلم بھی پانی کے بہاؤ میں بہہ جاتا ہے۔ آیت میں چونکہ نہ تو یہ وجہ شبہ مذکور ہے اور نہ ہی اس میں حرف تشبیہ مذکور ہے۔اس لئے اس میں "تشبیه بلیغ" موجود ہے۔

﴿إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (۴۵)﴾

ترجمہ: (وہ وقت بھی یاد کرو) جب فرشتوں نے مریم سے کہا تھا کہ: اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمے کی (پیدائش) کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، جو دنیا اور آخرت دونوں میں صاحب وجاہت ہوگا، اور (اللہ کے) مقرب بندوں میں سے ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔❷ یہاں لفظِ "كَلِمَة" استعمال ہوا ہے، اس کا حقیقی معنی لفظِ "كُنْ" کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں۔دلیل اس پر یہ ہے کہ یہاں اس کلمہ کا نام عیسیٰ بتایا گیا ہے حالانکہ عیسیٰ کسی کلمہ کا نام نہیں، اس لئے آیت میں

❶ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں مذکور نہ ہو۔

❷ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت، مسببیت، جزئیت، کلیت، حالیت، محلیت، ما کان علیہ، ما یکون علیہ، لزوم یا عموم وخصوص کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

"کَلِمَة" سے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد لیا جائے گا۔ اور وہ مجازی معنی "ولد" (بیٹے) کے ہے۔ ان دونوں معنوں (کن اور بیٹا) کے درمیان علاقہ سبیت، مسببیت کا ہے۔ کیونکہ کلمہ "کن" سبب اور "ولد" مسبب ہے۔ آیت میں گویا سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ (۴۵)﴾

اس آیتِ کریمہ میں "مجاز عقلی" (اسنادی مجازی) پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں "يُبَشِّر" فعل استعمال ہوا ہے، اس کا معنی (خوشخبری دینے) کے ہے۔ آیت میں اس فعل کی نسبت اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف ہوئی ہے، حالانکہ خوشخبری دینے والے اصل میں فرشتے تھے، اللہ تعالیٰ نہیں، اس لئے اس فعل کا فاعلِ حقیقی فرشتہ ہے، مگر چونکہ اللہ کے حکم سے فرشتہ نے حضرت مریم کو خوشخبری دی تھی، اس لحاظ سے اللہ سبحانہ کا حکم اس خوشخبری کا سبب ہوا۔ اس ظاہری سببیت کی مناسبت سے آیت میں فعل کی نسبت فاعل حقیقی (فرشتہ) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی (اللہ سبحانہ) کی طرف کردی گئی ہے۔ اسی لئے آیت میں "مجاز عقلی" پایا جاتا ہے۔

﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ (۴۶)﴾

ترجمہ: اور وہ گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرے گا اور بڑی عمر میں بھی، اور وہ راست باز لوگوں میں سے ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں "احتراس" واقع ہوا ہے۔ ❷ اس آیتِ کریمہ میں جب عیسیٰ

---

❶ اسنادی مجازی یہ ہے کہ فعل یا معنی فعل یعنی فعلِ مجہول اور اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی جائے۔

❷ احتراس اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے کلام میں جس میں خلاف مقصود کا وہم ہو رہا ہو کوئی لفظ یا جملہ بڑھا دیا جائے جو اس وہم کو دور کرے۔

علیہ السلام کے بارے میں ”وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ“ کے ذریعہ یہ کہا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام ماں کی گود میں لوگوں سے بات کرے گا، تو اس سے وہم پیدا ہوا کہ ماں کی گود میں وقت سے پہلے بچے کا بولنا خطرہ سے خالی نہیں، شاید بچہ آگے زندہ نہ رہ سکے، یہ وہم خلاف مقصود تھا۔ آیت میں ”وَ كَهْلًا“ کا لفظ لایا گیا اور اس وہم کو دور کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا خلاف عادت ایام طفولیت میں بولنا ان کی زندگی کے لئے خطرے کا باعث نہیں بلکہ وہ بڑھاپے کا زمانہ بھی پائیں گے۔ اس آیت کریمہ میں چونکہ ”وَ كَهْلًا“ کا لفظ خلاف مقصود وہم کو دور کر رہا ہے۔ اس لئے آیت میں ”احتراس“ پایا جاتا ہے۔

﴿قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۴۷)﴾

ترجمہ: مریم نے کہا: پروردگار مجھ سے لڑکا کیسے پیدا ہو جائے گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں؟ اللہ نے فرمایا: اللہ اسی طرح جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ”کنایة“ پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ”يَمْسَسْنِي“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا اصلی معنی (معنی ملزوم) چھونا ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس لفظ کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے۔ اور اس کا لازم معنی (جماع کرنا) ہے۔ آیت میں چونکہ لفظِ ”يَمْسَسْنِي“ بول کر اس کا لازم معنی (جماع کرنا) مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں ”کنایة“ پایا جاتا ہے۔ کنایہ کی صورت میں جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھ سے کسی آدمی نے مجامعت نہیں کی۔

قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۴۷)﴾

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا اصلی معنی یعنی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

اس مقام میں سوال وجواب کا طرز اپنایا گیا ہے۔ جب فرشتوں نے حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تو فوراً انہوں نے ”أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ“ بول کر سوال کیا کہ آج تک مجھے کسی بشر کا ہاتھ نہیں لگا تو میرا بیٹا کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اس سوال کو سن کر اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ جیسا چاہے بغیر باپ کے بچہ پیدا کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال وجواب کا انداز اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ سوال وجواب کا انداز ”أقرب إلى الفهم“ ہوتا ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ (۴۸)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ”التفسير بعد الابهام“ پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ”الكِتَابَ“ کا ذکر ہوا ہے، اب کتاب کونسی ہے؟ اس کی وضاحت نہیں کی، آگے ”وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيل“ بول کر اس مبہم کی وضاحت کر دی گئی کہ یہاں کتاب سے توراۃ وانجیل مراد ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”التفسير بعد الابهام“ موجود ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَاب (۴۸)﴾

بعض علماء قرأت نے اس فعل کو ”يُعَلِّم“ کی جگہ ”نُعَلِّم“ قرار دیا ہے۔ اگر آیت میں یہ قرأت مان لی جائے تو اس میں ”التفات من الغيبة إلى التكلم“ واقع ہوگا۔❷ اس آیت سے قبل ”إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ“ میں ”قَضَى“ اور ”يَقُولُ“ غائب کے صیغہ ہیں۔ اس لحاظ سے ”نُعَلِّم“ کے بجائے ”يُعَلِّم“ غائب کا صیغہ ہونا چاہیے، مگر آیت

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ کہ کسی کلام میں پہلے کسی مبہم شئ کو بیان کیا جائے پھر اس کے بعد اس مبہم کی تفسیر اور وضاحت کی جائے۔

❷ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ کرے مگر کلام میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ ذکر کر دیئے جائیں۔

میں ایسانہیں ہوا بلکہ ”یُعَلِّم“ کی جگہ ”نُعَلِّم“ متکلم کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”التفات من الغیبة إلی التکلم“ واقع ہوا ہے۔مگر واضح رہے کہ یہ التفات ان لوگوں کے کہنے کے مطابق ہے جو فعل کو ”نُعَلِّم“ پڑھتے ہیں،اگر یہاں فعل کو اپنی حالت میں ”یُعَلِّم“ پڑھا جائے تو آیت میں کوئی التفات نہ ہوگا۔

﴿إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۴۷)أُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ (۴۹)﴾

ان دونوں جملہ میں جمع کی تعبیر مفرد سے کی گئی ہے۔وہ اس طرح کہ یہاں امر سے ”امور“ مراد ہے،اسی طرح ”الْأَكْمَهَ“ سے اندھے اور ابرص سے برص والے لوگ مراد ہیں اور یہ سب جمع ہیں۔آیت میں جمع کی جگہ ”وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَص“ واحد استعمال ہوا ہے،اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں جمع کی تعبیر مفرد سے ہوئی ہے۔

﴿وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۵۰)﴾

ترجمہ:اور جو کتاب مجھ سے پہلے آچکی ہے،یعنی تورات میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں،اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ کچھ چیزیں جو تم پر حرام کی گئی تھیں،اب تمہارے لیے حلال کردوں،اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں،لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

﴿وَأُحْيِ الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ (۴۹)...... وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۵۰)﴾

یہاں لفظِ ”أُحْيِ“ اور ”الْمَوْتَى“ کے معنوں میں ”طباق“ پایا جاتا ہے۔[1]

[1] طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

یہاں ''أُحْيِ''،بمعنیٰ (زندہ کرنے) کے ہےاور''الْمَوْتَى''،بمعنیٰ (مرے ہوئے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے،اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔اسی طرح اگلے جملے میں لفظِ ''أُحِلَّ'' بمعنیٰ (حلال کرنے) کے ہےاور ''حُرِّمَ''،بمعنیٰ (حرام کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں،اس لئے ان دونوں میں بھی ''طباق'' موجود ہے۔

﴿وَرَسُولًا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِءُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ(۴۹)وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ(۵۰)إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ(۵۱)﴾

مذکورہ آیتِ کریمہ کے متعدد مقامات میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہاں آیت نمبر۴۹ میں ایک مرتبہ ''أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ'' کا جملہ ذکر ہوا ہے، پھراس کے بعد آیت نمبر۵۰ میں دوبارہ''وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّه'' میں اسی جملہ کو دہرایا گیا ہے۔اسی طرح آیت نمبر۴۹ میں ایک مرتبہ ''كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ'' میں لفظِ 'الطَّيْر'' کا ذکر ہوا، پھراس کے بعد اسی آیت میں آگے ''طَيْرًا''،بول کر دوبارہ اسی لفظ کا ذکر کیا گیا ہے۔اسی طرح آیت نمبر ۴۹ میں ''بِإِذْنِ الله'' بولکر لفظِ ''الله'' کا ذکر کیا گیا ہے، پھراس کے بعد نمبر۵۰ میں ''فَاتَّقُوا الله''،بول کر دوبارہ لفظِ ''الله'' کا ذکر کیا گیا ہے۔اسی طرح آیت نمبر۵۱ میں ایک مرتبہ ''رَبِّي'' میں لفظِ ''رَبّ'' کا ذکر ہوا، پھر دوبارہ اسی آیت میں ''رَبُّكُمْ''،بول کر لفظِ ''رَبّ'' کا ذکر کیا گیا ہے۔اسی طرح آیت نمبر۴۹ میں ایک مرتبہ ''وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ''،بول کر

لفظِ ''مَا'' کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آگے دوبارہ ''بِـمَا تَأْكُلُونَ'' بول کراسی لفظِ ''ما'' کو ذکر کیا گیا ہے۔ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہاں متعدد مقامات میں ''تکرار'' موجود ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ ان آیتوں میں اس مضمون کو خوب تاکید سے بیان کیا جائے۔

﴿فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۵۲)﴾

ترجمہ: پھر جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ وہ کفر پر آمادہ ہیں، تو انہوں نے (اپنے پیروؤں سے) کہا: کون کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہوں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارة تصريحية وتبعية'' پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں معلوم ہونے یا شعور ہونے کو احساس کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں معلوم ہونا یا شعور ہونا ''مشبه'' اور احساس کرنا ''مشبه به'' ہے، ان دونوں میں سے چونکہ آیت میں ''أَحَسَّ''، بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔ یہاں ''أَحَسَّ'' کو بطور استعارہ اس لئے لینا پڑا کیونکہ اس کا حقیقی معنی یہاں درست نہیں ہوتا، وہ اس لئے کہ محسوس ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو جسم رکھتی ہو، کفر کا جسم نہیں ہوتا جو اس سے محسوس ہو، اس لئے اس پر ''أَحَسَّ'' کا اطلاق حقیقی معنی پر نہیں ہوگا، بلکہ بطور استعارہ ''أَحَسَّ''، بمعنی (علم) کے ہوگا۔اس آیت کریمہ میں ''استعارة تبعية'' بھی موجود ہے۔ ❷ یہاں ''أَحَسَّ''، فعل مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تبعية'' موجود ہے۔

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو حرف، فعل یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر یہاں ''أَحَسَّ'' (رَای یا سَمِعَ) کے معنی میں ہوتو پھر استعارہ نہیں ہوگا، ایسی صورت میں آیت کا معنی بالکل درست ہوگا استعارہ کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ ''رای اور سَمِعَ'' کا معنی لینے کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ خاصہ بصر سے یا خاصہ سمع سے عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کفر کا ادراک کیا۔اور ظاہر ہے کہ ان خاصوں سے ادراک کرنا بالکل صحیح معنی ہے۔اس میں استعارہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

﴿قَالَ مَنْ أَنْصَارِی إِلَی اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ(۵۲)﴾

اس آیتِ کریمہ میں سوال جواب کا اسلوب اپنایا گیا ہے۔''مَنْ أَنْصَارِی إِلَی اللهِ'' کا جملہ دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سوال ہے، جب عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کفر اور ارادہ قتل کو معلوم کیا تو انہوں نے حوارین سے سوال کیا''مَنْ أَنْصَارِی إِلَی اللهِ'' (کون ہے جو اللہ کے دین کا مددگار رہے۔) یہ سوال کرنا تھا کہ فوراً حواریوں نے جواب دیا ''نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ'' (اے عیسیٰ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔)اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں سوال وجواب کا انداز اپنایا گیا ہے تاکہ مضمون سمجھ آئے اور ذہن نشین ہو۔

﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۵۴)﴾

ترجمہ: وران کافروں نے (عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی، اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''مَکَرُوْا''اور''المَاکِرِیْن'' کے درمیان ''جناس اشتقاق'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''مَکَرُوا''اور''الـمَاکِرِین'' کا اصل مادہ اشتقاق (مکر) ہے۔ اوران کا اصل معنی (چال چلنا) ہے۔ان دونوں چیزوں میں چونکہ مذکورہ کلمات ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان میں ''جناس اشتقاق'' پایا جاتا ہے۔

❶ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمے اصل مادہ اشتقاق اور اصل معنی میں ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہوں۔

﴿قَالَ مَنْ أَنْصَارِی إِلَی اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِیُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۵۲)......رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (۵۳)......وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۵۴)﴾

ان آیتوں میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ایک مرتبہ پہلی آیت میں ''مَنْ أَنْصَارِی إِلَی اللَّه''، میں لفظِ ''أَنْصَار'' کا استعمال ہوا، پھر اس کے بعد اسی آیت میں آگے ''نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّه'' میں دوبارہ لفظِ ''أَنْصَار'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں ''آمَنَّا بِاللَّه'' میں ''آمَنَّا'' فعل کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں ''رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْت'' میں دوبارہ ''آمَنَّا'' فعل کا ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح آیت نمبر ۵۴ میں ایک مرتبہ ''مَكَرَ اللَّه''، میں لفظِ ''اللَّه'' کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد اسی آیت میں آگے ''اللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ''، میں لفظِ ''اللَّه'' کا دوبارہ ذکر ہوا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان آیات میں متعدد مقامات پر ''تکرار'' ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تا کہ ان آیتوں کے مضمون میں تاکید اور مبالغہ بیان ہو۔

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵۵)﴾

ترجمہ: (اس کی تدبیر اس وقت سامنے آئی) جب اللہ نے کہا تھا کہ: اے عیسیٰ میں تمہیں صحیح سالم واپس لے لوں گا، اور تمہیں اپنی طرف اٹھا لوں گا، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان (کی ایذا) سے تمہیں پاک کردوں گا۔ اور جن لوگوں نے تمہاری اتباع کی ہے، ان کو قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب رکھوں گا جنہوں نے تمہارا انکار کیا ہے۔ پھر تم

❶ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ، کلمہ یا کوئی حکم مکرر ذکر کیا جائے۔ اور یہ تکرار کسی غرض کے لیے ہوتا ہے۔

سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، اس وقت میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں "**اسناد مجازی**" (مجاز عقلی) پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "قَالَ" فعل استعمال ہوا ہے۔ یہ "**قول**" مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (کہنا) ہے۔ آیت میں اس فعل کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام سے باتیں کرنے والا اللہ سبحانہ تعالیٰ نہیں بلکہ جبرئیل یا دوسرے فرشتہ تھے، اس لحاظ سے آیت میں اس فعل کا فاعلِ حقیقی جبرئیل یا دوسرے فرشتہ ہیں، مگر چونکہ اللہ کے حکم سے جبرئیل یا دیگر فرشتوں نے حضرت عیسیٰ سے بات کہی تھی، اس لحاظ سے اس فعل کا اصل سبب اللہ کا حکم ہے۔ اس ظاہری سبب کے مناسبت کی وجہ سے آیت کریمہ میں فعل کی نسبت فاعلِ حقیقی (جبرئیل یا دیگر فرشتہ) کی طرف کرنے کے بجائے فاعلِ غیر حقیقی (اللہ سبحانہ تعالیٰ) کی طرف کر دی گئی ہے۔ آیت میں چونکہ فعل کی نسبت فاعلِ حقیقی کی جگہ فاعلِ غیر حقیقی کی طرف کر دی گئی ہے۔ اس لئے اس میں "**مجاز عقلی**" (اسناد مجازی) موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے دو مقامات میں "**استعارة تصريحية**" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں دو استعارہ پائے جاتے ہیں:

نمبر ۱: "مُتَوَفِّيكَ" میں۔

نمبر ۲: "فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا" میں۔ پہلے استعارہ "مُتَوَفِّيكَ" کی تفصیل یہ ہے کہ اس استعارہ میں مدت پوری کرنے یا پورا پورا انتہاء تک پہنچانے کو موت دینے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس تشبیہ میں مدت پوری کرنا یا پورا پورا انتہاء تک کسی چیز کو پہنچانا "**مشبہ**" اور موت

---

❶ مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل یا معنیٰ فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعل حقیقی کی جگہ فاعل غیر حقیقی کی طرف کر دی جائے۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

دینا ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''مُتَوَفِّیکَ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔

دوسرے استعارہ ''فَوْقَ الَّذِینَ کَفَرُوْا'' کی تفصیل یہ ہے کہ اس استعارہ میں عزت کے مقام ومرتبہ کی بلندی کو اس چیز کی بلندی سے تشبیہ دی گئی ہے جو حقیقتاً کسی چیز پر متمکن اور بلند ہو۔ اس میں عزت کے مقام ومرتبہ کی بلندی ''مشبہ'' ہے اور حقیقتاً کسی چیز کا کسی چیز پر بلند اور متمکن ہونا ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''فَوْقَ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔

﴿فَأَمَّا الَّذِینَ کَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیدًا فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِینَ (٥٦) وَأَمَّا الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَیُوَفِّیهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا یُحِبُّ الظَّالِمِینَ (٥٧)﴾

ترجمہ: چنانچہ جو لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کو تو میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا، اور ان کو کسی طرح کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان کو اللہ ان کا پورا پورا ثواب دے گا، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

ان دونوں آیتوں کے درمیان ''مقابلۃ'' پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں پہلی آیت میں ''أَمَّا الَّذِینَ کَفَرُوْا'' سے اہل کفر کا ذکر کیا گیا پھر ''فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیدًا'' سے ان کو کفر پر ملنے والے عذاب کا ذکر کیا گیا، یہ دونوں (اہل کفر اور ان کو عذاب ملنا) ایک دوسرے کے موافق معنی ہیں اور یہ دونوں موافق بایں معنی ہے کہ ان میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔ پہلی آیت

(1) مقابلہ یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو موافق معنوں کو بیان کیا جائے پھر بالترتیب ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کی ضد لائی جائے، واضح رہے کہ یہاں موافق معنوں سے مراد وہ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہو۔

میں ان موافق معنوں کو بیان کرنے کے بعد دوسری آیت میں بالترتیب ان کی ضد لائی گئی۔ اہل کفر کی ضد (اہل ایمان) کا ذکر "وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" سے کیا گیا، پھر عذاب کی ضد (ثواب واجر) کا ذکر "يُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ" سے کیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں "مقابلة" پایا جاتا ہے۔

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (٥٦)......وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (٥٧)﴾

یہاں "التفات من التكلم إلى الغيبة" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں اللہ سبحانہ نے کافروں کو عذاب دینے کی خبر بتانے کیلئے "أُعَذِّبُ" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ متکلم کا صیغہ ہے، اس لفظ کے اعتبار سے اگلی آیت میں بھی "فَيُوَفِّيهِم" کی جگہ "فَأُوَفِّيهِمْ" کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ متکلم کی جگہ "فَيُوَفِّيهِمْ" بول کر غائب کا صیغہ آیت میں لایا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں "التفات من التكلم إلى الغيبة" پایا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ سامع آیت کے بدلتے انداز کو دیکھ کر لطف اندوز ہو اور سامع کی توجہ مسلسل سماعت کی طرف برقرار رہے۔

﴿ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (٥٥) فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (٥٦) وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (٥٧)﴾

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو تکلم کے الفاظ کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں تکلم کی جگہ غائب کا لفظ استعمال کر لیا جائے۔

ان آیاتِ کریمہ میں ''التفصیل بعد الاجمال'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''إِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَأَحْکُمُ بَیْنَکُمْ'' میں اجمالاً یہ بتایا گیا ہے کہ تم لوگوں کا لوٹنا قیامت کے روز اللہ کی طرف ہوگا اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے ہو اللہ رب العزت اُن کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے۔ اس میں اجمالاً فیصلہ کا ذکر ہوا ہے، یہ نہیں بتایا گیا کہ فیصلہ کا نتیجہ اور ثمرہ کیا ہوگا، اس کی صورت کیا ہوگی؟ اس سے کلام خاموش ہے۔ آیت میں اجمالی طور پر فیصلہ کا ذکر کرنے کے بعد اگلی آیتوں میں ''فَأَمَّا الَّذِینَ کَفَرُوا'' اور ''وَأَمَّا الَّذِینَ آمَنُوا'' سے فیصلہ کی تفصیل اور وضاحت بتائی گئی کہ اختلاف کرنے والوں میں سے کافروں کو عذاب دے کر اور ایمان والوں کو ان کی اطاعت کا اجر دے کر فیصلہ کیا جائے گا۔ اس سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں ''التفصیل بعد الاجمال'' واقع ہوا ہے۔

﴿ذَلِکَ نَتْلُوهُ عَلَیْکَ مِنَ الْآیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیمِ (۵۸) ثُمَّ قَالَ لَهُ کُنْ فَیَکُونُ (۵۹)﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) یہ وہ آیتیں اور حکمت بھرا ذکر ہے جو ہم تمہیں پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

یہاں پہلی آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت اور واقعات کی یہ باتیں پڑھ کر سنائی ہیں۔ جس وقت یہ آیت اتر رہی تھی تب تک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت و واقعات سنا دیتے تھے۔ اس لحاظ سے آیت میں ''نَتْلُو'' مضارع کی جگہ ''تَلَیتُ'' ماضی کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ماضی کی تعبیر مضارع سے ہی کی گئی ہے، ایسا اس لئے ہوا تاکہ ماضی کی حالت کو موجودہ حالت میں پیش کیا جائے، گویا نصیحت اور واقعات پڑھ کر سنانے کا کام ابھی ابھی

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کوئی مبہم شئی یا مبہم بات ذکر کی جائے پھر اس کے بعد اس مبہم کی تفصیل و وضاحت بیان کی جائے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ سامع کو کلام سننے میں لطف آئے۔

سامع کے سامنے انجام پا رہا ہے۔اسی طرح دوسری آیت میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہوا ہے، ان کی تخلیق بھی زمانہ ماضی میں ہو چکی ہے، اس لحاظ سے دوسری آیت میں بھی ''کَانَ'' ماضی ہونا چاہیے ''یَکُوْنُ'' نہیں، لیکن آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ فعلِ ماضی کی جگہ فعل مضارع یعنی ''یَـکُوْنُ'' سے آیت کی تعبیر ہوئی ہے۔ یہاں بھی حکایت حال ماضیہ کے فائدہ کے خاطر ماضی کی تعبیر مضارع سے کی گئی ہے، گویا عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق ابھی ہو رہی ہے۔

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۵۹)﴾

ترجمہ: اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے، اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ان سے کہا: ہو جاؤ، بس وہ ہو گئے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''تشبیہ مرسل'' پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں عیسیٰ علیہ السلام ''مشبہ'' ہے اور حضرت آدم علیہ السلام ''مشبہ بہ'' ہے۔ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح آدم علیہ السلام کی تخلیق بغیر باپ کے ہوئی، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق بھی بغیر باپ کے ہوئی ہے۔اس وجہ شبہ کی بنیاد پر آیت میں مذکورہ تشبیہ واقع ہوئی ہے، لیکن چونکہ آیت میں ''کَمَثَل'' میں ''کاف'' حرفِ تشبیہ مذکور ہے، اس لئے اس میں ''تشبیہ مرسل'' موجود ہے۔ یہ دراصل غریب کی اغرب سے تشبیہ ہے۔وہ اس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق میں کم ازکم ماں کا دخل تو ہے، اس لئے بغیر باپ کے ان کی تخلیق عجیب وغریب ضرور ہے، مگر آدم علیہ السلام کی تخلیق اس سے زیادہ اغرب ہے کہ ان کی تخلیق ماں باپ دونوں کے بغیر ہے۔

---

❶ تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور ہو۔

﴿الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (۶۰)﴾

ترجمہ: حق وہی ہے جو تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے، لہٰذا شک کرنے والوں میں شامل نہ ہوجانا۔

اس آیت میں "الهاب وتهييج" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں بھی رسول کو شک کرنے والوں کے زمرے میں داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ایسا انداز ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین کرنے پر ابھارا گیا ہے، اس لئے اس آیت میں "الهاب وتهييج" موجود ہے۔

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴)﴾

ترجمہ: (مسلمانو! یہود ونصاری سے) کہہ دو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم تم میں مشترک ہو، (اور وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔ پھر بھی اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "كَلِمَةٍ" میں "مجاز" استعمال ہوا ہے۔ ❷ یہاں "كَلِمَةٍ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ لفظ صرف مفرد "كَلِمَة" کے لئے وضع کیا گیا ہے، مگر یہاں "كَلِمَةٍ" سے یہ معنی مراد نہیں، بلکہ اس لفظِ "كَلِمَةٍ" سے "كَلام" (جمع) مراد لیا گیا ہے، جو اس لفظ

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے مخاطب کے سامنے ایسا انداز اپنایا جائے جس سے سامع اور مخاطب کو کسی کام پر ابھارا جائے۔

❷ مجاز یہ ہے کہ لفظ جس معنی کیلئے وضع کیا گیا ہے اس معنی میں استعمال نہ کیا جائے، بلکہ دوسرے معنی کے لئے استعمال کیا جائے، اصطلاح بلاغت میں اس کو معنی حقیقی اور معنی مجازی کہا جاتا ہے۔

کا موضوع لہ معنی نہیں ہے۔آیت میں چونکہ لفظ بول کراس کا غیر موضوع لہ معنی مراد لیا گیا ہے،اس لئے اس میں ''مجاز'' موجود ہے۔

﴿أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ایک مرتبہ ''أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ'' میں لفظِ ''اللّٰہ'' کا ذکر ہوا ہے، پھر اس کے بعد آگے ''أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ'' بول کر اسی لفظِ ''اللّٰہ'' کو دوبارہ ذکر کیا ہے،اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ ''تکرار'' اس لئے واقع ہوا تا کہ اللہ کا نام بار بار سن کر سامع لطف اندوز ہو اور شرک و بت پرستی کی خوب مذمت واضح ہو۔

﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (۶۴)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''تشبیہ مؤکد'' پائی جاتی ہے۔❷ یہاں بنی اسرائیل کے حلت وحرمت کے بارے میں جن لوگوں کی پیروی اور اطاعت کرتے تھے ان کی تشبیہ اس رب سے دی گئی ہے جو واقعتاً عبادت اور ربوبیت کا مستحق ہے۔اس میں بنی اسرائیل کے مقتداء ''مشبہ'' اور حقیقی رب ''مشبہ بہ'' ہے۔آیت میں چونکہ حرفِ تشبیہ مذکور نہیں،اس لئے اس میں ''تشبیہ مؤکد'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہود و نصاریٰ کے نظریہ کی تردید کی گئی ہے۔ یہود و نصاری اپنے احبار ورہبان کے ربوبیت کے اس معنی میں قائل تھے کہ وہ اشیاء کی حلت وحرمت میں اِن کے قول کو مانتے تھے، یہ جس چیز کو حلال کہتے اُسے حلال تصور کرتے ،جس چیز کو حرام سمجھتے تو یہ اُسے حرام قرار دیا، گویا انہوں نے انہیں رب تسلیم کرلیا ہے، اس لیے کہ یہ اختیارات تو

❶ تکرار اطناب کی ایک صورت ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ،کلمہ یا حکم بار بار ذکر کیا جائے۔
❷ تشبیہ مؤکد وہ تشبیہ ہے جس میں حرفِ تشبیہ مذکور نہ ہو۔

رب کے پاس ہوتے ہیں۔

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاء (64)يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ(٦٥)مَاكَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا(٦٧)إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ (٦٨)﴾

ان آیتوں میں بھی "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ " قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا" میں "أَهْلَ الْكِتَاب" کے لفظ سے اہلِ کتاب کو خطاب ہوا، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں "يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّون" بول کر دوبارہ اسی نداء کو ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں تیسرے جملہ میں "مَاكَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا" میں لفظِ ابراہیم کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں "إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيم" میں دوبارہ لفظِ ابراہیم کا ذکر ہوا ہے، اس سے پتہ چلا کہ یہاں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ پہلا تکرار اس لئے ہوا تاکہ اہلِ کتاب کو نداء کر کے انہیں بتلایا جائے کہ تم اہلِ کتاب ہو کر بھی حق کو تسلیم نہیں کرتے ہو۔ اور دوسرا تکرار اس لئے ہوا تاکہ بار بار ابراہیم علیہ السلام کا نام لیکر ان کی عظمت اور رفعتِ شان کو واضح کی جائے۔

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا(٦٤)يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ(٦٥)﴾

ان دونوں آیاتِ مبارکہ میں "إجمال" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں بھی "أَهْلَ الْكِتَاب" سے اہلِ کتاب کو خطاب تو ہوا مگر اس سے مراد کون کون سے اشخاص وافراد ہیں؟ اس بارے میں آیت خاموش ہے، وہ افراد واشخاص مبہم ہیں، اسی لئے آیت میں ابہام پایا جاتا ہے۔ یہ ابہام اس لئے واقع ہوا تاکہ سامع توجہ اور جستجو میں لگا رہے کہ ان سے مراد کونسے افراد ہیں۔

❶ اجمال کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو مجمل اور مبہم چھوڑ دیا جائے اس کی توضیح وتعین نہ کی جائے۔

﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (٦٨)﴾

ترجمہ: ابراہیم کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی آخرالزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں، اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''أَوْلَى'' اور لفظِ ''وَلِيُّ'' کے درمیان ''جناس مماثل'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''أَوْلَى'' اور ''وَلِيُّ'' دونوں اسم ہیں، اس لئے یہ دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

﴿وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّونَكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (٦٩)﴾

ترجمہ: (مسلمانو) اہل کتاب کا ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں کو گمراہ کردے، حالانکہ وہ اپنے سوا کسی اور کو گمراہ نہیں کررہے، اگرچہ انہیں اس کا احساس نہیں ہے۔

یہاں دو صیغے ''يُضِلُّونَ'' میں ''جناس تام'' پایا جاتا ہے۔ ❷

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس پایا جائے، یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں کے درمیان۔

❷ جناس تام وہ جناس ہے جس میں دو کلموں کے تمام حروف چار چیزوں میں متفق ہوں۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں:

نمبر۱: ہیئت: اس سے مراد حرکات وسکنات ہے۔

نمبر۲: نوع: اس سے مراد حروف ہجاء ہے۔

نمبر۳: عدد: اس سے مراد مقدار حروف ہے۔

نمبر۴: ترتیب: اس سے مراد حروف کی تقدیم وتاخیر ہے۔

یہاں دو صیغے ''یُضِلُّوْن'' چونکہ ہیئت، نوع، عدد اور ترتیب میں متفق ہیں، اس لئے ان کے درمیان ''جناس تام'' واقع ہیں۔

﴿یَاأَهْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَکْفُرُونَ بِآیَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (۷۰)﴾

ترجمہ: اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود (ان کے من جانب اللہ ہونے کے) گواہ ہو۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ'' تَکْفُرُونَ'' اور لفظِ ''تَشْهَدُونَ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ یہاں تَکْفُرُونَ ''کفراً'' مصدر سے مشتق ہے اور اس کا معنی (چھپانے) کے ہے۔ اسی طرح تَشْهَدُونَ ''شهادة'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (ظاہر کرنا اور اقرار کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی (چھپانا اور ظاہر کرنا) ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿یَاأَهْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۷۱)﴾

ترجمہ: اے اہل کتاب! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں گڈ مڈ کرتے ہو اور کیوں جان بوجھ کر حق بات کو چھپاتے ہو؟

''الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ'' ان دونوں الفاظ کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''الْحَقَّ'' بمعنی (حق وسچ) کے ہے۔ اور ''بِالْبَاطِلِ'' بمعنی (باطل اور جھوٹ) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ چونکہ ان مقابل معنوں آیت میں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

﴿وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْکِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِی أُنْزِلَ عَلَى الَّذِینَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاکْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُونَ (۷۲)﴾

ترجمہ: اہل کتاب کے ایک گروہ نے (ایک دوسرے سے) کہا ہے کہ جو کلام مسلمانوں پر نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آؤ، اور ان کے آخری حصے میں اس سے انکار کردینا، شاید اس طرح مسلمان (بھی اپنے دین سے) پھر جائیں۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "آمِنُوا" اور لفظِ "وَاكْفُرُوا" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں آمِنُوا "إيمان" مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنیٰ (ایمان لانے) کے ہے۔ اور "وَاكْفُرُوا" "كُفْرًا" مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنیٰ (کفر کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت میں "وَجْهَ النَّهَارِ" کا معنیٰ (ابتدائے دن) کے ہے۔ اور "آخِرَهُ" کا معنیٰ (انتہائے دن) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں دو اوقات کی تخصیص ہوئی ہے:

نمبر۱: "وَجْهَ النَّهَارِ" بول کر ابتدائے دن کی تخصیص ہے، جس سے مراد دن کا آغاز ہے۔

نمبر۲: "آخِرَهُ" بول کر انتہائے دن کی تخصیص کی گئی ہے۔ یہاں ان دونوں اوقات کی تخصیص اس لیے کی کہ اہلِ کتاب مؤمنین کیساتھ دن کی ابتداء میں ملتے اور بطورِ نفاق کے کہتے کہ وہ اِن کے ساتھ ہیں، اور دن کے آخر میں کفار کے ہم نوا ہوتے۔ یہ اس لیے کرتے تاکہ سادہ لوح مسلمان اِن کے طرزِ عمل کی وجہ سے معاذ اللہ کفر کریں کہ جب اہلِ کتاب نے اس مذہب کو چھوڑا، تو شاید اس میں کوئی کمی کوتاہی ہوگی، ورنہ یہ پڑھے لکھے لوگ کیوں چھوڑتے۔

﴿وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۷۲) وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَى هُدَى اللَّهِ أَنْ يُؤْتَى أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۷۳) يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۷۴)﴾

مذکورہ تینوں آیتوں میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔ (1) یہاں پہلی آیت کے لفظِ ''آمِنُوا'' اور ''آمَنُوا'' کے درمیان ''جناس مماثل'' موجود ہے۔ ''آمِنُوا'' اور ''آمَنُوا'' دونوں فعل ہیں اور دونوں فعل ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، اس لئے ان کے درمیان ''جناس مماثل'' ہوگا۔ اسی طرح دوسری آیت میں لفظِ ''الْهُدَى'' اور ''هُدَى'' دونوں اسم ہیں، یہ بھی ایک نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان کے درمیان بھی جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں موجود جناس کو ''جناس مماثل'' کہا جائیگا۔ اسی طرح دوسری آیت میں لفظِ ''يُؤْتَى'' اور ''أُوتِيتُم'' دونوں فعل ہیں، ان میں موجود جناس بھی ''جناس مماثل'' ہوگا۔ اسی طرح تیسرے جملہ کے لفظِ ''الْفَضْلَ'' اور چھوتے جملہ کے لفظِ ''الْفَضْلَ'' کے درمیان بھی ''جناس مماثل'' موجود ہے، کیونکہ یہ دونوں بھی اسم ہیں اور ایک ہی نوع کے کلمے ہیں۔ ان الفاظ میں اگر غور کیا جائے تو ''تکرار'' بھی معلوم ہوگا، کیونکہ ان الفاظ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے، اور جب کسی جملہ، کلمہ یا کو حکم کو مکرر ذکر کیا جائے تو وہ ''تکرار'' کہلاتا ہے۔ یہاں بھی الفاظ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے، یہ ''تکرار'' اس لئے واقع ہوا تا کہ آیتوں کے مضمون ومفہوم میں تاکید ہو سکے۔

﴿وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۷۵) وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۸۰)﴾

(1) جناس مماثل یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو، یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں میں۔

ترجمہ: اہل کتاب میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس دولت کا ایک ڈھیر بھی امانت کے طور پر رکھوادو تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے، اورانہی میں سے کچھ ایسے ہیں کہ اگر ایک دینار کی امانت بھی ان کے پاس رکھواؤ تو وہ تمہیں واپس نہیں دیں گے، اِلَّا یہ کہ تم ان کے سر پر کھڑے رہو۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس لیے ہے کہ انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ امیوں (یعنی غیر یہودی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ اور (اس طرح) وہ اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں۔ اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے سکتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا قرار دے دو۔ جب تم مسلمان ہو چکے تو کیا اس کے بعد وہ تمہیں کفر اختیار کرنے کا حکم دے گا؟

یہاں پہلی آیتِ کریمہ کے لفظِ ''بِقِنْطَارٍ'' اور ''بِدِینَارٍ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''بِقِنْطَارٍ''، بمعنی (مال کثیر) کے ہے اور ''بِدِینَارٍ''، بمعنی (مال قلیل) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طبـــاق'' موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت کے لفظِ ''یُؤَدِّهٖ'' کا معنی (عطاء کرنے) کے ہے، اور ''لاَ یُؤَدِّهٖ'' کا معنی (منع کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔ دوسرے آیت کے لفظِ ''الْکُفْر'' اور ''مُسْلِمُونَ'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' موجود ہے، کیونکہ ''الْکُفْر''، بمعنی (انکار کرنے) کے ہے اور ''مُسْلِمُونَ''، بمعنی (ماننے اور تسلیم کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

پہلی آیتِ کریمہ کے لفظ ''بِقِنْطَارٍ'' اور لفظ ''بِدِینَارٍ'' میں ''کنایۃ'' بھی پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''بِقِنْطَارٍ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا اصل معنی (معنی ملزوم) ایک خاص وزن ہے جو ہر زمانہ میں مختلف ہوتا رہا ہے، مگر آیت میں اس لفظ سے اس کا معنی لازم مراد لیا گیا ہے اور وہ (مال کثیر) ہے۔ اسی طرح اس میں ''دِیْنَار'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ''دِیْنَار'' اصل میں ایک خاص سکہ کو کہتے ہیں، مگر آیت میں ''دِیْنَار'' سے اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے اور وہ (مال قلیل) ہے۔ آیت میں چونکہ دونوں الفاظ سے ان کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''کنایۃ'' پایا جاتا ہے۔ کنایہ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے نبی اہلِ کتاب میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کو مال کثیر امانت رکھوائے تو وہ فوراً ادا کر دے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر آپ ان کو تھوڑا مال بھی امانت رکھوائے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہے اور امانت ادا نہ کرے۔

اس آیت میں ''تکرار'' بھی پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ایک بار ''بِقِنْطَارٍ یُؤَدِّہٖ'' میں ایک مرتبہ '' یُؤَدِّہٖ'' فعل کا ذکر ہوا پھر اس کے بعد اسی آیت میں آگے ''بِدِینَارٍ لَا یُؤَدِّہٖ'' میں دوبارہ اسی فعل کو ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ بعض اہل کتاب کی شناعت وقباحت میں خوب مبالغہ ہو۔

﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (۷۵)﴾

اس آیتِ کریمہ میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔❸ یہاں یہ جملہ اہل کتاب میں

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے، مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا اصل معنی (معنی ملزوم) مراد لینا بھی درست ہو۔

❷ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ، کلمہ یا حکم بار بار ذکر کیا جائے، اور یہ تکرار کسی مقصد وغرض کے تحت ہوتا ہے۔

❸ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی جملہ، کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں اس محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

سے تعلیم یافتہ لوگوں کا قول ہے۔اس میں ''فِیْ'' کے بعد ''اَکْلِ اَمْوَال'' کے الفاظ محذوف ہے۔ یہ اصل میں ''لَیْسَ عَلَیْنَا فِیْ اَکْلِ اَمْوَالِ الْأُمِّیِّینَ سَبِیلٌ ''تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر امیوں کے مال کھانے کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی، چونکہ اس جملہ سے ''اَکْلِ اَمْوَالِ'' کے الفاظ حذف کردیئے گئے ہیں،اس لئے اس میں ''ایجاز حذف''،موجود ہے۔

﴿ذَلِکَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (۷۵) أُولَئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ(۷۷)﴾

ان دونوں جملوں میں اہلِ کتاب کے کچھ افراد کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ''ذَلِکَ'' اور ''أُولَئِکَ'' اسم اشارہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اسم اشارہ کسی بعید چیزوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے وضع ہوئے ہیں۔مگر یہاں ان جملوں میں یہ اسمائے اشارات اس لئے استعمال ہوئے تا کہ یہ بتایا جائے کہ بعض اہلِ کتاب کا شر وفساد اور مال میں خیانت بہت دور اور حد درجے فساد تک پہنچ چکا ہے۔

﴿بَلَى مَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (76)﴾

ترجمہ: بھلا پکڑ کیوں نہیں ہوگی ؟ (قاعدہ یہ ہے کہ) جو اپنے عہد کو پورا کرے گا اور گناہ سے بچے گا تو اللہ ایسے پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ ''اتَّقَى''اور ''الْمُتَّقِينَ'' کے درمیان ''جناس مغائر'' موجود ہے۔❶ یہاں ''اتَّقَى'' فعل اور ''الْمُتَّقِينَ '' اسم ہیں، یہ دونوں علیحدہ علیحدہ نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان دونوں کے درمیان جناس واقع ہوا ہے،اس لئے ان میں ''جناس مغائر'' موجود ہے۔

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو الگ الگ نوع کے کلموں میں جناس واقع ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں ''الاظھار فی مقام الاضمار'' بھی پایا جاتا ہے۔❶ آیت میں ''مَنْ أَوْفَى'' کی صورت میں اہل تقویٰ کا ذکر ہوا ہے۔ ''مَنْ'' موصولہ معناً جمع ہے اور یہ بعد میں آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے۔ اس لحاظ سے آگے آیت میں ''يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ'' کی جگہ ''يُحِبُّهُم'' بول کر ضمیر لوٹانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ''الْمُتَّقِين'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''الاظھار فی مقام الاضمار'' پایا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ متقیوں کا مقام بہت اہم اور بلند ہے اور اللہ کی محبت ہر متقی کو عام ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (٧٧)﴾

ترجمہ: (اس کے برخلاف) جو لوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد اور اپنی کھائی ہوئی قسموں کا سودا کر کے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، اور قیامت کے دن نہ اللہ ان سے بات کرے گا، نہ انہیں (رعایت کی نظر سے) دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا، اور ان کا حصہ تو بس عذاب ہوگا، انتہائی دردناک۔

اس آیتِ کریمہ میں ''استعارۃ تصریحیۃ و تبعیۃ'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں اہلِ کتاب کے استبدال یعنی معمولی سی رقم کے بدلہ اللہ کے عہد اور قسموں کو چھوڑ دینے کو ''اِشْتِرَاء'' (خرید وفروخت کرنے) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان دونوں میں استبدال ''مشبہ'' اور اِشْتِرَاء ''مشبہ بہ'' ہے۔ ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح خرید وفرخت میں ثمن اور مبیع کا تبادلہ پایا جاتا

❶ یہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کر دیا جائے۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

ہے،اسی طرح استبدال میں بھی ہے۔آیت میں چونکہ ''اِشْتَرُوْا'' بول کرمشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے اس میں ''استعارۃ تصریحیة'' پایاجاتا ہے۔اسی طرح اس آیت میں ''استعارۃ تبعیة'' بھی موجود ہے۔❶ یہاں ''اِشْتَرُوْا'' فعلِ مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے اس میں ''استعارۃ تبعیة'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے دوجگہوں میں ''مجاز'' پایاجاتا ہے۔❷ یہاں ''لَایُکَلِّمُ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس کامعنی موضوع لہ(عدم تکلم) کے ہے،مگرآیت میں یہ معنی مرادنہیں بلکہ اس سے مرادشدت غضب اورناراضگی ہے،جواس لفظ کا مجازی معنی ہے۔اسی طرح ''لَا یَنْظُرُ'' کااصل معنی (نہ دیکھنا) ہے،مگرآیت میں اس سے ذلت اورناراضگی مراد ہے۔ان دونوں لفظوں کے اصل معنی کوچھوڑ کرغیرموضوع لہ میں استعمال کیاگیا ہے،اس لئے آیت میں ''مجاز'' پایاجاتا ہے۔آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ ایسے لوگوں سے ناراض اور ان پرغصہ ہونگے اوران کواللہ رسواء وذلیل کرینگے۔

﴿بَلَى مَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ(٧٦) وَلَايُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَايَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ(٧٧)﴾

یہاں پہلی آیت میں اللہ کی محبت کے عنوان کیساتھ ''يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ'' بول کر بالخصوص تقوی داروں کی تخصیص کی گئی ہے،حالانکہ اللہ کی محبت عام مؤمنین کے لئے بھی ہے،مگرچونکہ عام مومنین میں تقوی داروں کا مقام ومرتبہ بڑا ہے،اس لئے آیت میں تقوی داروں کی تخصیص کی گئی ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں اللہ کی ناراضگی اورعدم کلام کے عنوان میں ''يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' بول کرقیامت کی تخصیص کی گئی ہے،چونکہ اعمال کابدلہ قیامت

❶ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جوفعل،حرف یااسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❷ مجاز یہ ہے کہ لفظ جس معنی کے لئے وضع کیاگیا ہے اس معنی میں استعمال نہ ہو بلکہ غیرموضوع لہ میں استعمال ہو۔

کے دن ہی ظاہر ہوگا، اس لئے آیت میں بالخصوص ''یَوْمَ الْقِیَامَةِ'' کا ذکر ہوا۔

﴿وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَمِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَمِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۷۸)﴾

ترجمہ: اورانہی میں سے ایک گروہ کے لوگ ایسے ہیں جو کتاب (یعنی تورات) پڑھتے وقت اپنی زبانوں کومروڑتے ہیں تاکہ تم (ان کی مروڑ کر بنائی ہوئی) اس عبارت کو کتاب کا حصہ سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں ہوتی، اوروہ کہتے ہیں کہ یہ (عبارت) اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اور (اس طرح) وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ ''أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ'' بول کر کتاب کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد آگے آیت میں ''لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ'' بول کر دوبارہ لفظِ ''کتاب'' کا ذکر ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تاکہ اہل کتاب میں سے جو لوگ زبان مروڑ کر تورات پڑھتے تھے ان کی مذمت وشناعت میں تاکید ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں دو تاکیدات استعمال ہوئے ہیں۔ وہ تاکیدات یہ ہیں:

نمبر ۱: ''إِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل جو تاکید کا معنی دیتا ہے۔

نمبر ۲: ''لَفَرِيقًا'' میں موجود ''لام'' یہ بھی تاکید کے لئے ہے۔

یہ دونوں تاکیدات اس لئے لائی گئیں تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہ فعلِ قبیح انہی سے صادر ہوا ہے۔

﴿وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۸۰)﴾

ترجمہ: اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے سکتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا قرار دے دو۔ جب تم مسلمان ہو چکے تو کیا اس کے بعد وہ تمہیں کفر اختیار کرنے کا حکم دے گا؟

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "لَا یَأْمُرُکُمْ" اور "أَیَأْمُرُکُمْ" میں **"جناس مماثل"** موجود ہے۔ ❶ یہاں "لَا یَأْمُرَکُمْ" اور "أَیَأْمُرُکُمْ" دونوں فعل ہیں اور دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان دونوں کلموں کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں **"جناس مماثل"** پایا جاتا ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ (۸۱)﴾

ترجمہ: اور (ان کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ اگر میں تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے، تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے، اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے (ان پیغمبروں سے) کہا تھا کہ کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے دی ہوئی یہ ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا: ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: تو پھر (ایک دوسرے کے اقرار کے) گواہ بن جاؤ، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی میں شامل ہوں۔

اس آیت کریمہ میں **"التفات من الغيبة إلى الخطاب"** پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو جائے یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں کے درمیان جناس واقع ہو۔

❷ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ ذکر کر دیئے جائے۔

آیت میں ''مِیثَاقِ النَّبِیِّینَ'' میں لفظِ ''النَّبِیِّینَ'' کا استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم ظاہر ہے اور اسمِ ظاہر الفاظ غائب کے قبیل سے ہے، اس لحاظ سے آیت میں آگے ''لَمَا آتَیْتُکُمْ'' میں ''کم'' ضمیر خطاب کی جگہ ''لَمَا آتَیْتُهُمْ'' بول کر ''هم'' ضمیر غائب استعمال کرنا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب ''هم'' کی جگہ خطاب ''کم'' کا الفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ''التفات من الغيبة إلى الخطاب'' پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ حضرات انبیاء کو خطاب کے ذریعہ اعزاز واکرام بخشا جائے۔

﴿قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا (۸۱)﴾

ترجمہ: اللہ نے (ان پیغمبروں سے) کہا تھا کہ: کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے دی ہوئی یہ ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا: ہم اقرار کرتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ''الاکتفاء'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''أَقْرَرْنَا'' کا جملہ ایک دوسرا جملہ ''أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي'' کا جواب ہے۔ سوال کے مطابق جواب ''أَأَقْرَرْنَا وَأَخَذْنَا عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِكَ'' ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ سوال میں ''أَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي'' تھا، مگر آیت میں اتنے الفاظ کی جگہ ''أَقْرَرْنَا'' کا مختصر لفظ لایا گیا اور ''أَخَذْنَا، إِصْرِكَ'' کو ''أَقْرَرْنَا'' پر کفایت کرتے ہوئے چھوڑ دیا گیا ہے، اور ''أَقْرَرْنَا'' باقی الفاظ کی طرف سے کافی ہوا۔ اس سے پتہ چلا کہ آیت میں ''الاکتفاء'' موجود ہے۔

﴿فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۸۲) وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ (۹۰)﴾

ترجمہ: اس کے بعد بھی جو لوگ (ہدایت سے) منہ موڑیں گے تو ایسے لوگ نافرمان ہوں گے......ایسے لوگ راستے سے بالکل ہی بھٹک چکے ہیں۔

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو زیادہ الفاظ کی جگہ کم الفاظ سے تعبیر کردی جائے اور کم الفاظ زیادہ الفاظ کے لئے کافی ہو۔

ان دونوں آیاتِ کریمہ میں ''قصر الصفة علی الموصوف'' پایا جاتا ہے۔ ❶
یہاں بھی پہلے جملے میں فسق کوعہد و پیمان سے روگردانی کرنے والے کیساتھ خاص کردیا گیا ہے، گویا یہ صفت روگردانی کرنے والوں میں ہی ہے دوسروں میں نہیں ہے۔

اسی طرح دوسرے جملہ میں بھی گمراہی اور ضلالت کو ایمان کے بعد کفر کرنے والوں کیساتھ مختص کردیا گیا ہے۔ قصر الصفۃ علی الموصوف کی صورت میں پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اقرار اور عہد کے بعد روگردانی کرنے والا ہی فاسق ہے کوئی اور نہیں۔ اسی طرح دوسرے جملہ کا مطلب ہے کہ ایمان کے بعد کفر کرنے والا اور پھر کفر میں اتنا بڑھ جائے کہ اس سے توبہ ہی نہ کرے، یہی سب سے بڑا گمراہ ہے۔

﴿أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (۸۳) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ (۹۰)﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات ہیں ان سب نے اللہ ہی کے آگے گردن جھکا رکھی ہے، (کچھ نے) خوشی سے اور (کچھ نے) ناچار ہوکر، اور اسی کی طرف وہ سب لوٹ کر جائیں گے۔

یہاں پہلے جملہ کے لفظ ''طَوْعًا وَكَرْهًا'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❷
یہاں ''طَوْعًا'' بمعنی (خوشی ورضامندی) کے ہے اور ''كَرْهًا'' بمعنی (زبردستی اور ناخوشی) کے ہے، یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت میں چونکہ یہ مقابل معانی جمع

---

❶ قصر الصفۃ علی الموصوف کی دو قسمیں ہیں:

نمبر ۱: اضافی۔ نمبر ۲: حقیقی۔ یہاں '' قصر الصفة علی الموصوف اضافی'' پایا جاتا ہے، اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی صفت کو ایک موصوف کیساتھ دوسرے موصوف کی بنسبت خاص کردیا جائے، چاہے وہ صفت اس دوسرے موصوف کے سواء کسی اور میں پائی جائے یا نہ پائی جائے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

کردئے گئے ہیں، اس لئے ان میں ''طبــاق'' موجود ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں ''کَفَرُوا'' اور ''إِيمَان'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' پایا جاتا ہے۔''کَفَرُوا'' (کفروانکار کرنے) کے معنی میں ہے اور ''إِيـمَـان'' (ایمان لانے) کے معنی میں ہے، یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، آیت میں چونکہ ان مقابل معنوں کو جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (۸۴)﴾

ترجمہ: کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو (کتاب) ہم پر اتاری گئی اس پر، اور اس (ہدایت) پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور (ان کی) اولاد پر ان کے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی، اور ان باتوں پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) پیغمبروں کو عطا کی گئیں۔ ہم ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی (ایک اللہ) کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے جملہ ''وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ'' میں ''عطف العام علی الخاص'' پایا جاتا ہے۔ (1) اس آیت میں پہلے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا نام لیا گیا ہے، یہ دونوں خاص انبیاء ہیں۔ آیت میں ان دو خواص کے ذکر کرنے کے بعد ''واو'' عاطفہ کے ذریعہ ''النَّبِيُّونَ'' کا عطف ان خواص پر کیا گیا ہے جو خود اس عام میں داخل ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ اس مقام میں ''عطف العام علی الخاص'' موجود ہے۔ ایسا اس

(1) یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے خاص شئی کو ذکر کیا جائے پھر اس خاص شئی پر ایسے عام کا عطف کیا جائے جس میں گذشتہ خاص شئی شامل ہو، یہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ مفہوم میں عموم حاصل ہو۔

لئے کیا تا کہ تمام انبیاء عمومیت کے ساتھ آیت کے مفہوم میں داخل ہو جائیں، اور ایمان لانے والے کے لیے ضروری ہے کہ جن انبیاء علیہم السلام کا نام لیا گیا ہے ان پر اور دیگر پر ایمان لے کر آئے اور اس میں تفریق نہ کرے۔

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (٨٦)إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا (٩٠)﴾

ترجمہ: اللہ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلیا؟ حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول سچے ہیں، اور ان کے پاس (اس کے) روشن دلائل بھی آ چکے تھے۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

ان آیات مبارکہ میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلی آیت میں ایک مرتبہ "كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ" میں فعل "يَهْدِي" کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد اسی آیت میں آگے جا کر "وَاللَّهُ لَا يَهْدِي" بول کر اسی فعل کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں ایک مرتبہ "كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ" کا جملہ استعمال ہوا ہے پھر اس کے بعد اگلی آیت میں "إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ" میں دوبارہ اسی جملہ کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں دو تکرار واقع ہوئے ہیں۔ یہ دونوں تکرار کفار کی شناعت میں مبالغہ لانے کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ (٩٠)﴾

ترجمہ: (اس کے برخلاف) جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ ایسے لوگ راستے سے بالکل ہی بھٹک چکے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کے لفظِ "كَفَرُوا" اور "كُفْرًا" کے درمیان "جناس مغائر"

موجود ہے۔ ❶ یہاں ''کَفَرُوْا'' فعل ہے اور ''کُفْرًا'' اسم۔ یہ دونوں الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، چونکہ الگ الگ نوع کے ان دونوں کلمے میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں ''جناس مغائر'' موجود ہے۔

﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ (۹۰)﴾

اس جملہ میں ''أُولَئِکَ'' مبتداء اور ''الضَّالُّونَ'' خبر ہے۔ ان دونوں کے درمیان ''ھم'' ضمیر لائی گئی ہے، یہ ضمیر اس لئے لائی گئی تا کہ آیت کے مفہوم و معنی میں تاکید حاصل ہو، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کے بعد کفر کر جائے اور ان کا کفر بڑھتا ہی چلا جائے اور اپنے کفر سے توبہ بھی نہ کرے تو وہ یقینی طور پر گمراہی میں ہیں۔

﴿فَاشْهَدُوْا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ (۸۱) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوْا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ (۹۰)﴾

یہاں پہلے جملہ کے لفظِ ''اشْهَدُوْا'' اور ''الشَّاهِدِينَ'' کے درمیان ''جناس اشتقاق'' پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''اشْهَدُوْا'' اور ''الشَّاهِدِينَ'' کا اصل مادہ اشتقاق ''شَهِدَ'' ہے اور ان کا اصل معنی (گواہی دینے) کے ہے۔ ان دونوں چیزوں میں چونکہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان میں ''جناس اشتقاق'' موجود ہے۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں لفظِ ''کَفَرُوْا'' اور ''کُفْرًا'' کا اصل مادہ اشتقاق ''کَفَرَ'' ہے، ان کا اصل معنی (انکار کرنے اور کفر کرنے) کے ہے۔ ان دونوں چیزوں میں چونکہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان دونوں میں بھی ''جناس اشتقاق'' پایا جاتا ہے۔

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو نوع کے کلموں میں جناس واقع ہو، یعنی اسم و فعل یا اسم و حرف یا حرف و فعل کے درمیان۔

❷ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمے اصل مادہ اشتقاق اور اصل معنی میں ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہو۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَى بِهِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۹۱)﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنایا اور کافر ہونے کی حالت میں مرے، ان میں سے کسی سے پوری زمین بھر کر سونا بھی قبول نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے اس کی پیشکش ہی کیوں نہ کرے۔ ان کو دردناک عذاب ہو کر رہے گا، اور ان کو کسی قسم کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔

اس آیتِ کریمہ میں "عَذَابٌ" کی صفت "مُؤلِمٌ" (اسم فاعل) کے بجائے مبالغہ کا صیغہ "فعیل" کے وزن پر "أَلِيمٌ" لایا گیا ہے، ایسا اس لئے کیا تا کہ عذاب کی سختی اور شدت کے مفہوم میں مبالغہ ہو۔

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۹۳)﴾

ترجمہ: تورات کے نازل ہونے سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں (جو مسلمانوں کے لئے حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لئے (بھی) حلال تھیں، سوائے اس چیز کے جو اسرائیل (یعنی یعقوب علیہ السلام) نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ (اے پیغمبر! یہودیوں سے) کہہ دو کہ "اگر تم سچے ہو تو تورات لے کر آ ؤ اور اس کی تلاوت کرو"۔

اس آیتِ کریمہ میں "فَأْتُوا" اور "فَاتْلُوا"، فعلِ امر کے صیغے ہیں۔ فعل امر اصل میں خود کو بڑھا سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنے کا نام ہے، مگر کبھی کبھی فعلِ امر اپنے اس اصل غرض کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ دوسرے اغراض و معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ان اغراض و معانی میں سے ایک معنیٰ "توبیخ" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فعلِ امر کو کسی کی قباحت بیان کرنے اور ڈانٹنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہاں بھی فعلِ امر اپنے اصل

معنی میں نہیں کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ یہود تورات میں یہ حکم نہیں دکھا سکتے، تو یہ فعلِ امر "توبیخ" کے لئے۔ "توبیخ" کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے یہودیوں تم بڑے نادان ہو، تم نے یہ جرات کیسے کی کہ تم ہر ہر چیز کو حرام کر بیٹھے۔ تمہارا یہ فعل بہت برا اور نازیبا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہود کا تہکم اور استہزاء کیا گیا ہے۔ تاکہ یہود کا جھوٹا اور مفتری ہونا سب کو معلوم ہو جائے، ان کے جھوٹے ہونے کے باوجود ان کو سچا کہنا یہ ان کے استہزاء کے لیے ہے۔

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ (٩٦)﴾

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا یقینی طور پر وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے (اور) بنانے کے وقت ہی سے برکتوں والا اور دنیا جہان کے لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔

اس آیت کریمہ میں بیت اللہ شریف کی عظمت وشرافت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ یہاں "لَلَّذِي بِبَكَّةَ" صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ یہ اصل میں "وُضِعَ لِلنَّاسِ لِلْبَيْتِ الَّذِي بِبَكَّةَ" تھا۔ اس میں سے "اَلْبَيْت" موصوف کو حذف کر دیا گیا ہے اور "لَلَّذِي" صفت کو اس موصوف کے قائم مقام کر دیا گیا ہے، جب کلام میں کسی چیز کو حذف کیا جاتا ہے تو اس سے کبھی شئی کی فخامت وعظمت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی موصوف کو حذف کر کے بیت اللہ کی عظمت وفخامت کا اظہار کیا گیا ہے، گویا بیت اللہ شریف اتنا عظیم الشان ہے کہ ادب کی وجہ سے اس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (٩٧)﴾

ترجمہ: اس میں روشن نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے، اور جو اس میں داخل ہوتا ہے امن پا جاتا ہے۔ اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے، اور اگر کوئی انکار کرے تو اللہ دنیا جہان کے تمام لوگوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیت کریمہ میں بلاغت کے کئی نکات پائے جاتے ہیں:

نمبر۱: حج کی فرضیت اور وجوب کی وضاحت کے لئے "حِجُّ الْبَيْتِ" کا لفظ لایا گیا ہے جو خبر کا صیغہ ہے۔ وجوب کو بتانے کے لئے قیاساً فعلِ امر کا صیغہ استعمال ہوا کرتا ہے، مگر یہاں تاکید کے لئے خبر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو وجودِ فعل کی تحقق پر دلالت کرے۔ گویا حکم کے بعد اب اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔

نمبر۲: اسی طرح مذکورہ پورا جملہ، جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حج بیت اللہ لوگوں کے ذمہ اللہ تعالیٰ کا عظیم حق ہے اور اس حق کی ادائیگی بندوں پر لازم ہے۔

نمبر۳: اس آیت میں پہلے "عَلَى النَّاسِ" بول کر آیت کا حکم تمام لوگوں کے لئے عام کر دیا، پھر اس کے فوراً بعد "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" بول کر اس عام کی تخصیص کر دی کہ عام مسلمانوں پر حج فرض نہیں بلکہ ان مسلمانوں پر حج لازم ہے جن کے پاس حج کی استطاعت (حج کا پورا خرچہ، اور گھر واپس ہونے تک گھر والوں کا نان نفقہ) موجود ہو۔

نمبر۴: اس میں "**الایضاح بعد الإبهام**" یا بالفاظ دیگر "**التفصيل بعد الإجمال**" پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں پہلے "عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ" بول کر ابہام کیساتھ اجمالی طور پر تمام لوگوں کا ذکر کیا گیا، پھر اس کے بعد آگے آیت میں "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا"

(1) یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے کوئی مبہم شئی یا اجمالاً کوئی شئی ذکر کی جائے، پھر اس کے بعد اس مبہم کی وضاحت اور مجمل کی تفصیل لائی جائے۔

بول کراس ابہام کی وضاحت کردی کہ یہاں لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حج کی پوری استطاعت رکھتے ہوں۔اس تقریر سے واضح ہوا کہ آیت میں "**التفصیل بعد الاجمال یاالایضاح بعدالابھام**" موجود ہے۔

علاوہ ازیں اس آیتِ کریمہ میں وَمَنْ کَفَرَ"فَمَنْ لَمْ یَحُجّ"(جو حج نہ کرے) کے معنی میں ہے،مگر آیت میں "فَمَنْ لَمْ یَحُجّ" کی جگہ اس کی تعبیر "وَمَنْ کَفَرَ" سے کی گئی ہے۔ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ وجوب حج کی تاکید ہواور وجوب کے باوجود تارک حج پرسختی سے نکیر ہو۔

﴿**قُلْ یَاأَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَکْفُرُونَ بِآیَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَى مَا تَعْمَلُونَ(٩٨)قُلْ یَاأَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ(٩٩)وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (١٠١)**﴾

ترجمہ: کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب کا گواہ ہے۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اللہ کے راستے میں ٹیڑھ پیدا کرنے کی کوشش کر کے ایک مومن کے لیے اس میں کیوں رکاوٹ ڈالتے ہو جبکہ تم خود حقیقت حال کے گواہ ہو؟ جو کچھ تم کرر ہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔اور تم کیسے کفر اپناؤ گے جبکہ اللہ کی آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں اور اس کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے؟ اور (اللہ کی سنت یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کا سہارا مضبوطی سے تھام لے، وہ سیدھے راستے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

پہلی آیت کریمہ میں "لِمَ تَکْفُرُونَ" میں "لِمَ" دوسری آیت میں "لِمَ تَصُدُّونَ" میں "لِمَ" اسی طرح تیسری آیت میں "کَیْفَ" کے الفاظ حروف استفہام ہیں۔حروفِ استفہامیہ اصل میں اس لئے وضع ہوئے تا کہ کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔یہی

حروفِ استفہامیہ کی اصل غرض ہے، مگر کبھی کبھی حروفِ استفہامیہ اپنے اصل معنی کے لئے استعمال نہیں ہوتے بلکہ دوسرے اغراض اور معنوں میں استفہام استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے ایک معنی ''انکار'' کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہام کو کسی بات کی نفی کرنے یا انکار کرنے کے لئے استعمال کیا جائے ۔ ان تینوں آیتوں میں موجود حروف استفہامیہ بھی اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہ تینوں بھی ''انکار'' کے لئے ہیں۔ انکار کی صورت میں ''لِمَ تَكْفُرُونَ'' کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اہلِ کتاب تمہیں اللہ کی آیتوں کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ''لِمَ تَصُدُّونَ'' کا معنی یہ ہوگا کہ اے اہل کتاب تمہیں لوگوں کو اللہ کے دین سے نہیں روکنا چاہیے۔ اسی طرح ''كَيْفَ تَكْفُرُونَ'' کا معنی یہ ہوگا کہ ''اے اہلِ کتاب! تمہیں کفر نہیں کرنا چاہیے''۔

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَى مَا تَعْمَلُونَ (۹۸)قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ(۹۹)وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۰۱)يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۱۰۲)وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ الخ(۱۰۳)﴾

ان آیتوں میں متعدد مقامات میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں ایک مرتبہ ''يَا أَهْلَ الْكِتَابِ'' کہا گیا پھر اس کے بعد دوسری آیت میں ''قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ'' میں دوبارہ اسی جملہ کو دہرایا گیا ہے۔ اسی طرح پہلی آیت کے آخر میں

❶ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ، کلمہ یا حکم مکرر ذکر کیا جائے اور یہ تکرار کسی نہ کسی مقصد و غرض کے لیے ہوتا ہے۔

''عَلٰی مَا تعمَلُونَ'' میں ''مَا تعمَلُونَ'' کا ذکر ہوا، پھر دوسری آیت کے آخر میں ''عَمَّا تَعمَلُونَ'' بول کر دوبارہ اسی جملہ کو دہرایا گیا ہے۔اسی طرح یہاں تمام آیتوں میں تقریباً بار بار لفظِ ''اللہ'' کا ذکر ہوا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ یہاں متعدد مقامات میں ''تکرار'' موجود ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ اہلِ کتاب کی شناعت وقباحت میں تاکید ومبالغہ ہو۔

﴿یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنْ تُطِیعُوا فَرِیقًا مِنَ الَّذِینَ أُوتُوا الْکِتَابَ یَرُدُّوکُمْ بَعْدَ إِیمَانِکُمْ کَافِرِینَ (۱۰۰)وَکَیْفَ تَکْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَی عَلَیْکُمْ آیَاتُ اللَّهِ وَفِیکُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ یَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِیَ إِلَی صِرَاطٍ مُسْتَقِیمٍ (۱۰۱)﴾

یہاں پہلی آیت کے لفظِ ''آمَنُوا'' اور دوسری آیت کے لفظِ ''تَکْفُرُونَ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں آمَنُوا ''ایمان'' مصدر سے مشتق ہے۔ یہ بمعنی (ایمان لانے) کے ہے۔اور تَکْفُرُونَ ''کفراً'' مصدر سے مشتق ہے، یہ بمعنی (کفروانکار کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیات میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔اسی طرح ''هُدِیَ'' اور ''تَکْفُرُونَ'' کے معنوں میں بھی ''طباق'' موجود ہے۔ یہاں هُدِیَ ''هداية'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (ہدایت پانے) کے ہے۔اور تَکْفُرُونَ ''کفراً'' مصدر سے مشتق ہے، اور کفر میں (گمراہی کا) معنی موجود ہوتا ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان معنوں کو آیات میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔ یہاں پہلی آیت کریمہ میں دو ''مجاز مرسل'' واقع ہوئے ہیں۔❷

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

❷ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت ومسببیت، کلیت وجزئیت، حالیت ومحلیت، ما کان وما یکون، لزوم یا عموم وخصوص کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

نمبرا: یہاں ''یَاأَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوْا'' میں ''الَّذِینَ آمَنُوْا'' کا معنی (تمام ایمان لانے والے اشخاص وافراد) کے ہے، یہ لفظ کا حقیقی معنی ہے، مگر آیت میں یہ معنی مرادنہیں بلکہ اس سے مخصوص قبیلے مراد ہیں، اور وہ اوس وخزرج ہیں، یہی لفظ کا مجازی معنی بھی ہے۔ ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے، کیونکہ اس میں حقیقی معنی (تمام مؤمنین) عام ہے اور مجازی معنی (اوس وخزرج) خاص ہے، گویا آیت میں عام بول کر خاص مراد لیا گیا ہے، چونکہ ان دونوں معنوں میں علاقہ عموم وخصوص کا ہے، اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

نمبر۲: اسی طرح اس آیت کریمہ میں ''الَّذِینَ اُوتُوا الْکِتَابَ'' کا حقیقی معنی (تمام اہلِ کتاب) ہے، مگر آیت میں یہ معنی مرادنہیں بلکہ اس کا مجازی معنی مراد ہے، اور وہ مجازی معنی (کوئی ایک غیر معین یہودی یاشأس بن قیس) ہے۔ ان دونوں معنوں (تمام اہل کتاب اور غیر معین یہودی یاشأس بن قیس) میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، کیونکہ اس میں تمام اہلِ کتاب (کل) اور غیر معین یہودی یاشأس بن قیس (جزء) ہے، گویا آیت میں کل بول کر جزء مراد لیا گیا ہے۔ چونکہ آیت میں لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں موجود مجازات مرسلات کو سمجھنے کی غرض سے اس کا شان نزول ذکر کیا جاتا ہے۔ شان نزول میں غور کرنے سے ''مجاز مرسل'' شرح صدر کیساتھ سمجھ آجائیگا۔ شان نزول یہ ہے کہ شاس بن قیس یہودی عظیم کافر تھا، یہ مسلمانوں پر شدت سے طعن وتشنیع کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انصار کے دو مسلمان قبیلے اوس وخزرج کسی مجلس میں محو گفتگو تھے، زمانہ جاہلیت میں ان کی جو عداوت تھی اسلام کی برکت سے وہ ختم ہوگئی۔ یہ باتیں اس شخص کو ہضم نہ ہوئیں، وہ بھی اس مجلس میں جا بیٹھا اور اس نے اوس وخزرج کو وہ لڑائی یاد دلائی جو زمانہ جاہلیت میں اِن دو قبیلوں کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ وہ لڑائی ہے جو نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی بعثت سے ایک سو بیس (120) سال قبل پیش آئی اور اس میں قبیلہ اوس نے غلبہ پایا تھا۔ اس شخص نے اس جنگ میں کہے جانے والے کچھ غیرت کے اشعار کہے، جس سے دونوں قبیلوں میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی اور وہ لڑنے کے لئے فوراً تیار ہو گئے، ایک دوسرے پر غصہ کرنے لگے، اور وہ کہنے لگے کہ اب تو بس جنگ ہی جنگ ہوگی۔ دونوں قبیلوں کے چند لوگ جمع ہو گئے اور لڑنے کے قریب ہو گئے، یہ باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جا کر دوبارہ ان میں صلح کروادی۔ اس پر قرآن کی یہ آیت اتری ''یَـا أَیُّھَـا الَّـذِینَ آمَنُوا'' سے اوس وخزرج کو خطاب ہوا کہ تم اس شخص کی ہرگز پیروی نہ کرو۔ اس شانِ نزول سے واضح ہوا ہے کہ ''الَّـذِیـنَ آمَـنُوا'' کا مصداق اوس وخزرج ہیں اور ''الَّذِینَ أُوتُوا الْکِتَابَ'' کا مصداق شاس بن قیس ہے۔

﴿وَاعْتَـصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ إِذْ کُـنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَیْنَ قُلُوبِکُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلَی شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَکُمْ مِنْهَا کَذَلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ آیَاتِهِ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُونَ (۱۰۳)﴾

ترجمہ: اور اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، اور اللہ نے تم پر جو انعام کیا ہے اُسے یاد رکھو کہ ایک وقت تھا جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ نے تمہیں اس سے نجات عطا فرمائی۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں کھول کھول کر واضح کرتا ہے، تاکہ تم راہ راست پر آجاؤ۔

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾

اس جملہ میں ''استعارة تصریحیة وأصلیة'' پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں دین یا قرآن کو رسی سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں دین یا قرآن ''مشبه'' ہے اور رسی ''مشبه به''

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

ہے۔ان دونوں میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح رسی کو کسی مقام پر باندھ کر مقصود تک پہنچا جاتا ہے، اسی طرح دین یا قرآن کے ذریعہ منزل مقصود تک کامیابی کیساتھ پہنچا جاتا ہے۔اس لئے آیت میں ان دونوں کے درمیان تشبیہ واقع ہوئی ہے، چونکہ ''بِحَبْلِ اللّٰہِ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔ اسی طرح آیت میں ''استعارۃ أصلیۃ'' بھی موجود ہے۔❶ یہاں ''حَبْل'' کا لفظ غیر مشتق ہے، چونکہ اس غیر مشتق میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے آیت میں ''استعارۃ أصلیۃ'' موجود ہے۔اسی طرح آیت میں ''استعارۃ ترشیحیہ''بھی پایا جاتا ہے۔❷ اس آیت میں رسی ''مشبہ بہ'' ہے۔آیت میں چونکہ مشبہ بہ کے ایک مناسب (مضبوطی) کو ''وَاعْتَصِمُوْا'' سے ذکر کردیا گیا ہے،اس لئے اس میں ''استعارۃ ترشیحیۃ'' موجود ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا﴾

اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ وتبعیۃ'' پائے جاتے ہیں۔یہاں بھروسہ کرنے یا اعتماد رکھنے کو''اعْتِصام'' (پکڑنے) سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں بھروسہ کرنا یا اعتماد رکھنا ''مشبہ'' اور پکڑنا ''مشبہ بہ'' ہے۔آیت میں چونکہ ''وَاعْتَصِمُوْا'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کردی گئی ہے،اس لئے اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔اس طرح اس میں ''استعارۃ تبعیۃ'' بھی موجود ہے۔❸ یہاں ''وَاعْتَصِمُوْا'' فعل مشتق ہے۔ اس میں چونکہ استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے اس میں ''استعارۃ تبعیۃ'' پایا جاتا ہے۔

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾

---

❶ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جو جامد یعنی اسمائے غیر مشتقات میں واقع ہو۔

❷ استعارہ ترشیحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کے کسی مناسب کو ذکر کیا جائے۔

❸ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

اس آیت کریمہ میں ''استعارۃ تمثیلیۃ'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں اوس وخزرج کے زمانہ جاہلیت کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی گہرے گڑے کے کنارے پر کھڑا گرنے والا ہو۔ یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب حالت سے تشبیہ اور مثال ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تمثیلیۃ'' پایا جاتا ہے۔

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۰۴)﴾

ترجمہ: اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں، اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ''يَدْعُونَ'' کے بعد ''النَّاس'' کا لفظ، ''يَأْمُرُونَ'' اور ''وَيَنْهَوْنَ'' کے بعد ''هم'' ضمیر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اصل میں ''يَدْعُونَ النَّاسَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ'' تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے اور انہیں نیکی کرنے کا اور برائی سے روکنے کا حکم کرے۔ اس آیت میں چونکہ ''النَّاس'' اور ''هم'' ضمیر حذف کر دیئے گئے ہے، اس لئے آیت میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔ یہ ایجاز حذف اس لئے واقع ہوا کیونکہ محذوف کا پتہ خود بخود چل جاتا ہے، اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے، نیز عمومیت کے فائدے کے پیش نظر بھی یہ حذف واقع ہوا ہے۔

❶ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت کی مثال اور تشبیہ دوسری مرکب حالت سے دی جائے۔

❷ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام سے کوئی جملہ، کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں اس محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

اس آیت کریمہ میں ”عطف الخاص علی العام“ پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلے ”يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ“ میں ”دعوت الی الخیر“ کا ذکر کیا گیا۔ یہ عام ہے کیونکہ اس میں خیر کے کاموں کی طرف دعوت دینے کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے بعد آیت میں آگے ”واو“ عاطفہ کے ذریعہ ”وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ“ بول کر گذشتہ عام میں داخل دو خاص کا عطف اسی عام پر کر دیا گیا، وہ دو خاص امور یہ ہیں:

نمبر۱: نیکی کا حکم۔

نمبر۲: برائی سے روکنا۔ یہاں عام (تمام بھلائیوں کی دعوت) پر خاص (نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا) کا عطف اس لئے ہوا تا کہ ان دونوں خاص امور کو تمام اعمالِ خیر پر فضیلت دی جائے۔

اس آیت میں ”مقابلة“ پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ”يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ“ میں دو امور بیان ہوئے ہیں:

نمبر۱: امر کرنا، حکم کرنا۔

نمبر۲: نیکی اور بھلائی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق معانی ہیں اور یہ موافق بایں معنی ہے کہ ان میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔ آیت میں ان موافق معنوں کو بیان کرنے کے بعد بالترتیب ان میں سے ہر ایک کی ضد لائی گئی۔ ”يَأْمُرُونَ“ کی ضد ”وَيَنْهَوْنَ“ سے بیان کی گئی ہے، اور ”الْمَعْرُوف“ کی ضد ”الْمُنكَر“ سے بیان کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ

---

❶ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے عام شئی کو ذکر کیا جائے، پھر اس کے بعد اس عام میں داخل خاص کا عطف اس عام پر کر دیا جائے۔ اور یہ کسی خاص مقصد وغرض کے تحت ہوتا ہے۔

❷ مقابلہ یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو موافق معنوں کو بیان کیا جائے، پھر بالترتیب ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کی ضد ذکر کی جائے۔ واضح رہے کہ یہاں موافق معنوں سے مراد وہ امور ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

اس آیت میں ”مقابلة“ پایا جاتا ہے۔

﴿وَأُولَئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

اس جملہ میں ”هـم“، ضمیر قصر کے لئے ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں صفت فلاح کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دینے والوں کے ساتھ مختص کر دیا گیا ہے، گویا صفت فلاح انہی میں پائی جاتی ہے کسی اور میں نہیں۔ ”قصر الصفة علی الموصوف“ کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ”یہی لوگ کامیاب ہے کوئی اور نہیں“۔

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (١٠٦) وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (١٠٧)﴾

ترجمہ: اس دن جب کچھ چہرے چمکتے ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ پڑ جائیں گے۔ چنانچہ جن لوگوں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کرلیا؟ لو پھر اب مزہ چکھو اس عذاب کا، کیونکہ تم کفر کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف جن لوگوں کے چہرے چمکتے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں جگہ پائیں گے، وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیاتِ کریمہ میں ”التفصيل بعد الاجمال“ پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ”يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ“ میں اجمالی طور پر دو طرح کے چہروں کا بیان ہوا، ایک روشن اور سفید چہرہ، دوسرا سیاہ اور بدنما چہرہ، مگر اس کی کوئی تفصیل نہیں ہوئی کہ کون سا چہرہ

❶ قصر کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک قسم ”قصر الصفة علی الموصوف“ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ صفت کو ایک ہی موصوف کیساتھ مختص کر دیا جائے، وہ صفت کسی دوسرے موصوف میں نہ پائی جائے۔

❷ یہ اطناب کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے کوئی مجمل شئ بیان کی جائے، پھر اس کے بعد اس مجمل شئ کی تفصیل بیان کی جائے۔

کس کا ہے؟ آیت میں ان چہروں کا ذکر اجمالاً کرنے کے بعد آگے ''فَأَمَّا الَّذِینَ اسْوَدَّتْ وُجُوھُھُمْ'' اور ''وَأَمَّا الَّذِینَ ابْیَضَّتْ وُجُوھُھُمْ'' سے اس مجمل کی تفصیل بیان کی گئی کہ سیاہ اور بدنما چہرہ کافر کا ہوگا اور روشن وسفید چہرہ اہل ایمان کا ہوگا، سیاہ چہرے والے جہنم میں ہونگے اور روشن چہرے والے رب کی رحمت (جنت) میں ہونگے۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ آیت میں ''التفصیل بعد الاجمال'' موجود ہے۔ یہاں اجمال کے بعد جب تفصیل کا موقع آیا تو ابتداء میں ''فَأَمَّا الَّذِینَ اسْوَدَّت'' بول کر کفار کی حالت کا ذکر ''وَأَمَّا الَّذِینَ ابْیَضَّتْ وُجُوھُھُمْ'' پر یعنی ایمان والوں کی حالت پر مقدم کیا گیا ہے، حالانکہ اجمال ''یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوہٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوہٌ'' میں روشن چہروں کا ذکر مقدم ہوا ہے۔ تفصیل میں اجمال کی طرح اہل ایمان کو مقدم کرنے کے بجائے اہل کفر کو مقدم اس لئے کیا کیونکہ یہ مقام مقام تحذیر ہے، یعنی اس مقام میں کفار کی حالت کی تشبیہ سے مسلمانوں کو ڈرانا مقصود ہے، اس مقصد کو جلدی حاصل کرنے کے لئے تفصیل میں اہلِ کفر کی حالت کو مقدم کیا گیا۔ اسی طرح تفصیل میں اہل کفر کی حالت کو مقدم اور اہل ایمان کی حالت مؤخر کرنے سے ایک فائدہ اور حاصل ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اجمال میں ابتداء اہلِ ایمان کے ذکر سے ہوئی تھی جو حسنِ ابتدا کی دلیل ہے اور تفصیل میں اہل کفر کے ذکر کو مقدم اور اہل ایمان کو مؤخر کر کے انتہاء بھی اہلِ ایمان کے ذکر سے کی گئی ہے جو حسنِ انتہاء کی دلیل ہے۔ اگر تفصیل میں اہل ایمان کا ذکر پہلے اور اہلِ کفر کا ذکر بعد میں ہوتا تو یہ بہترین نکتہ یعنی حسنِ ابتداء اور حسن انتہاء حاصل نہ ہوتا۔

یہاں لفظ ''تَبْیَضُّ'' اور ''تَسْوَدُّ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں تَبْیَضُّ ''اِبْیَاضٌ'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (سفید ہونے) کے ہے اور تَسْوَدُّ ''اِسْوِدَادٌ'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (سیاہ ہونے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک

(1) طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ آیت میں ان دونوں مقابل معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت کا لفظ أَكَفَرْتُمْ ''كُفْرًا'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (انکار اور کفر کرنے) کے ہے اور ''إِيمَانِكُمْ'' میں لفظ ''اِيمَان'' کا معنی (ایمان لانے اور ماننے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

یہاں پہلی آیت میں ''تلوين الخطاب'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں ''فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ'' کے بجائے ''وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ'' کی طرح ''فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي النَّارِ'' کا انداز اپنانا چاہیے تھا، مگر آیت میں اس انداز سے کلام کو ''أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ'' کے اسلوب و انداز کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''تلوين الخطاب'' موجود ہے۔

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ (١٠٦) وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ (١٠٧)﴾

ان آیاتِ کریمہ میں ''فَأَمَّا'' اور ''أَمَّا'' دونوں حرف تفصیل ہے۔ ''يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ'' میں جو اجمال تھا، ''فَأَمَّا'' اور ''أَمَّا'' سے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہاں پہلی آیت کریمہ میں ''استعارة تصريحية'' اور ''تبعية'' پائے جاتے ہیں۔ ❷ یہاں ہنس مکھ ہونے کو سفید ہونے سے اور غمگین وغمزدہ ہونے کو سیاہ ہونے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں ہنس مکھ ہونا ''مشبه'' اور سفید ہونا ''مشبه به'' ہے۔ اسی طرح غمزدہ ہونا ''مشبه'' اور سیاہ ہونا ''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ دونوں مشبہ بہ کی صراحت ''تَبْيَضُّ''

---

❶ تلوین الخطاب کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو ایک انداز سے دوسرے انداز کی طرف منتقل کر دیا جائے۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

اور ''تَسْوَدُّ'' (سفید اور سیاہ ہونا) بول کر لفظوں میں کر دی گئی ہیں، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔ اس آیت میں ''استعارۃ تبعیۃ'' بھی موجود ہے۔ ❶ یہاں ''تَبْیَضُّ'' اور ''تَسْوَدُّ'' فعل مشتق ہیں، چونکہ ان دونوں میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تبعیۃ'' پایا جاتا ہے۔

﴿ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (١٠٦) ﴾

اس آیت کریمہ کے لفظ ''کَفَرْتُمْ'' اور لفظِ ''تَکْفُرُوْنَ'' کے درمیان ''جناس مماثل'' پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''کَفَرْتُمْ'' اور ''تَکْفُرُوْنَ'' دونوں فعل ہیں اور دونوں فعل ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک نوع کے ان دونوں کلموں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

اس جملہ میں ''استعارۃ مکنیۃ'' اور ''تخییلیۃ'' پائے جاتے ہیں۔ ❸ یہاں ''الْعَذَابَ'' کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا ادراک چکھ کر کیا جاتا ہو۔ اس استعارہ میں عذاب ''مشبہ'' اور چکھ کر ادراک ہونے والی چیز ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں مشبہ بہ (چکھ کر معلوم ہونے والی چیز) مذکور نہیں اور ''الْعَذَابَ'' مذکور ہے، البتہ ''فَذُوْقُوْا'' بول کر ''مشبہ'' کے ایک لازم (چکھنے) کو ذکر کر کے ''مشبہ بہ'' (چکھ کر معلوم ہونے والی چیز) کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ مکنیۃ'' موجود ہے۔ اس میں چونکہ ''مشبہ

---

❶ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❷ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں کے درمیان۔

❸ استعارہ مکنیہ یہ ہے کہ مشبہ بہ محذوف ہو اور مشبہ مذکور ہو، البتہ مشبہ بہ کے کسی لازم کو ذکر کر کے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے، اور اگر مشبہ بہ کے اس لازم کو مشبہ کے لئے ثابت کر دیا جائے تو اسے اصطلاحِ بلاغت میں ''استعارۃ تخییلیۃ'' کہا جاتا ہے۔

به'' کے لازم (چکھنے) کو''مشبہ''(الْعَذَابَ) کے لئے مفعول بنا کر ثابت کیا گیا ہے،اس لئے آیت میں ''استعارة تخيلية'' بھی موجود ہے۔

﴿فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

یہ آیتِ کریمہ اہل ایمان کے حق میں ہے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان ہمیشہ اللہ کی رحمت (جنت) میں ہونگے۔اس میں ''رَحْمَةِ اللَّهِ'' اسم ظاہر ہے،آیت میں اس اسمِ ظاہر کے بعد ''فِيهَا''،بول کراس اسم ظاہر کی ضمیر لائی گئی ہے۔ایسا اس لئے کیا تا کہ اسم ضمیر ''ها'' کے ذریعہ اسم ظاہر ''رَحْمَةِ اللَّهِ''کی تا کید ہو سکے۔

اس آیت کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''رَحْمَت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے،اس کا حقیقی معنی (رحمت) کے ہے،مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ لفظِ ''رَحْمَت'' سے اس کا مجازی معنی مراد ہے اور وہ مجازی معنی (جنت) کے ہے۔ان دونوں معنوں (رحمت اور جنت) کے درمیان علاقہ حالیت،محلیت کا ہے،کیونکہ رحمت حال اور جنت اس کا محل ہے،گویا آیت میں حال (رحمت) بول کر محل (جنت) مراد لیا گیا ہے،چونکہ آیت کے اس لفظ کے حقیقی معنی اور مجازی معنی میں علاقہ حالیت اور محلیت کا ہے،اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

﴿تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ(١٠٨)﴾

اس آیت کریمہ کے لفظِ ''الْحَقِّ'' اور لفظِ ''ظُلْمًا'' کے معنوں میں ''طباق'' موجود ہے۔یہاں ''الْحَقِّ'' بمعنی (انصاف وعدل) کے ہے اور ''ظُلْمًا'' بمعنی (ظلم وستم) کے

❶ مجاز مرسل وہ مجاز ہے ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت ومسببیت،کلیت وجزئیت،حالیت ومحلیت،ما کان وما یکون علیہ،یا عموم وخصوص کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''تِلْکَ'' اسمِ اشارہ استعمال ہوا ہے۔ اسمِ اشارہ کئی اغراض ومقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے، ان میں سے ایک غرض مشارالیہ کی عظمتِ شان کو بیان کرنا ہے۔ یہاں بھی ''تِلْکَ'' اسمِ اشارہ لاکر اللہ سبحانہ کی آیتوں کی عظمتِ شان کو بیان کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں بہت ہی عظیم الشان ہیں جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ ''التفات من الغیبة إلی التکلم'' واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں ''تِلْکَ آیَاتُ اللَّهِ'' میں لفظِ ''اللَّه'' استعمال ہوا ہے، یہ لفظ اسم ظاہر ہے اور اسم ظاہر الفاظ غائب کے قبیل میں سے ہے۔ اس لحاظ سے آگے آیت میں ''نَتْلُوهَا'' کی جگہ ''یَتْلُوهَا'' بول کر غائب کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی جگہ ''نَتْلُوهَا'' متکلم کا صیغہ لایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت کریمہ میں ''التفات من الغیبة إلی التکلم'' واقع ہوا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ اللہ سبحانہ کی عظمت شان وکبریائی پر دلالت ہو۔

﴿تِلْکَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْکَ بِالْحَقِّ وَمَا اللهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ(۱۰۸) وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۱۰۹)﴾

ان آیتوں میں اور ان سے پہلے اور بعد والی آیتوں میں لفظِ ''اللّٰہ'' کا ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں بھی ان آیتوں میں بار بار لفظِ ''اللّٰہ'' کا ذکر ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان

---

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو الفاظ غائب کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں غائب کی جگہ تکلم کے الفاظ ذکر کردیئے جائے۔

❷ تکرار اطناب کی ایک صورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں کوئی جملہ، کلمہ یا حکم مکرر ذکر کیا جائے، اور یہ کسی مقصد وغرض کے لیے ہوتا ہے۔

آیتوں میں لفظِ ''اللہ'' کا''تـکـرار'' پایا جاتا ہے۔یہ تکرار اس لئے ہوا کیونکہ یہ جملے متغائرالمعنی ہیں۔جب جملے متغائرالمعنی ہوتو عرب والوں کا قانون اس بارے میں یہ ہے کہ وہ کسی لفظ کے لئے ضمیر کی جگہ اسی لفظ کو اسم ظاہر کی صورت میں مکرر ذکر کرتے ہیں، کیونکہ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کرنے میں اس شئی کی عظمت وفخامت بیان ہوتی ہے، یہاں بھی جملہ متغائرالمعنی ہیں،اس لئے ان آیتوں میں بھی اسم ظاہر لفظِ ''الـلّٰـہ'' کا''تـکـرار'' ہوا، تاکہ آیات، عدل وانصاف، بادشاہات اور معاد کے مضمون کو عظمتِ شان اور تاکید کے ساتھ بیان کیا جائے۔

﴿لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ (۱۱۳)﴾

ترجمہ: (لیکن) سارے اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں، اہل کتاب ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو (راہ راست پر) قائم ہیں، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں اور جو (اللہ کے آگے) سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں''لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ'' میں''مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ'' کا جملہ، جملہ اسمیہ ہے۔یہ جملہ اسمیہ کی صورت میں اس لئے لایا گیا تاکہ تمام اہلِ کتاب کے برابر نہ ہونے کے معنی میں استمرار پر دلالت ہو۔اسی طرح اس آیت میں''يَتْلُوْنَ'' اور''يَسْجُدُوْنَ'' جملہ فعلیہ لائے گئے ہیں، یہ دونوں جملہ فعلیہ اس لئے لائے گئے ہے تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ اہلِ کتاب کے نیک لوگوں کی تلاوت اور عبادت میں ہر دن تجدد ہوتا ہے، اور یہ عبادت استمرار سے جاری تھی۔

﴿يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (۱۱۴)﴾

ترجمہ: یہ لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اچھائی کی تلقین کرتے

اور برائی سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں کی طرف لپکتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار صالحین میں سے ہے۔

یہ آیت کریمہ ان اہلِ کتاب کے اوصاف میں اتری جنہوں نے ایمان قبول کیا ہیں اور یہودیت یا نصرانیت سے توبہ کی۔ اس آیت میں "أُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ" میں "أُولَئِكَ" اسم اشارہ بعید کا لایا گیا ہے۔ اس لئے تا کہ اہلِ کتاب میں سے مذکورہ اوصاف کے حاملین کی بلندی مرتبہ اور ان کے منزلت کی رفعت کو بیان کیا جائے، مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کا مقام بہت عظیم الشان اور بلند و بالا ہے۔

﴿يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۱۱۴)﴾

اس آیت کریمہ میں "الاكتفاء" موجود ہے۔ ❶ یہاں ایمان باللہ اور ایمان آخرت کا ذکر ہوا ہے، باقی ایمانیات یعنی "إيمان على الرسول" اور "إيمان على الملائكة" وغیرہ کا مفہوم ایمان باللہ اور ایمان آخرت سے خود بخود پتہ چل جاتا ہے، اس لئے آیت میں باقی ایمانیات کو ایمان باللہ اور ایمان آخرت پر اکتفاء کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "الاكتفاء" موجود ہے۔

﴿وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۱۱۴) إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا (۱۲۰)﴾

ان دونوں آیات مبارکہ میں "مقابلة" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں پہلی آیت میں "يَأْمُرُونَ

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص کلام میں کچھ ضروری اشیاء کو ذکر کیا جائے، باقی ضروری اشیاء کو مذکور پر کفایت کرتے ہوئے ذکر نہ کیا جائے، یہ اس وقت ہوگا جب مذکور میں باقی محذوف پر دلالت پائی جائے۔

❷ مقابلہ محسنات معنویہ کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو موافق معنوں کو بیان کیا جائے، پھر بالترتیب ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کی ضد لائی جائے۔ یہاں موافق معنوں سے مراد وہ امور ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

بِالْمَعْرُوفِ“ میں دو موافق معانی بیان ہوئے ہیں:

نمبر۱: ”یَأْمُرُونَ“ میں امر دینے اور حکم دینے کا بیان ہوا۔

نمبر۲: ”بِالْمَعْرُوفِ“ میں نیکی کا بیان ہوا۔ یہ دونوں موافق بایں معنی ہے کہ ان میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔ آیت میں ان موافق معنوں کو بیان کرنے کے بعد بالترتیب ان کی ضد لائی گئی ہے۔ امر وحکم دینے کی ضد کو ”وَیَنْهَوْنَ“ سے بیان کیا گیا، پھر ”بِالْمَعْرُوفِ“ یعنی نیکی کی ضد (بدی) کا ذکر ”الْمُنْكَرِ“ بول کر کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ”مقابلة“ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی ”مقابلة“ پایا جاتا ہے۔ تطبیق یہ ہے کہ اس آیت میں ”إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ“ میں دو معانی بیان ہوئے ہیں:

نمبر۱: ”إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ“ میں مسلمانوں کو ملنے والی اچھائی کا ذکر ہو۔

نمبر۲: ”تَسُؤْهُمْ“ میں کافروں کی ناپسندیدگی کا ذکر ہوا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق معانی ہیں، اس طور پر کہ ان میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔

آیت میں ان موافق معنوں کو بیان کرنے کے بعد بالترتیب ان کی ضد لائی گئی، مسلمانوں کو ملنے والی اچھائی کی ضد (برائی) کا ذکر ”إِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ“ سے کیا گیا اور کافروں کی ناپسندیدگی کی ضد (کافروں کی خوشی) کا ذکر ”يَفْرَحُوا بِهَا“ سے کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ دوسری آیت میں بھی ”مقابلة“ موجود ہے۔

﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (۱۱۵) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۱۶)﴾

یہاں پہلی آیت کریمہ میں ”وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ“ میں اللہ تعالیٰ کے علم کے عنوان کے ساتھ بالخصوص اہل تقویٰ کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ اللہ سبحانہ کا علم متقی اور غیر متقی

دونوں پر یکساں طور پر محیط ہے، مگر چونکہ تقوی داروں کا مقام ومرتبہ بہت بلند وبالا ہے، اس لئے آیت میں غیر متقی کو چھوڑ کر متقی کی تخصیص کی گئی ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں کافروں کے لئے ''أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ'' بول کر صرف مال اور اولاد کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ کافروں کو صرف یہی نہیں بلکہ کوئی چیز فائدہ نہ دے گی، مگر آیت میں دوسرے چیزوں کا ذکر چھوڑ کر بالخصوص مال ودولت کا ذکر اس لئے کیا کہ انسانوں کو تمام چیزوں میں یہ دونوں چیزیں سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۱۶)﴾

ترجمہ: (اس کے برعکس) جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، اللہ کے مقابلے میں نہ ان کے مال ان کے کچھ کام آئیں گے، نہ اولاد، وہ دوزخی لوگ ہیں، اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں متعدد مقامات میں چونکہ بار بار ''ھم'' ضمیر کا ذکر ہوا ہے، اس لئے اس میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تاکہ کافروں کی شناعت، مال واولاد کا عدمِ نفع اور ان کے جہنمی ہونے کو تاکید کے ساتھ بیان کیا جائے۔

﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللهُ وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۱۷)﴾

ترجمہ: جو کچھ یہ لوگ دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سخت سردی والی تیز ہوا ہو جو ان لوگوں کی کھیتی کو جا لگے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہو اور وہ اس کھیتی کو برباد کر دے۔ ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔

❶ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ، کلمہ یا حکم مکرر ذکر کیا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں "تشبیہ تمثیل" پائی جاتی ہے۔ ❶ یہاں کافر مفاخراور گھمنڈ میں آکر جو مال خرچ کرتے اور اس مال کے بدلہ میں جو اعزاز وتعریف حاصل کرتے تھے ان کو ایسے کھیتی سے تشبیہ دی گئی جس میں تیز ٹھنڈی ہوا آکر اسے تباہ وبرباد کردے، بالکل یہی حالت کافروں کے خرچ کردہ مال اور اس پر حاصل ہونے والے منافع کی ہے۔ ان میں وجہ شبہ (تباہی کی حالت) متعدد امور یعنی ہوا، سردی، کھیتی وغیرہ سے کشید ہے، اس لئے آیت میں "تشبیہ تمثیل" موجود ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظِ "ظَلَمَ" اور "یَظْلِمُوْنَ" کے درمیان "جناس مماثل" پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں "ظَلَمَ" اور "یَظْلِمُوْنَ" دونوں فعل ہیں، اور دونوں ایک نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک نوع کے ان دونوں کلموں میں جناس واقع ہوا ہے۔ اس لئے ان میں "جناس مماثل" موجود ہے۔

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا یَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْآیَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (۱۱۸)﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے سے باہر کے کسی شخص کو رازدار نہ بناؤ، یہ لوگ تمہاری بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم تکلیف اٹھاؤ، بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ (عداوت) ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے پتے کی باتیں تمہیں کھول کھول کر بتا دی ہیں، بشرطیکہ تم سمجھ سے کام لو۔

---

❶ تشبیہ تمثیل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ متعدد امور سے کشید ہو۔

❷ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے دو کلموں میں جناس پایا جاتا ہے، یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں کے درمیان۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصریحیة" اور "أصلیة" پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں قلبی دوست کو کپڑے کے استر اور بنیان وغیرہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ "بطانة" وہ کپڑا ہوتا ہے جو بالکل جسم کے ساتھ مَس ہوتا ہے۔ اس استعارہ میں مخلص دوست "مشبه" ہے اور کپڑے کا استر "مشبه به" ہے۔ ان دونوں میں وجہ شبہ شدت میلاپ ہے، یعنی جس طرح یہ جسم کے نہایت قریب ہوتا ہے اسی طرح قلبی دوست بھی انسان کے نہایت قریب ہوتا ہے۔ آیت میں اسی وجہ شبہ کی بنیاد پر مذکورہ استعارہ واقعہ ہوا ہے، اس میں چونکہ "بِطَانَةً" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصریحیه" موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت میں "استعارة أصلیة" بھی موجود ہے۔ ❷ یہاں لفظِ "بِطَانَةً" غیر مشتق ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة أصلیة" موجود ہے۔

اس آیت کریمہ میں "مجاز مرسل" پایا جاتا ہے۔ یہاں "أَفْوَاهِ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا معنی حقیقی (منہ) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں، اس لیے کہ (منہ) سے حسد کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ زبان سے ہوتا ہے۔ اس لئے آیت میں "أَفْوَاهِ" سے زبان مراد لیا جائے گا، جو اس لفظ کا مجازی معنی ہے۔ ان دونوں معنوں میں علاقہ حالیت، محلیت کا ہے، کیونکہ منہ محل اور زبان حال ہے۔ آیت میں گویا محل (منہ) بول کر حال (زبان) مراد لیا گیا ہے، چونکہ آیت کے اس لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ حالیت، محلیت کا ہے، اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿هَا أَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جو جامد یعنی غیر مشتقات میں واقع ہو۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۱۱۹)﴾

ترجمہ: دیکھو تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، اور تم تو تمام (آسمانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، اور (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (قرآن پر) ایمان لے آئے، اور جب تنہائی میں جاتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے کے مارے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔ (ان سے) کہہ دو کہ اپنے غصے میں خود مرو، اللہ سینوں میں چھپی ہوئی باتیں خوب جانتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں "استعارة تصريحية" اور "تبعية" پائے جاتے ہیں۔❶ یہاں مسلمانوں سے عداوت وبغض کے اظہار کرنے کو انگلیوں کے پوروں کو دانتوں سے کاٹنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں سے عداوت کا اظہار کرنا "مشبه" ہے اور دانتوں سے پورے چبانا "مشبه به" ہے۔ آیت میں چونکہ "عَضُّوا" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں "استعارة تبعية" بھی پایا جاتا ہے۔❷ یہاں "عَضُّوا" فعل مشتق ہے، اور اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تبعية" موجود ہے۔

﴿إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۱۲۰)﴾

ترجمہ: اگر تمہیں کوئی بھلائی مل جائے تو ان کو برا لگتا ہے، اور اگر تمہیں کوئی گزند پہنچے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں، اگر تم صبر اور تقوی سے کام لو تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کے (علم اور قدرت کے) احاطے میں ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔ یہاں اچھائی یا برائی

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

کے حصول کو چھونے یا پہنچنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں اچھائی یا برائی کا حصول ''مشبہ'' ہے اور چھونا یا پہنچنا ''مشبہ بہ'' ہے۔آیت میں چونکہ '' تَمۡسَسۡکُمۡ '' اور ''تُصِبۡکُمۡ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی،اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔یہ دراصل معقول شئی کی محسوس شئی سے تشبیہ ہے۔کیونکہ اچھائی یا برائی کا حاصل ہونا معقول شئی ہے اور چھونا یا پہنچنا محسوس اشیاء میں ہوتا ہے۔اس لئے آیت میں حصول کو چھونے یا پہنچنے سے تشبیہ دینا ''تشبیۃ المعقول بالمحسوس'' کے قبیل سے ہوگا۔

﴿وَإِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ أَهۡلِکَ تُبَوِّءُ الۡمُؤۡمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۱۲۱)﴾

ترجمہ:(اے پیغمبر!جنگ احد کا وہ وقت یاد کرو)جب تم صبح کے وقت اپنے گھر سے نکل کر مسلمانوں کو جنگ کے ٹھکانوں پر جما رہے تھے،اور اللہ سب کچھ سننے جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔یہاں ''أَهۡلِکَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے،اس کا حقیقی معنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے،اس میں تمام ازواجِ مطہرات شامل ہیں،تمام گھر والیوں پر اہل کا اطلاق ہوتا ہے،مگر جمہور مفسرین کے نزدیک آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس لفظ کا مجازی معنی مراد ہے،اور وہ مجازی معنی (بعض گھر والے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔)ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے۔پہلا معنی (معنی حقیقی)عام ہے،مجازی معنی خاص ہے،گویا آیت میں عام بول کر خاص مراد لیا گیا ہے۔چونکہ آیت کے اس لفظ کے حقیقی معنی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے،اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

﴿وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۱۲۱)وَعَلَى اللَّهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُونَ (۱۲۲) وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الۡأَرۡضِ يَغۡفِرُ لِمَنۡ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۲۹)

یہاں پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے اوصاف میں سے بالخصوص صفت ''سَمِیع'' اورصفت ''عَلِیم'' کا ذکر ہوا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے اور بھی بہت سے اوصاف ہے، مگر یہ مقام چونکہ معرکہ آرائی کا ہے اور معرکہ آرائی کے وقت رب سے دعا وغیرہ کی جاتی اور لوگوں کے دلوں کے کیفیات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ دعا کے مناسب (سماعت) ہے اور دلوں کے کیفیات کے مناسب (جاننا) ہے۔ آیت میں مقام کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے صفت ''سَمِیع'' اور ''عَلِیم'' لائی گئی جن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت انسانوں کی پکار کو سنتے ہیں اور دلوں کے حال کو جانتے ہیں۔

دوسرے جملہ ''فَلْیَتَوَکَّلِ'' ذکر کر کے بالخصوص اللہ پر توکل وبھروسہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ عبادت دعا، پکار، نصرت ومدد سب کچھ اللہ سے ہی ہوتا ہے، مگر چونکہ توکل کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے اور جنگ کے موقع پر بالخصوص اسباب پر نہیں بلکہ اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ ہونا چاہیے، اسی لئے آیت میں ''فَلْیَتَوَکَّلِ'' سے توکل کے حکم کی تخصیص ہوئی ہے۔

تیسرے جملہ میں اللہ سبحانہ کے بے شمار مخلوقات میں سے صرف ''السَّمَاوَاتِ'' اور ''الْأَرْض''، بول کر آسمان وزمین کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ اللہ سبحانہ کی بہت سی مخلوقات اور بھی ہیں، مگر چونکہ بظاہر تمام مخلوقات میں سے سب سے بڑے یہی دونوں ہیں، اس لئے آیت میں بالخصوص ان کا ذکر ہوا۔ اسی طرح تیسرے جملہ میں معافی تلافی کرنے اور عذاب دینے کیساتھ اللہ سبحانہ کا ذکر ہوا ہے کہ اللہ جس کو چاہے معاف کرے جس کو چاہے عذاب دے، حالانکہ معاف کرنا یا سزاء دینا وغیرہ دنیا کے بادشاہ بھی کرتے ہیں، مگر چونکہ معافی اور عذاب پر کامل قدرت اور مکمل اختیارات صرف اللہ رب العزت کے پاس ہیں، دنیا کے بادشاہ قوانین، حالات، اور ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے پابند ہوتے ہیں، جب کہ رب العالمین کسی چیز کے پابند نہیں، جس کو چاہیں معاف کریں اور جس کو چاہیں سزا دیں،

اس لئے آیت میں اللہ سبحانہ وتعالی کے ساتھ ان دونوں چیزوں کی تخصیص کی گئی ہے۔

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (١٢٦) لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ (١٢٧)﴾

ترجمہ: اللہ نے یہ سب انتظام صرف اس لئے کیا تھا تاکہ تمہیں خوشخبری ملے، اور اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان نصیب ہو، ورنہ فتح تو کسی اور کی طرف سے نہیں، صرف اللہ کے پاس سے آتی ہے جو مکمل اقتدار کا بھی مالک ہے، تمام تر حکمت کا بھی مالک۔ (اور جنگ بدر میں یہ مدد اللہ نے اس لئے کی) تاکہ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے ان کا ایک حصہ کاٹ کر رکھ دے، یا ان کو ایسی ذلت آمیز شکست دے کہ وہ نامراد ہو کر واپس چلے جائیں۔

یہاں ''وَلِتَطْمَئِنَّ'' میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔❶ اس میں دلوں سے خوف کے زائل ہونے اور دلوں کا دھڑکنے سے سکون پا لینے کو حرکت سے سکون کی طرف آنے والے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں دلوں سے خوف وغیرہ کا زائل ہونا ''مشبہ'' ہے اور اطمینان القلب والا شخص ''مشبـه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''وَلِتَطْمَئِنَّ'' ذکر کر کے مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی، اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

یہاں دوسری آیت میں ''لِيَقْطَعَ طَرَفًا'' میں ''استعارة تمثيلية'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں قتل ہونے والے شخص کے قتل ہونے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی حالت کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے اجزاء ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکے ہوں۔ یہ چونکہ ایک مرکب حالت کی دوسری مرکب سے تشبیہ اور مثال ہے، اس لئے آیت میں ''استعـارة تمثيلية'' موجود ہے۔

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

❷ استعارہ تمثیلیہ یہ ہے کہ ایک مرکب حالت کو دوسری مرکب حالت سے تشبیہ اور مثال دی جائے۔

اسی طرح یہاں دوسری آیت کے ’’فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ‘‘ میں بھی ’’استعارة تصريحية‘‘ موجود ہے۔ یہاں کافروں کو بغیر کامیابی وکامرانی اور بغیر مال غنیمت کے لوٹنے کو ایسے شخص کے امید لگانے سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی دوسرے شخص سے امید لگالے، مگر وہ دوسرا شخص اس کی امید پر پانی پھیردے اور ساری امید ختم کردے۔ اس میں کافروں کا بغیر کامیابی کے لوٹنا ’’مشبہ‘‘ اور کسی سے امید لگا کر امید کا پورا نہ ہونا ’’مشبہ بہ‘‘ ہے۔ آیت میں چونکہ ’’فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ‘‘ بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں ’’استعارة تصريحية‘‘ پایا جاتا ہے۔

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۲۹) وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۲۳)﴾

یہاں پہلے جملے کے لفظ ’’يَغْفِرُ‘‘ اور لفظ ’’يُعَذِّبُ‘‘ کے معنوں میں ’’طباق‘‘ پایا جاتا ہے۔❶ یہاں يَغْفِرُ ’’غفران‘‘ مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (گناہوں کی بخش کرنا) ہے۔ اور يُعَذِّبُ ’’تعذيباً‘‘ مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (گناہوں پر سزا دینا) ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ آیت میں ان مقابل معنوں کو جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں ’’طباق‘‘ موجود ہے۔ اسی طرح دوسرے جملہ کے لفظ ’’نَصَرَ‘‘ اور ’’أَذِلَّةٌ‘‘ کے معنوں میں ’’طباق‘‘ پایا جاتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ یہاں نَصَرَ ’’نصراً‘‘ مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (مدد ونصرت کرنے) کے ہے، مدد ونصرت کرنے میں (عزت واعزاز) داخل ہے۔ اور ’’أَذِلَّةٌ‘‘ کا معنی (ذلت) کے ہے۔ یہ دونوں معانی عزت وذلت ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ یہ دونوں معانی آیت میں جمع کردیئے گئے ہیں، اس لئے ان کے درمیان ’’طباق‘‘ موجود ہے۔

---

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

﴿إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۲۲) لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (۱۲۸)﴾

ترجمہ: جب تم میں سے دو گروہوں نے یہ سوچا تھا کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں، حالانکہ اللہ ان کا حامی و ناصر تھا، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ (اے پیغمبر) تمہیں اس فیصلے کا کوئی اختیار نہیں کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے کیونکہ یہ ظالم لوگ ہیں۔

یہاں پہلے جملے کے لفظِ ''تَفْشَلَا'' اور دوسرے جملہ کے لفظِ ''لَكَ'' میں ''مجاز'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلی آیت میں ''تَفْشَلَا'' تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور تثنیہ اصل میں دو افراد کے لئے وضع کیا گیا، مگر آیت میں یہ لفظ تثنیہ کے لئے نہیں، بلکہ جمع کے لئے ہے، اسی طرح دوسرے جملہ میں ''لَكَ'' میں ''لام'' استعمال ہوا ہے۔ یہ ''لام'' (کے لئے) کا معنی ادا کرنے کے لئے موضوع ہے، مگر یہاں یہ لفظ اس معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہ ''علی'' (پر) یا ''إلی'' (کی طرف) کے معنی میں ہے۔ ان دونوں میں چونکہ الفاظ اصل معنی سے ہٹ کر دوسرے معنی کے لے استعمال ہوئے ہیں، اس لئے ان میں ''مجاز'' موجود ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۱۳۰)﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود مت کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تمہیں فلاح حاصل ہو اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''تَأْكُلُوا'' کا صیغہ استعمال

❶ مجاز یہ ہے کہ لفظ کو جس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اس معنی کے لئے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے۔ ان میں سے پہلے معنی کو حقیقی معنی اور دوسرے معنی کو مجازی معنی کا نام دیا جاتا ہے۔

ہوا ہے جو ''اَکَلَ'' مصدر سے مشتق ہے۔اس کا حقیقی معنی (کھانے) کے ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں، کیونکہ دگنا سود کوئی نہیں کھاتا بلکہ لیتا ہے۔اس لئے آیت میں ''اَکَلَ'' سے حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی مراد لیا جائے گا اور مجازی معنی ''اَخَذَ'' (لینے) کے ہے۔ان دونوں معنوں (کھانا اور لینا) میں علاقہ ما یکون علیہ کا ہے۔ ❶ یہاں بھی ''اَخَذَ'' پر ''اَکَلَ'' کا اطلاق زمانہ ماضی کے اعتبار سے ہوا ہے، وہ اس طرح کہ سود لینے کے بعد کھانے کی نوبت آتی ہے۔اور عموماً انسان سود کھانے کے لیے ہی لیتا ہے، اس لئے (لینے) کے معنی پر ''اَکَلَ'' کا اطلاق کیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ ان دونوں میں علاقہ ''ما یکون علیہ'' کا ہے، اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

﴿أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً﴾

ان دونوں لفظوں کے درمیان ''جناس مماثل'' موجود ہے۔ ❷ یہاں ''أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً'' دونوں اسم ہیں اور دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں۔چونکہ ان دونوں کلموں میں جناس وقع ہوا ہے، اس لئے ان میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (۱۳۳)﴾

ترجمہ: اور اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور وہ جنت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھاؤ جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں تمام آسمان اور زمین سما جائیں۔وہ ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔یہاں ''مَغْفِرَةٍ'' اور ''جَنَّةٍ''

❶ ما یکون علیہ کا مطلب یہ ہے کہ مجازی معنی پر لفظ کا اطلاق زمانہ مستقبل کے اعتبار سے کیا جائے۔

❷ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں میں۔

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ان دونوں کے حقیقی معنی (بخشش اور جنت) کے ہے،مگر آیت میں ان الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لئے گئے بلکہ مجازی معنی مراد لیا گیا ہے۔ان کا مجازی معنی (اعمالِ صالحہ) کے ہے۔الفاظ کے ان دونوں معنوں کے درمیان علاقہ سببیت، مسببیت کا ہے، کیونکہ اعمالِ صالحہ "سبب" اور مغفرت وجنت "مسبب" ہے۔آیت میں گویا مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے۔آیت میں چونکہ لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ سببیت، مسببیت کا ہے،اس لئے آیت میں "مجاز مرسل" موجود ہے۔

﴿عَرْضُهَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضُ﴾

اس آیت کریمہ میں "تشبیہ بلیغ" پائی جاتی ہے۔❶ یہاں جنت کی چوڑائی کو آسمان وزمین کی چوڑائی سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں جنت کی چوڑائی "مشبہ" ہے اور آسمان وزمین کی چوڑائی "مشبہ بہ" ہے۔آیت میں نہ حرفِ تشبیہ مذکور ہے اور نہ ہی وجہ شبہ،اس لئے اس میں "تشبیہ بلیغ" پائی جاتی ہے۔یہ جملہ اصل میں "عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضُ" تھا۔

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾

اس آیت کریمہ میں جنت کی نسبت تقوی داروں کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ جنت کا تیار ہونا تقوی دار اور گناہ گار مسلمان دونوں کے لئے ہے۔مگر چونکہ اکثر وبیشتر اللہ کے حکموں کی تکمیل اہل تقوی کرتے ہیں گناہ گار مؤمنین نہیں کرتے،اس لئے آیت میں جنت کی اضافت تقوی داروں کی طرف کر دی گئی ہے۔

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۴)﴾

❶ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ اور حرف تشبیہ مذکور نہ ہو۔

ترجمہ: جو خوشحالی میں بھی اور بدحالی میں بھی (اللہ کے لیے) مال خرچ کرتے ہیں، اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کردینے کے عادی ہیں۔ اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظِ ''السَّرَّاءِ'' اور ''الضَّرَّاءِ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''السَّرَّاءِ'' بمعنی (آسودگی اور کشادگی) کے ہے اور ''الضَّرَّاءِ'' بمعنی (تنگی) کے ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں، چونکہ آیت میں ان مقابل معنوں کو کلام میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں کے درمیان ''طباق'' پایا جاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں متقی کی صفات میں سے ایک صفت ''اِنفَاق فِیُ سَبِیُلِ اللّٰہ'' (مال خرچ کرنا) ہے اور دوسری صفت (غصہ کو پینا) ہے۔ آیت میں انفاق کے لئے ''یُنفِقُونَ'' بول کر فعلِ مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا، جبکہ غصہ کے پینے کو بیان کرنے کے لئے ''الْکَاظِمِینَ'' بول کر صیغہ اسمِ فاعل استعمال کیا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف اس لئے ہوا تاکہ ''اِنفَاق فِیُ سَبِیُلِ اللّٰہ'' میں فعل کے تجدد اور حدوث پر دلالت ہو، اسی لئے اس کو فعلِ مضارع کیساتھ بیان کیا ہے، اور غصہ کے پینے میں دوام واستمرار پر دلالت ہو، اسی لئے اس کو اسمِ فاعل کیساتھ لایا گیا ہے۔

﴿وَالْعَافِینَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِینَ﴾

اس جملہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''عموم و خصوص'' کا علاقہ ہے۔ یہاں لفظِ ''النَّاس'' استعمال ہوا ہے، اس کا معنی (لوگوں) کے ہے۔ یہ لفظ کا حقیقی معنی ہے، مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ظاہری بات ہے کہ تمام لوگ مجرم نہیں ہوتے کہ ان کو معاف کیا جائے۔ اس لئے آیت میں لفظ کا معنی مجازی مراد لیا جائیگا اور وہ معنی مجازی (ظالم آدمی یا مملوک) کے ہے۔ اس لفظ کے دونوں معنوں کے درمیان علاقہ عموم

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

وخصوص کا ہے، کیونکہ (لوگ) عام معنی ہے اور (ظالم یا مملوک) خاص معنی ہے۔ آیت میں گویا عام بول کر خاص معنی مراد لیا گیا ہے، چونکہ آیت میں لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

﴿وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۳۵)﴾

ترجمہ: اور اللہ کے سوا ہے بھی کون ہے جو گناہوں کی معافی دے؟ اور یہ اپنے کیے پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے۔

اس آیت کریمہ میں ''مَنْ'' حرف استفہامیہ استعمال ہوا ہے۔ ❶ یہاں بھی ''مَنْ'' استفہامیہ اپنے اصل معنی کے لئے مستعمل نہیں بلکہ یہ بھی ''انکار'' کے لئے استعمال ہوا ہے۔ انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اللہ کے علاوہ کوئی گناہوں کی مغفرت نہیں کرسکتا''۔

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۴) وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۳۵)﴾

ان دونوں آیات کریمہ میں دو جملہ معترضہ پائے جاتے ہیں۔ ❷ یہاں پہلی آیت

---

❶ حروف استفہامیہ اصل میں کسی شے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی حروف استفہامیہ اپنے اصل معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنی کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک معنی ''انکار'' کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حروف استفہامیہ کے ذریعہ کسی شی کی نفی کی جائے۔

❷ اصطلاح بلاغت میں جملہ معترضہ لانے کو اعتراض کہا جاتا ہے۔ اعتراض اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ کسی کلام کے اجزاء کے درمیان یا دو معناً مربوط جملے کے درمیان کوئی لفظ یا جملہ لایا جائے اور یہ کسی نہ کسی مقصد وغرض کے لیے ہوتا ہے۔

میں ”وَاللہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِینَ“ کا جملہ، اوردوسری آیت میں ”وَمَنْ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللہُ“ کا جملہ استعمال ہوا ہے۔ یہ دونوں جملے متقین کے اوصاف کے درمیان میں واقع ہوئے ہیں۔ متقین کے اوصاف پر مشتمل جملے باہم معناً مربوط ہیں، معناً ان مربوط جملوں کے درمیان ”وَاللہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِینَ“ اور ”وَمَنْ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ“ کے جملے لائے گئے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دونوں جملے بطورِ جملہ معترضہ کے واقع ہوئے ہیں۔ اس میں پہلا جملہ معترضہ ”وَاللَّهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِینَ“ اس لئے واقع ہوا تاکہ متقین کے اوصافِ سابقہ (یعنی کشادگی وتنگی میں خرچ کرنا، غصہ کو پینا اور لوگوں کو معاف کرنا) کی خوب مدح وثناء ہو اور خصوصاً صفتِ معافی کی۔ دوسرا جملہ معترضہ ”وَمَنْ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ“ اس لئے واقع ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ گناہوں کے بعد خلاصی اور بخشش کا ایک ہی ذریعہ ہے، وہ رب العالمین سے مغفرت وبخشش کی امید کر کے سچی توبہ کرنا ہے۔

﴿أُولَئِکَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِینَ فِیهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِینَ (۱۳۶)﴾

ترجمہ: یہ ہیں وہ لوگ جن کا صلہ ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت ہے، اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہوں گے، جن میں انہیں دائمی زندگی حاصل ہوگی۔ کتنا بہترین بدلہ ہے جو کام کرنے والوں کو ملنا ہے!۔

اس آیتِ کریمہ میں ”أُولَئِکَ“ اسمِ اشارہ استعمال ہوا ہے، یہ اسمِ اشارہ بعید کا ہے۔ یہاں اسم اشارہ بعید اس لئے لائے تاکہ اس کے مشار الیہ یعنی گناہوں کے بعد تائب ہونے والوں کے مقام ومنزلت کی بلندی کو واضح کیا جائے اور فضیلت میں ان کے درجات کو بلند کیا جائے۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ سُنَنٌ فَسِیرُوا فِی الْأَرْضِ فَانْظُرُوا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِینَ (۱۳۷)﴾

ترجمہ:تم سے پہلے بہت سے واقعات گزر چکے ہیں،اب تم زمین میں چل پھر کر دیکھو لوکہ جنہوں نے (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا ان کا انجام کیسا ہوا؟

اس آیتِ کریمہ کے لفظ''فَسِیْرُوْا''میں''مجاز مرسل''موجود ہے،یہاں''سِیْرُوْا'' ''سَیْراً'' مصدر سے مشتق ہے۔اس کا حقیقی معنی زمین پر سفر کرنے کے ہے۔مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس کا مجازی معنی مراد ہے،اور وہ مجازی معنی (غور وفکر کرنے کے بعد تسلی اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے عبرت حاصل کرنا) ہے ان دونوں معنوں (زمین پر سفر کرنا اور غور وفکر کر کے عبرت حاصل کرنا) کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے۔کیونکہ زمین پر سفر کرنا (خاص) اور عبرت حاصل کرنا (عام) ہے،کیونکہ عبرت حاصل کرنا سفر اور غیر سفر سب کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔آیت میں گویا خاص بول کر عام مراد لیا گیا ہے،چونکہ آیت میں اس لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ عموم وخصوص کا ہے،اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔

﴿إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (١٤٠)﴾

ترجمہ:اگر تمہیں ایک زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی اسی جیسا زخم پہلے لگ چکا ہے۔یہ تو آتے جاتے دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں،اور مقصد یہ تھا کہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے،اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید قرار دے،اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ میں''التفات من التکلم إلی الغیبة''پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلے

❶ یہ مقتضائے حال کے خلاف کلام ذکر کرنے کی ایک صورت ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو تکلم کے الفاظ کا تقاضہ کرے،مگر کلام میں تکلم کی جگہ غائب کا لفظ ذکر کر دیا جائے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات بابرکت کے لئے ''نُدَاوِلُ'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ تکلم کا صیغہ ہے۔ اس اعتبار سے آگے بھی ''لِيَعْلَمَ اللهُ'' میں غائب کا صیغہ لانے کی جگہ ''لِنَعْلَمَ'' بول کر متکلم کا صیغہ لانا چاہئے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ''لِنَعْلَمَ'' کے بجائے ''لِيَعْلَمَ'' بول کر غائب کا صیغہ لایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''الالتفات من التکلم إلى الغيبة'' پایا جاتا ہے۔ اس التفات سے جہاد فی سبیل اللہ کی عظمتِ شان کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہاں ضمیر کی جگہ فاعل اسم ظاہر لفظِ ''اللہ'' کو لایا گیا، تاکہ مخاطب کے دل میں اللہ کی ہیبت اور عظمت پیدا ہو، اور معلوم ہو کہ عارضی طور پر شکست کے بھی کئی فوائد ہیں۔ اس میں اللہ رب العزت کے جاننے سے مراد بدلہ عطا کرنا ہے۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰)﴾

اس جملہ میں ''کناية'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ''لَا يُحِبُّ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی ملزوم (اصل معنی) ناپسند کرنے کے ہے۔ آیت میں اگرچہ یہ معنی مراد لینا بھی درست ہے، اس لفظ سے اس کا معنی لازم مراد لیا گیا ہے اور وہ لازم (بغض کرنا) ہے، گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ظالموں سے بغض ونفرت کرتا ہے۔ آیت میں چونکہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''کناية'' واقع ہوا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ''تعريض'' بھی پائی جاتی ہے۔ ❷ یہاں ''لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ'' کا جملہ استعمال ہوا ہے۔ اس کا ظاہری معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے نفرت کرتے ہیں۔ جملہ کو اسی معنی کی طرف مائل کیا گیا ہے، مگر مراد دوسری جانب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کر اس کا لازم معنی مراد لیا جائے مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ کا معنی اصلی یعنی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

❷ تعریض بھی دراصل کنایہ کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو ایک جانب مائل کیا جائے، مگر مراد اس سے دوسری جانب ہو۔

کرنے والوں اور نیک لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔اس میں چونکہ جملہ کو ایک طرف مائل کر کے مراد دوسری جانب لی گئی ہے،اس لئے آیت میں ''تعریض'' پائی جاتی ہے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰) وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۴۱)﴾

یہاں بھی ''لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ'' کا جملہ بطور جملہ معترضہ کے واقع ہوا ہے۔اس میں ''لِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا'' اور ''وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا'' دونوں جملے علت بیان کرنے کے لئے لائے گئے ہیں،اس لحاظ سے یہ دونوں جملے معناً ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔معناً ان دونوں مربوط جملوں کے درمیان ''وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ'' کا جملہ لایا گیا ہے،اس لئے یہ جملہ جملہ معترضہ ہوگا۔یہ جملہ معترضہ اس لئے لایا گیا تا کہ آیت کے مفہوم میں تاکید اور مبالغہ ہو سکے۔

﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۴)وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ (۱۳۵)وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا(۱۴۰) وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا(۱۴۱)﴾

ان آیات کریمہ کے متعدد مقامات میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔یہاں پہلے جملے میں ایک مرتبہ اللہ سبحانہ کا ذکر لفظِ ''اللَّه'' کے ساتھ ہوا،پھر اس کے بعد اگلی آیتوں میں بار بار لفظ ''اللّٰه'' کا ذکر ہوا ہے،اس سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں لفظِ ''اللَّه'' کا تکرار پایا جاتا ہے۔اسی طرح یہاں ''لِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا'' میں ''الَّذِينَ آمَنُوا'' کا ذکر ہوا ہے،اس کے بعد اگلے جملے میں ''لِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا'' بول کر دوبارہ اسی جملہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ یہاں ''الَّذِينَ آمَنُوا'' والے جملہ کا تکرار ہوا ہے۔اس مقام میں پہلا تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ بار بار لفظِ اللہ کے ذکر سے ذات باری تعالی کی محبت اور عظمت

نصیب ہو، زبان کو حلاوت اور سامع کو لطف آئے، اور دوسرا تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ اہل ایمان کی عظمت بیان کی جائے۔

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ (۱۳۴)وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۱۳۹)وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰)وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۴۱)﴾

پہلے جملے کے لفظ ”السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ“ کے معنوں میں ”طباق“ موجود ہے۔❶ یہاں ”السَّرَّاءِ“ بمعنی (کشادگی) کے ہے اور ”وَالضَّرَّاءِ“ بمعنی (تنگدستی) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ”طباق“ موجود ہے۔

دوسرے جملہ میں ”لَا تَهِنُوا“ اور ”الْأَعْلَوْنَ“ کے معنوں میں ”طباق“ موجود ہے۔ یہاں لَا تَهِنُوا ”وھن“ مصدر سے مشتق ہے۔ اس کا معنی (ہمت ہار کر مغلوب ہونا) ہے اور ”الْأَعْلَوْنَ“ بمعنی (غالب ہونے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور آیت میں ان مقابل معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ”طباق“ موجود ہے۔

تیسرے جملہ میں لفظِ ”آمَنُوا“ ”اِيمَان“ مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (ایمان لانے) کے ہے اور لفظِ ”الظَّالِمِينَ“ ”ظلماً“ مصدر سے مشتق ہے۔ یہ (کفر کرنے) کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان مقابل معنوں کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ”طباق“ موجود ہے۔

چوتھے جملہ میں لفظِ ”آمَنُوا“ اور ”الْكَافِرِينَ“ کے معنوں میں ”طباق“ پایا جاتا

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

ہے۔ یہاں ''آمَنُوا'' بمعنی (ایمان لانے) کے ہے اور ''الْکَافِرِینَ'' بمعنی (کفر کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ان دونوں مقابل معنوں کو آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿هَـذَا بَيَـانٌ لِلـنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ (۱۳۸) وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا (۱۴۰)﴾

یہاں پہلے جملہ میں ''هَـذَا'' اسم اشارہ اور دوسرے جملہ میں ''تِـلْكَ'' اسمِ اشارہ استعمال ہوئے ہیں۔ اسمِ اشارہ سے کئی اغراض ومقاصد مطلوب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک غرض مشارالیہ کی عظمت واہمیت کو بیان کرنا ہے۔ یہاں بھی ''هَـذَا'' اسم اشارہ کے ذریعہ مشارالیہ (قرآن) کی عظمت کی طرف اشارہ کیا کہ قرآن بہت عظیم الشان نصیحت ہے، اور دوسرے جملہ میں ''تِلْكَ'' اسم اشارہ سے مشارالیہ (تبدیلی ایام) کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۹)﴾

اس آیت کریمہ میں ''وَلَا تَهِـنُـوا وَلَاتَـحْـزَنُوا'' فعل نہی کو ''إِنْ'' حرف شرط کے ساتھ معلق کیا گیا ہے، اور یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر تم مؤمن ہوگے تو تم ہی غالب رہوگے، غلبہ کے لیے ایمان شرط ہے۔ یہاں ''وَأَنْتُـمُ الْأَعْلَوْنَ'' کو جملہ اسمیہ لایا گیا ہے جو استمرار ودوام اور یقینی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

﴿وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۴) وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۳۵) فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۳۷) هَـذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ (۱۳۸) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۹) وَاللَّـهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰) وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۴۱)﴾

ان تمام آیتوں میں ’’تخصیص‘‘ پائی جاتی ہیں۔ یہاں پہلے جملہ میں اللہ کی محبت کے عنوان کے ساتھ بالخصوص ’’اَلْمُحْسِنِینَ‘‘ بول کر نیکوکاروں کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ اللہ کی محبت تمام مؤمنین کے لئے ہے، مگر نیکوکاروں سے اللہ تعالی کو زیادہ محبت ہے ان کی اطاعت وفرمانبرداری کی وجہ سے۔ اس لئے آیت میں ’’اَلْمُحْسِنِینَ‘‘ ذکر کر کے نیکوکاروں کی تخصیص کی گئی ہے۔ دوسرے جملہ میں ’’وَهُمْ يَعْلَمُونَ‘‘ کی قید بڑھائی گئی ہے تاکہ یہ بات بتائی جائے کہ جب کبھی اچھے لوگوں سے غلطی سرزد ہو جائے تو وہ اپنی غلطی پر جان بوجھ کر کبھی بھی اصرار نہیں کرتے، البتہ اگر انہیں علم نہ ہو تو علیحدہ بات ہے۔ تیسرے جملہ میں ’’كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ‘‘ سے بالخصوص جھٹلانے والوں کی تخصیص کی گئی ہے، کیونکہ حق کا جھٹلانا عنداللہ بہت سخت مبغوض فعل ہے۔ اس لئے یہاں بالخصوص ’’اَلْمُكَذِّبِينَ‘‘ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح چوتھے جملہ میں قرآن کریم کو بالخصوص اہل تقوی کے لئے ’’هُدًى وَمَوْعِظَةٌ‘‘ (ہدایت اور نصیحت) کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، چونکہ قرآن سے زیادہ تر اہل تقوی ہی مستفید ہوتے ہیں، اس لئے جملہ میں ’’اَلْمُتَّقِينَ‘‘ کی تخصیص کی گئی ہے۔ پانچویں جملہ میں ’’إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ‘‘ کی قید بڑھا کر فتح وغلبہ کے حصول کو مقید کر دیا گیا ہے۔ یہ قید اس لئے بڑائی گئی ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ فتح کے لئے ایمان پر استقامت ضروری ہے۔ چھٹے جملہ میں اللہ سبحانہ نے نفرت کے عنوان میں ’’الظَّالِمِينَ‘‘ بول کر ظلم کی تخصیص کی ہے۔ اسی طرح ساتھویں اور آخری جملہ میں ’’الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ‘‘ بول کر (طبقہ مؤمنین اور طبقہ کفار کی) تخصیص کی گئی ہے۔ اس جملہ میں مسلمانوں کی کامیابی اور کفار کی ناکامی کی خبر دی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے پرکھنے اور کفار کے مٹنے کی خبر دی گئی ہے۔

﴿فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا (۱۳۷) وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۹) وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۱۴۰) وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۴۱)﴾

ان آیات مبارکہ میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے جملے میں نظر وفکر دوڑانے کو حقیقی سفر کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں نظر وفکر دوڑانا ''مشبہ'' ہے اور سفر کرنا ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''سِیرُوا'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں غلبہ پانے کو جگہ کی بلندی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں غلبہ پانا ''مشبہ'' ہے اور جگہ کی بلندی ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''الْأَعْلَوْنَ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔ تیسرے جملہ میں بھی کبھی مسلمانوں پر محنت ومشقت لانے اور کبھی کافروں پر مشقت ومحنت لانے کو دنوں کے بدلنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں مسلمانوں وکافروں پر مشقت لانا ''مشبہ'' ہے، دنوں کا بدلنا ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''نُدَاوِلُهَا'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔ بالکل آخری جملہ میں مسلمانوں کی کوتاہیاں ختم کرنے کو کسی چیز کے گھٹانے سے تشبیہ دی گئی اور کافروں کے مغلوب ہونے کو کسی چیز کے مٹانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان میں مسلمانوں کی تمحیص اور کافروں کا مغلوب ہونا ''مشبہ'' ہے اور کسی چیز کا پرکھنا اور مٹانا ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''لِيُمَحِّصَ اور ''وَيَمْحَقَ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (۱۴۲)﴾

ترجمہ: بھلا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (یونہی) جنت کے اندر جا پہنچو گے؟ حالانکہ ابھی تک

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانچ کرنہیں دیکھا جو جہاد کریں، اور نہ ان کو جانچ کر دیکھا ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ''أَمْ'' حرفِ استفہام داخل ہوا ہے۔حروفِ استفہام اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات لینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں،مگر کبھی کبھی حروفِ استفہام اصل معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوا کرتے ہیں۔ان میں سے ایک معنی ''انکار'' ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہامیہ کے ذریعہ کسی عنوان وغیرہ کی نفی کی جائے۔ یہاں بھی ''أَمْ'' استفہامیہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، بلکہ یہ بھی ''انکار'' کے لئے ہے۔انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ تم بغیر محنت ومشقت کے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اس آیت کریمہ ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ایک مرتبہ ''لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ'' میں لفظ ''یَعْلَمِ'' کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آگے آیت میں ''وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ'' بول کر دوبارہ لفظ ''یَعْلَمَ'' کا ذکر کیا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس آیت میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔یہ تکرار یا تو اس لئے واقع ہوا تا کہ صبر کرنے والوں کی فضیلت واضح کی جائے یا یہ تکرار اس لئے ہے کہ ان دونوں فعلوں کا متعلق جدا جدا ہے۔پہلے ''یَعْلَمِ'' کا تعلق جہاد سے ہے اور دوسرے کا تعلق صبر سے ہے، گویا اللہ تعالی دونوں عبادات کرنے والوں کو اور ان کی نیت وارادے کو جانتا ہے۔اسی لئے آیت میں یہ ''تکرار'' پیش آیا۔

﴿وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۱۴۳)﴾

ترجمہ:اور تم تو خود موت کا سامنا کرنے سے پہلے (شہادت کی) موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔چنانچہ اب تم نے کھلی آنکھوں اسے دیکھ لیا ہے۔

❶ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ،کلمہ یا کوئی حکم مکرر ذکر کیا جائے۔

اس آیتِ کریمہ میں ''توبیخ'' پائی جاتی ہے۔❶ یہاں تمہیداً آیت کا شان نزول ملاحظہ ہو۔حضرات صحابہ کرام میں سے کچھ صحابہ نے اصحاب بدر کی شہادت کے بعد آرزو ظاہر کی تھی کہ کاش بدر والوں کی طرح ہم بھی قتال کرتے اور قتال میں مشرکوں کو قتل کرتے اور اس میں شہادت وغیرہ کے ذریعہ کامیابی حاصل کرتے۔ یہ بعض صحابہ کی تمنا تھی ،مگر جب معرکہ کا وقت آیا تو ان میں کچھ کمزوری اور لغزش آ گئی اور اپنی آرزوں کے خلاف انہوں نے کیا، اللہ تعالیٰ کو یہ فعل پسند نہ آیا اور فوراً توبیخ کر دی کہ تم لڑائی اور جنگ کی تمنا کرتے ہو،مگر جب موقع آتا ہے تو بزدلی یا ہزیمت کی طرف مائل ہونے لگتے ہو، یا تم شہادت کی تمنا کرتے ہومگر جب شہادت کے ذرائع دیکھتے ہو تو تمہاری ہمتیں کمزور ہونے لگتی ہیں،جس میں دین اسلام کے دشمنوں کا بظاہر غلبہ ہے،اس لئے تم ایسی تمنا نہ کیا کرو،تمہارے لئے ایسی تمنا کرنا کہ اس میں پھر کمزوری آئے نازیبا کام ہے۔

اس آیت میں دشمنوں سے ملاقات کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ''رَأَيْتُمُوْا'' میں رؤیت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،اسی طرح اس رؤیت کو ''وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ'' بول کر نظر کی قید سے مقید کر دیا گیا ہے۔ایسا اس لئے کیا تاکہ آیت میں تاکید اور مبالغہ ہو۔

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ(۱۴۴)﴾

ترجمہ:اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک رسول ہی تو ہیں۔ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا انہیں قتل کر دیا جائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

❶ توبیخ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو ڈانٹا جائے اور کسی بات پر تنبیہ کی جائے۔

اس آیت کریمہ میں ”قصر الموصوف علی الصفة الإضافی“ پایا جاتا ہے۔ ❶ اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صفت رسالت کے ساتھ تبری عن الموت کے اعتبار سے خاص کر دیا گیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آیت کے مخاطب حضرات صحابہ کرام تھے، جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر حیرانگی ہوئی تھی۔ وہ صحابہ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اوصاف سے متصف سمجھتے تھے یعنی رسالت اور تبری عن الموت (موت سے بری ہونا)۔ قرآن میں ”مُحَمَّدٌ رَسُولٌ“ فرما کر حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم کو صفتِ رسالت پر منحصر کر دیا گیا کہ آپ کے لئے صرف صفتِ رسالت ہے، صفتِ تبری عن الموت نہیں، لہٰذا آپ کی موت سے حیرانی نہیں ہونی چاہئے، البتہ تبری عن الموت کے علاوہ دوسری صفات آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے یا نہیں اس بارے میں آیت خاموش ہے۔ اس میں ”قصر قلب“ بھی پایا جاتا ہے۔ ❷

حضرات صحابہ کرام نے گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبری عن الموت کے صفت سے متصف ہونے کی وجہ سے بمنزلہ معبود سمجھ لیا تھا۔ (واضح رہے کہ حقیقتاً صحابہ کرام کا عقیدہ ایسا نہ تھا مگر بعض لوگوں کے فعل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شاید صرف الوہیت کا اعتقاد رکھا ہے رسالت کا نہیں، اس لئے جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سنا تو دین حق سے وہ رجوع کرنے لگے، گویا انہوں نے یہ اعتقاد کر لیا کہ رسول تو معبود تھے جب وہ فوت ہوئے تو ان کے عبادت سے رجوع کرنا چاہئے۔) آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ موصوف کو ایک صفت کے ساتھ کسی دوسری صفت کے اعتبار سے خاص کر دیا جائے، خواہ اس دوسری صفت کے علاوہ اور صفات بھی اس موصوف میں پائی جائیں یا نہ پائی جائیں۔

❷ قصر قلب یہ ہے کہ متکلم مخاطب کے خلاف خیال رکھتا ہو، اس لئے وہ مخاطب کے خیال کے خلاف کسی ایک صفت سے موصوف کو مختص کر کے تردید کر دیتا ہے۔

کوصفتِ رسالت کے ساتھ خاص کردیا اوران کی تردید کردی کہ آپ صرف رسول ہی ہیں رب نہیں کہ آپ پرموت نہ آئے۔اس تقریر سے واضح ہوا کہ اس میں ''قصر قلب'' بھی موجود ہے۔

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ (۱۴۴)﴾

اس آیت کریمہ میں بھی ''تکرار'' پایاجاتا ہے۔یہاں پہلے ''مَاتَ'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔اس کامعنی (روح کاجسم سے علیحدہ ہونا) ہے۔پھراس کے بعد آیت میں آگے ''قُتِلَ'' کا صیغہ استعمال ہواہے جو پہلے جملے کے معنی میں ہے،اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ''مَاتَ اور قُتِلَ'' تکرار کے قبیل سے ہے۔یہ تکرار اس لئے واقع ہوا کیونکہ عرف عام میں دونوں جداجدا ہے۔عرف میں موت قتل سے علیحدہ شئی ہے،اگرچہ لغتاً دونوں کامعنی جسم سے روح کا جدا ہونا ہے،مگر چونکہ عرف میں دونوں کامفہوم علیحدہ ہے،اس لئے یہاں یہ ''تکرار'' واقع ہوا ہے۔

﴿انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ(۱۴۴)﴾

اس آیتِ کریمہ میں بھی ''کنایة'' پایاجاتا ہے۔❶ یہاں ''انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ'' کااصلی معنی (معنی ملزوم) الٹے پیروں بھاگنا ہے،آیت میں یہ معنی مراد لینا درست ہے،مگر یہاں اس لفظ سے الٹے پیروں کے بھاگنے کا لازم مراد لیا گیاہے اوروہ لازم معنی (اسلام سے کفر کی طرف دوبارہ لوٹ کرجانا) ہے۔چونکہ آیت میں لفظ بول کراس کا لازم مراد لیا گیا ہے،اس لئے آیت میں ''کنایة'' موجود ہے۔

﴿وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ (۱۴۴)وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (۱۴۵)﴾

ترجمہ:اور جوشکرگزار بندے ہیں اللہ ان کوثواب دے گا۔اور جولوگ شکرگزار ہیں ان کوہم جلد ہی ان کااجرعطا کریں گے۔

---

❶ کنایہ یہ ہے کہ لفظ بول کراس کا لازم معنی مراد لیا جائے،مگراس کے ساتھ ساتھ لفظ کامعنی اصلی یعنی معنی ملزوم مراد لینا بھی درست ہو۔

یہاں دوسرے جملہ میں ''التفات من الغیبۃ إلی التکلم'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں پہلے جملے میں اللہ سبحانہ نے اپنے لئے ''سَیَجْزِی'' بول کر غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس لحاظ سے دوسرے جملہ میں بھی ''سَنَجْزِی'' کی جگہ ''سَیَجْزِی'' بول کر غائب کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی جگہ اس میں ''سَنَجْزِی'' بول کر تکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''التفات من الغیبۃ إلی التکلم'' پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ جمع متکلم کے صیغے سے اللہ رب العزت کی عظمت شان کا اظہار کیا جائے۔

﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۱۴۷)﴾

ترجمہ: ان کے منہ سے جو بات نکلی وہ اس کے سوا نہیں تھی کہ وہ کہہ رہے تھے: ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بھی اور ہم سے اپنے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہو اس کو بھی معاف فرمادے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے، اور کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرمادے۔

اس آیت کریمہ کے لفظِ ''قَوْل'' اور ''قَالُوْا'' کے درمیان ''جناس مغائر'' موجود ہے۔ ❷ یہاں ''قَوْل'' اسم اور ''قَالُوْا'' فعل ہے۔ یہ دونوں الگ الگ نوع کے کلمے ہیں، چونکہ الگ الگ نوع کے کلموں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ''جناس مغائر'' موجود ہے۔

❶ اس کا مطلب یہی ہے کہ کلام کا سیاق وسباق اور مقتضائے حال تو غائب کے الفاظ کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں غائب کی جگہ تکلم کا لفظ ذکر کردیا جائے اور یہ کسی غرض کے لیے ہوتا ہے۔

❷ جناس مغائر یہ ہے کہ دو نوع کے کلموں میں جناس واقع ہو یعنی اسم و فعل یا فعل وحرف یا حرف واسم کے درمیان جناس واقع ہو۔

﴿وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ (۱۴۳)وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا(۱۴۷)﴾

یہاں پہلے جملے میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔اس میں ''مَوْتَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس کا حقیقی معنی (موت وشہادت) کے ہے،مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس لفظ کا مجازی معنی مراد لیا جائیگا اور وہ مجازی معنی (جہاد فی سبیل اللہ) کے ہے۔ان دونوں معنوں (شہادت اور جہاد فی سبیل اللہ) کے درمیان علاقہ سببیت ،مسببیت کا ہے، کیونکہ موت مسبب ہے اور جہاد اس کا سبب ہے، گویا آیت میں مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے۔آیت میں چونکہ لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان علاقہ سببیت ،مسببیت کا ہے،اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' موجود ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں ''ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا'' کا حقیقی معنی (قدموں کو جمائے رکھنا) ہے،مگر آیت میں یہ حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے اور وہ مجازی معنی (دلوں کو مضبوط رکھنا) ہے۔ جب دل مضبوط ہوگا تو قدم بھی ثابت قدم رہیں گے،اب ان دونوں معنوں کے درمیان بھی علاقہ سببیت ،مسببیت کا ہے۔آیت میں گویا مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے۔ان دونوں معنوں میں علاقہ چونکہ سببیت ،مسببیت کا ہے،اس لئے آیت میں 'مجاز مرسل' موجود ہے۔

﴿أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ (۱۴۴)فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۴۸)﴾

یہاں پہلے جملہ کے لفظِ ''انْقَلَبْتُمْ''اور ''يَنْقَلِبْ'' کے درمیان ''جناس مماثل '' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''انْقَلَبْتُمْ''اور ''يَنْقَلِبْ'' دونوں فعل ہیں،اس لئے یہ دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک نوع کے ان دونوں کلموں میں جناس واقع ہوا ہے،اس لئے ان میں ''جناس مماثل''موجود ہے۔اسی طرح اگلی آیت کے لفظِ ''ثَوَابَ الدُّنْيَا'' میں

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دوکلموں میں جناس واقع ہو،یعنی دوفعلوں، دواسموں، یا دوحرفوں میں جناس واقع ہو۔

''ثَوَابَ'' اور''ثَوَابِ الآخِرَةِ'' میں لفظِ''ثواب'' دونوں اسم ہیں۔اس لئے یہ دونوں بھی ایک نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان دونوں میں بھی جناس واقع ہوا ہے،اس لئے ان میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۱۴۷)فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۴۸)﴾

ترجمہ:ان کے منہ سے جو بات نکلی وہ اس کے سوانہیں تھی کہ وہ کہہ رہے تھے: ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بھی اور ہم سے اپنے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہو اس کو بھی معاف فرمادے،ہمیں ثابت قدمی بخش دے،اور کافرلوگوں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرمادے۔ چناچہ اللہ نے انہیں دنیا کا انعام بھی دیا اور آخرت کا بہترین ثواب بھی،اور اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

یہاں پہلے جملے میں موجودلفظِ''ذُنُوبَ''اور''إِسْرَافَ'' کوبعض مفسرین نے شئی واحد قراردیاہے،اگران کےاس قول کو مان لیا جائےتو آیت میں''ذُنُوبَ''اور''إِسْرَافَ'' کی وجہ سے ''تکرار''آئیگا۔اسی طرح دوسرے جملہ میں بھی ایک مرتبہ''ثَوَابَ الدُّنْيَا'' کے ساتھ لفظِ''ثَوَابَ'' کا ذکر ہونے کے بعد''وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ''میں دوبارہ''ثَوَابَ'' کا لفظ لایا گیاہے۔اس سے واضح ہوا کہ دوسرے جملہ میں بھی''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ان دونوں جگہوں میں''تکرار'' تاکید کے لئے واقع ہوا ہے،اس میں بتلایا گیا ہے کہ آخرت کا بدلہ اللہ رب العزت عطا فرمائے گا، یہاں نسبت اللہ رب العزت کی طرف ہے،اوررب العالمین اپنی شایانِ شان عطا فرمائے گا،اور آخرت کا بدلہ ہی بہترین ہے جو دائمی ہے،ایسے نیک عمل کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ (۱۴۹)﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے اگر تم ان کی بات مانو گے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا دیں گے، اور تم پلٹ کر سخت نقصان اٹھاؤ گے۔

اس آیت کریمہ میں دو "استعارة تصريحية" پائے جاتے ہیں۔❶ یہاں دین سے پلٹنے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف لوٹنے اور پلٹنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں دین سے پھرنا "مشبہ" اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف لوٹنا "مشبہ بہ" ہے۔ آیت میں چونکہ "يَرُدُّوْ" بول کر مشبہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت کریمہ میں کفر کے ذریعہ اعمال کے ضائع کرنے کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا اصل مال اور نفع مکمل طور پر کاروبار میں ضائع ہو چکا ہو۔ اس میں کفر کے ذریعہ اعمال کو ضائع کرنا "مشبہ" ہے اور کاروبار میں نقصان اٹھانا "مشبہ بہ" ہے۔ آیت میں چونکہ "خَاسِرِينَ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔

﴿بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ (۱۵۰) سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ (۱۵۱)﴾

ترجمہ: (یہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں) بلکہ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے، اور وہ بہترین مددگار ہے۔ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے ہم عنقریب ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے، کیونکہ انہوں نے اللہ کی خدائی میں ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ ظالموں کا بدترین ٹھکانا ہے۔

---

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

ان دونوں میں ''التفات من الغيبة إلى التكلم'' پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلے جملے میں ''بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ'' میں لفظ ''اللّٰه'' استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم ظاہر ہے اور اسم ظاہر غائب کے حکم میں ہے، اس لحاظ سے اگلے جملہ میں ''سَنُلْقِي'' کی جگہ ''سَيُلْقِي'' بول کر غائب کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ''سَيُلْقِي'' کی جگہ ''سَنُلْقِي'' بول کر تکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ دوسرے جملہ میں ''التفات من الغيبةالى التكلم'' پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تا کہ یہ بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رعب ودبدبہ کافروں کے دل میں ڈالا جائیگا وہ بہت بڑا اور ہیبت ناک ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''الرُّعْبَ'' سَنُلْقِي کا مفعول اور ''فِيْ قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوْا'' جار مجرور ہے۔ اصول کے مطابق مفعول جار مجرور پر مقدم ہوتا ہے، مگر یہاں جار مجرور کو مفعول پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا تا کہ حال (رعب) سے پہلے محل (کفار کے دل) کو اہتمام کے ساتھ بیان کیا جائے۔

اس آیت میں ''استعارة تصريحية'' بھی موجود ہے۔ یہاں دلوں میں رعب پیدا کرنے کو کسی مجسم شئی کو ڈالنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں دلوں میں رعب ڈالنا ''مشبه'' اور کسی مجسم شئی کو کسی دوسری چیز میں ڈالنا ''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''سَنُلْقِي'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں ''الاظهار فی مقام الاضمار'' پایا جاتا ہے۔ (1) اس آیت

(1) یہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال، کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کر دیا جائے اور یہ کسی مقصد کی خاطر ہوتا ہے۔

کریمہ میں ”الَّذِینَ کَفَرُوا“ کی صورت میں کفار کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس میں موجود ”الَّذِینَ“ اسم موصول آئندہ جملے میں آنے والی ضمیر کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آیت میں آگے کفار کے ٹھکانے کا بڑا ہونا ”وَبِئْسَ مَثْوَی الظَّالِمِینَ“ کی جگہ ”وَبِئْسَ مَثْوٰهُمْ“ سے بیان ہونا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ”مَثْوٰهُمْ“ میں ”ھم“ ضمیر لانے کی جگہ ”الظَّالِمِینَ“ اسم ظاہر کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں ”الاظھار فی مقام الإضمار“ موجود ہے۔ ایسا اس لئے ہوا تا کہ کفار کی شناعت میں سختی ہو۔ نیز یہ بتایا جائے کہ انہوں نے ظلم کیا اور اللہ رب العزت کے ساتھ شریک ٹھہرایا، ان کے جرم ظلم کرنے کی صراحت ہو جائے۔

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (۱۵۲)﴾

ترجمہ: پھر اللہ نے ان سے تمہارا رخ پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائے۔ البتہ اب وہ تمہیں معاف کر چکا ہے، اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں ”الاظھار فی مقام الإضمار“ پایا جاتا ہے۔ یہاں مؤمنین کے لئے ”صَرَفَكُمْ، لِيَبْتَلِيَكُمْ“ اسی طرح ”عَنكُمْ“ میں ”کم“ ضمیر خطاب کی استعمال کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے آگے آیت میں ”وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ“ میں ”الْمُؤْمِنِينَ“ اسم ظاہر کی جگہ ”وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَيْكُمْ“ ہونا چاہئے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ”کم“ ضمیر خطاب کی جگہ ”الْمُؤْمِنِينَ“ بول کر اسم ظاہر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ”الاظھار فی مقام الاضمار“ موجود ہے۔ یہ اس لئے تا کہ اللہ سبحانہ کے فضل کی علت بیان کی جائے کہ تم پر اللہ رب العزت اس لئے فضل کرنے والے ہیں کہ تم ایمان لائے ہو۔

﴿إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۵۳)﴾

ترجمہ: (وہ وقت یاد کرو) جب تم منہ اٹھائے چلے جارہے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے، اور رسول تمہارے پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے، چنانچہ اللہ نے تمہیں (رسول کو) غم (دینے) کے بدلے (شکست کا) غم دیا، تاکہ آئندہ تم زیادہ صدمہ نہ کیا کرو، نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے، اور نہ کسی اور مصیبت پر جو تمہیں پہنچ جائے۔ اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ''أَحَدٍ'' سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کو مراد لیا ہے، اس صورت میں یہ ابہام کے قبیل سے ہوگا، اس لیے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ صراحت سے نہیں ہے، لیکن راجح بات یہ ہے کہ آپ کا تذکرہ آگے صراحتاً موجود ہے، گویا ابہام کے بعد صراحت ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو جگہ ''غَمًّا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں الفاظ کے درمیان ''جناس مماثل'' موجود ہے۔ (۱) یہاں دونوں لفظ ''غَمًّا'' اسم ہیں اور دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ایک ہی نوع کے دو کلموں کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ''غَمًّا'' کے الفاظ کے درمیان ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

﴿ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ

(۱) جناس مماثل کا مطلب یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو یعنی دو فعلوں، دو اسموں یا دو حرفوں میں۔

یَقُولُونَ لَوْکَانَ لَنَامِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَا قُتِلْنَاهَاهُنَاقُلْ لَوْکُنْتُمْ فِی بُیُوتِکُمْ لَبَرَزَالَّذِینَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلَی مَضَاجِعِهِمْ وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِی صُدُورِکُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَافِی قُلُوبِکُمْ وَاللّٰهُ عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۱۵۴)﴾

ترجمہ: پھراس غم کے بعد اللہ نے تم پر طمانینت نازل کی، ایک اونگھ جوتم میں سے کچھ لوگوں پر چھارہی تھی۔اور ایک گروہ وہ تھا جسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، وہ لوگ اللہ کے بارے میں ناحق ایسے گمان کررہے تھے جو جہالت کے خیالات تھے، وہ کہہ رہے تھے: کیا ہمیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے؟ کہہ دو کہ اختیار تو تمام تر اللہ کا ہے۔ یہ لوگ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا مقدر میں لکھا جاچکا تھا وہ خود باہر نکل کر اپنی اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے۔اور یہ سب اس لیے ہوا تاکہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے،اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کا میل کچیل دور کردے۔اللہ دلوں کے بھید کوخوب جانتا ہے۔

﴿یَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَیْرَالْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ﴾

اس آیت کریمہ کے لفظ "یَظُنُّونَ" اور "ظَنَّ" کے درمیان "جناس اشتقاق" موجود ہے۔❶ یہاں "یَظُنُّونَ" اور "ظَنَّ" کا اصل مادہ اشتقاق "ظَنًّا" ہیں۔اسی طرح ان کا اصل معنی (گمان کرنے) کے ہے، چونکہ مذکورہ دونوں الفاظ ان دونوں چیزوں میں ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان کے درمیان "جناس اشتقاق" موجود ہے۔

﴿یَقُولُونَ هَلْ لَنَامِنَ الْاَمْرِمِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهُ لِلّٰهِ یُخْفُونَ فِی اَنْفُسِهِمْ مَالَا یُبْدُونَ لَکَ یَقُولُونَ لَوْکَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا﴾

❶ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمے اصل مادہ اشتقاق اور معنی میں ایک دوسرے کے موافق ہوں۔

اس آیت میں کریمہ میں ’’الاعتراض‘‘ یعنی جملہ معترضہ موجود ہے۔ یہاں ’’یَقُولُونَ هَلْ لَنَامِنَ الْأَمْرِمِنْ شَیْءٍ‘‘ کا جملہ منافقین کا قول ہے۔ (اس میں منافقین نے سوال کیا ہے کہ کیا ہمارے بس کی کوئی بات ہے؟) پھر اس کے بعد ’’یُخْفُونَ فِی أَنْفُسِهِمْ‘‘ بھی منافقوں کے ایک فعل کا بیان ہے۔ (اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ منافقین بہت سی باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپاتے تھے۔) یہ جملہ دراصل ’’یَقُولُونَ‘‘ سے حال ہے اور ’’یَقُولُونَ‘‘ کا فاعل ذوالحال ہے۔ ذوالحال اور حال دونوں معناً ایک دوسرے سے مربوط جملہ ہیں، معناً ان دونوں مربوط جملہ کے درمیان ’’إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ‘‘ کا جملہ لایا گیا ہے۔ یہ جملہ چونکہ ’’یَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ مَاقُتِلْنَاهَاهُنَا‘‘ بول کر دو مربوط جملہ کے درمیان آیا ہے، اس لئے آیت میں ’’الاعتــراض‘‘ پایا جاتا ہے۔ باقی یہ جملہ معترضہ اس لئے آیا تاکہ منافقین کے سوال کا جواب ہو کہ تمہارا کسی قسم کا اختیار نہیں چل سکتا، تمام اختیارات کے مالک صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ’’التفسیر بعد الابهام‘‘ بھی واقع ہوا ہے۔ ❶ یہاں پہلے ’’یُخْفُونَ فِی أَنْفُسِهِمْ مَا لَا یُبْدُونَ‘‘ میں منافقین کی ایک عادت بتائی گئی کہ اے نبی! منافقین آپ سے بہت باتیں اپنے دلوں میں چھپاتے پھرتے ہیں، آپ کے سامنے ان باتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ باتیں کونسی ہے؟ اس بارے میں آیت مبہم ہے۔ آیت میں ان باتوں کو ’’مَــا لَا یُبْـدُونَ‘‘ تک مبہم اور غیر واضح چھوڑا گیا۔ پھر اس کے بعد آگے آیت میں اللہ سبحانہ نے اس مبہم بات کی وضاحت کردی کہ منافقین یہ کہا کرتے تھے کہ ’’اگر ہمارا بس چلتا تو ہم وہاں قتل نہ ہوتے‘‘۔ یہ منافقین کے گذشتہ پوشیدہ قول کی وضاحت اور تفسیر ہے، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ’’التفسیر بعد الابهام‘‘ موجود ہے۔

❶ یہ اطناب کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں پہلے کوئی چیز یا کوئی بات مبہم ذکر کیا جائے، پھر اس کے بعد اس شئ کی وضاحت بیان کی جائے۔

﴿قُلْ لَوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ﴾

اس آیت کریمہ میں ''احتجاج نظری'' پایا جاتا ہے۔❶ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاد کے لئے نکلو اور موت کی شدت سے گھبرا کر جہاد نہ چھوڑو۔ موت صرف جہاد ہی میں منحصر نہیں جو تم کو صرف جہاد ہی میں آئے؟ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر تم جہاد نہ میں جاؤ تب بھی جس کے مقدر میں قتل ہونا لکھا ہوا ہو وہ لازمی قتل کی جگہ پہنچ کر رہیگا۔ اس میں چونکہ میدان جہاد میں موت سے نفی کے لئے عقلی دلیل دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''احتجاج نظری'' موجود ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا (۱۴۹) لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ (۱۵۳) يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ (۱۵۴)﴾

یہاں پہلے جملہ کے لفظ ''آمَنُوا'' اور لفظِ ''كَفَرُوا'' کے معنوں میں ''طباق'' موجود ہے۔❷ یہاں آمَنُوا ''ایمان'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (ایمان لانے) کے ہے۔ اور كَفَرُوا ''كفراً'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (کفر وانکار کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان کو آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔ دوسرے جملہ میں بھی لفظِ ''فَاتَ'' اور لفظِ ''أَصَابَ'' کے معنوں میں ''طباق'' موجود ہے۔ یہاں ''فَاتَ'' بمعنی (ہاتھوں سے نکلنے) کے ہے اور ''أَصَابَ'' بمعنی (پہنچے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت میں چونکہ یہ مقابل معانی جمع کر دیئے گئے ہیں، اس لئے ان میں ''طباق'' موجود

❶ احتجاج نظری کا مطلب یہ ہے کہ متکلم کلام میں ایسی باتیں یا معنی ذکر کرے جس پر عقلی دلائل سے استدلال کیا جا سکے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو ذکر کر دیا جائے۔

ہے۔اسی طرح تیسرے جملہ میں لفظِ یُخفُون ''إخفاء'' مصدر سے مشتق ہے،اس کا معنی (چھپانے) کے ہےاور یُبدُونَ ''بداء'' مصدر سے مشتق ہے،اس کا معنی (ظاہر کرنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، چونکہ ان مقابل معنوں کو ایک ہی آیت میں جمع کردیا گیا ہے،اس لئے ان میں بھی ''طباق'' موجود ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۵٦)﴾

ترجمہ:اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ہے، اور جب ان کے بھائی کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا جنگ میں شامل ہوتے ہیں تو یہ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے،اور نہ مارے جاتے۔(ان کی اس بات کا) نتیجہ تو (صرف) یہ ہے کہ اللہ ایسی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت کا سبب بنادیتا ہے،(ورنہ) زندگی اور موت تو اللہ دیتا ہے۔اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو جگہ ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں ایک مرتبہ ''مَامَاتُوا'' میں ''ما'' نافیہ کا ذکر ہوا ہے، پھر اس کے بعد آگے آیت میں ''وَمَاقُتِلُوا'' میں دوبارہ لفظِ ''ما'' کو ذکر کیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ اس آیت کریمہ میں ''ما'' نافیہ کا ''تکرار'' موجود ہے، یہ پہلی جگہ ہے۔اسی طرح دوسری جگہ ''وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ'' میں بھی ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔اس میں چونکہ لفظ ''اللّٰہ'' مکرر ذکر ہوا ہے،اس لئے اس میں بھی ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے لایا گیا تاکہ آیت کے عنوان میں تاکید پیدا ہو۔

❶ تکرار اطناب کی صورت ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ،کلمہ یا حکم مکرر ذکر کیا جائے اور تکرار کسی مقصد وغرض کی بناء پر ہوتا ہے۔

﴿إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ﴾

اس جملہ میں ''استعارۃ تصریحیۃ''اور''تبعیۃ'' پائے جاتے ہیں۔ ❶ یہاں خشکی پر سفر کرنے والے شخص کو سمندر میں تیرنے والے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس استعارہ میں خشکی پر سفر کرنے والا ''مشبہ''اور سمندر میں تیرنے والا ''مشبہ بہ'' ہے۔ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح سمندر میں تیرنے والا آدمی تیراکی کے ذریعہ سمندر کے سفر کرتے کرتے منزلوں کو طے کرتا جاتا ہے۔اسی طرح خشکی کا مسافر بھی سفر کرتے کرتے منزلوں کو طے کرتا ہے۔آیت میں چونکہ ''ضَرَبُوْا''بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کر دی گئی ہے،اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔اسی طرح اس آیت میں ''استعارۃ تبعیۃ'' بھی پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''ضَرَبُوْا'' فعل ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے،اس لئے اس جملہ بھی ''استعارۃ تبعیۃ'' موجود ہے۔

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۱۵۴) وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۱۵۶)﴾

یہاں پہلے جملے میں اللہ سبحانہ کے علم کے متعلق صرف سینوں کے رازوں کا بیان ہوا ہے، حالانکہ اللہ کا علم تمام چیزوں سے متعلق ہے، مگر چونکہ یہاں منافقین کے دلی باتوں کا ذکر ہورہا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کی باتوں کا پتہ اللہ تعالیٰ کو نہیں چل رہا ہے،اس لئے آیت میں بالخصوص ''بِذَاتِ الصُّدُورِ'' بول کر ان کے خیال کی تردید کی گئی کہ اللہ تعالیٰ اچھی طرح سینوں کی باتوں کو جانتے ہیں،اس نکتہ کے خاطر آیت میں ''بِذَاتِ الصُّدُورِ'' کی تخصیص کی گئی ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں اللہ سبحانہ کی صفت بصارت کیساتھ بالخصوص انسان کے اعمال کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ کی بصارت وعلم کا تعلق لوگوں کے

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کر دی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل،حرف یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

اقوال سے بھی ہے، مگر چونکہ بصارت کا تعلق انسان کے اعمال سے زیادہ ہے بہ نسبت انسان کے اقوال سے، اس لئے آیت میں بصارت کو عمل کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

﴿لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾

اس آیت کریمہ میں ''ذٰلِکَ'' اسمِ اشارہ استعمال ہوا ہے۔ اسمِ اشارہ سے کبھی مشار الیہ کی عظمت اور کبھی حقارت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں ''ذٰلِکَ'' اسم اشارہ لاکر مشار الیہ یعنی منافقین کے دلوں میں موجود افسوس وندامت کا بڑا ہونا بیان کیا گیا ہے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (١٥٩)﴾

ترجمہ: ان واقعات کے بعد اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر (اے پیغمبر) تم نے ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر تم سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔ لہٰذا ان کو معاف کر دو، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب تم رائے پختہ کر کے کسی بات کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت میں ''فَبِمَا'' میں لفظِ ''ما'' زائد ہے۔ یہ ''ما'' نفی کے معنی میں نہیں، بلکہ یہ لفظ آیت کے معنی میں تاکید اور مبالغہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے بہت بہت زیادہ مہربانی کی وجہ سے آپ لوگوں کے لئے نرم مزاج ثابت ہوئے ہیں۔

﴿إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (١٦٠)﴾

ترجمہ: اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں، اور اگر وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے؟ اور مومنوں کو چاہئے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

اس آیت کریمہ میں ''مقابلة'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ'' میں دو موافق معانی بیان ہوئے ہیں:

نمبر۱: ''إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ'' میں اللہ کی نصرت کا بیان ہوا ہے۔

نمبر۲: ''فَلَا غَالِبَ لَكُمْ'' میں اللہ کی مدد کی صورت میں دشمنوں کا غالب نہ آنا بیان ہوا۔

یہ دونوں (اللہ کی نصرت اور دشمنوں کا غالب نہ ہونا) ایک دوسرے کے موافق بایں معنی ہیں کہ ان میں باہمی کوئی تقابل وتضاد نہیں۔ آیت میں ان موافق معنوں کو بیان کرنے کے بعد بالترتیب ان میں سے ہر ایک کی ضد لائی گئی ہے۔ اللہ سبحانہ کی مدد ونصرت کی ضد (اللہ کا مدد نہ کرنا) ''وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ'' سے بیان ہوا اور دشمنوں کے غالب نہ آنے کی ضد (دشمنوں کے غالب آنے کا امکان) ''فَمَنْ ذَا الَّذِي'' میں استفہام انکار کی صورت میں آئی کہ جب کوئی مدد کرنے والا نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ دشمن غالب آجائے۔ اس تقریر سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ''مقابلة'' پایا جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''تنويع الكلام'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ''إِنْ يَنْصُرْكُمْ'' اور ''وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ'' دونوں شرط ہے، مگر ان دونوں شرطوں کی جزاء کی نوعیت مختلف ہے۔ وہ اس طرح کہ ''إِنْ يَنْصُرْكُمْ'' کی جزاء ''فَلَا غَالِبَ لَكُمْ'' ہے، یہ جوابِ شرط منفی ہے اور اس

❶ مقابلہ محسنات بدیعیہ کی ایک قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں پہلے دو موافق معنوں کو بیان کیا جائے، پھر بالترتیب ان موافق معنوں میں سے ہر ایک کا مقابل ذکر کیا جائے، واضح رہے کہ یہاں موافق امور سے مراد وہ معانی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو مختلف نوعیت سے پیش کیا جائے۔

میں ’’لا‘‘ کے لفظ سے صراحتاً نفی کی گئی ہے۔اس کے برعکس ’’وَإِنْ یَخْذُلْکُمْ‘‘ کی جزاء ’’فَمَنْ ذَا الَّذِی یَنْصُرُکُمْ‘‘ ہے، جس میں نفی کی صراحت لفظاً تو نہیں البتہ اس میں موجود ’’مـن‘‘ استفہامیہ میں ضمناً استفہامیہ انکاریہ ہونے کی وجہ سے نفی کا معنی موجود ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں شرط کی جزائیں مختلف نوعیت کی آئی ہیں،اس لئے آیت میں ’’تنویع الکلام‘‘ موجود ہے۔

اس آیت کریمہ میں ’’تکرار‘‘ بھی پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ایک مرتبہ ’’إِنْ یَنْصُرُکُمْ‘‘ میں لفظِ ’’یَنْصُر‘‘ کا ذکر ہوا، پھراس کے بعد آگے آیت میں ’’فَمَنْ ذَاالَّذِی یَنْصُرُکُمْ‘‘ میں دوبارہ اسی لفظ ’’یَنْصُر‘‘ کوذکر کیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ’’تکرار‘‘ پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تاکہ آیت کے مضمون میں تاکید ہو۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾

اس آیت کریمہ میں ’’عَلَى اللَّهِ‘‘ جار مجرور ملکر معمول ہے ’’فَلْيَتَوَكَّلِ‘‘ فعل کے لئے اور ’’فَلْيَتَوَكَّل‘‘ فعل عامل ہے۔ویسے تو عموماً عامل مقدم اور معمول مؤخر ہوا کرتے ہیں،مگر کبھی کبھی کسی مقصد وغرض کی بناء پر معمول کو مقدم اور عامل کو مؤخر کردیا جاتا ہے۔یہاں بھی حصر کی غرض سے ’’عَلَى اللَّهِ‘‘ معمول کو اس عامل پر مقدم کردیا گیا ہے۔❷ یہاں بھی معمول کو عامل پر مقدم کرکے ’’تَوَكَّل‘‘ کو اللہ کیساتھ مختص کردیا گیا ہے۔حصر کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہئے کسی اور پر نہیں۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۱۵۹) إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ (۱۶۰)﴾

یہاں دوسری آیت کریمہ میں ’’التفات من الغیبة إلی الخطاب‘‘ پایا جاتا ہے۔

❶ تکرار اطناب کی ایک قسم ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ،کلمہ یا حکم مکرر ذکر کیا جائے۔
❷ حصر کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو دوسری شئی کیساتھ مخصوص طریقہ پر مختص کردیا جائے۔

یہاں پہلے آیت میں مؤمنین کے لئے "لَهُمْ" میں "هم" ضمیر اور "لَانْفَضُّوا" غائب کے الفاظ لائے گئے ہیں، ان الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے اگلی آیت میں مسلمانوں کے لئے "إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ" کی جگہ "إِنْ يَنْصُرْهُمْ" بول کر "هُمْ" ضمیر غائب ذکر کرنا چاہیے تھا "كُمْ" ضمیر خطاب نہیں، مگر آیت میں "هُمْ" ضمیر کی جگہ "كُمْ" ضمیر خطاب لایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "التفات من الغيبة إلى الخطاب" پایا جاتا ہے۔ یہ التفات اس لئے واقع ہوا تاکہ مسلمانوں کو مخاطب بنا کر ان کا اعزاز واکرام کیا جائے۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (١٦١)﴾

ترجمہ: اور کسی نبی سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے۔ اور جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن وہ چیز لے کر آئے گا جو اس نے خیانت کرکے لی ہوگی، پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیت کریمہ کے لفظِ "يَغُلَّ" اور "غَلَّ" کے درمیان "جناس مماثل" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "يَغُلَّ" اور "غَلَّ" دونوں فعل ہیں، اور دو فعل ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں، چونکہ یہ دونوں کلمے ایک نوع کے ہیں اور ان میں جناس واقع ہوا، اس لئے ان دونوں میں "جناس مماثل" موجود ہے۔

﴿أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (١٦٢)﴾

ترجمہ: بھلا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا تابع ہو وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف سے ناراضگی لے کر لوٹا ہو، اور جس کا ٹھکانا جہنم ہو؟ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو، یعنی دو فعلوں، دو حرفوں یا دو اسموں کے درمیان۔

اس آیتِ کریمہ میں "استعارة تصريحية" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں اللہ سبحانہ کے مشروع کردہ احکامات کو اس دلیل سے تشبیہ دی گئی ہے جس دلیل کی اتباع سے کسی کو راہ نمائی ملے۔ اس میں اللہ کے مشروع کردہ احکام "مشبہ" اور قابل اتباع دلیل "مشبہ به" ہے۔ آیت میں چونکہ "اتَّبَعَ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت میں گناہ گار کی تشبیہ اس شخص سے دی گئی ہے جسے کسی اچھے کام کے کرنے کا حکم دیا جائے، مگر وہ اس کام سے جان چھڑائے۔ اس میں گناہ گار شخص "مشبہ" ہے اور اچھے کام سے رخ پھیرنے والا "مشبہ به" ہے۔ آیت میں چونکہ "بَاءَ بِسَخَطٍ" سے مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ "سَخَطٍ" نکرہ استعمال ہوا ہے۔ نکرہ سے کبھی کسی چیز کی فخامت، حقارت، کثرت یا عظمت وغیرہ بیان کی جاتی ہیں۔ یہاں بھی "سَخَطٍ" نکرہ لا کر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا بڑا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا بڑا غضب اور ناراضگی پانے والا شخص نیک آدمی کے مانند نہیں ہوسکتا۔

اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں "أَفَمَنِ" ہمزہ استفہامیہ استعمال کیا گیا ہے۔ حروف استفہامیہ اصل میں کسی شئی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی حروف استفہامیہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے اغراض ومعانی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں ایک معنی "انکار" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہامیہ کے ذریعہ کلام میں موجود عنوان یا مضامین کی نفی کی جائے۔ یہاں بھی ہمزہ استفہام اپنے اصل معنی میں نہیں، بلکہ "انکار" کے لئے ہے۔ انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی پیروی کرنے والا اس شخص کی طرح

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

نہیں ہوسکتا جواللہ کی ناراضگی کا مستحق ٹھہرا ہوا۔

﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُم (١٦٠)أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ(١٦٢)﴾

یہاں پہلے جملہ میں لفظِ ''یَنْصُر''اور''یَخْذُلْ'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''یَنْصُر'' بمعنی (مدد کرنے) کے ہے۔اور ''یَخْذُلْ''،بمعنی (رسوا کرنے اور مدد چھوڑنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں،آیت میں ان دونوں مقابل معانی کوجمع کر دیا گیا ہے،اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں ''رِضْوَانَ اللَّهِ'' کا معنی (اللہ کی خوشنودی) کے ہے۔اور ''سَخَطٍ'' کا معنی (ناراضگی) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں ۔آیت میں ان مقابل معنوں کوجمع کر دیا گیا ہے،اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (١٦٣)﴾

ترجمہ:اللہ کے نزدیک ان لوگوں کے درجات مختلف ہیں،اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ اس کوخوب دیکھتا ہے۔

اس آیت میں کریمہ میں ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''دَرَجَاتٌ'' سے پہلے ''ذو'' اور بعد میں ''مُتَفَاوَتَةٌ مُتَخَافَةٌ'' کے الفاظ محذوف ہیں۔ یہ اصل میں ''هُم ذو دَرَجَاتٍ مُتَفَاوَتَةٍ مُتَخَافَةٍ'' تھا۔اس میں سے چونکہ ''ذو''اور''مُتَفَاوَتَةٌ مُتَخَافَةٌ'' کے الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں،اس لئے آیت میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔

❶ ایجاز حذف یہ ہے کہ کوئی جملہ،کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کر دیا جائے اور کلام میں محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (١٦٠)وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ(١٦١) وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (١٦٣)﴾

یہاں پہلے جملہ میں اہل ایمان کو بالخصوص توکل کی تاکید کی گئی ہے، حالانکہ دعائیں، عبادات وریاضات وغیرہ سب کچھ اللہ سے ہوتا ہے، مگر چونکہ توکل بہت اعلیٰ صفت ہے، اس لئے آیت میں باقیوں کو چھور کر بالخصوص اسی کا ذکر کیا۔ اسی طرح دوسرے جملہ میں خیانت کے حرمت کیساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ خیانت عام انسانوں کے لئے بھی حرام ہے، مگر یہاں عام لوگوں کا ذکر چھوڑ کر خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس لئے ہوا تاکہ خیانت کی حرمت کو پرزور انداز میں ثابت کیا جائے کہ یہ اتنا عظیم گناہ ہے کہ اس کا ارتکاب نبی کے لئے جائز نہیں تو عام مومنین کے لئے اس کے جواز کا بالکل ہی امکان نہیں۔ تیسرے جملہ میں "بِمَا يَعْمَلُونَ" بول کر بالخصوص انسانوں کے اعمال کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ کی بصارت وعلم کا تعلق لوگوں کے اقوال اور باتوں سے بھی ہے، مگر چونکہ جزاء وسزاء کی بڑی مقدار اعمال پر موقوف ہے، اس لئے آیت میں بصارت کو عمل کے ساتھ خاص کیا ہے۔

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (١٦٤)﴾

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جبکہ یہ لوگ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت کریمہ میں ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ''مَنَّ اللّٰہُ'' کے بعد ''الْهِدَايَة'' کا لفظ محذوف ہے۔ یہ اصل میں ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ الْهِدَايَة عَلَى الْمُؤْمِنِينَ'' تھا۔ آیت سے چونکہ ''الْهِدَايَة'' کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔ ایجاز حذف میں ''الْهِدَايَة'' کو مقدر ماننے کی صورت میں ''طباق'' ہوگا، یعنی ''الْهِدَايَة'' اور ''ضَلَال'' کے معنوں میں ''طباق'' ہوگا۔ ❶ یہاں ''الْهِدَايَة'' بمعنی (ہدایت) کے ہے اور ''ضَلَال'' بمعنی (گمراہی) کے ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل معنی ہیں۔ آیت میں چونکہ تقدیری طور پر ان دونوں مقابل معنوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

﴿أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (١٦٥)﴾

ترجمہ: جب تمہیں ایک ایسی مصیبت پہنچی جس سے دگنی تم (دشمن کو) پہنچا چکے تھے، تو کیا تم ایسے موقع پر یہ کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آ گئی؟ کہہ دو کہ یہ خود تمہاری طرف سے آئی ہے۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظِ ''أَصَابَتْ'' اور ''مُصِيبَةٌ'' کے درمیان ''جناس اشتقاق'' پایا جاتا ہے۔ ❷ یہاں ''أَصَابَتْ'' اور ''مُصِيبَةٌ'' کا اصل مادہ اشتقاق ''صوب'' ہے اور ان کا اصل معنی (مصیبت پہنچنا) ہے۔ ان میں چونکہ مذکورہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہیں، اس لئے ان کے درمیان ''جناس اشتقاق'' موجود ہے۔

اس آیت کریمہ کی ابتداء میں ہمزہ استفہامیہ استعمال ہوا ہے۔ حروف استفہامیہ اصل میں کسی شے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، مگر کبھی کبھی

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

❷ جناس اشتقاق یہ ہے کہ دو کلمے اصل مادہ اشتقاق اور اصل معنی میں ایک دوسرے کے موافق اور متحد ہو۔

حروفِ استفہامیہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے معانی اور اغراض کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ان میں سے ایک معنی ''انکار'' ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حروفِ استفہامیہ کے ذریعہ کسی عنوان یا مضمون کی نفی کی جائے۔اس آیت میں موجود ہمزہ استفہامیہ بھی اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں، یہ بھی ''انکار'' کے معنی میں ہے۔انکار کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تم کو غزوہ احد میں تکلیف پہنچی تو تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ یہ تکلیف وآفت کہاں سے ہم پر آپڑی؟

﴿هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ (١٦٧)﴾

ترجمہ:اس دن (جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے) وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی اور جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظ ''الْكُفْر'' اور ''الاِيمَان'' کے معنوں میں ''طباق'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''الْكُفْر'' بمعنی (کفر وانکار کرنے) کے ہے اور ''الاِيمَان'' بمعنی (ایمان لانے) کے ہے۔یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔آیت میں چونکہ یہ مقابل معانی جمع کردیئے گئے ہیں، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظِ ''يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ'' اور ''يَكْتُمُونَ'' کے معنوں میں ''طباق'' بھی پایا جاتا ہے۔یہاں ''يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ'' کا جملہ استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد (وہ باتیں ہیں جنہیں منافقین زبان سے ظاہر کرتے) تھے اور ''يَكْتُمُونَ'' سے مراد وہ باتیں جنہیں منافقین اپنے دلوں میں چھپاتے پھرتے تھے۔یہ دونوں معانی ایک دوسرے

❶ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

کے مقابل ہیں، ان مقابل معنوں کو چونکہ آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان "طباق" موجود ہے۔

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ (١٦٦) وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا (١٦٧)﴾

ترجمہ: اور تمہیں جو مصیبت اس دن پہنچی جب دونوں لشکر ٹکرائے تھے، وہ اللہ کے حکم سے پہنچی، تا کہ وہ مومنوں کو بھی پرکھ کر دیکھ لے۔ اور منافقین کو بھی دیکھ لے، اور ان (منافقوں) سے کہا گیا تھا کہ آؤ اللہ کے راستے میں جنگ کرو یا دفاع کرو۔

ان دونوں آیتوں میں "تکرار" پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلی آیت میں ایک مرتبہ "وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ" بول کر فعل "يَعْلَمَ" کا ذکر کیا گیا ہے پھر اس کے بعد اگلی آیت میں "وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا" میں دوبارہ اسی فعل "يَعْلَمَ" کا ذکر کیا گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں "تکرار" موجود ہے۔ یہ تکرار اس لئے واقع ہوا کیونکہ ان فعلوں کا متعلق جدا جدا ہے۔ پہلے فعل کا متعلق اہل ایمان اور دوسرے فعل کا متعلق اہل نفاق ہے۔ ان کے درمیان علیحدگی اور جدائی پائی جاتی ہے، اس لئے آیت میں دونوں "يَعْلَمَ" فعل لا کر "تکرار" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور ہر ایک کی معرفت پر اللہ رب العزت دونوں کو الگ الگ جزاء دے گا۔

﴿الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (١٦٨)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے (شہید) بھائیوں کے بارے میں بیٹھے بیٹھے یہ باتیں بناتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو خود اپنے آپ ہی سے موت کو ٹال دینا۔

اس آیت کریمہ میں بھی تقدیری طور پر "قَعَدُوْا" اور "خَرَجُوْا" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ یہ جملہ اصل میں "الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا حِينَ خَرَجُوْا" تھا۔

اس میں قَعَدُوا ''قعوداً'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (جہاد میں جانے سے رکنا) ہے۔ اور خَرَجُوا ''خروج'' مصدر سے مشتق ہے، اس کا معنی (جہاد کے لئے نکلنے) کے ہے۔ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت میں سے چونکہ ان مقابل معنوں کو تقدیری اعتبار سے جمع کر دیا گیا ہے، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''احتجاج نظری'' پایا جاتا ہے۔ ❶ منافقین جہاد میں جانے کو اپنے حق میں ہلاکت اور موت سمجھتے تھے اور جہاد سے پیچھا چڑھانے کو حیات سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی تردید کی اور اسے ایک عقلی دلیل سے ثابت کیا کہ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو کہ جہاد میں موت آتی ہے تو ذرا ایسا تو کرو کہ جہاد کے علاوہ حالات میں موت کو ٹال دو، لیکن تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ جہاد میں اگر تم نہیں مارے گئے تب بھی موت تمہارے مقدر ضرور ہوگی۔ اس میں منافقوں کے خیال کی تردید ایک عقلی طریقہ سے کی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''احتجاج نظری'' موجود ہے۔

﴿فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۷۰) يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۷۱)﴾

ترجمہ: اور ان کے پیچھے جو لوگ ابھی ان کے ساتھ (شہادت میں) شامل نہیں ہوئے، ان کے بارے میں اس بات پر بھی خوشی مناتے ہیں کہ (جب وہ ان سے آکر ملیں گے تو) نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل پر بھی خوشی مناتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ اللہ مؤمنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ متکلم کلام میں ایسی باتیں یا معانی ذکر کرے جن پر عقلی دلائل سے استدلال کرنا ممکن ہو۔

ان دونوں آیتوں میں ”تکرار“ پایا جاتا۔ یہاں پہلی آیت میں ایک مرتبہ ”یَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِینَ لَمْ یَلْحَقُوا“ میں ”یَسْتَبْشِرُونَ“ فعل کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد اگلی آیت میں ”یَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ“ بول کر دوبارہ اسی فعل ”یَسْتَبْشِرُونَ“ کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں ”یَسْتَبْشِرُونَ“ فعل کا ”تکرار“ پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ اہل ایمان کی فضلیت کو تاکید سے بیان کیا جائے۔

﴿یَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لا یُضِیعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِینَ﴾

اس آیت کریمہ میں ”لَا یُضِیعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِینَ“ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ مؤمنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے جبکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتے، دنیا یا آخرت میں ضرور عمل کا بدلہ دیتے ہیں، آخرت میں تو مؤمنوں کو اور دنیا میں کافروں کو ان کے عمل کا اجر دے دیتے ہیں۔ اس کے باوجود آیت میں ”أَجْرَ الْمُؤْمِنِینَ“ بول کر مؤمنوں کا ذکر کیا گیا ہے، دوسروں کا ذکر چھوڑ دیا گیا۔ یہ تخصیص اس لئے واقع ہوئی تا کہ اہل ایمان کی شرافت وکرامت کا خوب اظہار ہو۔

﴿وَلا یَحْزُنْکَ الَّذِینَ یُسَارِعُونَ فِی الْکُفْرِ إِنَّهُمْ لَنْ یَضُرُّوا اللَّهَ شَیْئًا یُرِیدُ اللَّهُ أَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیمٌ (۱۷۶)﴾

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) جو لوگ کفر میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھا رہے ہیں، وہ تمہیں صدمے میں نہ ڈالیں، یقین رکھو وہ اللہ کا ذرا بھی نقصان نہیں کر سکتے، اللہ یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے، اور ان کے لیے زبردست عذاب (تیار) ہے۔

ان دونوں آیتوں میں ”تکرار“ پایا جاتا ہے۔ پہلی آیت میں ایک مرتبہ ”لَنْ یَضُرُّوا اللَّهَ“ میں لفظ ”اللَّه“ کا ذکر ہوا پھر اس کے بعد آگے آیت میں ”یُرِیدُ اللَّهُ“ بول کر دوبارہ اسی لفظ ”اللَّهُ“ کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں لفظ ”اللَّهُ“ کا تکرار موجود ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں ”إِنَّهُمْ“ میں ایک مرتبہ ”هُمْ“ کا ذکر ہوا ہے، پھر اس کے

بعد ''لَهُمْ حَظًّا، وَلَهُمْ عَذَابٌ'' میں دوبارہ اسی ''هم'' ضمیر کو دہرایا گیا، اس سے واضح ہوا کہ پہلی آیت میں بھی ''تکرار'' موجود ہے۔ یہ دونوں تکرار آیت کے مفہوم کو مؤکد کرنے اور اللہ رب العزت کو ضرر نہ پہنچانے، کفار کا آخرت میں حصہ نہ ہونے اور ان کے لیے بڑے عذاب کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔

﴿وَلَا يَحْزُنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ (۱۷۶)﴾

اس آیت کریمہ میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں کفر وشرک کی مدد کرنے کو کسی کام میں جلدی کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں کفر وشرک کی مدد کرنا ''مشبه'' ہے اور جلدی سے کام سرانجام دینا ''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''يُسَارِعُونَ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۷۷)﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو مول لے لیا ہے وہ اللہ کو ہرگز ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور ان کے لیے ایک دکھ دینے والا عذاب تیار ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''طباق'' موجود ہے۔ ❷ یہاں ''الْكُفْرَ'' بمعنی (کفر وانکار کرنے) کے ہے۔ اور ''الإِيمَانِ'' بمعنی (ایمان لانے) کے ہے۔ یہ دو معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، آیت میں یہ دو مقابل معانی جمع کردیئے گئے ہیں، اس لئے ان کے درمیان ''طباق'' موجود ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔ ❸ یہاں ایمان کے

❶ استعارہ تصریحیہ جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ طباق یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

❸ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

بدلے کفر اپنانے کو خریداری کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں ایمان کے بدلے کفر اپنانا ''مشبه'' اور خریداری کرنا''مشبه به'' ہے۔ان میں وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح خریداری میں ثمن کے بدلہ مبیع لی جاتی ہے، اسی طرح کافروں نے ایمان کے بدلہ میں کفر لیا ہے۔ آیت میں ''اشْتَرَوُا''، بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية''موجود ہے۔

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ (۱۷۸)﴾

ترجمہ:اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں تا کہ وہ گناہ میں اور آگے بڑھ جائیں اور(آخر کار)ان کے لیے ایسا عذاب ہوگا جو انہیں ذلیل کر کے رکھ دے گا۔

اس آیت میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔اس میں ایک مرتبہ''أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ'' میں ''نُمْلِي'' فعل کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آگے آیت میں''إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا'' میں دوبارہ''نُمْلِي''کا ذکر ہوا ہے۔اس سے واضح ہو کہ آیت میں''تکرار'' موجود ہے۔یہ تکرار اس لئے واقع ہوا تا کہ تاکید کے ساتھ اس بات کی وضاحت ہو کہ ڈھیل دینا اِن کے عذاب کو بڑھانے کے لیے ہے،تا کہ مزید گناہوں میں آگے بڑھتے رہیں اور رُسوا کن عذاب کے مستحق بنیں۔

اس آیت کریمہ میں''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔یہاں سزا نہ دینے کو مہلت دینے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں سزا نہ دینا''مشبه''اور مہلت دینا''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ''نُمْلِي''،بول کر مشبہ بہ (مہلت دینا) کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس جملہ میں''استعارة تصريحية''موجود ہے۔اسی طرح آیت میں گناہوں کے

بڑھنے کو جسمانی چیز کے بڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں گناہوں کا بڑھنا"**مشبہ**" ہے اور جسمانی اشیاء کا بڑھنا"**مشبہ بہ**" ہے۔آیت میں "**لِیَزْدَادُوْا**" بول کر چونکہ مشبہ بہ (جسمانی چیزوں کا بڑھنا) کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے اس میں "**استعارۃ تصریحیۃ**" موجود ہے۔

﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۷۹)﴾

ترجمہ:اللہ ایسا نہیں کرسکتا کہ مؤمنوں کو اس حالت پر چھوڑ رکھے جس پر تم لوگ اس وقت ہو،جب تک وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کردے،اور (دوسری طرف) وہ ایسا بھی نہیں کرسکتا کہ تم کو (براہ راست) غیب کی باتیں بتادے۔ہاں وہ (جتنا بتانا مناسب سمجھتا ہے اس کے لیے) اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو،اور اگر ایمان رکھو گے اور تقوی اختیار کرو گے تو زبردست ثواب کے مستحق ہوگے۔

﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ (۱۷۹)﴾

اس آیت کریمہ میں اگر "**أَنْتُمْ**" کا مخاطب مؤمنین ہو تو آیت میں "**التفات من الغیبة إلی التکلم**" پایا جائیگا۔یہاں "**لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِینَ**" میں لفظ "**الْمُؤْمِنِینَ**" استعمال ہوا ہے۔یہ لفظ اسمِ ظاہر ہے اور اسم ظاہر الفاظ غائب کے قبیل میں سے ہے۔اس لحاظ سے آیت میں آگے مؤمنین کے لئے "**عَلَی مَا أَنْتُمْ**" کی جگہ "**عَلَی مَا هُمْ عَلَیه**" بول کر "**هُمْ**" غائب کی ضمیر لانا چاہیے تھی تاکہ مؤمنین کی طرح "**هُمْ**" بھی غائب کا لفظ ہوتا،مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ "**هُمْ**" کی جگہ "**أَنْتُمْ**" بول کر خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "**التفات من الغیبة إلی الخطاب**" واقع ہوا ہے۔یہ اس لئے

ہوا تا کہ مؤمن کی عظمت شان واضح کی جائے۔یہ تفصیل اس صورت میں ہے جب "أَنْتُمْ" کے مخاطب مؤمنین ہو،اگر "أَنْتُمْ" کے مخاطب مومنین کے علاوہ دوسرے افراد ہوتو پھر یہ التفات کے قبیل سے نہیں ہوگا بلکہ "تلوین الخطاب" کے قبیل سے ہوگا۔❶ یہاں بھی "لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ" میں مؤمنین کی بات چل رہی تھی کہ اس انداز سے آیت کو "مَا أَنْتُمْ" بول کر غیر مؤمنین کی طرف پھیر دیا۔اس واضح ہوا کہ آیت میں "تلوین الخطاب" موجود ہے۔

﴿حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾

اس جملہ میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔اس میں منافقوں کو ناپاک چیز سے اور مسلمانوں کو پاک چیز سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس تشبیہ میں مسلمان اور منافق "مشبه" ہے اور ناپاک وپاک چیزیں "مشبه به" ہیں۔آیت میں چونکہ "الْخَبِيث" اور "الطَّيِّبِ" بول کر مشبہ بہ (ناپاک و پاک) کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے آیت میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔

اس جملہ میں "طباق" بھی پایا جاتا ہے۔یہاں "الْخَبِيث" بمعنی (ناپاک) کے ہے۔اور "الطَّيِّبِ" بمعنی (پاک) کے ہے۔یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت میں یہ دونوں مقابل معنوں کو جمع کردیئے گئے ہیں،اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔

﴿فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

اس آیت کریمہ کے لفظِ "آمِنُوا" اور "تُؤْمِنُوا" کے درمیان "جناس مماثل" موجود ہے۔❷ یہاں "آمِنُوا" اور "تُؤْمِنُوا" دونوں فعل ہیں،اور دونوں ایک ہی نوع

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کردیا جائے۔

❷ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو،یعنی دو فعلوں، دو حرفوں یا دو اسموں کے درمیان۔

کے کلمے ہیں، چونکہ ایک نوع کے ان دونوں کلموں میں جناس پایا جاتا ہے،اس لئے ان کے درمیان ”جناس مماثل“ موجود ہے۔

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۱۸۰)﴾

ترجمہ: اور جو لوگ اس (مال) میں بخل سے کام لیتے ہیں جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے کوئی اچھی بات ہے، اس کے برعکس یہ ان کے حق میں بہت بری بات ہے، جس مال میں انہوں نے بخل سے کام لیا ہوگا، قیامت کے دن وہ ان کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔ اور سارے آسمان اور زمین کی میراث صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت کریمہ میں ”التفات من الغيبة الى الخطاب“ پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلے جملہ میں ”يَبْخَلُونَ“ وغیرہ غائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت میں آگے ”تَعْمَلُونَ“ کی جگہ ”يَعْمَلُونَ“ بول کر غائب کا صیغہ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ آیت میں ”يَعْمَلُونَ“ غائب کی جگہ ”تَعْمَلُونَ“ خطاب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ”التفات من الغيبة إلى الخطاب“ موجود ہے۔ یہ التفات اس لئے ہوا تاکہ سامع کو سننے میں لطف آئے۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۱۸۱)﴾

ترجمہ: اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مال دار ہیں۔ ہم ان کی یہ بات بھی (ان کے اعمال نامے میں) لکھے لیتے ہیں، اور انہوں نے انبیاء کو جو ناحق قتل کیا ہے، اس کو بھی، اور (پھر) کہیں گے کہ دہکتی آگ کا مزہ چکھو۔

اس آیت کریمہ میں ''إِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ'' یہود کے قول کی حکایت ہے۔ یہود کہا کرتے تھے کہ (نعوذ باللہ من ذلک) اللہ فقیر ہے اور ہم یہود مالدار ہیں۔اس میں یہود نے ایک جملہ ''إِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ'' کو اللہ کی طرف منسوب کیا اور دوسرا ''وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ'' اپنی طرف۔اس میں انہوں نے دو تاکیدات بیان کیں:

نمبر۱: ''إِنَّ''۔

نمبر۲: جملہ اسمیہ جو تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

یہ دونوں تاکیدات اس لئے لائے ہیں تاکہ یہ لوگ فقر کی نسبت اللہ کی طرف کرنے میں مبالغہ کرسکیں،اس کے برعکس یہود نے ''نَحْنُ أَغْنِيَاءُ'' بول کر خود کے لئے ایسا جملہ منسوب کیا جس میں تاکید کا نام ونشان نہیں، گویا یہود نے اپنے لئے ایسا جملہ بیان کیا جو کسی طرح تاکید کا محتاج نہیں، وہ مالدار اور اغنیاء کی صفت سے اس قدر متصف ہے کہ اس میں گویا کسی کو اختلاف کرنے یا انکار کرنے کی گنجائش ہی نہیں،اس لئے انہوں نے اپنے لئے منسوب جملہ کو بلا تاکید کے ذکر کیا ہے۔ان کا اللہ کی طرف جملہ کو تاکید سے منسوب کرنا اور اپنی طرف بلا تاکید منسوب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان لوگوں میں ''تعنت'' پایا جاتا تھا اور یہ لوگ گھرے کفر وسرکشی میں پڑے ہوئے تھے۔

﴿سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا﴾

اس آیت کریمہ میں ''مجاز عقلی''(اسناد عقلی) پایا جاتا ہے۔[1] یہاں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ''سَنَكْتُبُ'' بول کر یہود کے قول کے لکھنے کو خود کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ لکھتے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے فرشتے لکھتے ہیں،اس لحاظ سے اس فعل کا فاعل حقیقی فرشتے ہیں اللہ تعالیٰ نہیں، مگر اللہ کے حکم سے فرشتے لکھتے ہیں،اس لئے اس میں مناسبت

---

[1] مجاز عقلی کا مطلب یہ ہے کہ فعل یا معنی فعل یعنی فعل مجہول اور اسمائے مشتقات وغیرہ کی نسبت کسی ظاہری مناسبت کی وجہ سے فاعل حقیقی کے بجائے فاعل غیر حقیقی کی طرف کردی جائے۔

موجود ہے۔اس مناسبت کی وجہ سے آیت میں فعلِ ''سَنَكْتُبُ'' کی نسبت فاعل حقیقی (فرشتہ) کی طرف کرنے کے بجائے فاعل غیر حقیقی (اللہ سبحانہ تعالیٰ) کی طرف کردی گئی ہے،اس لئے اس میں ''مجاز عقلی'' پایا جاتا ہے۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا﴾

اس جملہ میں کے لفظِ ''قَوْلَ''اور''قَالُوا''میں ''جناس مغائر'' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں ''قَوْلَ''،اسم اور''قَالُوا''،فعل ہے۔یہ دونوں دو الگ الگ نوع کے کلمے ہیں،چونکہ دونوں میں جناس واقع ہوا ہے،اس لئے ان میں ''جناس مغائر'' پایا جاتا ہے۔

﴿ذَلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ (۱۸۲)﴾

ترجمہ: یہ سب تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے جو تم نے آگے بھیج رکھا تھا،ورنہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔❷ یہاں ''أَيْدِیْ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے،جس کا حقیقی معنی (ہاتھوں) کے ہے،مگر آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ اعمال صرف ہاتھ نہیں کرتے بلکہ انسان کا پورا وجود عمل کرنے میں شامل ہوتا ہے۔ اس لئے آیت میں اس لفظ کا مجازی معنی (نفس انسان) مراد لیا جائے گا۔لفظ''أَيْدِیْ'' کے ان دونوں معنوں (ہاتھوں اور نفس انسان) میں علاقہ کلیت، جزئیت کا ہے، کیونکہ (ہاتھ) جزء اور (نفس انسان) کل ہے۔آیت میں گویا جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔اس لئے آیت میں ''مجاز مرسل'' پایا جاتا ہے۔

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو نوع کے کلموں میں جناس پایا جائے۔

❷ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس کے معنی حقیقی اور معنی مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو بلکہ سببیت ومسببیت، کلیت وجزئیت، حالیت ومحلیت، ما کان علیہ وما یکون علیہ،لزوم یا عموم وخصوص کے علاقوں میں سے کوئی ایک علاقہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں انسانی اعضاء میں سے دوسرے اعضاء کو چھوڑ کر بالخصوص ''أَیْد''
بول کر ہاتھوں کی تخصیص کی گئی ہے، کیونکہ زیادہ تر اعمال ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں۔

﴿سَنَكْتُبُ مَاقَالُوْا...... ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ(۱۸۱) ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ (۱۸۲)﴾

یہاں پہلے جملے میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔❶ اس جملہ میں محفوظ کرنے کو لکھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس استعارہ میں محفوظ کرنا ''مشبه'' ہے اور لکھنا ''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''سَنَكْتُبُ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس آیت میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں ''استعارة مكنية'' پایا جاتا ہے۔❷ اس آیت کریمہ میں جہنم کے عذاب کو ایسی چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو چکھی جاتی ہو، اس میں جہنم کا عذاب ''مشبه'' ہے اور چکھی جانے والی اشیاء ''مشبه به'' ہیں۔آیت میں ''عَذَابَ الْحَرِيقِ'' بول کر مشبہ (جہنم کا عذاب) ذکر کردیا گیا اور مشبہ بہ (چکھی جانے والی چیزیں) محذوف کردی گئی ہے، البتہ ''ذُوقُوْا'' بول کر مشبہ بہ کے ایک لازم (چکھنے) کا ذکر کرکے ''مشبه به'' کی طرف اشارہ کردیا گیا، اس لئے اس میں ''استعارة مكنية'' موجود ہے۔

اسی طرح دوسرے جملہ میں عمل ادا کرنے کو کسی چیز کو آگے بھیجنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں عمل ادا کرنا ''مشبه'' ہے اور کسی چیز کو آگے بھیجنا ''مشبه به'' ہے۔آیت میں چونکہ ''قَدَّمَتْ''، بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کردی گئی ہے، اس لئے اس آیت میں بھی ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں مذکور ہو۔

❷ استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ محذوف ہو اور مشبہ مذکور ہو، البتہ مشبہ بہ کے کسی لازم کو ذکر کرکے مشبہ بہ کی طرف اشارہ کردیا جائے۔

﴿الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّى يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَاءَ كُمْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَ بِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (١٨٣)﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے یہ وعدہ لیا ہے کہ کسی پیغمبر پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لے کر نہ آئے جسے آگ کھا جائے۔تم کہو کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس بہت سے پیغمبر کھلی نشانیاں بھی لے کر آئے اور وہ چیز بھی جس کے بارے میں تم نے (مجھ سے) کہا ہے۔پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم واقعی سچے ہو؟

اس آیت کریمہ میں ”مذہب کلامی“ پایا جاتا ہے۔❶ یہود کو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کا کہا جاتا ہے تو فوراً وہ بولتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم بھیجا کہ جب تک کوئی پیغمبر ہمارے پاس ایسی نیاز لے کر نہ آئے جس کو آگ آ کر کھا جائے تب تک ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے۔اللہ سبحانہ نے اس قول کے بعد یہود کو جھوٹا قرار دیا اور یہود کے جھوٹ کو ثابت کرنے کے لئے ان کے خلاف مسلمہ دلیل پیش کی کہ تمہارا دعویٰ سچا نہیں، کیونکہ اس سے پہلے بہت سے انبیاء دلائل وحقانیت کی نشانیاں لے کر آئے تھے، اگر تم سچے ہوتے تو تم ان کو قتل نہ کرتے ،تم نے انہیں قتل کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے تمہیں ایسا حکم نہیں دیا جیسا تم کہتے ہو۔یہ چونکہ ایسی دلیل ہے جو مخاطبین (یہود) کے نزدیک بھی مسلّم ہے اور اس دلیل سے متکلم کی مراد بھی پوری ہو جاتی ہے،اس لئے آیت میں ”مذہب کلامی“ موجود ہے۔

❶ مذہب کلامی یہ ہے کہ متکلم اپنے دعوی کی صحت پر مخاطب کے نزدیک مسلّم قطعی دلیل پیش کرے،اس طور پر کہ ان دلیلوں کے مقدمات تسلیم کر لینے سے مطلوب اور مقصود لازمی طور پر ثابت ہو جائے۔

﴿يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ (۱۸۳) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ(۱۸۵)﴾

اس جملے میں "استعارۃ تصریحیۃ" اور "تبعیۃ" پائے جاتے ہیں۔❶ یہاں آگ کے جلانے دینے کو کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں آگ کا کسی چیز کو جلانا "مشبہ" ہے اور کھانا کھانا "مشبہ بہ" ہے۔آیت میں "تَأْكُلُهُ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارۃ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔اس آیت میں "استعارۃ تبعیۃ" بھی موجود ہے۔❷ یہاں "تَأْكُلُ" فعل ہے، اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں "استعارۃ تبعیۃ" موجود ہے۔

اسی طرح دوسری آیت کے جملہ میں موت پانے کو کسی چیز کے چھکنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں موت پانا "مشبہ" ہے اور کسی چیز کو چھکنا "مشبہ بہ" ہے۔آیت میں چونکہ "ذَائِقَةُ" بول کر مشبہ بہ صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے، اس لئے آیت میں 'استعارہ تصریحیۃ" پایا جاتا ہے۔یہاں لفظ "ذَائِقَةُ" اسم مشتق بھی ہے، چونکہ اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے یہ بھی "استعارۃ تبعیۃ" کی قبیل سے ہوگا۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا(۱۸۱) فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۱۸۴)﴾

یہاں دونوں آیتوں میں "جناس مماثل" پایا جاتا ہے۔❸ یہاں دونوں "قَالُوا" فعل ہے اور دونوں ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان دونوں فعلوں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں "جناس مماثل" موجود ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں لفظ

❶ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی جائے۔

❷ استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جو فعل، حرف، یا اسمائے مشتقات میں واقع ہو۔

❸ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو یعنی دو اسموں، دو فعلوں یا دو حرفوں میں۔

''كَذَّبُوْكَ'' اورلفظ ''كُذِّبَ'' دونوں فعل ہیں۔ یہ دونوں بھی فعل ہونے کی وجہ سے ایک ہی نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان دونوں میں جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں بعض علماءِ قرآءت نے ''بِالْبَيِّنَاتِ'' کی طرح ''الزُّبُرِ وَالْكِتَابِ'' کو بھی ''باء'' کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی انہوں نے ''جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَبالزُّبُرِ وَبالْكِتَابِ'' کے ساتھ پڑھا۔ اگر آیت میں اس قرآءت کو تسلیم کرلیا جائے تو آیت میں ''باء'' کی زیادتی ہوگی اور وہ زیادتی ایسی صورت میں آیت کے مضمون میں تاکید کا فائدہ دے گی۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (١٨٥)﴾

ترجمہ: ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور تم سب کو (تمہارے اعمال کے) پورے پورے بدلے قیامت ہی کے دن ملیں گے۔ پھر جس کسی کو دوزخ سے دور ہٹالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہ صحیح معنی میں کامیاب ہوگیا، اور یہ دنیوی زندگی تو (جنت کے مقابلے میں) دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں۔

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (١٨٥)﴾

اس آیت کریمہ میں ''تشبیہ بلیغ'' پائی جاتی ہے۔❶ یہاں دنیاوی زندگی کو اس سامان سے تشبیہ دی گئی ہے جس سامان کو خریدار دھوکہ سے پیش کرے اور خریدنے والا بیچارہ دھوکہ کھا کر اس سامان کو خرید لے۔ اس میں دنیاوی زندگی ''مشبہ'' ہے اور دغہ بازی سے بیچا جانے والا سامان ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں نہ تو ان دونوں کے درمیان وجہ شبہ ذکر کیا گیا نہ ہی کوئی حرف تشبیہ، اس لئے آیت میں ''تشبیہ بلیغ'' پائی جاتی ہے، یہ اصل میں ''وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا كَمَتَاعِ الْغُرُورِ'' تھا۔

❶ تشبیہ بلیغ وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ اور حرف تشبیہ دونوں مذکور نہ ہو۔

﴿إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ (١٨١) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (١٨٥)﴾

یہاں پہلے جملہ کے لفظ "فَقِيرٌ اور أَغْنِيَاءُ" کے معنوں میں "طباق" پایا جاتا ہے۔ ❶ یہاں "فَقِيرٌ" بمعنی (غریب ومحتاج) کے ہے۔ اور "أَغْنِيَاءُ" بمعنی (مالدار ومستغنی) کے ہے۔ یہ معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ آیت مین ان مقابل معنوں کو جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں "النَّارِ" بمعنی (جہنم) کے ہے۔ اور "الْجَنَّةَ" بمعنی (جنت وباغات) کے ہے۔ یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، اس لئے ان میں "طباق" موجود ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں "الموت" بمعنی (موت) کے ہے، اور "الْحَيَاةُ" بمعنی (زندگی) کے ہے، یہ بھی ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں۔ ان کو بھی آیت میں جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان معنوں کے درمیان "طباق" موجود ہے۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ (١٨١) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ (١٨٥)﴾

ان دونوں آیتوں میں "التفات من الغيبة الى الخطاب" پایا جاتا ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے پہلے اپنے لئے "سَمِعَ" غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس لحاظ سے آگے آیت میں "سَنَكْتُبُ" کے بجائے "سَيَكْتُبُ" بولنا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی جگہ "سَنَكْتُبُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو تکلم کا لفظ ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں "التفات من الغيبة إلى التكلم" پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اگلی آیت

❶ طباق یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کردیا جائے۔

میں ”التفات من الغیبة الی الخطاب“ پایا جاتا ہے۔ ❶ اس جملہ میں پہلے ”کُلُّ نَفۡسٍ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ لفظ اسمِ ظاہر ہے اور اسمِ ظاہر غائب کے قبیل سے ہے۔ اس لحاظ سے آگے آیت میں ”أُجُورَكُمۡ“ میں ”كم“ خطاب کی جگہ ”أُجُورَهُمۡ“ بول کر غائب کی ضمیر لانا چاہیے تھی، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ آیت میں غائب کی جگہ ”كُـــمۡ“ بول کر خطاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ”التفات من الغیبة الی الخطاب“ پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلی آیت میں التفات اس لئے واقع ہوا تاکہ اللہ سبحانہ کی عظمت شان اور بڑائی واضح ہو، اور دوسرے جملہ میں التفات اس لئے واقع ہوا تاکہ بات میں تاکید پیدا ہو۔

﴿وَإِنۡ تَصۡبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡأُمُورِ (۱۸۶)﴾

ترجمہ: اور اگر تم نے صبر اور تقوی سے کام لیا تو یقیناً یہی کام بڑی ہمت کے ہیں (جو تمہیں اختیار کرنے ہیں)۔

اس آیت کریمہ میں ”إِنۡ تَصۡبِرُوا وَتَتَّقُوا“ پورا جملہ شرط ہے۔ اس شرط کی جزاء میں آگے ”ذَٰلِكَ“ اسم اشارہ استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم اشارہ اس لئے استعمال ہوا تاکہ صبر وتقویٰ کی عظمت شان واضح کی جائے۔

﴿وَإِذۡ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الۡكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكۡتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُونَ (۱۸۷)﴾

ترجمہ: اور (ان لوگوں کو وہ وقت نہ بھولنا چاہئے) جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ تم اس کتاب کو لوگوں کو سامنے ضرور کھول کھول کر بیان کرو گے، اور اس کو چھپاؤ گے

❶ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا سیاق وسباق تو الفاظ غائب کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں غائب کی جگہ خطاب کے الفاظ ذکر کر دیئے جائے۔

نہیں۔ پھر انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سے قیمت حاصل کرلی، اس طرح کتنی بری ہے وہ چیز جو یہ مول لے رہے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ”استعارۃ تصریحیۃ تبعیۃ“ پائے جاتے ہیں۔ یہاں اقرار وعہد کی پامالی کرنے کو کسی چیز کو انسان کے پیٹھ کے پیچھے سے پھینکنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں اقرار وعہد کی پامالی کرنا ”مشبہ“ ہے اور پیٹھ کے پیچھے پھینکنا ”مشبہ بہ“ ہے۔آیت میں چونکہ ”فَنبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ“ بول کر مشبہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ”استعارۃ تصریحیۃ“ پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں ”فَنَبَذُوا“ فعل مشتق ہے، اور اس میں استعارہ واقع ہوا ہے، اس لئے آیت میں ”استعارۃ تبعیۃ“ بھی موجود ہے۔

اسی طرح اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے چھپانے پر دنیا کے معمولی رقم لینے کو تھوڑا پیسہ دے کر کسی چیز کی خریداری کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کا کتمان کرنا، تحریف کرنا اور اس کے بدلہ دنیا کا معمولی رقم لینا ”مشبہ“ ہے اور خریداری کرنا ”مشبہ بہ“ ہے۔آیت میں چونکہ ”اشْتَرَوْا بِهِ“ بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ”استعارۃ تصریحیۃ“ پایا جاتا ہے۔اسی طرح لفظ ”اشْتَرَوْا“ فعل ہے، فعل میں جب استعارہ واقع ہوا تو وہ استعارہ تبعیہ کے قبیل میں سے ہوتا ہے، لہٰذا ”اشْتَرَوْا“ میں بھی ”استعارۃ تبعیۃ“ ہوگا۔

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (١٩٠)﴾

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے بارے آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ”لِأُولِي الْأَلْبَابِ“ بول کر عقلمندوں کی تخصیص

کی ہے، حالانکہ آسمان وزمین کی تخلیق، دن اور رات کے اختلاف میں صرف ان ہی کے لئے نشانیاں نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے یہ نشانیاں ہیں، خواہ عقلمند ہوں یا غیر عقلمند، مگر چونکہ ان نشانیوں سے زیادہ تر استفادہ عقلمند لوگ ہی کرتے ہیں، اس لئے آیت میں دوسروں کا ذکر چھوڑ کر بالخصوص ''لِأُولِی الْأَلْبَابِ'' بول کر عقلمندوں کی تخصیص کی گئی ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''لَآیَاتٍ'' نکرہ استعمال ہوا ہے۔ نکرہ سے کبھی شئی کی فخامت اور عظمت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی ''لَآیَـاتٍ'' کو نکرہ لا کر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی عظمت وفخامت کو بیان کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق اور دن، رات کے اختلاف میں عقلمندوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہاں ''لَآیَـاتٍ'' إِنَّ حرف مشبہ بالفعل کی خبر ہے، اس خبر میں ''لام'' تاکید کا دخول ہوا ہے۔ یہ ''لام'' خبر میں اس لئے داخل ہوا تاکہ ''إِنَّ'' سے جو تاکید حاصل ہوئی ہے اس میں مزید تاکید ہو۔

﴿ الَّـذِیـنَ یَـذْكُـرُونَ اللَّهَ قِیَامًا وَ قُعُودًا وَ عَلَى جُنُوبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُونَ فِی خَـلْقِ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱)﴾

ترجمہ: جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔

اس آیت کریمہ میں ''هَذَا'' اسم اشارہ استعمال ہوا ہے۔ اسم اشارہ کئی اغراض ومقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک غرض تعظیم ہے۔ (۱) یہاں بھی اسم اشارہ تعظیم کے لئے ہے۔ اس اسم اشارہ سے آسمان وزمین کی تخلیق کی عظمت بیان کی گئی ہے۔

---

(۱) تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ اسم اشارہ کو مشار الیہ کی عظمتِ شان بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

﴿رَبَّنَا إِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۱۹۲)﴾

ترجمہ: اے ہمارے رب! آپ جس کسی کو دوزخ میں داخل کردیں، اسے آپ نے یقیناً رسوا ہی کردیا، اور ظالموں کو کسی قسم کے مددگار نصیب نہ ہوں گے۔

اس آیت کریمہ میں "وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ" میں ظالموں کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ مددگاروں کا نہ ملنا صرف ظالموں کے لئے ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے اوصاف کے مالک افراد کے لئے بھی مددگار وانصار نہیں ہونگے مگر چونکہ ظلم کرنا ایک بہت برا فعل ہے، اس فعل کی شناعت وقباحت میں تاکید بیان کرنے کے لئے آیت میں دیگر لوگوں کا ذکر چھوڑ کر بالخصوص ظالموں کا ذکر ہوا ہے۔

اس آیت کریمہ میں "الاظهار فی مقام الاضمار" پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلے "إِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ" میں "مَنْ" موصولہ استعمال ہوا ہے۔ یہ "مَنْ" موصولہ آگے آیت میں آنے والی ضمیروں کا مرجع بن سکتا ہے، اس لحاظ سے آیت میں آگے "وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ" کی جگہ "وَمَا لَهُمْ" (یہ اس صورت میں جب "مَنْ" سے اس کا معنی مراد لیا جائے) یا "وَمَالَه" (یہ اس صورت میں جب "مَنْ" سے صرف لفظ مراد ہو) ہونا چاہئے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ آیت میں "لهم یا لـه" کی صورت میں ضمیر لانے کے بجائے "وَمَا لِلظَّالِمِينَ" بول کر اسم ظاہر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں "الاظهار فی مقام الاضمار" موجود ہے۔ یہ اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جائے کہ جہنم میں داخل ہونے والے کافروں کو مددگار اس لئے نہیں ملے گا کیونکہ انہوں نے کفر کی صورت میں ظلم کیا ہے۔

﴿رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ (۱۹۳)﴾

❶ یہ کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتضائے حال اور کلام کا سیاق وسباق تو ضمیر کا تقاضہ کرے، مگر کلام میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لایا جائے۔

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، چنانچہ ہم ایمان لے آئے۔ لہٰذا اے ہمارے پروردگار! ہماری خاطر ہمارے گناہ بخش دیجیے ہماری برائیوں کو ہم سے مٹا دیجیے، اور ہمیں نیک لوگوں میں شامل کرکے اپنے پاس بلائیے۔

اس آیت کریمہ میں ''تَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ'' بول کر نیکوکاروں کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ بزرگی کے دیگر درجات اور بھی ہے، مثلاً مقربین، صدیقین، شہداء وغیرہ۔ مگر آیت میں ان کا ذکر نہیں ہوا، چونکہ یہاں مقصود ابرار کی فضلیت کو بیان کرنا ہے، اسی لئے بالخصوص آیت میں دیگر کو چھوڑ کر ابرار کی تخصیص ہوئی ہے۔

﴿رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي (۱۹۳)﴾

اس جملہ کے لفظ ''مُنَادِیاً'' اور ''یُنَادِي'' کے درمیان ''جناس مغائر'' موجود ہے۔ ❶ یہاں ''مُنَادِیًا'' اسم اور ''یُنَادِي'' فعل ہے۔ یہ دونوں دو نوع کے کلمے ہیں، چونکہ ان کے درمیان جناس واقع ہوا ہے، اس لئے ان میں ''جناس مغائر'' موجود ہے۔

اگر اس آیت میں ''سَمِعْنَا'' سے قرآن مجید مراد ہو تو اس میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جائے گا۔ ❷ یہاں قرآن مجید میں موجود امر، نہی اور وعدہ وعید وغیرہ کے قبول کرنے کو سماعت کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں قبول کرنا ''مشبہ'' ہے۔ اور سماعت کرنا ''مشبہ بہ'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''سَمِعْنَا'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا (۱۹۳)﴾

اس جملہ میں ''تکرار'' بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں تکرار اس صورت میں ہوگا جب ''ذُنُوبَ''

❶ جناس مغائر یہ ہے کہ دو نوع کے کلموں میں جناس واقع ہو، یعنی اسم و حرف، اسم و فعل، یا حرف و فعل کے درمیان۔

❷ استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی جائے۔

اور ''سَیِّئَاتِ'' کا معنی ایک ہو۔ یعنی یہ دونوں جب غلطی اور گناہ کے معنی میں ہوں گے، تب ان میں تکرار ہوگا، وہ اس طرح کی ''ذُنُوبَ'' بھی گناہ کے معنی میں ہے۔ آیت میں ایک مرتبہ اس گناہ کے ذکر کرنے کے بعد دوبارہ اسی معنی کو ''سَیِّئَاتِ'' کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ اس جملہ میں بھی ''تکرار'' موجود ہے۔ اور یہ تکرار گناہوں کی کثرت کی طرف مشیر ہے۔ اور ''کَفِّرْ'' باب تفعیل سے معافی کی کثرت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

﴿رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۱۹۴)﴾

ترجمہ: اور اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ کچھ بھی عطا فرمائیے جس کا وعدہ آپ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے کیا ہے، اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے۔ یقیناً آپ وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کیا کرتے۔

اس آیت کریمہ میں ''وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' بول کر قیامت کے دن کی تخصیص کی گئی ہے، حالانکہ جس طرح قیامت میں رسوا ہونا ممکن ہے، اسی طرح دنیا میں بھی رسوائی ہوا کرتی ہے، مگر آیت میں دنیا کی رسوائی کا ذکر چھوڑ دیا گیا اور آیت میں قیامت کے دن کی تخصیص کردی گئی، چونکہ آخرت کی رسوائی دنیا کی رسوائی کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور ذلت آمیز ہے اور وہ رسوائی ساری انسانیت کے سامنے ہوگی، اس لئے آیت میں قیامت کی تخصیص کی گئی اور دنیا کا ذکر چھوڑ دیا گیا۔

﴿وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا (۱۹۱) رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ (۱۹۴)﴾

ان دونوں آیات مبارکہ میں ''ایجاز حذف'' پایا جاتا ہے۔ (1) یہاں پہلے جملہ میں

(1) ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی کلام میں کوئی جملہ، کلمہ یا اس سے زیادہ کو حذف کردیا جائے اور کلام میں اس محذوف کو متعین کرنے والا کوئی قرینہ بھی موجود ہو۔

''رَبَّنَا'' سے پہلے ''قَائِلِیْنَ'' کا لفظ محذوف ہے۔ یہ اصل میں ''وَیَتَفَکَّرُونَ فِی خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قَائِلِیْنَ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا'' تھا۔ آیت میں چونکہ ''قَائِلِیْنَ'' کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔

اسی طرح دوسرے جملہ ''عَلَی'' کے بعد ''اَلْسِنَةِ'' کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ اصل میں ''رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى أَلْسِنَةِ رُسُلِک'' تھا۔ اس سے چونکہ ''اَلْسِنَةِ'' کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے، اس لئے اس میں ''ایجاز حذف'' موجود ہے۔

﴿رَبَّنَا إِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ (۱۹۲) رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا(۱۹۳) رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا(۱۹۴)﴾

ان آیتوں میں لفظ ''رَبَّنَا'' کا ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ پہلے جملہ میں ''رَبَّنَا'' کا ذکر ہوا ہے، پھر اس کے بعد اگلی آیتوں میں بار بار اس لفظ ''رَبَّنَا'' کو دہرایا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ ان آیتوں میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ تیسرے جملہ میں بھی لفظ ''رَبَّنَا'' میں ''تکرار'' پایا جاتا ہے۔ یہ تکرار اس لئے ہوا تا کہ دعا مانگنے کے دوران اللہ تعالی کی ربوبیت کا اور عاجزی کا خوب اظہار ہو۔

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۵)﴾

ترجمہ: چنانچہ ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی (اور کہا) کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب آپس میں ایک جیسے ہو۔ لہذا جن لوگوں نے ہجرت کی، اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا، اور میرے راستے میں تکلیفیں دی گئیں، اور جنہوں نے (دین کی خاطر) لڑائی لڑی اور قتل ہوئے، میں ان سب کی برائیوں کا ضرور کفارہ

کردوں گا، اورانہیں ضرور بالضرور ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے انعام ہوگا، اوراللہ ہی ہے جس کے پاس بہترین انعام ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''**التفات من الغیبة إلی التکلم**'' پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلے ''رَبُّھُمْ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ لفظ اسم ظاہر ہے اوراسم ظاہر الفاظ غائب کے قبیل سے ہے، اس لحاظ سے آیت میں آگے ''لَاأُضِیعُ'' کی جگہ ''لَایُضِیعُ'' بول کر غائب کا لفظ لانا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس میں غائب کی جگہ ''لَاأُضِیعُ'' بول کر تکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں ''**التفات من الغیبة إلی التکلم**'' موجود ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ''**التفات من الغبیة إلی الخطاب**'' بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں پہلے لوگوں کے لئے ''لَھُمْ رَبُّھُمْ'' میں ''ھُمْ'' ضمیر غائب کا استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے آگے آیت میں ''**منکم**'' میں ''**کم**'' ضمیر خطاب کی جگہ ''**منھم**'' بول کر ''**ھم**'' ضمیر غائب کا استعمال ہونا چاہیے تھا، مگر آیت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ غائب کی جگہ ''**کم**'' خطاب کا لفظ لایا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ''**التفات من الغبیة إلی الخطاب**'' بھی موجود ہے۔ اس لئے تاکہ قبولیت دعا کی اہمیت کو بیان کیا جائے اور دعا مانگنے والوں کی عظمت وشرافت واضح کی جائے اور مخاطب کو عمل پر ابھارا جائے۔

﴿ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۵)﴾

اس آیت میں بھی ''**تکرار**'' پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ ''ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ'' میں لفظِ ''ثَوَابَ'' کا ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آگے آیت میں ''حُسْنُ الثَّوَابِ'' بول کر دوبارہ اسی لفظِ ''ثَوَابَ'' کو دہرایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ''**تکرار**'' موجود ہے۔ یہ تکرار تاکید کے لئے ہے کہ اللہ تعالی بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے۔

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ (۱۹۵)﴾

اس آیت کریمہ میں ''**استعارة تصریحیة**'' پایا جاتا ہے۔ یہاں دعا کے قبول کرنے

کو جواب دینے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں دعا قبول کرنا ”مشبہ“ ہے۔اور جواب دینا ”مشبہ بہ“ ہے۔آیت میں چونکہ ”اسْتَجَابَ“ بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے،اس لئے اس آیت میں ”استعارۃ تصریحیۃ“ موجود ہے۔

﴿أَنِّی لَا أُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنکُمْ (۱۹۵)﴾

اس آیت کریمہ میں بھی ”استعارۃ تصریحیۃ“ پایا جاتا ہے۔یہاں عمل کے عدم ضیاع کو عدم بدلہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں عمل کا عدم ضیاع ”مشبہ“ ہے اور عمل کا عدم بدلہ ”مشبہ بہ“ ہے۔آیت میں چونکہ ”لَا أُضِیعُ“ بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے،اس لئے آیت میں ”استعارۃ تصریحیۃ“ موجود ہے۔

﴿إِنَّ فِی خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَآیَاتٍ لِأُولِی الْأَلْبَابِ (۱۹۰)الَّذِینَ یَذْکُرُونَ اللهَ قِیَامًا وَقُعُودًا وَعَلَی جُنُوبِهِمْ (۱۹۱) لَا أُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنکُمْ مِنْ ذَکَرٍ أَوْ أُنْثَی بَعْضُکُمْ مِنْ بَعْضٍ (۱۹۵)﴾

مذکورہ تینوں آیات مبارکہ میں ”طباق“ پایا جاتا ہے۔[1] یہاں پہلے جملے میں ”السَّمَاوَات“ بمعنی (آسمانوں) کے ہے۔اور ”الْأَرْضِ“ بمعنی (زمین) کے ہے۔یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔اس لئے ان کے درمیان ”طباق“ موجود ہے۔اسی طرح اس جملہ میں ”اللَّیْلِ“ بمعنی (رات) کے ہے۔اور ”النَّهَارِ“ بمعنی (دن) کے ہے۔یہ دونوں معنی بھی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔اسی طرح دوسرے جملہ میں ”قِیَامًا“ اور ”قُعُودًا“ کے معنوں میں بھی ”طباق“ پایا جاتا ہے۔یہاں ”قِیَامًا“ بمعنی (کھڑا ہونے) کے ہے۔اور ”وَقُعُودًا“ بمعنی (بیٹھنے) کے ہے۔یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔

اسی طرح تیسرے جملہ میں لفظِ ”ذَکَرٍ“ بمعنی (مذکر) کے ہے۔اور لفظِ ”أُنْثَی“ بمعنی (مونث) کے ہے،یہ دونوں معانی بھی ایک دوسرے کے مقابل معانی ہیں،چونکہ ان

[1] طباق کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام میں دو مقابل معنوں کو جمع کر دیا جائے۔

کوآیت میں جمع کردیا گیاہے،اس لئے ان میں ''طباق'' موجود ہے۔

﴿أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا(۱۹۳) لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى (۱۹۵)﴾

ان دونوں جملے میں ''جناس مماثل '' پایا جاتا ہے۔❶ یہاں پہلے جملہ میں '' آمِنُوا'' اور'' آمَنَّا'' دونوں فعل ہیں۔یہ دونوں فعل ہونے کی وجہ سے ایک ہی نوع کے کلمے ہیں،اس لئے ان دونوں میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔اسی طرح دوسرے جملہ میں ''عَمَلَ اور عَامِلٍ'' دونوں اسم ہیں، یہ دونوں بھی اسم ہونے کی وجہ سے ایک ہی نوع کے کلمے ہیں۔ چونکہ ان میں جناس واقع ہوا ہے،اس لئے ان میں ''جناس مماثل'' موجود ہے۔

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ (۱۹٦)﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان کا شہروں میں (خوشحالی کے ساتھ) چلنا پھرنا تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے۔

اس آیت کریمہ میں بھی ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔ یہاں طلب معاش کے لئے کافروں کے زمین پر سفر کرنے کو الٹنے پلٹنے سے تشبیہ دی گئی۔اس میں طلب معاش کے لئے کافروں کے زمین پر سفر کرنا''مشبہ'' ہے۔اورالٹنا پلٹنا''مشبہ بہ'' ہے۔آیت میں چونکہ ''تَقَلُّبُ''بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کردی گئی ہے،اس لئے اس آیت میں ''استعارۃ تصریحیۃ'' موجود ہے۔

﴿مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۹۷)﴾

ترجمہ: یہ تو تھوڑا سا مزہ ہے (جو یہ اڑا رہے ہیں) پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے،اور وہ بدترین بچھونا ہے۔

اس آیت میں بھی ''استعارۃ تصریحیۃ'' پایا جاتا ہے۔یہاں جہنم کو مستقل ٹھکانے

❶ جناس مماثل یہ ہے کہ ایک نوع کے دو کلموں میں جناس واقع ہو۔

سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں جہنم ''مشبه'' ہے اور مستقل قرار والی جگہ ''مشبه به'' ہے۔ آیت میں چونکہ ''الْمِهَادُ'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

﴿لَكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ (۱۹۸)﴾

ترجمہ: لیکن جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوئے عمل کرتے ہیں، ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اللہ کی طرف سے میزبانی کے طور پر وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ وہ نیک لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ'' بول کر نیکوکاروں کی تخصیص کی گئی، دوسروں کا ذکر چھوڑ دیا گیا، چونکہ یہاں مقصود ابرار کی فضلیت کو بیان کرنا ہے، اسی لئے بالخصوص آیت میں دیگر کو چھوڑ کر ابرار کی تخصیص کی گئی ہے۔

﴿خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۱۹۸)﴾

اس آیت کریمہ میں ''استعارة تصريحية'' پایا جاتا ہے۔یہاں جنت میں ملنے والے اعزاز و کرامتوں کو مہمان نوازی کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں جنت میں اعزازات وکرامات کا ملنا ''مشبه'' ہے۔اور مہمان نوازی کرنا ''مشبه به'' ہے۔آیت میں چونکہ ''نُزُلًا'' بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے۔اس لئے اس آیت میں ''استعارة تصريحية'' موجود ہے۔

﴿وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹۹)﴾

ترجمہ: اور بیشک اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کے آگے عجز و نیاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر بھی جو تم پر نازل کی گئی ہے اور اس پر بھی جو ان پر نازل کی گئی تھی، اور اللہ کی آیتوں کو تھوڑی سی قیمت لے کر بیچ نہیں ڈالتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہیں۔ بیشک اللہ حساب جلد چکانے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں کافروں کا بدلہ دیئے جانے کو حساب کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ میں کافروں کو بدلہ جانا "مشبه" ہے۔ اور حساب کرنا "مشبه به" ہے۔ آیت میں چونکہ "الْحِسَابِ" بول کر مشبہ بہ کی صراحت لفظوں میں کر دی گئی ہے، اس لئے اس میں "استعارة تصريحية" موجود ہے۔ یہاں استعارہ اس لئے لیا گیا کیونکہ اس میں حساب اپنے معنی میں نہیں ہوسکتا، وجہ یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے بارے میں ہے اور کافروں کے لئے قیامت کے روز کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا، جیسے اللہ کا فرمان ہے: "فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا" (کفار کے اعمال اکارت ہوجائینگے اور ہم ان کے لئے کوئی ترازوں حساب کتاب کا قائم نہیں کرینگے۔) اس سے صراحتاً معلوم ہوا کہ قیامت کے روز کافروں کے لئے حساب نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہاں حساب بمعنی بدلہ کے ہوکر استعارہ واقع ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں "تکرار" بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک مرتبہ "وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ" میں لفظِ "مَا" اور "إنزال" کا ذکر کیا گیا، پھر اس کے بعد آگے آیت میں "وَمَا أُنْزِلَ" بول کر دوبارہ اس کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ آیت میں "تکرار" ہے۔ یہ تکرار اس لئے تا کہ بعض اہلِ کتاب کے سابقہ اور موجودہ نزولِ وحی پر ایمان لانے کو تاکید کے ساتھ بیان کیا جائے۔

مؤلف کی کاوشوں پر ایک طائرانہ نظر

اسٹاکسٹ

ادارۃ المعارف کراچی
(احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا۔ کراچی)
021-35123161,021-35032020,0300-2831960

مولانا محمد ظہور صاحب
(جامعہ سراج الاسلام، پارہوتی، مردان)
0334-8414660,0313-1991422

مولانا محمد نعمان صاحب کے علمی و تحقیقی بیانات و دروس کے لئے اس وٹس ایپ نمبر پر رابطہ کریں: 03112645500

Designed & Printed By: Shafaq Urdu Bazar Karachi. 0321-2037721